ایڈورڈ سعید

ترجمہ : شاہد حمید

ایلفا براوو

مسئلۂ فلسطین
ایڈورڈ سعید
ترجمہ: شاہد حمید
الفا براوو
بک سیلرز اینڈ پبلشرز، میاں چیمبرز، ۳۔ٹیمپل روڈ۔لاہور

بار اوّل : ۱۹۹۱ء

ناشر : ایلفابرادو، لاہور

پریس : طفیل آرٹ پریس، لاہور

قیمت : دو سو روپے

فرید حدّاد

اور

راشد حسین

کی یاد میں

ایڈورڈ سعید

فہرست مضامین

باب ۴

کیمپ ڈیوڈ کے بعد مسئلہ فلسطین

عرض مترجم

ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب "فلسطین کا مسئلہ" کیمپ ڈیوڈ[1] کے معاہدے کے کچھ ہی عرصہ بعد تحریر کی تھی۔ اس دوران میں پلوں کے نیچے بہتیرا پانی بہہ چکا ہے۔ خود مشرق وسطیٰ کا منظر وہ نہیں رہا جو ۱۹۸۵ء کے عشرے کے اوائل میں تھا۔ ایران اور عراق ایک طویل اور خونریز جنگ لڑ چکے ہیں۔ لبنان ابھی تک خانہ جنگی کی لپیٹ میں ہے۔ لیکن وہاں کی صورت حال وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ "لندن ٹائمز" کے ایک نامہ نگار کے مطابق بعض مغربی طاقتوں کا یہ خیال ہے کہ لبنان کی عیسائی اقلیت کا تحفظ اسی صورت ممکن ہے کہ اسے وہاں سے نکال لیا جائے اور قبرص میں آباد کر دیا جائے (قبرص کے ترکوں کے لیے لمحۂ فکریہ)

۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ عمومی طور پر عربوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ مصر، شام اور اردن کی فوجیں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئیں۔ لیکن اس جنگ کے بطن سے فلسطینی تحریک مزاحمت نے ایک نیا موڑ لیا۔ یاسر عرفات تحریک آزادیٔ فلسطین (پی ایل او) کے نئے رہنما منتخب ہوئے اور ان کی قیادت میں فلسطینیوں نے اسرائیل کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں کا آغاز کیا۔ اردن اور لبنان ان کارروائیوں کے مرکز قرار پائے۔ اردن کے شاہ حسین اسرائیل کی جوابی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ اردن اور لبنان ان کارروائیوں سے

---

[1] تفصیل باب چہارم میں دیکھیں۔

اتنے لرزہ براندام ہوئے کہ خود انہوں نے فلسطینیوں کے خلاف بزن بول دیا۔ اور خاصے کشت و خون کے بعد انہیں اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ لبنان میں البتہ فلسطینی اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں ان کے پناہ گزینوں کے کیمپ ہی نہیں تھے بلکہ چھاپہ مار کارروائیوں کے بڑے اڈے بھی وہیں قائم ہو گئے۔ اسرائیل ان کارروائیوں سے اتنا زچ ہوا کہ ۱۹۸۷ء میں وہ براہِ راست لبنان پر حملہ آور ہو گیا۔ اس حملے کے تین مقاصد تھے۔

اوّل: لبنان میں فلسطینیوں نے اپنے جو قدم مضبوطی سے جما لیے تھے، انہیں اکھاڑا جائے۔

دوم: اسرائیلی سرحدوں سے ملحق لبنان کے علاقے پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ روز روز کے فلسطینی حملوں کا امکان ختم ہو سکے۔

سوم: لبنانی عیسائیوں کو فلسطینیوں اور مقامی مسلمانوں کے خلاف ہلاشیری دی جائے تاکہ مقامی لوگ آپس ہی میں الجھے رہیں اور یوں اسرائیل کی طرف کوئی میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

بظاہر اسرائیل ان مقاصد کے حصول میں خاصا کامیاب رہا ہے۔ وہ جنوبی لبنان کے خاصے بڑے حصے پر اپنا تسلط قائم کر چکا ہے اور وہاں مسلمانوں کے خلاف اپنے عیسائی حاشیہ نشینوں کا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ بیروت کے قریب صابرہ اور شتیلہ کے فلسطینی کیمپوں پر توپوں، ٹینکوں، بحری اور ہوائی جہازوں سے یلغار کر دی۔ فلسطینی بیچارے

جو پہلے ہی اپنوں کے لگائے ہوئے زخموں کی وجہ سے نڈھال تھے ، معمولی ہتھیاروں کی مدد سے کب تک مقابلہ کرتے ۔ اگرچہ وہ کئی دن تک "میدانِ جنگ" میں ڈٹے رہے ، تاہم آخرکار انہیں ہزیمت اٹھانا پڑی ۔ یاسر عرفات بمشکل تمام اپنی جان بچا سکے ۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے اس موقع پر خوب بغلیں بجائیں ۔ انھوں نے اسے اسرائیل کی "فتح عظیم" اور یاسر عرفات کی "شکستِ فاش" سے تعبیر کیا ۔ اسرائیلیوں اور ان کے حواریوں نے ان دونوں کیمپوں میں اس قدر سفاکی ، درندگی اور شقاوت کا مظاہرہ کیا اور اتنے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا کہ چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ ہو گئی اور ساری دنیا "الامان ، الامان" پکار اٹھی ۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں خیر کا پہلو پنہاں ہوتا ہے ۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی ۔ اسرائیل کی ساری تدبیریں الٹی پڑ گئیں ۔ اس نے تقریباً نہتے جلاوطن فلسطینیوں کو پہلے بے دست و پا بنا دیا ہو لیکن قدرت کے رنگ نیارے ہیں ۔ فلسطینیوں کو جب نہ اردن نے قبول کیا اور نہ لبنان میں جائے پناہ مل سکی جہاں سے وہ دشمن کے خلاف برسرِ پیکار ہو سکتے تو خود ان علاقوں سے ، جن پر اسرائیل نے جنگ ۱۹۶۷ء کے دوران میں قبضہ کر لیا ، آزادی و حریت کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور وہاں کے عربوں نے غاصب و قابض دشمن کے خلاف تحریک مزاحمت کا ، جسے "انتفاضہ" کا نام دیا گیا ہے ، آغاز کر دیا یہ تحریک اتنی جاندار اور روح پرور ثابت ہوئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ، جن کی عمریں بمشکل سات سات ، آٹھ آٹھ سال ہوں گی ، بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لے رہے ہیں ۔ لوگ گرفتار ہوتے ہیں ، اسرائیلی بربریت کا نشانہ بنتے ہیں ، اپنی آنکھوں اپنے گھروں کو مسمار اور فصلوں کو نذرِ آتش ہوتا دیکھتے ہیں

ملک بدر ہوتے ہیں، گولیوں سے ان کے جسم بھنتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بے رحم اور سنگ دل فوجی درندوں سے ڈنڈے، لاٹھیاں اور گولیاں کھاتے ہیں، جسمانی، ذہنی اور روحانی ایذائیں سہتے ہیں، لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں آتی۔ اسرائیل نے ہر حربہ آزمالیا، ہر ظلم آزمالیا لیکن وہ اس تحریک کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تحریک کی طوالت، فلسطینیوں کی استقامت اور ان کے جذبۂ حریت کی فراوانی نے ان کے بدترین مخالفوں کو بھی انگشت بدنداں کر دیا ہے، یا دلِ ناخواستہ ہی سہی، وہ شمع آزادی کے ان پروانوں کے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہیں۔

دوسری طرف انقلاب دیگر نمودار ہوا۔ تحریک آزادی فلسطین کے صدر یاسر عرفات اور دوسرے رہنماؤں نے سجدہ سہو یوں ادا کیا کہ انہوں نے نہ صرف اسرائیل کے خلاف "متشدانہ" کارروائیوں کا سلسلہ بند کر دیا بلکہ اسرائیل کو زندہ و تابندہ حقیقت کے طور پر قبول کر لیا اور اس کے ساتھ براہِ راست کلام کرنے کی حامی بھر لی۔ لیکن اسرائیل پر اس "نے نوازی" کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ ابھی تک یاسر عرفات اور ان کے ساتھیوں کو "دہشت گرد" کہنے پر مصر ہے، مقبوضہ علاقوں سے اپنا قبضہ ختم کرنے پر راضی نہیں اور فلسطینیوں کے ساتھ کسی قسم کی بات چیت کا ڈول ڈالنے سے انکاری ہے۔ چنانچہ فلسطین کا مسئلہ یوں کا توں لٹکا ہوا ہے اور مستقبل قریب میں اس کے حل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

اوپر جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، فطرتاً ایڈورڈ سعید کی کتاب میں ان کا ذکر نہیں ملے گا کیونکہ یہ ان واقعات کے رونما ہونے سے پہلے لکھی جا چکی

تھی۔ لیکن مصنف نے اپنی کتاب میں جن بنیادی مباحث ۔ صیہونیت کیا ہے؟ یہ کہاں سے آئی؟ یہودیوں نے اس کے فروغ کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے؟ مغربی سیاست دانوں نے مکروفریب کے کیا کیا جال بچھائے؟ نام نہاد لبرل دانشوروں، ناول نگاروں، شاعروں، مقالہ نویسوں، سفرناموں کے مصنفوں اور صیہونیت کے دیگر ہمدردوں نے کیسے فضا ہموار کی؟ خود صیہونیوں نے فلسطین میں آباد ہونے کے لیے کن کن جتنوں سے کام لیا اور اپنے دعاوی کو سچا ثابت کرنے کے لیے کن کن تاویلوں کا سہارا لیا؟ جب اسرائیل قائم ہو گیا تو فلسطینیوں کو کیسے ملک بدر کیا گیا؟ اور جو نکالے نہ جا سکے، ان پر کیسے عرصۂ حیات تنگ کیا گیا اور جمہوریت کے تمام تر دعووں کے باوجود انہیں آج تک کیسے درجہ دوم کے شہری بنائے رکھا گیا؟ فلسطینیوں نے تحریک آزادی کیسے منظم کی اور فلسطینی شاعروں، کہانی نویسوں، دوسرے ادیبوں، مصنفوں اور دانشوروں نے کیسے اس تحریک کے لیے زمین ہموار کی اور اس کی آبیاری کی؟ پی۔ ایل۔ او اور دوسری تحریکیں کیسے وجود میں آئیں؟ جنگ سڑسٹھ کے کیا نتائج مرتب ہوئے؟ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے نے کیا گل کھلائے؟ فلسطینیوں کے نقطۂ نظر سے فلسطین کے مسئلے کا کیا حل ممکن ہے؟ وغیرہم — کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے اور ان پر جو سیر حاصل بحث کی ہے، وہ ہمیں اس مسئلہ کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے میں بہت مدد دیتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس مسئلہ کو پہلی مرتبہ صحیح انداز سے پیش کیا گیا ہے، تو غلط نہ ہوگا۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی یہ کتاب صیہونیت کے اصل چہرے سے

نقاب سرکانے اور اس ضمن میں مغرب کے نام نہاد لبرل سیاستدانوں اور دانشوروں نے جو مکروہ کردار ادا کیا ہے، اس کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑنے کی غرض سے لکھی تھی۔ وہ اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صہیونیوں نے یہ کتاب ہی بازار سے غائب کرا دی، اب تو کسی خوش نصیب کو ہی دستیاب ہوتی ہے۔

جب چھاپہ خانہ وجود میں نہیں آیا تھا، کسی کتاب کا غائب کرنا آسان نہیں تھا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے بقول کم از کم برِصغیر میں ایسا کرنا ناممکنات میں تھا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت کے درمیان میں لوگوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آچکا تھا جنہیں ورّاق یا[1] نسّاخ کہتے تھے۔ یہ ہر کوچہ و بازار میں کھڑے رہتے تھے۔ چونکہ ان لوگوں کا ذریعہ روزگار نقل نویسی تھا اس لیے یہ ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ کون سی کتاب کون سے شہر یا قصبے میں دستیاب ہے۔ جونہی کوئی آرڈر موصول ہوتا، وہ فوراً اس کی نقل کرتے

---

[1] وہ لوگ جو قرآن مجید، حدیث یا دوسری کتابوں کی نقول تیار کرتے تھے یا کاغذ فروشی کا دھندہ کرتے تھے، انہیں وراق کہتے تھے۔ برصغیر میں انہیں نساخ بھی کہتے تھے۔ "فوائد بہیہ" از مولانا عبدالحیی فرنگی محلی بحوالہ "پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ صفحہ ۵۷

[2] یہ لوگ اپنے کام میں کتنے پھرتیلے تھے۔ اس کی بے شمار، سید مناظر احسن گیلانی نے اپنی محولہ بالا کتاب میں دی ہیں۔ بگرام کے ایک عالم شاہ طیب نے چار پانچ سو صفحے کی شرح ملا جامی" ایک ہفتے میں نقل کر دی۔ انہوں نے ایک اور ضخیم کتاب

بقیہ اگلے صفحہ پر

اور گاہک تک پہنچا دیتے ۔
عبدالقادر بدایونی اکبر اعظم کے دربار کے ساتھ منسلک تھے اور اپنے زمانے کے زبردست وقائع نویس تھے ۔ انہیں اکبر اعظم کے اکثر اعمال و افعال سے شدید اختلاف رہتا تھا ۔ ایک مطلق العنان عہد حکومت میں وہ اس کا اظہار کھلے بندوں نہیں کر سکتے تھے ۔ ہوتا یہ تھا کہ وہ روزمرہ کے واقعات کی صورت میں قلمبند کرتے رہتے تھے ۔ اپنی زندگی میں انھوں نے کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دی ۔ لیکن جونہی ان کی آنکھ بند ہوئی ، نساخوں کو اس تصنیف بے بہا کی سن گن مل گئی اور انہوں نے دنوں کے اندر اندر اس کے نسخے تمام مملکت میں پھیلا دیئے ۔ اس وقت جہانگیر سریرائے تخت تھا ۔ اسے بھی خبر مل گئی ۔ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا ۔ "اولادِ او (عبدالقادر) طلب داشتہ و اعتراض ساختند" ۔ انھوں نے عذر پیش کیا ۔ "آنہا گفتند ما خورد سال بودیم ، خبرے نداریم" ۔ جہانگیر کی سمجھ میں کچھ کچھ بات آ گئی ، بہر حال

"بقیہ حاشیہ ۱۱" ، "بہجۃ المحافل" ۲۳ دنوں میں خوشخط رقم کر دی ۔ فیضی اور ابوالفضل کے والد شیخ مبارک نے اپنے ہاتھ سے پانچ صد کتابیں تحریر کی تھیں ۔ اور سب سے حیرت انگیز واقعہ یہ ہے ۔ مشرقی پنجاب کے قصبے حصار میں حضرت بابا فرید شکر گنج کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ جنید حصاری مقیم تھے ۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے ان کی زود نویسی کے متعلق لکھا ہے ۔ "در سہ روزہ تمام قرآن مجید با اعراب می نوشت" تین دنوں میں زیر زبر پیش کے ساتھ قرآن مجید تحریر کرنا معجزہ ہی ہو سکتا ہے ۔ لیکن اس سے اس زمانے کی زود نویسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ روزنامہ "ہندو" مدراس کے بقول برصغیر میں چھاپے خانے پر پہلی کتاب ۱۵۵۰ء میں چھپ چکی تھی لیکن چھاپہ خانے مقبول نہ ہو سکے کیونکہ وہ خطاطوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے ۔

اس نے ملا کے بچوں سے مچلکہ لے لیا کہ کتاب کی اشاعت نہ ہونے پائے
لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس زمانے کی "وراقیت" اور "نساخیت" کا
نظام اتنی وسعت اختیار کر چکا تھا کہ جہانگیر کی مطلق العنان حکومت اپنی تمام کوششوں
کے باوجود ملا کی تاریخ معدوم کرانے سے قاصر رہی۔

اس کے برعکس آج جب پریس اتنی ترقی کر چکا ہے اور تو اور نقول کی تیار
کرنے کی مشینیں ہر گلی نکڑ پر موجود ہیں، کتاب غائب کرانا اتنا مشکل نہیں۔ اگر کسی
حکمران کی جبین ناز پر کسی کتاب کی اشاعت سے بل پڑ جائیں، تو اس کی اشاعت
پر آناً فاناً پابندی لگ جاتی ہے۔ تیسری دنیا کے ہم چوں ما دیگرے نیست قسم کے
حکمران یہی طریقہ پسند فرماتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا کرنے سے زیر زمین
کام کرنے والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ ایک طریقہ صیہونیوں نے اختیار کیا ہے
جونہی ان کے کانوں میں بھنک پڑتی ہے کہ کوئی ایسی تصنیف بازار میں آئی ہے یا آنے
والی ہے، وہ اس کی تمام کاپیاں خریدنے دوڑتے ہیں۔ کتاب تلف ہو جاتی ہے
اور اگر پبلشر مغربی ہے، تو پھر ترکش کے تمام تیر آزما کر اس کی مزید اشاعت
رکوا دی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایڈورڈ سعید کی اس کتاب کے ساتھ
بھی کچھ اسی قسم کی واردات گزری ہے۔ راقم الحروف کو اپنے قیام لندن کے
دوران میں کسی دکان پر بھی، نہ نئی نہ پرانی کتابیں بیچنے والی، اس کا کوئی نسخہ
دستیاب نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ FOYLES میں بھی نہیں، جن کا یہ دعویٰ ہے کہ
وہ ہر وقت پچاس لاکھ کتابیں سٹاک میں رکھتے ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے
کتب فروش ہیں۔ معلوم نہیں خالد احمد ڈپٹی ایڈیٹر "فرنٹیئر پوسٹ" لاہور نے
اپنے واشنگٹن میں قیام کے دوران میں یہ کتاب کیسے اور کہاں سے ڈھونڈ
نکالی۔ انہوں نے محمد سلیم الرحمٰن کو پڑھنے کے لیے دی۔ وہ اسے پڑھ کر چوکے

اور فیصلہ کیا کہ اس کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ محمود گیلانی ایسی چیز چھاپنے کے تیار رہتے ہیں۔ فوراً حامی بھرلی۔ ترجمے کے لیے قرعۂ فال ناچیز کے نام نکلا اور یوں اسے اردو میں منتقل کرنے کا موقعہ میسّر آیا۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی یہ کتاب امریکی قارئین کے لیے تحریر کی تھی۔ یوں اس میں ایسی بے شمار شخصیات، واقعات اور اصطلاحات کے حوالے ہیں، جن سے اہل مغرب تو خوب واقف ہیں لیکن۔ اس ناچیز کی دانست میں چند ایک لوگوں کو چھوڑ کر وہ اردو کے عام قارئین کے لیے اجنبی ہیں۔ چنانچہ موضوع کو عام سہل بنانے کے لیے متعلقہ مقامات پر حواشی تحریر کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں مصنف نے خود حواشی تحریر کئے ہیں وہاں لفظ "مصنف" لکھ دیا گیا ہے۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کی مختلف کتابوں کے نام بھی مصنف ہی نے دیئے ہیں۔ باقی حواشی راقم الحروف کے تحریر کردہ ہیں، اس لیے ان میں اگر کوئی اغلاط ہوں، تو اس کی ذمہ داری اسی کے کندھوں پر ہوگی نہ کہ فاضل مصنف کے۔

ترجمے پر نظر ثانی محمد سلیم الرحمٰن نے کی ہے۔ عربی مقامات اور اشخاص کے ناموں کے تلفظ کے بارے میں سجاد رضوی نے اعانت کی ہے۔ میں ان دونوں احباب کا مشکور ہوں

شاہد حمید

لاہور

۲۱ر ستمبر ۱۹۸۹ء

مصنّف

ایڈورڈ سعید بیت المقدس میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی اور
ثانوی تعلیم بیت المقدس اور مصر کے سکولوں میں حاصل کی۔ پھر وہ امریکہ
چلے آئے۔ بی۔ اے انھوں نے پرنسٹن یونیورسٹی میں کیا۔ ایڈورڈ سعید نے
ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں اسی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ یہاں
انھوں نے BOWDOIN انعام بھی حاصل کیا۔

۱۹۷۴ء میں ایڈورڈ سعید ہارورڈ یونیورسٹی میں تقابلی ادب کے مہمان
پروفیسر تھے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں انھوں نے سٹینفورڈ یونیورسٹی کے نفسیات
اور کرداری علوم کی اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں فیلو کی حیثیت سے خدمات سرانجام
دیں۔ ۱۹۷۷ء میں انھوں نے پرنسٹن یونیورسٹی میں ادبی تنقید پر لیکچر دیئے۔
۱۹۷۹ء میں وہ ایک اور مشہور امریکی یونیورسٹی جان ہاپکنز کے شعبہ انسانیات
میں مہمان پروفیسر تھے۔ آج کل وہ نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی اور
تقابلی ادب کے پروفیسر ہیں۔ انھیں مشہور ناول نگار کونریڈ پر سند تسلیم کیا جاتا ہے۔
ایڈورڈ سعید کی کتب آٹھ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور یورپ، افریقہ،
ایشیا، اور آسٹریلیا میں چھپ چکی ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی نے اپنا پہلا سالانہ
ٹریلنگ TRILLING انعام انہیں ان کی کتاب "BEGINNINGS :
INTENTION & METHOD" پر دیا۔ ۱۹۷۸ء میں امریکہ

کے نیشنل بک کرٹکس سرکل ایوارڈ کے شعبۂ تنقید کے مقابلے میں ان کی کتاب "اوریئنٹلزم" دوسرے نمبر پر آئی۔ ان کی دیگر کتب میں "لٹریچر اینڈ سوسائٹی" اور Conrad and the Fiction of Autobiography شامل ہیں۔

محمد حسن عسکری اور فیض احمد فیض نے ایڈورڈ سعید کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ خود ایڈورڈ سعید نے بیروت میں فیض احمد فیض سے اپنی ملاقات کا ذکر بڑے پیار سے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ یہ مضمون انگلستان کے ایک رسالے "گرانٹا" میں شائع ہوا تھا۔

فلسطینیوں کا پُرزور طریقے سے مؤقف پیش کرنے کی پاداش میں صیہونی ان پر زبانی ہی نہیں بلکہ جسمانی حملے بھی کر چکے ہیں۔ ایڈورڈ سعید فلسطینی قومی کونسل کے رُکن بھی ہیں۔

دیباچہ

اگرچہ اس کتاب کا بیشتر حصہ ۱۹۷۷ء کے دوران میں اور ۱۹۷۸ء کے اوائل میں تحریر کیا گیا تھا، تاہم مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ کے اس انتہائی اہم دور ۷۸-۱۹۷۷ء میں جو واقعات رُونما ہوئے، یہ کتاب محض ان کے حوالے سے تحریر نہیں کی گئی ہے۔ اس کے برعکس میرا مقصد یہ تھا کہ میں ایک ایسی کتاب تحریر کروں جو امریکی قارئین کے سامنے فلسطینی مؤقف کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جو ایک وسیع اکثریت کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہو۔ یہ درست ہے کہ فی زمانہ (مغرب میں) فلسطینیوں اور فلسطینی مسئلے کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ جہاں تک فلسطینیوں کے مؤقف کا تعلق ہے، اسکی تحسین کرنا تو بہت دُور کی بات ہے، (مغرب کے) اکثر لوگوں کو یہ بھی علم نہیں کہ یہ مؤقف ہے کیا۔ اس مؤقف کو ایک منضبط اور مربوط شکل میں پیش کرنے کے لیے میں نے زیادہ تر جس چیز پر انحصار کیا ہے، اسے بجا طور پر فلسطینی تجربہ کہا جا سکتا ہے، اور جب ۱۸۸۰ء کے عشرے کے اوائل میں صیہونی نوآبادکاروں کے اولیں قافلے فلسطین کے ساحلوں پر وارد ہونے لگے، تو یہ تجربہ اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کا تجربہ بن گیا۔ اس کے بعد فلسطینی تاریخ ایک اپنا ہی مخصوص اور عجب

تاریخ سے خاصا مختلف رخ اختیار کر لیتی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اس صدی کے دوران میں جو کچھ فلسطینیوں نے کیا اور جو کچھ دوسرے عربوں نے کیا، ان کے مابین متعدد روابط پائے جاتے ہیں لیکن فلسطینی تاریخ کی وہ خصوصیت، جو اسے دوسروں سے مختلف بنا دیتی ہے ——— اس کا صیہونیت کے ساتھ کاری قومی تصادم ——— اپنے خطّے میں اپنی مثل آپ ہے ۔

اس کتاب کو تحریر کرنے میں میری جو غرض و غایت تھی اور میں نے اس ضمن میں جو کارکردگی دکھائی ہے (یہ دونوں باتیں خواہ کتنے ہی نقائص اور خامیوں سے لبریز ہوں) ان میں فلسطینی تاریخ کی اس بے مثال خصوصیت (جس کا ذکر اوپر آیا ہے) نے میری راہنمائی کی ہے ۔ خود ایک فلسطینی ہونے کے ناطے میں نے بلاشبہ یہ کوشش کی ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہم میں جو کمزوریاں اور کوتاہیاں ہیں، میں ان سے آگاہ رہوں ۔ بعض معیاروں کے مطابق ہم شاید دوسروں سے کوئی مختلف قوم نہیں ۔ ہماری قومی تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ جب ہمارا مقابلہ بنیادی طور پر ایک یورپی اور جاہ طلب نظریے اور اس کی عملی تفسیر سے ہوا تو ہم مات کھا گئے ۔ ہم مغرب کو یہ جتانے میں ناکام رہے ہیں کہ ہم جس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، وہ مبنی بر انصاف ہے ۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ہم نے اپنے سیاسی تشخص اور ارادے کی تعمیر شروع کر دی ہے ۔ ہم نے آہستہ آہستہ، دھیرے دھیرے، اپنے اندر ایک زبردست لچک پیدا کر لی ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی ہے کہ ہمارا زبردست قومی احیاء ہوا ہے ۔ ہم نے

تیسری دنیا کی تمام اقوام کی حمایت حاصل کر لی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس حقیقت کے باوجود کہ جغرافیائی طور پر ہم منتشر ہو چکے ہیں اور مختلف ٹولیوں میں بٹ چکے ہیں، اور اس حقیقت کے بھی باوجود کہ دنیا میں کوئی ایسا علاقہ نہیں، جسے ہم اپنا علاقہ کہہ سکیں، ہم زیادہ تر ایک قوم کی حیثیت سے متحد ہو چکے ہیں۔ ہمارا یہ اتحاد کیوں ممکن ہوا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسطینی تصور (ہمیں جس قسم کی بے دخلی کا اور جس قسم کے جبر و تشدد کا، جو صرف ہمارے لیے ہی روا رکھا گیا، تجربہ ہوا، یہ تصور اسی تجربے کا شاخسانہ ہے) میں اتنی قوت ہے کہ یہ مختلف الخیال عناصر کو آپس میں مربوط کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہم سب نے اس تصور کو مثبت جوش و خروش کے ساتھ لبیک کہا۔ فلسطینیوں کو جو ناکامیاں اٹھانا پڑیں اور بعد میں جس طرح ان کا احیا ہوا، یہی وہ باتیں ہیں جنہیں ان کی جیتی جاگتی تفصیلات و جزئیات سمیت میں نے اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم میرا گمان یہ ہے کہ جب بھی میرے (امریکی اور یورپی) قارئین کے سامنے فلسطینی مسئلہ آتا ہے، تو ان میں سے بہتوں کے ذہنوں میں فوراً "دہشت گردی" کا تصور لپکنے لگتا ہے۔ اور میں نے اس کتاب میں دہشت گردی کا جو زیادہ ذکر نہیں کیا تو اس کی جزوی وجہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کو بالکل ناجائز اور غیر منصفانہ انداز سے جس سے کینہ اور بغض چھلکا پڑتا ہے، دہشت گردی کے مترادف قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگر میں ایسا کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اپنا استدلال دفاعی انداز سے پیش کر رہا ہوں۔ اس صورت میں یا تو میں یہ کہتا کہ ہماری "دہشت گردی" جیسی بھی ہے، اس کا جواز موجود ہے اور یا پھر میں یہ نقطۂ نظر اختیار کر لیتا کہ

فلسطینی دہشت گردی نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور لوگ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔ تاہم حقائق اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ان میں سے بعض کا یہاں اعادہ کر دیا جائے۔ محض اعداد و شمار ہی کو لے لیں۔ اب تک جتنی انسانی جانوں کا اتلاف ہوا ہے اور جتنی املاک تباہی و بربادی کا شکار ہوتی ہیں، انہی کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اب تک صیہونیوں نے فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں جو انتقاماً جوابی کارروائی کے طور پر فلسطینیوں نے صیہونیوں کے ساتھ کیا ہے۔ گزشتہ بیس سالوں سے اسرائیل، اردن اور لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں کو جس طرح تقریباً مسلسل اپنے حملوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے، وہ اس حقیقت کی صرف ایک نمائندہ تصویر ہے کہ صیہونیوں اور فلسطینیوں نے تباہی و بربادی کے جو ریکارڈ قائم کئے ہیں، ان دونوں میں سرے سے کوئی تناسب نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ مغربی (اور یقیناً صیہونی لبرل) صحافی اور دانشور اپنی گفتگوؤں اور تحریروں میں بڑی منافقت برتتے ہیں کیونکہ (جب فلسطینی دہشت گردی کا ذکر آتا ہے تو وہ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں لیکن) وہ اس صیہونی دہشت گردی کے متعلق ایک لفظ تک نہیں کہتے بلکہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے رہتے ہیں[1]۔ کیا یہ صریحاً بے ایمانی نہیں کہ جب فلسطینیوں کی کارروائیوں کا تذکرہ مقصود

---

[1]: اس سے ملتی جلتی سنسر شپ کا ایک جائزہ امریکہ کے ماہر لسانیات نوئم چومسکی نے اپنے مضمون

"Ten years After tet: The Big Story That Got Away"

میں پیش کیا تھا۔ یہ مضمون ایک جریدے "More"

کی جلد ہشتم شمارہ ۶ (جون ۱۹۷۸ء) کے صفحات نمبر ۱۶-۲۳ پر شائع ہوا تھا۔

ہوتا ہے تو اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنے کے لیے "اسرائیلی شہری باشندوں" یا "قصبوں" اور "دیہاتوں" یا "سکولوں کے (معصوم) بچوں" کے خلاف "عربوں" کی دہشت گردی جیسی بلیغ تراکیب استعمال کی جاتی ہیں لیکن جب اسرائیل معصوم و بے گناہ فلسطینی شہری باشندوں پر بم باری کرتا ہے تو "فلسطینی ٹھکانوں" پر "اسرائیلی حملے" جیسی غیر جانبدارانہ لفاظی سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اس قسم کی تراکیب اور الفاظ سے قطعاً یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اسرائیلی حملوں کا اصل ہدف جنوبی لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپ ہیں حالانکہ اشارہ انہی کی طرف ہوتا ہے [دسمبر ۱۹۷۰ء کے اواخر میں جو واقعات پیش آئے، ان کے متعلق امریکی اخبارات میں خبریں اور رپورٹیں شائع ہوئیں، اب میں انہی خبروں اور رپورٹوں کے حوالے سے بات کر رہا ہوں] جب سے (۱۹۶۷ء) اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ پر قبضہ کیا ہے، اسرائیلی قابض حکام وہاں آئے روز جس قسم کی چیرہ دستیاں روا رکھ رہے ہیں اور جس طرح کی دوسری شرمناک کارروائیاں کر رہے ہیں، ان میں قطعاً کوئی کمی نہیں آئی لیکن مغرب (اور اسرائیل) کے اخبارات و جرائد اور دوسرے ذرائع ابلاغ ان کے بارے میں منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں اور ٹس سے مس تک نہیں ہوتے۔ لیکن اگر بیت المقدس کے کسی بازار یا مارکیٹ میں ایک بھی بم پھٹ جائے تو وہ اپنی چیخ چنگھاڑ سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت کراہت محسوس ہوتی ہے کہ ایک بھی امریکی اخبار نے اسرائیلی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل گُور Gur کا مندرجہ ذیل انٹرویو شائع نہیں کیا۔

سوال: کیا یہ سچ ہے کہ (مارچ ۱۹۷۸ء کے دوران میں اسرائیل نے لبنان پر چڑھائی کی تھی، اسکے دوران میں) آپ نے لوگوں کے بے ترتیب

جگہوں پر بلا تخصیص اور بلا امتیاز بم باری کی
تھی؟

جواب: میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کی یادداشت

انتخابی ہوتی ہے (یعنی جو چاہا، یاد رکھا، جو چاہا بھلا دیا) کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ ان دس سالوں کے دوران میں ہم نے جو کچھ کیا، اس کے بارے میں میں جھوٹ موٹ یہ کہہ دوں کہ مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں؟ ہم نے پوری نہر سویز کے کنارے کنارے کیا کیا؟ یہی نا کہ پندرہ لاکھ افراد کو پناہ گزیں بنا دیا! آپ کہاں رہتے ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔
ہم نے اسمٰعیلیہ، سویز، بندر سعید اور بندر فواد پر بم باری کی اور پندرہ لاکھ افراد پناہ گزیں بن گئے۔۔۔۔۔ پھر یہ جنوبی لبنان کی آبادی کب سے اتنی مقدس ہو گئی ہے (کہ ہم ان پر بم باری نہ کریں)؟ وہ خوب جانتے تھے کہ دہشت گرد کیا کر رہے ہیں۔ آوی وم کے قتل عام کے بعد میں نے اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر جنوبی لبنان کے چار دیہات پر بم باری کرائی۔

سوال: شہری اور غیر شہری باشندوں کے مابین کسی تخصیص کے بغیر؟
جواب: کیسی تخصیص؟ ارِبد[1] کے باشندوں نے کیا کیا تھا کہ وہ ہماری

---

[1] شمالی اردن کا ایک خاصہ بڑا قصبہ۔ اس کی آبادی زیادہ تر فلسطینیوں پر مشتمل ہے۔

بم باری کے مستحق ٹھہرے؟

سوال: لیکن فوج جو اعلامیے جاری کرتی ہے، ان میں تو یہی دعوے کیا جاتا ہے کہ "ہم نے دہشت گردوں کے خلاف جوابی فائرنگ کی" یا "دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر جوابی حملے کیے"؟

جواب: بھائی ذرا سنجیدگی سے بات کریں۔ کیا آپ کو علم نہیں تھا کہ ہم نے دشمن کو تھکانے اور اسے رزم آرائی سے بیزار کرانے کے لیے جس طویل جنگ کا آغاز کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اردن کی ساری وادی اپنے باشندوں سے خالی ہو گئی؟

سوال: پھر آپ یہ دعوے کرتے ہیں کہ آبادی کو سزا دی جانا چاہیے؟

جواب: بالکل۔ اور اس بارے میں میرے ذہن میں قطعاً کسی قسم کا شک شبہ نہیں۔ جب میں نے (جنوبی لبنان پر حملے کے دوران میں) یانوخ[1] کو طیارے، توپ خانہ اور ٹینک استعمال کرنے کی اجازت دی تو مجھے ٹھیک ٹھیک معلوم تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ہماری آزادی کی جنگ کو شروع ہوئے تیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس سارے عرصے کے دوران میں ہم شہری (عرب) آبادی کے خلاف ہی تو جنگ لڑتے رہے ہیں جو شہروں اور دیہاتوں میں آباد تھی۔ اور جب بھی ہم (ان شہری باشندوں کے خلاف) ایسی

---

[1] یانوخ: اسرائیل کے شمالی محاذ کا کمانڈر۔ یہ اس کے نام کی تصغیر ہے

جنگ کرتے ہیں، تو بار بار یہی سوال پوچھا جاتا ہے:
کیا ہمیں عام شہریوں پر حملے کرنا چاہئیں یا نہیں کرنا چاہئیں۔؟

چنانچہ دہشت گردی کے متعلق ایک بات جو عیاں ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے ادراک میں بھی عدم توازن پایا جاتا ہے اور اس کے ارتکاب میں بھی عدم توازن ہی کارفرما ہے۔ مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسرائیل جن فلسطینیوں کو اپنی جیلوں میں محبوس کرتا ہے، فلسطینی ان کی رہائی کے لیے مختلف انداز سے کوششیں کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کوششوں میں بعض اسرائیلی باشندوں کو یرغمال بنا لیا جاتا ہے تاکہ اسرائیل پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ لیکن اس سلسلے میں جب بھی اسرائیلی یرغمالوں کو استعمال کیا گیا تو ہر بار یہ اسرائیلی افواج ہی تھیں جنہوں نے توپوں کے دہانے کھولنے اور عمداً خون کے دریا بہانے میں پہل کی۔ لیکن محض اعداد و شمار کے حوالے دینے اور وضاحتیں پیش کرنے سے کچھ نہیں بنتا ——— کیونکہ یہودیوں اور عربوں کے مابین، فلسطینیوں اور صیہونی یہودیوں کے مابین، فلسطینیوں اور باقی بنی نوع انسان (مغرب میں یہی نظر آتا ہے کہ فلسطینی ساری دنیا سے برسرپیکار ہیں) کے مابین، یہودیوں اور اہل مغرب کے مابین مخاصمت اور عناد کی داستان اتنی قدیم اور طویل ہے کہ اس کو پڑھ کر ایک دفعہ تو انسان کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور اس کے ہوش و حواس سُن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اب مسئلہ فلسطین ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے ساتھ بے شمار ہولناکیاں وابستہ ہیں اور جس کی جزئیات اخلاقی اعتبار سے بڑا الجھاؤ پیدا کرتی ہیں۔ تاہم (مغرب میں) اس مسئلے کو یوں پیش کیا جاتا ہے جیسے نہ تو کوئی ہولناکی اس کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ اخلاقی اعتبار سے اس

ب۲ روزنامہ "الہمیشر مارّ" مورخہ ۱۰ ارمئی ۱۹۷۸ء

کی جزئیات میں کوئی الجھاؤ ہے۔ اسے آسانی سے، سہولت سے، ناگزیر طور پر، دبا کر، بھینچ کر، "فلسطینی دہشت" کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، ایک فلسطینی کی حیثیت سے مجھے ان پر غصہ بھی آتا ہے اور میں ان کی مذمت بھی کرتا ہوں۔ تاہم ایک ایسے شخص کی حیثیت سے، جو ہر قسم کے مختلف طریقوں سے اس مسئلے سے اثر انداز ہوا ہے، میں یہ ضرور کہوں گا ——— میں یہاں ایک واحد فلسطینی کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں ——— کہ یہ جو طیاروں کے اغوا کی وارداتیں ہوتی ہیں، یہ جو لوگ ایسی مہموں پر نکل پڑتے ہیں جن میں خود ان کے اپنے ہلاک ہونے کا زیادہ احتمال ہوتا ہے (اسے وہ خودکشی کا مشن کہتے ہیں) یہ جو چھپ چھپ کر افراد کو قتل کیا جاتا ہے، یہ جو درسگاہوں اور ہوٹلوں کو بم باری کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اس قسم کی باتوں نے مجھے دہلا دیا ہے۔ اس دہشت گردی نے، جو اپنے ستم رسیدگان پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑتی ہے، مجھ پر لرزہ طاری کر دیا ہے اور مجھے تو اس دہشت گردی سے بھی ہول آنے لگا ہے جو ان فلسطینی مردوں اور عورتوں کے دلوں اور دماغوں میں جاگزیں ہو گئی ہے جنہیں حالات نے اس قسم کی کاروائیاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ میں اس قسم کا کوئی جھوٹا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں یہ کتاب ایک غیر جانبدار یا لاتعلق مبصر کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں، مجھے یہ یقین ہے کہ خود دہشت گردی پر سامنے سے حملہ کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے میرے لیے یہ بہتر ہوگا کہ میں اپنے قارئین تک اس وسیع تر فلسطینی داستان کے کچھ معانی پہنچانے کی سعی کروں جس کی یہ سب باتیں شاخسانہ ہیں، اور اگر اپنے اختتام پر یہ داستان ضیاع

اور مصائب و آلام کے المیوں کی شدت کم نہ کر سکے ——— اور یہ کر بھی نہیں سکتی ——— تو بھی یہ کم از کم ان قارئین کے سامنے وہ کچھ تو پیش کر دے گی جو اب تک ان کی نظروں سے اوجھل رہا ہے یعنی ان پر اس اجتماعی قومی زخم کی حقیقت عیاں ہو جائے گی جو ہر فلسطینی کے لیے مسئلہ فلسطین میں موجود ہے۔

ایک چھوٹی سی غیر یورپی قوم کی منجملہ دیگر خصوصیات کے ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی تحویل میں دستاویزوں، تاریخ کی کتابوں، خود نوشت سوانح عمریوں، ڈائریوں، روزنامچوں اور اس قسم کی دیگر تحریروں کا وافر ذخیرہ نہیں ہوتا۔ فلسطینیوں کے معاملے میں بھی یہ بات درست ہے اور فلسطینی تاریخ کے متعلق اگر کوئی عظیم اور مستند کتاب نہیں ملتی تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ میں نے یہاں اس کمی کی تلافی کرنے کی کوشش نہیں کی اور میرا ایسا نہ کرنے کی وجوہات بالکل صاف طور پر واضح ہیں۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ پیش کرنے کی سعی کی ہے، وہ یہ ہے کہ فلسطینی تجربہ تاریخ کا ایک اہم اور ٹھوس جزو ہے اور یہ تاریخ کا ایک ایسا جزو ہے جسے صیہونیوں اور اہل مغرب دونوں نے زیادہ تر نظر انداز کر رکھا ہے۔ صیہونیوں نے اسے اس لیے نظر انداز کیا ہے کیونکہ ان کی تمنا یہ تھی کہ کاش ایسی تاریخ وقوع پذیر ہی نہ ہوتی اور یہاں تک یورپینوں اور امریکیوں کا تعلق ہے، انھوں نے اس لیے اس سے آنکھیں پھیریں کہ دراصل ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اس کا کریں کیا۔ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مسلم اور عیسائی فلسطینی، جو صدیوں سے فلسطین میں آباد چلے آ رہے تھے، یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء میں انہیں مار مار کر باہر بھگا دیا گیا، اسی تحریک کے

ناشاد اور بدقسمت نخچیر تھے جس کا واحد مقصد عیسائی یورپ کے ہاتھوں یہودیوں کو ظلم و ستم سے نجات دلانا تھا۔ لیکن یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ چونکہ صیہونیت یہودیوں کو فلسطین میں لانے اور انہیں ایک قوم کی صورت میں ڈھالنے میں بطریقِ احسن کامیاب رہی ہے، دنیا کو اس بارے میں مطلق چنتا نہیں ہوئی کہ اس مہم کے نتیجے کے طور پر فلسطینیوں پر کیا بیتی۔ انہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا، دَر دَر کی خاک چھاننا پڑی، ہر قسم کے پُر آشوب حالات اور مصائب و آلام کی بھٹی میں سے گزرنا پڑا لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی ایسا ستم ظریف سامنے آئے جو تصویر کے دونوں رُخ دکھا سکے۔ اس تصویر کا ایک رُخ وہ کامیابی اور کامرانی ہے جس کے ڈنکے چار دانگ عالم بج رہے ہیں اور دوسرا رُخ وہ تباہی و بربادی ہے جس کا بہتوں کو علم ہی نہیں ہے۔ اس تباہی کا نقشہ حنّا ارینٹ[۱] نے بدیں الفاظ کھینچا ہے:

> جنگ (عظیم دوم) کے بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ یہودی مسئلہ، جو واحد ناقابل حل مسئلہ متصور ہوتا تھا، حقیقتاً حل ہو گیا ہے ——— اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے جو ذرائع بروئے کار لائے گئے، ان کی مدد سے پہلے تو ایک علاقے میں نو آبادیاں تعمیر کی گئیں اور پھر اس کی تسخیر عمل میں آئی ——— لیکن اس سے نہ تو اقلیتوں کا مسئلہ حل ہوا اور نہ ان لوگوں کا جن کا کوئی وطن نہیں رہا تھا۔ ہماری صدی کے عملاً تمام دوسرے واقعات کی طرح یہودی مسئلے

---

[۱] حنّا ارینٹ (Hannah Arendt) ۱۹۰۶-۷۵ء ایک جرمن نژاد امریکی مؤرخ

کے حل نے بھی پناہ گزینوں کی محض ایک نئی قسم ـــــــ عرب ـــــــ پیدا کر دی۔ اس طرح ان لوگوں کی تعداد میں، جن کا کوئی اپنا وطن نہیں تھا، سات سے آٹھ لاکھ افراد کا اضافہ ہو گیا۔[۱]

جیسا کہ میں نے اس کتاب میں بار بار اس بات کی تکرار کی ہے کہ ـــــــ جہاں تک اسرائیل اور اس کی تاریخ کا تعلق ہے، اس کی تعریف کے تو نہایت تسلسل کے ساتھ پل باندھے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک فلسطینیوں کی حقیقی صورت حال کا تعلق ہے کہ وہ بھی گوشت پوست کے انسان ہیں اور جیسے تیسے اپنی زندگی گزار رہے ہیں، ان میں سے ہر شخص کی ایک چھوٹی موٹی داستانِ حیات ہے اور اس کی یہ داستان ان مصائب و آلام سے عبارت ہے جو اسے برداشت کرنا پڑے، اور یہ کہ ان لوگوں کی بھی کچھ امنگیں ہیں، کچھ آرزوئیں ہیں۔ پہلے تو کوئی مانتا ہی نہیں تھا کہ حقیقت میں ان لوگوں کا بھی کوئی وجود ہے، خیر اب اتنا تو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ لوگ واقعی روئے زمین پر موجود ہیں۔ اب حالات نے کچھ پلٹا کھایا ہے اور اچانک مسئلہ فلسطین بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے اور ایک حل کا متلاشی ہے۔ عالمی رائے عامہ مطالبہ کر رہی ہے کہ اس مسئلے پر، جسے اب تک حقارت سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے لیکن جو مشرق وسطیٰ کے تعلق میں مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے، مناسب توجہ دی جائے جس کا کہ وہ مستحق ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سب باتوں کے

---

[۱] حنا ارینٹ "The Origins of Totalitarianism" New York: Harcourt Brace Jovanovich (صفحہ نمبر ۲۹)

باوجود کوئی معقول اور تسلی بخش حل تو بہت دور کی بات ہے، اس معاملے کے بارے میں مناسب وموزوں بحث وتمحیص کا امکان بھی دھندلکے میں لپٹا ہوا ہے۔ بحث مباحثہ تو تب ہو جب حالات سازگار ہوں اور یہاں، جیسا کہ میں پیشتر ازیں بھی عرض کر چکا ہوں، یہ حال ہے کہ (مغرب میں) فلسطینیوں کے متعلق یہ تاثر گہرا اور پختہ ہو چکا ہے کہ وہ بس پناہ گزیں ہیں، انتہا پسند ہیں اور یا پھر دہشت گرد ہیں، پھر ان کے بارے میں عام بحث مباحثہ کیسا؟ مشرق وسطی کے "ماہرین" کا ایک خاصا بڑا طبقہ اس بحث وتمحیص پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے پر تُلا رہتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے افراد عمرانی علوم کی گھسی پٹی اصطلاحیں، جنہیں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھتا، اور بوسیدہ نظریاتی آراء، جنہیں علم کا لبادہ اوڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، استعمال کرتے ہیں۔ اور میرے خیال میں سب سے اہم بات وہ تہذیبی اور ثقافتی رویہ ہے جو اہل مغرب کے رگ وپے میں سما چکا ہے اور جس کے ماخذ وہ صدیوں پرانے تعصبات ہیں جو وہ (اہل مغرب) اسلام، عربوں اور مشرق (اورینٹ) کے متعلق روا رکھتے ہیں۔ چونکہ فلسطینی بھی مشرقی ہیں، عرب ہیں اور زیادہ تر اسلام کے پیروکار ہیں، اس لیے ان کے بارے میں بھی اہل مغرب نے یہی رویہ اپنا لیا ہے۔ اس رویے نے جس سے اپنی باری آنے پر صیہونیت نے فلسطینیوں کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اخذ کیا، ہمیں انسانیت کے زمرے سے خارج کر دیا اور ہمیں ایک ایسی چیز بنا دیا جو وبال جان ہو، اس لیے بمشکل قابل برداشت ہو۔

یہ کہنا تو شاید زیادتی ہو گا کہ مشرق وسطیٰ اور فلسطینیوں کے متعلق معاشرتی علوم کے نقطۂ نظر سے جو علمی مطالعے منظر عام پر آتے ہیں، ان سب میں اس روایت کو جاری رکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ ان کا رجحان

اسی طرف ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ان میں اکثر مطالعے اس اندازِ فکر کی، جس نے فلسطینی حقوق کے مقابلے میں صیہونیت کو جائز قرار دے دیا ہے، خوشہ چینی کرتے ہیں اور بے شمار اہم امور میں اسے بلا چون و چرا صحیح تسلیم کر لیتے ہیں، تو یہ کہنا پڑے گا کہ اس صورت میں یہ (مطالعے) بیکار کی اشیاء بن جاتے ہیں۔ اور مشرق وسطیٰ کی حقیقی صورتِ حال کی تفہیم میں وہ کسی قسم کی مدد نہیں کرتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد اس ملک (امریکہ) میں جدید مشرق وسطیٰ کے (امور و حالات کے) متعلق جتنے بھی سنجیدہ مطالعے پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے تقریباً ایک بھی ایسا نہیں جس نے کسی ایک شخص کو بھی اس صورتِ حال کے متعلق تیار کیا ہو جو اس علاقے میں رُونما ہو رہی ہے معاملہ خواہ ایران کے حالیہ واقعات کا ہو یا لبنان کی خانہ جنگی کا، فلسطینیوں کی مزاحمت کا ہو یا ۱۹۷۳ء کی جنگ میں عربوں کی کارکردگی کا۔ یہ بات ان سب پر صادق آتی ہے۔ میرا یہ قطعاً ارادہ نہیں کہ میں اپنی اس کتاب کو عمرانی علوم کی ان تصنیفات کی اور خاص طور پر ان تصنیفات کی، جو سرد جنگ کے آغاز کے بعد سپردِ قلم کی گئی ہیں، استدلالی انداز سے تردید کرنے کا ذریعہ بنالوں، جن کے متعلق بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان میں سائنسی معروضیت اختیار کی گئی ہے حالانکہ ان کے متعلق کسی نے یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ ان پر نظریاتی تعصب کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس قسم کا استدلالی انداز، جو محض دوسروں کے نقطۂ نظر کی تردید کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، عموماً (اخلاقی) "اقدار سے عاری" ہوتا ہے اور اس لیے اس میں لغزشوں کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ میرا شعوری طور پر یہ پختہ ارادہ ہے کہ میں اس قسم کی لغزشوں سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔

دوسری باتوں کے علاوہ ان لغزشوں میں مندرجہ ذیل بھی شامل ہیں:۔

سیاسی حقائق کی وہ کہانیاں اور رپورٹیں جن میں توجہ کا مرکز محض عظیم طاقتوں کی رقابت اور چشمک کو بنایا گیا ہو۔ ایسی نگارشات جن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ ہر وہ چیز قابل قبول اور قابل تمنا ہے جس کا تعلق مغرب سے ہو یا جس کا مقصد تیسری دنیا کے ممالک پر جدیدیت کا رنگ چڑھانا ہو۔

ایسی تحریریں جن میں عوامی تحریکوں کو تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن ظالم و جابر اور معمولی یا اوسط درجے کی چمچہ حکومتوں کی، جنہوں نے کوئی کارنامہ سر انجام نہیں دیا ہوتا، تعریفوں کے پُل باندھے جاتے ہیں اور انہیں شیر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

ایسی تصنیفات جن میں ہر اس چیز کو جو آسانی سے کسی بنے بنائے مخصوص سلسلے میں ٹھیک طرح سمانہ سکے یا جس پر کسی مخصوص طریقۂ فکر، طریقہ عمل یا اصول کا اطلاق نہ ہو سکتا ہو، حالانکہ اس کے مقاصد "تعقلی" "تجربی" اور "علمی" ہوتے ہیں، یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے کہ یہ تاریخ کے اصولوں کے مطابق نہیں۔

ان تصورات میں جو فاش خامیاں ہیں، انہیں علانیہ اس بات کا ذمے دار ٹھہرایا گیا کہ ایران "ہمارے" ہاتھوں سے نکل گیا یا یہ کہ "ہم" "اسلام کے احیائے نو" کے متعلق پیش گوئی کرنے سے قاصر رہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی کہ یہ تصورات جن مقدمات پر قائم ہیں، ان کا جائزہ لیا جا سکے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں تصورات پر دوبارہ اصرار ہو جاتا ہے اور ایک مرتبہ پھر عمرانی علوم کے ماہرین، جنہیں فیصلے مرتب کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرنا ہوتا ہے، کوتاہ نظری پر مبنی انہی چیزوں کا دوبارہ مشورہ دینے لگتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر امریکہ کی خارجہ پالیسی کو ایسے مقاصد کے حصول کے لیے داؤ پر لگا دیا جاتا ہے جو (میرے جیسے) غیر ماہرین کی نظروں میں کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے یا پھر اس پالیسی کو رجعت پسندانہ تاریخی خوابوں کی تکمیل کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے

حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس قسم کے خواب بھی کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔
اور جب کہ میں یہ سطور سپردِ قلم کر رہا ہوں، کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کے فاش نقائص نے میرے نکتے کو صحیح ثابت کرنا شروع کر دیا ہے۔

تاہم میرا خیال ہے کہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ۱۹۶۷ء تک صیہونیوں اور ماہرین کے ہاتھوں فلسطینیوں کی جو سُبکی اور بے وقری ہوتی رہی اور نتیجتاً انہیں جس طرح بے وقعت گردانا گیا، اس سے خود فلسطینی بھی متفق تھے۔ پھر ہم نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا۔ ہم نے دنیا کو دریافت کیا اور دنیا نے ہمیں دریافت کر لیا۔ ہم جس طرح رات کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے اور پھر جس طرح آہستہ آہستہ ہماری بیداری ہوئی، میں نے اسے بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاہم اس سرزمین (فلسطین) پر، علاقے پر، عالمی سیاست وغیرہ وغیرہ پر جس طرح ہماری زندگی کا سورج غروب ہوا، اسے بھی میں نے نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن اس سارے تجربے کے دوران میں وہ عنصر، جو صیہونیت نے تشکیل کیا تھا، ہمارے ساتھ رہا۔ ہمارے لیے نہ تو یہ کوئی نظری مسئلہ تھا اور نہ دُشنام طرازی کا معاملہ۔ انداز مختلف سہی لیکن صیہونیت ہمارے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ یہ یہودیوں کے لیے ہے۔ ہمیں اس کے متعلق دنیا کو جو لازماً بتانا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اس کا مفہوم کس طرح ہمارے لیے چند ٹھوس چیزوں کی صورت میں نکلا جن کی زندہ نشانیاں ہم اجتماعی طور پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔

میں نے اپنی کتاب کو ایک سیاسی مقالہ کہا ہے کیونکہ میں نے اس میں فلسطینیوں کے مسئلے کو امریکی قارئین کے سامنے اس انداز سے نہیں پیش کیا جیسے یہ کوئی ایسی چیز ہو جو نہ تو کسی بیرونی چیز سے متاثر ہوتی ہو اور نہ کسی بیرونی چیز پر اثر انداز ہو سکتی ہو اور نہ میں نے اسے ایک کامل چیز بنا کر پیش کیا ہے کہ اس پر مزید کچھ کہنے سننے

کی گنجائش ہی نہ ہو بلکہ میں نے اسے ایک ایسی چیز کے طور پر پیش کیا ہے جس پر غور کیا جانا چاہیے، جسے آزما کر دیکھنا چاہیے، جس پر توجہ دی جانا چاہیے۔ ـــــــ قصہ مختصر، میں نے اسے ایک ایسا موضوع بنا کر پیش کیا ہے جس سے سیاسی طور پر نپٹا جانا چاہیے۔ ہم کافی عرصے تک نہ تو تاریخ کی کتابوں اور مضمونوں کا عنوان بن سکے اور نہ کسی نے ہمارے متعلق بحث و تمحیص کی ضرورت محسوس کی۔ اپنے ہی منکسرانہ انداز سے یہ کتاب فلسطین کے مسئلے کو ایک ایسا موضوع بنانے کی کوشش کرتی ہے جس پر بحث و تمحیص ہونا چاہیے اور جس کی سیاسی تفہیم ہونا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اس کتاب میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ کسی "ماہر"[۱] کا نقطۂ نظر نہیں اور نہ یہ کوئی ذاتی گواہی قسم کی چیز ہے، بلکہ یہ ان حقیقتوں کا ایک سلسلہ وار بیان ہے جن کا (فلسطینی عوام یا دوسروں کو) تجربہ ہو چکا ہے۔ اس کی بنیاد انسانی حقوق اور معاشرتی تجربے کے تضادات پر رکھی گئی ہے اور حتی الوسع اسے ایک ایسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے جسے عام لوگ اپنی زندگی میں روزانہ استعمال کرتے ہیں۔

کتاب میں جس استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی تشکیل چند ایک اساسی مقدمات سے ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک مقدمہ یہ ہے کہ ایک قوم، جسے فلسطینی عرب قوم کہا جاتا ہے، (روئے زمین پر) مسلسل موجود رہی ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ صیہونیت اور عالم عرب کے مابین جو تعلق پایا جاتا ہے،

---

[۱] یہاں اس لفظ سے مراد مغرب کے وہ لوگ ہیں جو اپنے بارے میں یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں مشرق وسطی کے امور و معاملات پر پورا عبور حاصل ہے۔

اس کی تفہیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس تجربے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جو کہ فلسطینیوں کو ہوا ہے۔ ایک اور مقدمہ یہ ہے کہ اسرائیل کی خود بھی اور اس کے حامیوں کی بھی اقوال و افعال دونوں طرح سے یہ کوشش رہی ہے کہ جیسے بھی ہو، فلسطینیوں کا نقش محو کر دیا جائے کیونکہ کئی (اگرچہ سارے نہیں) اعتبار سے یہودی مملکت کی تعمیر فلسطین اور فلسطینیوں کی نفی پر کی گئی ہے۔ اسرائیل نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے، ہمارا محض وجود ہی اس کو اس بارے میں موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ایک نمایاں حقیقت یہ ہے اور یہ حقیقت آج بھی اپنی جگہ پر موجود ہے کہ اگر آپ نے اسرائیل میں یا کسی کٹر صیہونی کے سامنے فلسطین یا فلسطینیوں کا محض نام ہی لے دیا تو سمجھیں کہ آپ کی شامت آگئی ہے کیونکہ آپ نے ایک ایسی چیز کا نام لے دیا ہے جس کا نام لینا ہی ان کے نزدیک گناہ ہے۔ اور آخری بات جسے میں اخلاقی طور پر اس قدر صحیح تصور کرتا ہوں کہ اس میں کسی اگر مگر کی گنجائش ہی نہیں، یہ ہے کہ تمام انسان انفرادی طور پر بھی اور گروہی حیثیت سے بھی اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں بنیادی حقوق جن میں خود ارادیت کا حق بھی شامل ہے، حاصل ہوں۔ ان حقوق سے میری مراد ہے کہ

کسی انسان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اپنے گھر یا وطن سے "منتقلی" کی دھمکی نہیں دی جانا چاہیے۔

کسی انسان کے خلاف محض اس بنا پر امتیاز نہیں برتا جانا چاہیے کہ وہ الف یا ب مذہب کا ماننے والا نہیں۔

کسی انسان کو کسی صورت میں بھی اور کسی بنا پر بھی اپنے وطن، قومی شناخت یا ثقافت سے محروم نہیں کیا جانا چاہیے۔

میرا اندازہ ہے کہ میں اس کتاب میں جو بنیادی سوال اٹھا رہا ہوں، وہ یہ ہے:

"فلسطینیوں کے بارے میں اسرائیل کیا کرنا چاہتا ہے، امریکہ کیا کرنا چاہتا ہے اور عرب کیا کرنا چاہتے ہیں"؟ اگر فلسطینی تجربے کی حقیقتیں تسلیم کر لی جائیں تو میں نہیں سمجھتا جیسا کہ صدر سادات اور ان کے مختلف حامی ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ننانوے فیصد پتے امریکہ کے ہاتھ میں ہیں، اور نہ مجھے یہ یقین ہے کہ وہ (پتے) زیادہ تر اسرائیل یا عرب مملکتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اصل بات ——— جس نے اس کتاب کا معرضِ وجود میں آنا ممکن بنایا ——— یہ ہے کہ اگر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فلسطینی ہاتھ بھی خالی نہیں، ان کے پاس بھی کچھ پتے ہیں اور یوں کہنا چاہیے کہ یہی وہ پتے ہیں جو ان کی امنگوں اور آرزوؤں، ان کی جدوجہد اور کامیابیوں (اور ناکامیوں) کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ مسئلہ فلسطین کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اب یہودی اور امریکی کیا سوچتے اور کیا کرتے ہیں۔ اور یہی وہ پہلو ہے جس پر اس کتاب میں توجہ دی گئی ہے۔

میں ایک بات کا ذکر، جو اظہر من الشمس ہے، اس لیے کر رہا ہوں تاکہ اس بنیادی وجودی اصول کی اہمیت واضح ہو سکے جس پر میرے خیال کے مطابق ایک قوم کی حیثیت سے ہمارے تجربے کا انحصار ہے۔ ہم ایک سرزمین پر رہتے تھے جسے فلسطین کہا جاتا تھا۔ ہمیں جس طریقے سے بے دخل کیا گیا اور جس طرح ہمارا وجود مٹانے کی کوشش کی گئی، کیا یہ باتیں محض اس لیے جائز تھیں کہ ان یہودیوں کو، جو نازیت کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئے تھے، سہارا دیا جا سکے؟

(یہودیوں کو سہارا دینا قابل تعریف بات سہی لیکن) اس عمل میں ہم میں سے تقریباً دس لاکھ فلسطینیوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا اور ہمارے معاشرے کو ناموجود بنا دیا گیا۔ وہ کون سا اخلاقی یا سیاسی معیار ہے جس کی بنا پر ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اپنے قومی وجود، اپنے وطن اور اپنے انسانی حقوق اور دعاوی سے دست بردار ہو جائیں؟ جب ایک پوری قوم کو یہ "مژدہ" سنایا جاتا ہے کہ وہ قانونی اعتبار سے غیر حاضر ہے، بلکہ اس کے خلاف فوجیں بھی استعمال کی جاتی ہیں (تاکہ اس کا نام ونشان مٹایا جا سکے) اس کے نام کے خلاف مہمیں چلائی جاتی ہیں (تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس نام کی کوئی قوم روئے زمین پر موجود نہیں) اس کی تاریخ تبدیل کر دی جاتی ہے تاکہ دنیا کو یہ "باور" کرایا جا سکے کہ اس کا تو کوئی وجود ہی نہیں، تو پھر ہمیں یہ بتایا جائے کہ وہ کون سی دنیا ہے جہاں اس قسم کی باتوں اور ہتھکنڈوں کے خلاف کوئی دلیل کام نہیں آسکتی؟ اگرچہ وہ تمام مسائل، جنہوں نے فلسطینیوں کے اردگرد حصار بنا رکھا ہے، پیچیدہ ہیں اور ان میں عظیم طاقتوں کی سیاست، علاقائی تنازعات، طبقاتی کشمکش اور نظریاتی کشیدگی سبھی کچھ ملوث ہے لیکن فلسطینی تحریک کو جس قوت نے زندہ وتوانا رکھا ہے اور جس نے اس میں نئی رُوح پھونکی ہے، وہ یہ ہے کہ اسے ان سادہ لیکن انتہائی اہمیت کے حامل مسائل سے آگہی ہے۔

جب امریکہ ایشیا اور افریقہ کے متعلق اپنی خارجہ پالیسی کی تشکیل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو فلسطینی واحد ایسی قوم نہیں جس کے متعلق وہ غلط اندازے لگاتا ہے یا جسے وہ نظرانداز کر دیتا ہے (کئی اور کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے) جنوری ۱۹۷۹ء میں جس طرح ایرانی حزبِ اختلاف نے شاہ کی حکومت کا تختہ الٹا، یہاں اس کا ذکر یقیناً برمحل ہے۔ (امریکہ نے ایران کے متعلق بالکل غلط

تخمینے لگائے حالانکہ) اس کے پاس معلومات کا فقدان نہیں تھا (بے شک صدر کارٹر نے "گھتا" بن کر اعدو زمانہ سازی سے کام لے کر ایران میں ناکامی کا الزام "خفیہ معلومات فراہم کرنے والے اداروں" کے سر دھر دیا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ انہیں سب حالات کا علم تھا۔) اگر افراد کے بارے میں یہ بات درست ہے کہ وہ پیچیدہ اور بے ترتیب حقیقتوں کے صاف ستھرے اور عام فہم حل چاہتے ہیں تو ظاہراً اداروں اور حکومتوں کے بارے میں بات بالکل غلط ہونا چاہیے۔ لیکن جہاں تک فلسطینی مسئلے کا تعلق ہے، امریکی حکومت کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے۔ موجودہ انتظامیہ اس اعلان کے ساتھ برسر اقتدار آئی تھی کہ وہ مشرق وسطیٰ کے امن کے متعلق ایک جامع سمجھوتے کے حق میں ہے۔ اس جامع سمجھوتے میں یہ مفروضہ بھی شامل تھا کہ مسئلہ فلسطین کا "اس کے تمام پہلوؤں سمیت" ایک منصفانہ حل تلاش کیا جائے گا لیکن جب سے کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے منظر عام پر آئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ (امریکی انتظامیہ) اس مسئلے کا مجموعی طور پر جائزہ لینے یا کسی بھی لحاظ سے اس کے ساتھ سنجیدگی سے عہدہ برآ ہونے میں بے بس ہو گئی ہے۔ اس نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ تمام دوسری قوموں نے جو کچھ قبول کیا ہے، یہ چالیس لاکھ باشندے اس سے کم تر (نام نہاد حکومت خود اختیاری) پر راضی ہو جائیں گے؟ اس نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ تنازعے میں ملوث ایک بڑے فریق کی عدم موجودگی میں صلح ناموں پر دستخط کیے جا سکتے ہیں؟ اس نے یہ کیونکر فرض کر لیا ہے کہ علاقے کی سٹیج پر جو سب سے بڑا کردار فعال طور پر سرگرم عمل ہے، اس کا کبھی سامنا کیے بغیر ہی خارجہ پالیسی چلائی جا سکتی ہے؟ اس نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ چونکہ آپ کی تمنا ہے کہ طاقت ور مخالف گروپ نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو

وہ چٹکی بجاتے نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے؟ اس نے یہ کیسے فرض کر لیا ہے کہ فلسطینیوں کو مستقلاً اسرائیل کی نوآبادی بننے پر رضامند ہونا چاہیے جب کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں؟ اس نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ فلسطینی اپنے قومی حقوق کی بازیابی کے لیے، جن سے انہیں محروم کیا گیا ہے، جو غصب کر لیے گئے ہیں، جنہیں پاؤں تلے کچل دیا گیا ہے، غیر معینہ عرصے تک جنگ جاری نہیں رکھ سکیں گے (حالانکہ وہ مشرق وسطیٰ کے ہر بحران میں نبرد آزما رہے ہیں)؟ یہ ہیں وہ سوالات، جو ان حیران کن حد تک ہنگامہ خیز تبدیلیوں کے پس منظر میں، جو اس وقت مشرق وسطیٰ میں رونما ہو رہی ہیں، یہ کتاب اٹھانے اور ان کے جوابات مہیا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

مجھے یہ بھی امید ہے کہ اس کتاب کے اختتامی باب میں قارئین کو ان فوری اہمیت کے حامل مسائل کے منصفانہ تجزیے کا تفصیلی ذکر بھی ملے گا جو کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کے بعد مشرق وسطیٰ کے بارے میں امریکی پالیسی، عرب اور علاقائی سیاست اور فلسطینیوں کے مؤقف اور ان کے رویوں کا تعین کر رہے ہیں۔

میں یہ کتاب آسانی سے نہیں لکھ سکا۔ اس کا بیشتر حصہ جدید فلسطینی تاریخ کے مفہوم کے مطالعے اور اس پر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ تاہم اس کتاب کا ایک اچھا خاصا حصہ اس فعال شرکت کا ثمر ہے جو فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کے حصول میں اکثر حوصلہ شکن تلاش میں کی گئی۔ (کم از کم میں اپنے بارے میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ) میں نے اس تلاش میں جو شرکت کی، وہ جلاوطنی کی حالت میں کی۔ چنانچہ ناگزیر طور پر روزمرہ کے واقعات، خبروں، اچانک تبدیلیوں اور اتفاقی گفتگوؤں نے میرے اعصاب پر شدید بوجھ ڈالا اور رہی سہی کسر غلط قسم کی تصریحات نے پوری کر دی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس نوعیت کی باتوں

کے اثرات سے بچ نہیں سکا ہوں گا۔ بہر حال ان (اثرات) سے بالکل ہی بچ نکلنا بھی غلط ہوتا۔ تاہم مجھے اس بات کا شعور ہے کہ میں نے نہ تو حالیہ تاریخ کی محض تلخیص ہی پیش کی ہے اور نہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق محض پیشین گوئی کی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ کرنے کی کوشش کی ہے۔ فلسطینیوں کو جو تجربہ ہوا ہے، اور عصری سیاسی منظر کے ساتھ اس تجربے کو جو مناسبت ہے، مجھے امید ہے کہ میں ان دونوں کی فلسطینی نقطۂ نظر سے تشریح و تعبیر کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ ایک فلسطینی کی حیثیت سے اپنی ذات کے متعلق اپنے خیالات و احساسات کی یوں تشریح کرنے سے محسوس ہوتا ہے، جیسے آپ اپنے آپ کو جنگ کے لیے آمادہ و تیار کر رہے ہوں۔ مغرب کا، جہاں میں رہتا ہوں، رویہ یہ ہے کہ وہ ہر اس شخص کو، جو فلسطینی ہونے کا دعویدار ہو، سیاسی اعتبار سے ایک قسم کا راندۂ قانون (یا اشتہاری مجرم) تصور کرتا ہے۔ اگر وہ اسے مفرور یا اشتہاری مجرم نہ بھی سمجھے تو بھی وہ اسے معاشرے سے باہر کا فرد تو ضرور قرار دے دیتا ہے اور یوں وہ اس سے کسی قسم کا راہ و رسم بڑھانے کا روادار نہیں ہوتا۔

اس کتاب کا مسودہ تیار کرنے میں ڈیبی روجرز، اسمار خولی اور پال لی پاری نے میری جو مدد کی ہے، میں اس کے لیے ان کا ممنون ہوں۔ اپنے ہم وطن فلسطینیوں کے ساتھ، جنہوں نے میری طرح ایک قوم کی حیثیت سے اپنی صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کی ہے، میری جو برسوں بحثیں ہوتی رہی ہیں، میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، سمجھا اور حاصل کیا ہے۔ میرے ان نفیس دوستوں نے بھی، جو اس ملک (امریکہ) میں، اسرائیل میں اور عرب ممالک میں رہتے ہیں۔ اپنے اپنے علم میں مجھے شریک کیا ہے۔ تاہم فرداً فرداً ان کے نام گنوانا اور ان کے سامنے

اپنی مخصوص احسان مندی کا اظہار کرنا، اس تجربے کو، جس میں ہم سب شریک رہے ہیں اور جس کے بغیر یہ کتاب تحریر نہیں کی جا سکتی تھی، غیر ضروری طور پر حقیر بنانا یا خواہ مخواہ اس کی اہمیت گھٹانا ہے۔

میرے ان دو دوستوں کے اذہان میں، جن کے ناموں کو صفحہ انتساب پر یادگار بنایا گیا ہے، کبھی اس قسم کا تصور بھی نہیں آیا ہوگا کہ ان کی زندگیاں مجھے اتنا متاثر کریں گی اور میری ذات پر ان کے اتنے گہرے نقوش ثبت ہوں گے۔ میرے یہ دونوں دوست فلسطینی تھے۔ جلا وطنوں کی حیثیت سے دونوں کی زندگیاں بہت عجیب و غریب انداز سے گزریں اور مرتے دم تک دونوں کے ذہنوں پر یہ خبط بھوت بن کر سوار رہا کہ وہ جلا وطن ہیں اور پھر جب انہوں نے موت کو گلے لگایا تو وہ بھی ان کے لیے مسرت کا کوئی پیغام نہ لائی بلکہ یہ موت بھی تلخی سے بھرپور، ناشاد اور افسوس ناک تھی۔ میری رائے میں دونوں ہی نہایت عمدہ اور اچھے انسان تھے۔ فرید حداد ایک ڈاکٹر تھا۔ وہ ایک عرب ملک میں رہتا تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔ میں اسے کئی سالوں سے جانتا تھا اور مجھ سے بہتر کسی اور کو یہ علم نہیں کہ اسے نہ صرف اس بات کا شدید احساس تھا کہ انسانی ناانصافی کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے متعلق کیا کیا جانا چاہیے۔ وہ سر تا پا عینیت پسند اور بے غرض تھا۔ اسے قید خانے میں سخت ایذائیں دی گئیں اور وہیں ۱۹۶۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

تاہم اپنی زندگی کے آخری دم تک (جہاں تک میں یہ بات بتانے کے قابل ہو سکا ہوں) اس نے جو کچھ کیا، ایک انسان ہونے کے ناطے اور ایک سیاسی جنگ جو پسند ہونے کے ناطے کیا، نہ کہ اس لیے کہ وہ لازماً ایک فلسطینی تھا۔ راشد حسین ایک فلسطینی شاعر تھا۔ وہ استہزائی کلام کا بادشاہ تھا۔ ۱۹۶۶ء تک وہ اسرائیل میں ہی

مقیم رہا۔ پھر وہ امریکہ چلا آیا اور مرتے دم تک وہیں آباد رہا۔ ۱۹۴۸ء (قیام اسرائیل کے بعد فلسطینی دیہاتوں پر جو کچھ بیتا اور وہاں زندگی نے جو رُخ اختیار کیا، اس کے متعلق میرا سارا علم اسی کا مرہونِ منت ہے۔ (فلسطینی دیہاتوں کی یہی وہ نئی زندگی ہے جس نے فلسطین کے مسئلے کو ایک فقید المثال قوت عطا کی ہے) جذبے کے اعتبار سے راشد حسین ایک کشادہ دل، عالی منش اور بے تعصب انسان تھا۔ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا تھا، وہی وہ زبان پر لے آتا تھا، سیاسی اعتبار سے وہ ایک بہت ایمان دار اور دیانت دار شخص تھا۔ اس کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ چنانچہ جو شخص بھی اس سے ملتا تھا، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ ایک ایسا فلسطینی تھا جو آزادانہ رائے کا مالک اور صحیح معنوں میں انقلاب کا شیدائی تھا۔ اپنے انہی نظریات کی بنا پر اسے بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور یہی مصائب ۱۹۷۷ء میں اسے موت سے ہم کنار کر گئے۔ فلسطینی جس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، فرید حداد اور راشد حسین نے اپنی عملی مثالوں سے مجھے اس کا مفہوم سمجھایا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس پر اپنے بے شمار دوسرے ہم وطنوں کی طرح، جو دنیا کے مختلف مقامات پر مقیم تھے، انھوں نے بھی اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔

ایڈورڈ سعید

پہلا باب

مسئلۂ فلسطین

۱

فلسطین اور فلسطینی

انیسویں صدی کے ساتویں آٹھویں عشرے کے اختتام تک ہر وہ چیز، جو اس خیالی خط کے، جو یونان اور ترکی کے مابین حدِ فاصل کا کام دیتا ہے، مشرق میں واقع ہے، "اورینٹ" کہلاتی تھی۔ چونکہ یہ لفظ یورپ والوں کی اختراع تھا، اس لیے (ان کے نزدیک) یہ لفظ کئی صدیوں تک ایک خاص قسم کی ذہنیت [جیسا کہ "اورینٹل ذہن" جیسی ترکیب اس کا منہ بولتا ثبوت ہے] اور چند مخصوص نوع کی ثقافتی، سیاسی بلکہ نسلی خصوصیات بھی [جیسا کہ مستبد اورینٹل حکمران، اورینٹل ہوس رانیاں اور شہوت پرستیاں اورینٹل شان و شوکت اور جاہ و جلال، اور اورینٹل پُراسراریت جیسے تصورات سے عیاں ہے] کی نمائندگی کرتا رہا۔ لیکن یورپ والے جب بھی اورینٹ کا تصور باندھتے تو [یہاں کی بوقلمونی کو قطعاً نظرانداز کر کے] سبھی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیتے تھے اور سب کے متعلق بلاتمیز ایک عمومی رائے

قائم کر لیتے تھے ۔ (ان کے نزدیک) اورینٹ (مشرق) نہ صرف یہ کہ مختلف
اور جہانِ دیگر تھا بلکہ یہ وہ سرزمین تھی جہاں کے فاصلے لامحدود تھے ، جہاں
کے باشندے جو زیادہ تر رنگدار تھے ، دیکھنے میں ایک ہی طرح کے نظر آتے
تھے اور ان کے مابین امتیاز کرنا مشکل امر تھا ۔ یہ رومانوں کی سرزمین تھی ۔
یہاں کے مقامات و مناظر میں نامانوس اور اجنبی سحر تھا ۔"عجائبات مشرق"
ایک طرح کی پُراسراریت میں ملفوف تھے ۔ تاہم ہر وہ شخص ، جو ملکہ وکٹوریہ
کے آخری عہد کی سیاسی تاریخ سے آگاہ تھے ، ضرور جانتا ہوگا کہ اب یورپ والوں
کو جس بات کی تشویش تھی ، وہ "اورینٹ" نہیں تھا ، بلکہ اس کی جگہ ایک
نئے مسئلے نے لے لی تھی ، جو بہت تکلیف دہ تھا ، جس کی نوعیت زیادہ تر سیاسی
تھی اور جسے انہوں نے " مشرقی مسئلے "کا نام دے دیا تھا ۔ اندازہ لگایا گیا
ہے کہ ۱۹۱۸ء تک یورپی اقوام زمین کے ۸۵ ٪ رقبے پر اپنا نوآبادیاتی تسلط قائم
کر چکی تھیں اور اس رقبے کا خاصا بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل تھا جسے پہلے محض
اورینٹل[1] کہا جاتا تھا ۔ اورینٹ کے ساتھ جو رومانی داستانیں وابستہ تھیں ، وہ اب
پادرِ ہوا ہو چکی تھیں ۔ ان کی جگہ نئے مسائل نے لے لی تھی کہ اورینٹ کیساتھ
نپٹا کیسے جائے ۔ ان میں پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہاں جو یورپی اقوام برسرِ پیکار تھیں
ان کی آپس میں ہی مسابقت اور چپقلش چل رہی تھی ۔ دوسرا مسئلہ خود محکوم اقوام
کا تھا ، جو اپنی آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں ۔ چنانچہ اورینٹ اب
کوئی ایسی جگہ نہیں رہ گیا تھا جو کہیں " اُدھر " واقع تھا ۔ بلکہ اب وہ ایک ایسی

---

[1] ایڈورڈ سعید : "Orientalism" ناشر Pan theon Books New York: صفحات ۴۹ - ۳۱

جگہ بن چکا تھا جس کے مسائل اس بات کے متقاضی تھے کہ ان پر فوری توجہ دی جائے، ان کی تمام جزئیات کی گہرائی تک جایا جائے۔ اب اورینٹ ایک خطہ نہیں تھا بلکہ یہ تو مختلف خانوں میں منقسم تھا۔ ان میں ایک خانہ وہ ہے جسے مشرقِ وسطیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ آج بھی اسے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اورینٹ کا وہ خطہ ہے کہ جب بھی اس کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن میں وہ بے شمار پیچیدگیاں، مسائل اور تنازعات ابھرنے لگتے ہیں جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کا مرکزی نقطہ وہ چیز ہے جسے میں مسئلہ فلسطین کا نام دوں گا۔

جب ہم کسی موضوع، مقام یا شخص کا "مسئلہ" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو ہم اس سے مختلف قسم کے کئی مفاہیم مراد لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینے کے بعد اپنی بات کا اختتام بدیں الفاظ کرتا ہے: "اب میں "م" کے مسئلے کی طرف آتا ہوں۔" یہاں نکتہ یہ ہے کہ "م" ایک ایسا مسئلہ ہے جو دوسرے تمام مسائل سے علیحدہ اور مختلف ہے۔ اس لیے ہمیں اس سے علیحدہ ہی نبرد آزما ہونا ہوگا۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب "کا مسئلہ" کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے تو اس سے اشارہ ایک ایسے مسئلے کی طرف کیا جاتا ہے جو بہت پرانا ہو، خصوصی طور پر گنجلک ہو، اور فوری توجہ کا متقاضی ہو۔ مثلاً حقوق کا مسئلہ، مشرقی (یورپی) ممالک کا مسئلہ، آزادیٔ افکار کا مسئلہ۔ تیسرا نکتہ یہ ہے [اور ان معنوں میں یہ ترکیب شاذ ہی استعمال کی جاتی ہے] کہ "کا مسئلہ" کی ترکیب ایک ایسے انداز سے استعمال کی جاسکتی ہے جس سے یہ مترشح ہو کہ اس ترکیب میں جس چیز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اس کی حیثیت گویا غیر یقینی، مشتبہ اور غیر مستحکم ہے۔ ۔ ۔

لوخ نیس[1] کی بلا کے وجود کا مسئلہ اس کی واضح مثال ہے۔ جب "نتو مسئلہ" کی ترکیب فلسطین کے ضمن میں استعمال کی جاتی ہے تو اس میں تینوں قسم کے مفاہیم مضمر ہوتے ہیں۔ اور رینٹ کی طرح، جس کا یہ ایک جزو ہے، فلسطین بھی ایک دوسری دنیا میں واقع ہے جو اس دنیا سے قطعی مختلف ہے، جس سے یورپ اور امریکہ کے باشندے آشنا ہیں اور جو بحر اوقیانوس کے اردگرد آباد ہے۔ ایک لحاظ سے فلسطین ایک ایسا مسئلہ بھی ہے جو جنگ عظیم دوم کے بعد دنیا کا تکلیف دہ حد تک انتہائی متنازعہ مسئلہ بن چکا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کے کئی شاخسانے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو فلسطین پر قابض ہونے کی تگ و تاز میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اس کی بازیابی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ فریقین کی یہ جدوجہد خود فلسطین کے اندر بھی جاری و ساری ہے۔ کسی دوسری جدوجہد کی نسبت جو تقریباً اتنا ہی عرصہ جاری رہی ہو جتنے عرصے سے فلسطین کے لیے ہو رہی ہے، اس جدوجہد میں نسبتاً کہیں زیادہ لوگوں کی توانائیاں صرف ہوئی ہیں۔ اور آخری نکتہ یہ ہے ـــــ اور اس کتاب کو زیر تحریر لانے کا محرک بھی یہی نکتہ بنا ہے ـــــ کہ فلسطین ایک ایسا تصور ہے جس پر بے پناہ تو تو میں میں ہوئی ہے، نزاعی بحثیں چلی ہیں، کھینچا تانی ہوئی ہے اور اس بحث مباحثے میں بعضوں نے تو اس کے وجود کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ ایک طرف تو فلسطینی اور ان کے حامی ہیں کہ ان کے سامنے اس کا محض نام ہی لے دیا جائے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ایک اہم اور مثبت سیاسی ادعا کا اظہار ہو گیا ہے۔ دوسری طرف فلسطینیوں

---

[1] لوخ نیس Loch Ness کی بلا (ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۲، صفحہ نمبر ۶۰۳)

کے دشمن ہیں جو اس نام سے ہی بدکتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہیں زیادہ منفی اور دھمکی آمیز انداز سے اس کے وجود سے انکار کرنے لگتے ہیں۔ یہاں ہم اُن ان مظاہروں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اس صدی کے ساتویں عشرے کے آخری اور آٹھویں عشرے کے بیشتر سالوں کے دوران میں امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کے گلی کوچوں میں ہوتے تھے۔ ان مظاہروں کے دو فریق تھے۔ ایک فریق نعرہ لگاتا تھا کہ "فلسطین موجود ہے"۔ دوسرا فریق گرہ لگاتا تھا کہ "فلسطین نام کا کوئی ملک صفحۂ ہستی پر موجود نہیں"۔ آج کل فلسطین[1] میں سرکاری دستور یہ ہے کہ جب بھی فلسطینیوں کا ذکر مقصود ہو تو انہیں "نام نہاد فلسطینی" کہا جاتا ہے۔ تاہم اتنا بھی غنیمت ہے ورنہ مسز گولڈا میئر[2] نے تو نہایت منہ پھٹ انداز سے ۱۹۶۹ء میں یہ دعوٰے کر دیا تھا کہ فلسطینیوں کا روئے زمین پر کوئی وجود نہیں۔

اور حقیقت یہی ہے کہ آج فلسطین کا وجود عنقا ہو چکا ہے۔ اس کی یاد تو محض ایک یاد باقی رہ گئی ہے یا پھر یہ ایک تصور، ایک سیاسی اور انسانی تجربے کے طور پر زندہ ہے یا پھر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلسطین ایک پیہم عوامی عزم کو بروئے کار لانے کا نام ہے اور یہ آخری بات زیادہ اہم ہے۔ فلسطین کے متعلق یہ تمام باتیں میرے اس مقالے کا موضوع نہیں گی۔ تاہم میں ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں میچ کر یہ نہیں کہوں گا کہ فلسطین، ہر اس شخص جو اس وقت مغرب میں رہائش پذیر

---

[1] آج کا اسرائیل۔

[2] گولڈا میئر (۱۸۹۸ - ۱۹۷۸ء) اسرائیل کی ایک سابق وزیر اعظم (۱۹۶۹ - ۷۵) روس کے شہر کیف میں پیدا ہوئی۔ امریکہ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۱ء میں فلسطین چلی گئی۔ صیہونیت کیلئے تندہی سے کام کرتی رہی۔ قیام اسرائیل کے بعد روس میں سفیر مقرر ہوئی۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ اسی کے وزارتِ عظمٰی کے عہد میں لڑی گئی۔

ہے اور تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہے، "کا مسئلہ" نہیں۔ تاہم
اس بات کا اعتراف بھی ایک ایسے میدان میں قدم دھرنا ہے، جو نسبتاً اجنبی
اور غیر مانوس ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک جو اخبارات و رسائل کا
مطالعہ کرتے ہیں، جو ٹیلی ویژن دیکھتے اور ریڈیو سنتے ہیں، جنہیں یہ گمان ہے
کہ انہیں سیاسی مسائل کی محض شد بد ہی نہیں بلکہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں،
جو یہ اعلان کرتے ہیں کہ بین الاقوامی تنازعات کے متعلق وہ ماہرانہ رائے
کے مالک ہیں، مشرقِ وسطیٰ بنیادی طور پر عرب اسرائیلی تنازعہ (کشمکش، مسئلہ،
جدوجہد وغیرہ) ہے اور یا اس سے کچھ ہی زیادہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ نقطۂ نظر
حقیقت کو گھٹا کر پیش کرتا ہے لیکن اس نقطۂ نظر کی اصلی خامی یہ ہے کہ اس نے
آج کے مشرق وسطیٰ سے فلسطین کے کسی عمل دخل کو لغوی طور پر خارج کر دیا ہے
کیونکہ بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ ستمبر ۱۹۷۸ء سے جب (امریکہ کے)
صدر جمی کارٹر، (اسرائیل کے وزیراعظم) مناچم بیگن اور (مصر کے) صدر انور سادات
واشنگٹن کے قریب کیمپ ڈیوڈ میں سر جوڑ کر بیٹھے تھے، یہی تینوں کامل طور پر مشرقِ
وسطیٰ کی علامت بن چکے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے متعلق جو کتابیں، رسالے، مضامین
وغیرہ کئے گئے ہیں، (کم از کم ۱۹۷۸ء تک) ان کی بیشتر تعداد یہی تاثر دیتی رہی کہ مشرقِ
وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا لب لباب یہ ہے کہ یہ ایسی نہ ختم ہونیوالی
جنگوں کا ایک سلسلہ ہے جو اسرائیل اور چند عرب ممالک کے مابین جاری ہیں۔ یہ
کہ ۱۹۴۸ء تک ایک ملک موجود تھا جسے فلسطین کے نام سے پکارا جاتا تھا،
اور یا یہ کہ اسرائیل کا وجود ــــــ یا عام محاورے کے مطابق اس کی
"آزادی" ــــــ فلسطین کے استیصال کا نتیجہ تھا، یہ وہ حقائق ہیں جن
کے درست ہونے کے متعلق کوئی جھگڑا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ

یہی وہ حقائق ہیں جن سے ان لوگوں کی بیشتر تعداد، جو مشرق وسطیٰ میں پیش آنیوالے واقعات و حالات میں دلچسپی لیتے ہیں، کم و بیش لاعلم ہے یا ناواقف ہے[1]۔ لیکن

---

[1] انگلستان کے ذرائع ابلاغ (باہمی رضامندی سے) مسئلہ فلسطین کے متعلق جس سنسرشپ کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، اس کا تفصیلی ذکر Christopher اور Michael Adams کی کتاب "Publish It Not: The Middle East Cover up" میں موجود ہے۔ اس کتاب کو لونگ مین گروپ نے ۱۹۷۵ء میں لندن سے شائع کیا تھا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب بھی کسی اسرائیلی باشندے یا اسرائیل کے کسی حامی کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو امریکہ کے موقر اخبار "نیویارک ٹائمز" میں اس پر معمول کے مطابق اسرائیل کے کسی مشہور و معروف حامی کا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ مثلاً مشہور ناول نگار سال بیلو (Saul Bellow) کی کتاب "To Jerusalem and Back" پر معروف نقاد ارونگ ہاؤ Irving Howe اور ٹیڈی کولک (Teddy Kollek) کی کتاب پر، جس میں اس نے بیت المقدس کے میئر کی حیثیت سے اپنے تجربات بیان کئے تھے، سال بیلو نے تبصرہ کیا تھا۔ اس اخبار کا یہ معمول بھی ہے کہ جب کوئی عرب باشندہ کوئی کتاب تحریر کرتا ہے یا کوئی مغربی عالم اپنی کسی کتاب میں اسرائیل پر معمولی سی نکتہ چینی کر دیتا ہے تو اس کتاب پر تبصرہ بھی کسی صیہونیوں کے حامی نقاد سے ہی کرایا جاتا ہے (مثلاً نوئم چومسکی کی کتاب "Peace in The Middle East" پر Michael Walzer سے اور سادات کی خودنوشت سوانح حیات پر Nadav Safran سے تبصرہ لکھوایا گیا۔ ۱۹۶۷ء کے بعد سے جب سے فلسطین کا مسئلہ نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے New York Review of Books

باقی اگلے صفحہ پر

اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ آج ان تقریباً چالیس لاکھ باشندوں سے جن میں
مسلمان اور عیسائی دونوں شامل ہیں، جو اپنے آپ کو فلسطینی گردانتے ہیں
اور جنہیں فلسطینی سمجھا جاتا ہے، یا تو مسلسل چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے
اور یا پھر ان کے متعلق لاعلمی پائی جاتی ہے حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جن سے
فلسطین کا مسئلہ عبارت ہوتا ہے اور اگر (فی الوقت) فلسطین کے نام
کا کوئی ملک (روئے زمین پر) موجود نہیں تو اس سے یہ مطلب بھی اخذ نہیں ہوتا
کہ کوئی ملک نہیں، تو پھر کوئی فلسطینی بھی نہیں۔ فلسطینی ہیں اور اس مقالے کے
ذریعے ان کی حقیقت کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عصر حاضر کی تاریخ کا بیشتر حصہ فلسطینیوں کے ارد گرد گھومتا ہے اور جس طرح

بقیہ صفحہ نمبر ۳۴:۔ نے کسی فلسطینی کی کوئی تحریر شائع نہیں کی۔ ۱۹۷۰ء کے دوران میں اس جریدے
نے آئی۔ ایف۔ بشون۔ Guido Gold اور Stanley Hof.man کے
ایسے مضامین ضرور شائع کیے جن میں اسرائیل پر تھوڑی بہت تنقید کی گئی تھی [واضح رہے کہ یہ تمام
اصحاب اس بات کے حامی ہیں کہ فلسطینیوں کو کسی نہ کسی قسم کا حق خود ارادیت ملنا چاہیے] تاہم یہ
اٹل حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ خود فلسطینیوں کو ———— جن کی کوئی کمی نہیں —
اپنے متعلق لکھنے کی اجازت قطعاً نہیں دی جاتی۔ اس سے بھی زیادہ قابل مذمت بات یہ
ہے کہ اسرائیلی حکومت جو کارروائیاں کرتی ہے [اور جنہیں خود اسرائیل کے اخبارات اکثر و
بیشتر معمول کے مطابق شائع کرتے رہتے ہیں] ان سے صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے اور ان کے
متعلق (مغربی اخبارات) ایک لفظ تک شائع نہیں کرتے، حالانکہ یہی کارروائیاں اگر
کسی دوسرے ملک کی حکومت کرتی تو انہیں صفحہ اوّل پر چیختی چنگھاڑتی سرخیوں کے ساتھ
شائع کیا جاتا (مصنف)

وہ خود امکانی اور غیر امکانی مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں، اسی طرح ان کی تاریخ بھی ممکن اور غیر ممکن مقامات پر بکھری ہوئی ہے۔ امور خارجہ کے متعلق کوئی سمپوزیم (مذاکرہ) منعقد کرنا ہو، کوئی عالمانہ تحریر قلم بند کرنا ہو یا کوئی اخلاقی رویہ اختیار کرنا ہو، ان میں سے کوئی بھی چیز اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک اس میں (گھما پھرا کر ہی سہی) فلسطینی [بعض اوقات اسے "عرب" بھی کہا جاتا ہے] دہشت گردی کا حوالہ نہ دیا جائے۔ کوئی بھی "خوددار" ہدایتکار جب کسی حالیہ اور غالباً خودساختہ سنگین واردات کے متعلق فلم بنانے کا منصوبہ تیار کرتا ہے، جب تک وہ اپنی کاسٹ میں کسی فلسطینی کو ایک مصدقہ دہشت گرد کی حیثیت سے شامل نہ کرلے، چین سے نہیں بیٹھے گا۔ "بلیک سنڈے" اور "سورسرر" (جادوگر) جیسی فلمیں فوراً ذہن میں آتی ہیں۔ دوسری طرف، مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے —————— موقع محل کے مطابق —————— فلسطینیوں کے ساتھ وہ تمام خصائص وابستہ کر دیئے جاتے ہیں جو پناہ گزینوں کا خاصہ ہوتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے یہ تو کیمپوں میں گلی سڑی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے یہ تو عرب ممالک کے "سیاسی فٹ بال" ہیں۔ کوئی زبان طعن دراز کرتا ہے کہ ان کے کیمپ اشتراکیت کے پھلنے پھولنے کے (موزوں) مقامات ہیں۔ ایک دور کی کوڑی لاتا ہے کہ یہ تو خرگوشوں کی طرح بے حد و حساب بچے پیدا کیے جا رہے ہیں۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ وہ تبصرہ نگار جو جذباتیت کی رو میں نہیں بہتے اور حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، اکثر یہ کہتے ہیں کہ فلسطینی عالم عرب کے چیدہ اور منتخب روزگار لوگ ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے کسی دوسری قوم کی نسبت نہ صرف یہ کہ وہ بہتر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ (اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر) انہیں عرب ممالک کے حساس ترین مقامات اور حساس ترین ذمہ داریوں پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ ایسے تمام ادارے، جیسے

خلیجی ممالک کی تیل کی وزارتیں اور تنصیبات جو دباؤ ڈالنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں، فلسطینیوں کے دائرۂ اختیار میں دے دی جاتی ہیں۔ تعلیمی اور معاشی مشیر انہیں مقرر کیا جاتا ہے اور عرب بورژوا طبقے (بڑے بڑے بینک کار، صنعت کار، دانشور وغیرہم) کی بیشتر تعداد فلسطینی ہے ۔ لیکن ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا جاتا ہے اور تمام فلسطینیوں [خواہ وہ کتنے ہی بڑے مقام پر فائز کیوں نہ ہوں] کے متعلق یہ مفروضہ قائم کرلیا جاتا ہے کہ وہ فتنہ و فساد کے متوالے اور انتقام کے پیاسے ہیں۔

اور آخری بات یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء کے بعد پہلی مرتبہ امریکہ میں سیاسی بحث مباحثے کا رخ مسئلہ فلسطین کی طرف مڑا ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اگر مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرنا مقصود ہے تو فلسطینیوں کے مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنا ہوگا تو (پرانے رویوں کے برعکس) صدر کارٹر سے لیکر عام آدمی تک کوئی شخص بھی اس پر ناک بھوں نہیں چڑھاتا اور نہ اسے یہود دشمنی پر محمول کرتا ہے۔ "فلسطینیوں کا وطن" اور مجوزہ امن کانفرنسوں میں فلسطینیوں کی نمائندگی کا ٹیڑھا مسئلہ، یہ اب اتنے اہم سوالات ہیں کہ انہوں نے امریکی عوام کے شعور کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کی حمایت میں مثبت انداز سے رائے شماری ہوئی تھی [ؔ] - لیکن امر واقع یہ ہے کہ واقعات نے صحیح

[ؔ] ۱۹۶۹ء میں جنرل اسمبلی نے اپنی قرارداد نمبر ۲۵۳۵-بی کے ذریعے اپنی اس گہری تشویش کا اظہار کیا تھا کہ "فلسطینیوں کو نہ صرف اپنے حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے بلکہ اجتماعی سزاؤں، من مانی نظر بندیوں، کرفیو کے نفاذ، مکانوں اور جائدادوں کے انہدام

باقی اگلے صفحہ پر

کروٹ اس وقت بدلی جب ۱۹۷۴ء میں یاسر عرفات جنرل اسمبلی کے اجلاس میں [فلسطینیوں کے نمائندے کی حیثیت سے] شریک ہوئے [اگرچہ یاروں نے ان کی اس شرکت کو بھی ایک متنازعہ مسئلہ بنا دیا تھا]، چنانچہ ان کی اس شرکت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اب مسئلہ فلسطین کسی دوسرے مسئلے کا دُم چھلا نہیں رہا بلکہ ۱۹۴۸ء کے بعد پہلی مرتبہ جنرل اسمبلی نے اس پر ایک علیحدہ اور خود مختار مسئلے کی حیثیت سے غور و فکر کیا۔ اس سے کچھ لوگوں کو تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن عام لوگوں کے اذہان میں یہ مسئلہ ایک نئے اور غالباً خوش آئند انداز سے جاگزیں ہو گیا۔

لیکن [جنرل اسمبلی کی] غیر مبہم قراردادوں اور ارادوں کے باوجود، فلسطینیوں کو اب بھی ایک ایسی مخصوص قوم تصور کیا جاتا ہے جس کا دوسرا نام مصیبت ہے ـــــ اور مصیبت بھی ایسی جس کی نہ کوئی اساس ہے اور نہ جس کے پیچھے کوئی سوچ بچار ہے بلکہ ایک ایسی مصیبت جو خواہ مخواہ بلکہ اللہ واسطے کھڑی کر دی جاتی ہے۔ وہ دق نہیں ہوتے جیسا کہ انہیں ہو جانا چاہئے تھا، وہ دوسرے پناہ گزینوں [جو بظاہر اپنے پناہ گزیں ہونے پر راضی برضا ہو چکے ہیں اور یوں اپنے حال میں مست ہیں] کا مقدر تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ وہ

بقیہ صفحہ نمبر ۳۷:۔ اور پناہ گزینوں اور مقبوضہ علاقوں کے دوسرے عرب باشندوں کیخلاف ظالمانہ کارروائیوں کے ذریعے اس محرومی کی شدت میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ جنرل اسمبلی فلسطینی عوام کے ناقابل تنسیخ حقوق کی توثیق نو کرتی ہے۔" اس کے ایک سال بعد جنرل اسمبلی نے قرارداد نمبر ۲۶۲۷ سی۔ کے ذریعے اس امر کو تسلیم کیا کہ فلسطین کے باشندے اقوام متحدہ کے منشور (چارٹر) کے مطابق مساوی حقوق اور حق خود ارادی کے مستحق ہیں۔ (مصنف)

مصیبت پر مصیبت کھڑی کئے جا رہے ہیں۔ اس نکتے کے ثبوت کے طور پر لبنانی اور اردن کے حالیہ بحرانوں کو، جن میں فلسطینی بھی شامل ہیں، پیش کیا جاتا ہے۔ اور اگر تبصرہ نگار کچھ زیادہ ہی دقیقہ رس اور دُور کی کوڑی لانے والا ہو تو وہ اس "حقیقت" کی طرف بھی اشارہ کرنے سے گریز نہیں کرے گا کہ فلسطینی دراصل اسلام کی نشاۃ ثانیہ[1]، جو (ان کے نزدیک) بلاریب ایک نہایت ہی ہیبت ناک واقعہ ہے، کا جزو ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق، جس کے خالق قدرے خبط عظمت میں مبتلا ہیں، اگر امریکہ کا صدر بھی فلسطین کے مسئلے کو اس انداز سے پیش کرے گا کہ مشرقِ وسطیٰ کے امن کا یہ ایک حقیقی اور ناگزیر جزو ہے تو اس کے متعلق یہ تصور کر لیا جائے گا کہ اس کے پیچھے مسلم تیل، مسلم عصبیت اور مسلم بلیک میل بول رہی ہے۔

اس قسم کا یہ تمام مواد، جس چیز کی پردہ پوشی کرتا ہے، وہ نہایت پیچیدہ اور آسانی سے (مغربی باشندوں کی) سمجھ میں آنے والی نہیں۔ یہ چیز، جسے عام مغربی باشندوں کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، ایک ایسی چیز ہے،

---

[1] اس سلسلے کا معرکۃ الآرا مضمون Bernard Lewis کا ہے جو اسلام کی واپسی ("The Return of Islam") کے عنوان سے جریدہ "کمنٹری" کے شمارہ جنوری ۱۹۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اصل میں یہ مضمون مصنف کے مضمون "اسلام کی بغاوت" کا، جو انڈیانا یونیورسٹی پریس کی مطبوعہ کتاب "مشرقِ وسطیٰ اور مغرب" ۱۹۶۴ء میں شامل ہے، نیا رنگ روپ ہے۔ دونوں مضامین صیہونیت کا نفیس اور کارآمد پراپیگنڈہ ہیں۔ میں نے ان دونوں مضامین پر اپنی کتاب "Orientalism" کے صفحات ۱۹-۳۱۶ پر تفصیلی بحث کی ہے (مصنف)

جس پر کوئی نظریہ منطبق نہیں کیا جا سکتا، جس پر دو جمع دو چار کا کوئی اصول نافذ نہیں ہوتا اور نہ جس سے کسی قسم کے جذبات یا رویوں کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اشارہ فلسطینیوں کے اس سو سالہ تجربے کے مرکزی نقطے کی طرف ہے جو بظاہر بہت سادہ نظر آتا ہے لیکن جسے آسان اور سہل الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ (اس چیز سے) میری مراد ایک ایسی سرزمین ہے، جسے فلسطین کا نام دیا جاتا ہے۔ صدیوں سے اس سرزمین پر ایک بہت بڑی اکثریت آباد تھی جو اگرچہ زیادہ تر گلہ بانوں اور کاشتکاروں پر مشتمل تھی، تاہم اسے معاشرتی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی طور پر ایک قوم کی حیثیت سے شناخت کیا جا سکتا تھا۔ اس قوم کی (ایک بہت بڑی اکثریت کی) زبان عربی اور مذہب اسلام تھا۔ یہ قوم —— اور اگر آپ جدید تصورات کے مطابق انہیں قوم کے درجے سے محروم کرنا چاہتے ہیں، تو افراد کا یہ گروہ —— اپنی شناخت اس سرزمین کے حوالے سے کرتی تھی، جس کے سینے کو چیر کر یہ اناج اور دوسری فصلیں کاشت کرتی تھی اور جس پر یہ اپنے جانور چراتی تھی اور جس پر یہ آباد تھی۔ [یہ قوم فقر و فاقے کی زندگی گزارتی تھی یا ٹھاٹ باٹ کی، یہاں یہ بات غیر متعلق ہے۔] اس شناخت کا احساس اسے اس وقت کے بعد خاص طور پر ہوا جب یورپی اقوام نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس سرزمین پر قبضہ کریں گی اور یہاں ان یہودی باشندوں کو آباد کریں گی جنہیں دوسرے ممالک سے لایا جاتا تھا۔ جہاں تک ہم سمجھ پائے ہیں، ہمیں اس امر کی کوئی واضح علامت نظر نہیں آئی کہ فلسطینیوں نے اس جدید قبضے کو تسلیم کر لیا ہے یا یہ کہ صیہونیوں نے فلسطین کو مستقل طور پر فلسطین سے بے دخل کر دیا ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے لیکن اصل بات یہی ہے کہ جسے ہم فلسطینی حقیقت کہتے ہیں، اس کی تعمیر کل بھی اس نئے غیر ملکی استعمار کے خلاف مزاحمت پر ہوئی

تھی، آج بھی یہ اسی مزاحمت پر استوار ہے اور آئندہ بھی اسی پر استوار رہے گی۔ اس بات کا بھی امکان زیادہ ہے کہ اس (مزاحمت) کے معکوس مزاحمت جو ابتدا ہی سے صیہونیوں اور اسرائیلیوں کا طرۂ امتیاز رہی ہے، جاری رہے گی یعنی صیہونیوں اور اسرائیلیوں نے نہ کبھی یہ تسلیم کیا ہے اور نہ وہ آئندہ کبھی یہ تسلیم کریں گے کہ فلسطینی عربوں کا بھی کوئی وجود ہے، نتیجتاً وہ ان کے وجود کی نفی کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کیونکہ [وہ خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ] فلسطینی عرب محض تکلیف دہ پریشانی (کا باعث) ہی نہیں بلکہ وہ آبادی کا ایک ایسا طبقہ ہیں جس کی جڑیں اس زمین کے ساتھ اس حد تک وابستہ ہیں کہ انہیں کسی طریقے سے بھی اکھاڑا نہیں جا سکتا۔

چنانچہ فلسطین کا مسئلہ ادعا اور انکار کے مابین ایک مقابلہ اور چشمک زنی ہے اور یہی وہ سو سالہ چشمک زنی ہے جس نے اسرائیل اور عرب ممالک کے مابین موجودہ تعطل کو زندہ رکھا ہے اور جو اس تعطل کو سمجھ میں آنے والی چیز بناتا ہے۔ اپنی ابتدا ہی سے یہ مقابلہ مضحکہ خیز حد تک انمل اور بے جوڑ چلا آرہا ہے۔ جہاں تک اہل مغرب کا تعلق ہے، (ان کے مطابق) فلسطین ایک ایسی سرزمین ہے جہاں نووارد یہودیوں نے، جو نسبتاً ترقی یافتہ ہیں (کیونکہ وہ یورپی النسل ہیں) تعمیر و ترقی اور تہذیب کاری کے میدانوں میں معجزے کر دکھائے ہیں اور جنہوں نے عربوں کے خلاف، جنہیں ہمیشہ ڈھور ڈنگر بنا کر پیش کیا جاتا رہا اور جن کے متعلق ہمیشہ یہ رائے قائم کی گئی کہ وہ اجڈ، گنوار اور تہذیب سے بے بہرہ ہیں، اس لیے کریہہ اور قابل نفرت ہیں، زبردست کامیاب تیکنیکی جنگیں لڑی ہیں۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ مقابلہ دو ایسی ثقافتوں کے مابین ہے جن میں ایک ترقی یافتہ ہے [اور ہر آن مزید آگے قدم بڑھائے جا رہی ہے] اور دوسری نسبتاً پسماندہ

اور کم و بیش روایت پسند ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس مقابلے میں وہ کون سے ہتھیار اور اوزار تھے، جو استعمال ہوئے اور ان ہتھیاروں اور اوزاروں نے مابعد تاریخ کو کیسے متشکل کیا، چنانچہ (بادی النظر میں) یہ تاریخ فلسطین پر یہودی دعاوی کی صحت کی تصدیق اور نتیجتاً فلسطینی دعاوی کی تکذیب کرتی نظر آتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں، ہمیں یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ فلسطینیوں اور صیہونیوں کے مابین جو کشمکش جاری ہے، وہ موجودگی اور تشریح و تعبیر کے مابین کشمکش ہے جس میں مؤخر الذکر اول الذکر پر مسلسل غالب آتی اور اسے بیخ و بن سے اکھاڑتی نظر آتی ہے۔ یہ موجودگی کیا تھی؟ اس بات سے قطع نظر کہ فلسطینی عرب کس قدر پسماندہ، غیر مہذب، اجڈ اور ڈھور ڈنگروں کی طرح بے زبان تھے، وہ حقیقت، جس سے نظریں نہیں چرائی جا سکتیں، یہی ہے کہ وہ اس سرزمین پر موجود تھے۔ اٹھارویں یا انیسویں صدی کے دوران میں شاتوبری آں[1]، مارک ٹوین[2]، لامارتین[3]، نیوال[4]، ڈیزرائیلی[5] اور دوسرے ادیبوں نے مشرق کے متعلق جو سفر نامے تحریر کیے، ان کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت واشگاف طور پر نظر آئے گی کہ ان میں ان عرب باشندوں کا ذکر کیا گیا ہے جو فلسطین کی سرزمین پر آباد تھے۔ اسرائیلی ذرائع کے مطابق ۱۸۲۲ء

---

[1] Vicomte Francois Rene'de Chateubriand اپنے زمانے کا مشہور سیاستدان، سفارت نگار اور ادیب تھا۔ [2] امریکی صحافی اور مزاح نگار (۱۸۳۵-۱۹۱۰ء) اس کا اصلی نام Samuel Clemens تھا۔ [3] Alphonse Marie Louis de Pratde Lamartine فرانسیسی شاعر اور سیاستدان۔ [4] ایک فرانسیسی مصنف اور سفر نامہ نگار [5] Benjamin Disraeli (۱۸۰۴-۸۱ء) برطانیہ کا مشہور یہودی وزیر اعظم مصنف، ناول نگار اور سفارت کار

میں فلسطین میں آباد یہودیوں کی تعداد چوبیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور یہ تعداد ملک کی کل آبادی کے، جس کا غالب حصہ عربوں پر مشتمل تھا، دس فیصد سے بھی کم تھی۔ یہ درست ہے کہ ان سفرناموں میں عربوں کو عام طور پر غیر دلچسپ اور غیر ترقی یافتہ بنا کر پیش کیا گیا ہے لیکن (اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا گیا کہ) وہ کم از کم وہاں موجود تو تھے۔ چونکہ یہ سرزمین فلسطین کے نام سے موسوم تھی، اس لیے مغربی اذہان نے اس کے موجود حقائق اور باشندوں کو کبھی در خور اعتنا نہیں سمجھا جو اس سرزمین پر حاوی تھے بلکہ اہل مغرب کے لاشعور میں یہ بات ہمیشہ رچی بسی رہی کہ چونکہ یہ سرزمین ایک عظیم بالشان اور درخشاں ماضی کی امین رہی تھی، اور بظاہر ایک عظیم الشان اور پُرشکوہ مستقبل کے بے پناہ امکانات سے بھرپور ہے۔ اس لیے اس پر از سر نو قبضہ کرنا اور اس کی نئے سرے سے تعمیر ضروری ہے۔ الفانسے دی مارتین کی تحریریں اس بارے میں ایک واضح مثال پیش کرتی ہیں۔ اس نے ۱۸۳۳ء میں اس علاقے کی سیاحت کی اور "سفرنامۂ مشرق" (Voyage en Orient) کے نام سے کئی سو صفحات پر مشتمل اپنے سفر کی داستان تحریر کی۔ جب اس کی یہ کتاب اشاعت کے مراحل سے گزر رہی تھی، تو اس نے اس کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شامل کر دیا۔ اس ضمیمے کا نام "خلاصۂ سیاست" تھا۔ اس ضمیمے میں اس نے فرانس کی حکومت کو کئی تجاویز پیش کیں۔ اگرچہ اس نے اپنی اصل کتاب میں اپنی ان بے شمار ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اس نے مقدس سرزمین میں عرب کسانوں اور شہری باشندوں کے ساتھ کی تھیں، لیکن اپنے ضمیمے میں وہ ان تمام باتوں کو گول کر لیا اور (بڑی ڈھٹائی کے ساتھ) اس نے یہ اعلان کیا کہ یہ علاقہ حقیقتاً ایک ملک نہیں (غالباً اس کے خیال کے مطابق وہاں کے باشندے "اصل" شہری نہیں تھے)، چنانچہ فرانس کے لیے یہ ایک سنہری موقع ہے کہ وہاں وہ ایک سامراجی یا نوآبادیاتی منصوبے کا آغاز کر دے[1]۔ لامارتین نے جو

---

[1] الفانسے لامرتین، "سفرنامۂ مشرق"۔ ناشر: ہاشت: پیرس۔ ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۸۷ء حصہ دوم صفحہ ۵۳۳

طریقۂ واردات اختیار کیا، وہ یہ ہے کہ اس نے ایک موجود حقیقت پر ——
یعنی رہائش پذیر عربوں کا طبقے پر —— مستقبل کی ایک آرزو کے ذریعے
—— پر خطِ تنسیخ پھیر دیا اور حقیقت سے ماورا ایک نیا خیال پیش کر دیا کہ
یہ (فلسطین کی) سرزمین تعمیر و ترقی کے لیے ایک زیادہ مستحق طاقت کے لیے خالی
(اور چشم براہ) ہے۔ بعینہٖ یہ بالکل اسی قسم کی سوچ ہے جس نے انیسویں صدی کے اواخر
میں اسرائیل زینگ ول[۱] کو فلسطین کے متعلق یہ صیہونی نعرہ تخلیق کرنے کی جرأت
دلائی: "قوم کے بغیر سرزمین، سرزمین کے بغیر قوم کے لیے"۔

واقعہ یہ ہے کہ فلسطین اہلِ مغرب کے تخیّل اور سیاسی عزائم میں ہمیشہ یہ ایک
خاص کردار ادا کرتا رہا ہے اور اس بات پر تو عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ
یہ مغرب ہی ہے جہاں جدید صیہونیت کا ظہور ہوا ہے۔ فلسطین کے حصول کی خاطر
مختلف تحریکیں وجود میں آئیں اور زائرین کی حیثیت سے لوگ جوق در جوق یہاں
آتے رہے۔ یہ سب کچھ صلیبی جنگوں کا ثمر اور انعام تھا۔ پھر یہ وہ جگہ بھی ہے
جس کا محض نام ہی [اس کا بار بار نام تبدیل کیے جانے کا سلسلہ بھی زلفِ یار
کی طرح طویل بلکہ غیر مختتم ہے) عقیدوں اور اصولوں کا مسئلہ رہا ہے۔ جیسا کہ میں
اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اس سرزمین کو فلسطین کے نام سے پکارنا یا نہ پکارنا، یعنی
اسے فلسطین کی بجائے (مثال کے طور پر) اسرائیل یا صیہون کے نام سے موسوم
کرنا، یہ سب کچھ ایک سیاسی عزم کی غمازی کرتا ہے۔ اس سے جزوی طور پر اس
مشکوک دعوےٰ پر کچھ روشنی پڑتی ہے جس پر صیہونیوں کی حمایت میں لکھی گئی تحریروں میں

۱: اسرائیل زینگ ول (Zangwill) (۱۹۲۶-۱۸۶۴) برطانوی مصنف
اور صیہونی تحریک کا زبردست پرچارک۔

اصرار کیا جاتا ہے کہ رومی سلطنت میں یہ محض ایک انتظامی خطے کا نام تھا اور اس (سلطنت کے زوال) کے بعد اس نام کو کبھی دوبارہ استعمال نہیں کیا گیا تا آنکہ ۱۹۲۲ء میں یہ علاقہ برطانوی انتداب میں آگیا۔ اسی انتداب کے دوران میں اس نام کا دوبارہ چلن ہوا۔ اس دعوے کا مقصد یہ جتلانا ہے کہ فلسطین بھی محض ایک تعبیر و تشریح ہے اور اس نام میں تو اتنا بھی تسلسل اور وقار نہیں پایا جاتا جتنا کہ بطور نام اسرائیل میں پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں اس قسم کے ہتھکنڈے کی مثال ملتی ہے جیسا لامارتین نے استعمال کیا تھا۔ یعنی یہ کہ مستقبل یا ماضی کے ایک سہانے تصور یا خواب کو اس طریقے سے کام میں لایا جائے کہ ماضی اور مستقبل کے مابین جو حقائق موجود ہیں، انہیں ملیا میٹ کر دیا جائے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ان لاتعداد نگارشات کو تو آپ بے شک ہاتھ بھی نہ لگائیں جو اہل یورپ نے قرونِ وسطیٰ سے اب تک تحریر کی ہیں اور جن میں بار بار فلسطین کا حوالہ دیا گیا ہے، آپ اگر محض ان جغرافیہ دانوں، مورخوں، فلسفیوں اور شاعروں کی تصنیفات پر ہی، جو آٹھویں صدی سے عربی زبان میں لکھی جا رہی ہیں، ایک چھچلتی نظر ڈال لیں تو آپ کو فلسطین کے متعلق (بے شمار) حوالے مل جائینگے۔ ممکن ہے کہ یہ نکتہ اتنا اہم نہ ہو لیکن اس سے یہ ثابت کرنے میں ضرور مدد ملتی ہے کہ علمیاتی طور پر فلسطین ______ کیونکہ فلسطین ایک ایسا مقام ہے جس کے ساتھ بے پناہ تخیلات اور عقائد وابستہ ہیں ______ کے نام کو اور وہاں اس کے باشندوں کی موجودگی کو کس طرح حقیقت سے عدم حقیقت میں، اور موجودگی کو عدم موجودگی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بھی اہم نکتہ یہ ہے کہ جہاں تک عرب فلسطینیوں کا تعلق ہے، ان کے نزدیک قرونِ وسطیٰ سے لے کر موجودہ زمانے تک فلسطین کی تسخیر اور اس کے متعلق یورپ والوں نے جتنے بھی دوسرے منصوبے بنائے ہیں، ان میں صیہونیوں کے منصوبے سب

سے زیادہ کامیاب رہے ہیں اور ان کی اس منصوبہ سازی کا عرصہ بھی باقی اہل یورپ کے منصوبوں کی نسبت کہیں زیادہ طویل ہے۔ میں یہاں یہ بات محض نسبتاً ایک سیدھے سادے تاریخی بیان کے طور پر کہہ رہا ہوں، ورنہ جہاں تک دوسرے ابتدائی منصوبوں کے مقابلے میں صیہونی منصوبے کی نسبتاً اپنی خوبیوں کا تعلق ہے تو میں فی الحال ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

فلسطین ساتویں صدی کے اواخر تک غالب طور پر ایک عرب اور مسلم ملک بن گیا تھا۔ اس کے تقریباً فوراً ہی بعد تمام عالم اسلام اس کی زرخیزی اور خوبصورتی کی بنا پر اور اس کی مذہبی اہمیت کے پیش نظر بھی، اس کی حدود اور خصوصیات سے ـــــــ جن میں اس کا عربی نام، فلسطین، بھی شامل ہے ـــــــ شناسا ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر ہمیں عربی زبان کی یہ تحریر، جو دسویں صدی کے اواخر میں قلم بند کی گئی تھی، نظر آتی ہے۔

"فلسطین شام کے صوبوں کا انتہائی مغربی صوبہ ہے۔ اس کی طویل ترین لمبائی رفح سے شروع ہوتی ہے اور لجون کی سرحد پر ختم ہوتی ہے۔ ایک گھوڑ سوار کو یہ مسافت طے کرنے میں دو دن درکار ہوں گے۔ یہ تو رہی اس کی لمبائی۔ جہاں تک اس کی طویل ترین چوڑائی کا تعلق ہے تو وہ جافہ سے ریحہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مسافت کو طے کرنے کے لیے بھی ایک گھوڑ سوار کو دو دن کا عرصہ لگے گا۔ جبل الزور، دیارِ قوم لوط، الجبل اور الشراح، جو کہ ایلہ تک پھیلا ہوا ہے ـــــــ الجبل اور الشراح، دو الگ الگ انتظامی اکائیاں ہیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہیں ـــــــ فلسطین میں شامل ہیں اور وہاں کی حکومت کے ماتحت ہیں۔

بارشیں اور شبنم فلسطین کی آبیاری کرتی ہیں۔ اس کے درخت اور مزروعہ اراضی

مصنوعی آبپاشی کے محتاج نہیں۔ صرف نابلس میں آپ سے یہ دیکھیں گے کہ آبِ رواں
اس مقصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ فلسطین شامی صوبوں کا زرخیز ترین
صوبہ ہے۔ اس کا صدر مقام اور سب سے بڑا شہر رام اللہ ہے لیکن آبادی
اور حجم کے اعتبار سے بیت المقدس اس کے تقریباً ہم پلہ ہے۔ اپنے چھوٹے
حجم کے باوجود فلسطین میں تقریباً بیس مساجد ایسی ہیں، جہاں جمعہ کا خطبہ دیا جاتا
اور نماز پڑھائی جاتی ہے۔[1]

۱۵۱۶ء میں فلسطین خلافت عثمانیہ کا ایک صوبہ بن گیا لیکن اس سے نہ
تو اس کی زرخیزی میں کوئی کمی واقع ہوئی اور نہ اس کے ایک صوبہ اور اسلامی
علاقے ہونے پر کوئی اثر پڑا۔ اس کے تقریباً ایک سو سال بعد ایک انگریز شاعر
جارج سینڈز نے فلسطین کا نقشہ بدیں الفاظ کھینچا ہے: "یہ وہ سرزمین ہے
جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ یہ قابل آباد عالم کا قلب ہے، اس کی
آب و ہوا معتدل ہے۔ یہ خوب صورت اور دلفریب پہاڑوں اور زرخیز وادیوں
سے آراستہ ہے۔ اس کی چٹانوں سے فرحت بخش پانی رستا ہے اور اس کا کوئی
علاقہ ایسا نہیں جو مسرت و انبساط یا منفعت سے مبرا ہو۔"[2] آٹھویں اور انیسویں
صدی کے مابین اس قسم کے بیانات نہ صرف سفرناموں میں بکثرت اور تواتر کے
ساتھ ملتے ہیں بلکہ فلسطین کے قدرتی وسائل کا جائزہ لینے کے لیے انگریزوں نے

---

[1] گائی لے سترانج نے اپنی کتاب
Palestine Under The Moslems:
A Description of Syria and Holy Land from A.D.650 to 1500, میں جو قدیم
مسلم جغرافیہ دانوں کی تحریروں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اصطخری اور ابن حوقل کی اس تحریر کا حوالہ دیا ہے۔ مصنف

[2] اس تحریر کا حوالہ Richard Bevis نے اپنے مقالے (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۵۰ پر)

جو ادارہ قائم کیا تھا، وہ بھی اپنی سہ ماہی سائنسی رپورٹوں میں اس قسم کی باتیں نہایت تسلسل کے ساتھ کرتا تھا۔

یہاں اس بات کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ اگرچہ ۱۸۸۲ سے یہودی آباد کار مسلسل فلسطین میں داخل ہو رہے تھے لیکن حالت یہ تھی کہ ۱۹۴۸ء کے موسم بہار سے چند ہفتے قبل تک، جب اسرائیل کا قیام عمل میں آیا، یہاں عربوں کی بے پناہ اکثریت تھی۔ مثلاً ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی کل آبادی دس لاکھ تینتیس ہزار اور تین سو چودہ تھی اور اس میں یہودیوں کی تعداد محض ایک لاکھ چوہتر ہزار اور چھ سو چھ تھی، ۱۹۳۶ء میں یہودیوں کی تعداد بڑھ کر تین لاکھ چوراسی ہزار اور اٹھہتر تک پہنچ گئی تھی جب کہ کل آبادی تیرہ لاکھ چھیاسٹھ ہزار اور چھ سو بانوے تھی۔ ۱۹۴۶ء میں کل آبادی انیس لاکھ بارہ ہزار اور ایک سو بارہ تھی اور اس میں یہودیوں کی تعداد چھ لاکھ آٹھ ہزار اور دو سو پچیس تھی[۱]۔ اعداد و شمار کے اس سارے گورکھ دھندے میں "مقامی باشندوں" کو نو وارد آباد کاروں سے بآسانی الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ "مقامی باشندے" تھے کون؟

یہ "مقامی باشندے" تھے، سبھی عربی بولتے تھے اور ان کی غالب تعداد سنی مسلمانوں پر مشتمل تھی، اگرچہ ان میں عیسائی، دروزی اور شیعہ مسلمان اقلیتیں بھی شامل تھیں ــــــ اور یہ ساری اقلیتیں بھی عربی ہی بولتی تھیں ــــ تقریباً ۶۵٪ فلسطینی عرب کاشتکاری کرتے تھے۔ یہ تقریباً پانچ سو دیہات میں رہتے تھے۔ یہ اپنی

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۴۷ Making The Desert Bloom: An Historical Picture of Pre-Zionist Palestine" میں دیا تھا۔ یہ مقالہ "مڈل ایسٹ نیوز لیٹر" کے شمارہ فروری، مارچ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا[۱]۔ حوالے کیلئے دیکھیں، ۱۹۴۷ء The Anglo Palestine year" book" 1947 مطبوعہ لندن، ۱۹۴۸ء

زمینوں پر فصلیں کاشت کرتے اور پھل اور سبزیاں اگاتے تھے۔ فلسطین کے تمام بڑے بڑے شہر ـــــــ بیت المقدس، حیفہ، جافہ، اریحہ، الناصرہ عکہ، نابلس، حبرون ـــــــ زیادہ تر فلسطینی عربوں نے تعمیر کئے تھے اور جب ان شہروں کے قرب و جوار میں ناجائز طور پر قبضہ کرنے والے صیہونیوں نے نئی بستیاں تعمیر کرلیں تو بھی فلسطینی عرب ان قدیم شہروں میں ہی مقیم رہے پھر فلسطینی دانشوروں اور پیشہ ور اشخاص پر مشتمل ایک اچھا خاصا معزز طبقہ بھی موجود تھا۔ چھوٹے پیمانے پر ہی سہی، لیکن صنعتیں اور کارخانے لگانے کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست قومی شعور کی رو بھی چل پڑی تھی۔ جدید فلسطین کی معاشرتی، معاشی اور سماجی زندگی کی تنظیم بھی آزادی اور سامراج دشمنی کے انہی مسائل پر استوار ہو رہی تھی جن کا چرچا پورے خطے میں ہو رہا تھا لیکن فلسطینیوں کا مزید دردِ سر یہ بھی تھا کہ انہیں ان مسائل سے بھی عہدہ برآ ہونا پڑا جو ایک طرف تو خلافت عثمانیہ ورثے میں چھوڑ گئی تھی، دوسری طرف رہی سہی کسر صیہونی آبادکاری اور (جنگ عظیم اول کے بعد) برطانوی انتداب نے پوری کردی تھی۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ ان تمام مسائل سے انہیں بیک وقت نپٹنا پڑا۔ انیسویں صدی کے آخری چند برسوں سے عظیم بیداری کی جو لہر رُوحوں کو گرما رہی تھی، کسی استثنا کے بغیر تقریباً سبھی عرب اپنے آپ کو اس کا جزو محسوس کر رہے تھے اور یہی وہ احساس ہے جس نے ان کی جدید تاریخ کو، جو اگرچہ کئی دوسرے اعتبار سے تو انتشار اور تفرقے سے مملو نظر آتی ہے۔ تقویت اور شیرازہ بندی عطا کی۔ حکم دروازہ، خلیل بیداس، خلیل سکاکینی اور نجیب نصر جیسے فلسطینی ادیب، لکھاری اور دانش ور، فتوہ اور نجدہ، عرب ہائر کمیٹیاں اور عرب لیگ آف عرب نیشنل لبریشن (جو یہ دلیل دیتی تھی کہ فلسطین کا مسئلہ صرف عرب اور یہودی مل جل کر ہی طے کر سکتے ہیں) ـــــــ جیسی سیاسی تنظیمیں ـــــ ان

سب کا عوام کے کسی نہ کسی طبقے پر گہرا اثر و رسوخ تھا۔ یہ سب لوگ اور تنظیمیں یہ فیصلہ کرتی تھیں کہ "غیر یہودی" فلسطینی جمہور کی توانائیاں کس سمت میں استعمال کی جانا چاہئیں۔ انہوں نے ایک فلسطینی شناخت تخلیق کی جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی حکمرانی اور یہودی آبادکاری، دونوں کی ڈٹ کر مخالفت کی جائے۔ اس سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ فلسطینیوں کے ذہنوں میں یہ تصور جڑ پکڑ گیا کہ ان کا تعلق ایک واضح قومی گروپ سے ہے، جس کی ایک اپنی زبان (فلسطینی عربی بولی) ہے اور جس کا ایک اپنا مخصوص قومی احساس ہے (جسے صیہونیت سے بالخصوص خطرہ درپیش ہے)۔

فلسطین پر قبضہ کرنے کے لیے جب صیہونیوں نے (اندازاً یہ زمانہ جنگِ عظیم اوّل کے دوران اور اس کے فوری بعد کا ہے) سنجیدگی کے ساتھ منصوبہ بندی شروع کی تو ابتدا ہی سے اس بات کے واضح شواہد ملنے لگے تھے (اور روز بروز یہ تصور عام ہوتا جا رہا تھا) کہ اسرائیل کی تعمیر اس عرب فلسطین کے کھنڈرات پر کرنا مقصود ہے۔ شروع شروع میں اس تصور کو گول مول انداز سے اور حجابات پردوں میں چھپا کر پیش کیا جاتا تھا۔ اور یہ اس لیے تاکہ اسے نوآبادیاتی نظام کی تعمیرِ نو کے جو اعلیٰ پیمانے کے یورپی استعمار کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھی، موافق بنایا جا سکے۔ تھیوڈور ہرزل[1] نے ۱۸۹۵ء میں اپنے روزنامچے میں یہ تحریر کیا کہ فلسطین کے متعلق کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے اس ضمن میں جو الفاظ استعمال کیے، وہ یہ تھے:

---

[1] Theodor Herzl (۱۸۶۰-۱۹۰۴) آسٹریا کا ہنگری نژاد شہری۔ اتفاق رائے سے اسے صیہونیت کا بانی مانا جاتا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے صحافی تھا۔ صیہونیت کی بنیادی دستاویزات اسی کی تحریر کردہ ہیں۔

"ہمیں مفلس اور قلاش آبادی کو ان کے اپنے ملک میں روزگار کے ہر قسم کے ذرائع سے محروم کرنا ہو گا اور راہداری کے ممالک میں ان کے لیے معاش کے ذرائع تلاش کر کے انہیں سرحد پار دھکیلنا ہو گا۔"

"لیکن مفلس اور قلاش لوگوں کی جائدادیں ہتھیانے اور انہیں ملک بدر کرنے کے عمل میں ہمیں نہایت احتیاط، سلیقے، ہوشیاری اور فرزانگی سے کام لینا ہو گا۔"[1]

اس زمانے کے دوران میں، جو اعلان بالفور[2] پر منتج ہوا، صیہونیوں کی طرف سے برطانوی حکومت کے ساتھ خط و کتابت کا کام لارڈ روتھ چائلڈ[3] نے سرانجام دیا۔

---

[1] Theodor Herzl: "Complete Diaries" ed Raphael Pataitran

Tran: Harry Zohn [New York: Herzl Press] v. 1. p.88

[2] اعلان بالفور وہ رسوائے زمانہ دستاویز ہے جسے یہودی سرمایہ داروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں برطانوی حکومت نے جاری کیا۔ اس کا مصنف آرتھر جیمز بالفور (Balfour) [1848-1930] تھا اگرچہ بالفور ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۵ء تک برطانیہ کا وزیر اعظم رہ چکا تھا، لیکن جنگ عظیم اوّل کے دوران میں وہ وزیر خارجہ کے عہدے پر متمکن تھا۔ اس کے اعلان کی رو سے فلسطین سرکاری طور پر صیہونیوں کا وطن تسلیم کر لیا گیا اور ان کے ساتھ یہ وعدہ بھی کر لیا گیا کہ وہاں بعد میں یہودیوں کی آزاد مملکت قائم کر دی جائے گی۔

[3] Rothschild جس کا جرمن تلفظ "روٹ شلٹ" ہے، جرمنی کا ایک یہودی سود خور خاندان تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد می ایر (Meyer) روتھ چائلڈ نے جرمنی کا پہلا بنک قائم کیا۔ بنک کاری کے کاروبار میں اس خاندان نے اتنی ترقی کی کہ اس کا شمار یورپ کے امیر ترین سرمایہ داروں میں ہونے لگا اور اس کے افراد مختلف ممالک (بقیہ: صفحہ نمبر ۵۲ پر)

اس نے ۱۸ جولائی ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کی حکومت کے سامنے جو محضر نامہ پیش کیا اس میں اس "اصول" کا ذکر کیا گیا ہے جس کے تحت فلسطین کی تشکیل نو کر کے اسے "یہودی قوم کے وطن" کے سانچے میں ڈھالنا تھا۔ اس اعلان کے کچھ ہی عرصے کے بعد شائم ویزمان[1] نے ڈنکے کی چوٹ اس حقیقت کا اظہار کرنا تھا کہ "برطانوی قوم پر اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے کہ صرف یہودی قوم اتنی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے کہ وہ فلسطین کی تعمیر نو کر سکے اور جدید اقوام (کی صفوں) میں اسے ایک (اعلیٰ وارفع) مقام دلا سکے"۔ انگلستانی یہودیوں کے سب سے بڑے فقیہہ[2] ڈاکٹر جے۔ ایچ ہرتز (Herz) نے بڑے خطیبانہ انداز سے اس زبردست اور کارگر "برطانوی حمایت" کا ذکر کیا ہے جو وہ "یہودی باشندوں کے لیے فلسطین میں ایک قومی وطن کے قیام نو" کے سلسلے میں کر رہا تھا۔ ان میں سے کسی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱: بشمول فرانس، برطانیہ اور امریکہ میں پھیل گئے اور جہاں بھی گئے، وہاں انھوں نے زبردست اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ برطانیہ کے لارڈ روتھ چائلڈ کا تعلق اسی خاندان کے ساتھ تھا

[1] شائم ویزمان ۱۸۷۴ء میں روس میں پیدا ہوا۔ جرمنی میں اس نے کیمسٹری کی تعلیم حاصل کی پھر وہ سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں تدریس کے شعبوں سے منسلک رہا۔ جنگ عظیم اول کے دوران میں اس نے ایسیٹون (Acetone)، جو دھماکہ خیز مواد بنانے میں استعمال ہوتی ہے، تیار کرنے کا نسبتاً بہتر اور ارزاں طریقہ دریافت کیا۔ اس کی یہ ایجاد بھی اعلان بالفور منظور کرانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ ویزمان صیہونیت کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اسرائیل کا پہلا صدر بھی منتخب ہوا۔ اس کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا۔

[2] یہودی امام: اس کا اصل لقب خاخام یا Rabbi (ربی) ہوتا ہے۔ یہودی فوج میں بھی ربی ہوتے ہیں۔ چیف ربی کا درجہ بریگیڈیئر کے برابر ہوتا ہے۔

بیان میں بھی اس امر کی مطلق صراحت نہیں کی گئی کہ اس وقت فلسطین میں کیا پایا جائے گا [بالالفاظِ دیگر یوں کہیں کہ آیا اس وقت فلسطین غیر آباد ہے اور اگر یہ آباد ہے تو کن لوگوں سے آباد ہے] ۔ تاہم ملک کی "تشکیل نو" اور "تعمیر نو" جیسی ترکیبات کا بلا مغالطہ اور صریحی مطلب یہی نکلتا ہے کہ اسکی موجودہ تشکیل کا ـــــــ جس میں لاکھوں عرب باشندے شامل تھے ـــــــ شیرازہ بکھیر دیا جانا تھا (یہ کام کیسے کیا جانا تھا اور کہاں کیا جانا تھا، کسی نے بھی اس کی وضاحت کرنے کی زحمت نہیں کی) تاکہ اس کی جگہ ایک نئی یہودی مملکت کی داغ بیل ڈالی جا سکے۔ یہ اعلانات جن میں ان لوگوں نے اپنے عزائم کی نشاندہی کی تھی، کچھ ایسے اسلوب میں پیش کئے گئے، جس سے اس حقیقت کی طرف، جو لاریب تکلیف دہ تھی (لیکن اپنی جگہ موجود تھی)، غیر مبہم الفاظ میں ذرا سا اشارہ بھی نہیں کیا گیا کہ ملک تو پہلے ہی (ایک نوآبادی کی حیثیت سے ہی سہی) تشکیل شدہ تھا اور ایک نئی استعماری طاقت اسکی جو تشکیل نو کرنا چاہتی ہے، اس سے یہاں کے باشندوں کو کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ جہاں تک خود ان بیانات کا تعلق ہے، تو اپنی جگہ وہ بالکل صحیح ہیں۔ فلسطین کی تعمیر نو ہوئی۔ اس کی تشکیل نو عمل میں آئی اور اسے نئے سرے سے قائم کیا گیا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کئے گئے، وہ کتنے ظالمانہ اور سفاکانہ تھے، اس کی ایک جھلک موشے دایان[1] کے اس بیان میں نظر آجاتی ہے جو اس نے اپریل ۱۹۶۹ء

---

[1] اسرائیل کا مشہور زمانہ یک چشم جرنیل اور سیاست دان فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ کئی سال اسرائیل کا وزیر خارجہ رہا۔ ۱۹۸۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ یہودیوں کی دہشت گرد تنظیم "ہگانہ" کا سربراہ بھی یہی شخص تھا۔

کے دوران میں دیا تھا۔

"ہم اس ملک میں وارد ہوئے جہاں پہلے ہی عرب آباد تھے اور ہم یہاں ایک عبرانی یعنی یہودی مملکت قائم کر رہے ہیں۔ اس ملک کے کافی علاقوں میں ہم نے عربوں سے زمینیں خریدیں (یہ زمینیں ملک کے کل رقبے کا چھ فیصد تھیں) ہم نے عرب دیہاتوں کی جگہ یہودی گاؤں تعمیر کئے، آپ تو ان عرب دیہاتوں کے نام بھی نہیں جانتے اور اس (لاعلمی) کے سلسلے میں آپ کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا کیونکہ اب جغرافیہ کی وہ کتابیں ہی ناپید ہو چکی ہیں (جن میں ان عرب دیہاتوں کا ذکر تھا)۔ صرف یہ کہ یہ کتابیں ناپید ہو چکی ہیں بلکہ یہ خود عرب دیہات بھی ناپید ہو چکے ہیں جہاں پہلے محالوں تھا۔ وہاں نہلال (دیان کا اپنا گاؤں) ابھرا۔ جبتہ کی جگہ جیوت نے، حنیفس کی جگہ سریدنے اور تل شمعان کی جگہ کیتقار کیھوشوا نے لے لی ہے۔ اس ملک میں ایک بھی مقام ایسا نہیں جہاں پہلے عرب آبادی موجود نہیں تھی (اسرائیلی جریدہ ہارے تز، ہوزخہ ۴ اپریل ۱۹۶۹ء)۔"

موشے دایان نے اگرچہ کافی صاف گوئی سے کام لیا ہے لیکن اس نے بھی زہر ہلاہل کو شکر میں لپیٹ کر پیش کیا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ "عرب دیہات بھی ناپید ہو چکے ہیں" تو اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دیہاتوں کو نہایت منظم طریقے سے مسمار کیا گیا، ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تا آنکہ وہ بالکل ملیامیٹ ہو گئے اور یوں ان کا نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ ایک اسرائیلی پروفیسر نے، جس کا نام اسرائیل شہاک ہے اور جو اس وحشیانہ کارروائی پر بے حد رنجیدہ ہے، ایسے تقریباً چار سو دیہات شمار کیے ہیں جنہیں اس

طریقے سے ملیامیٹ کر دیا گیا۔ وہ کہتا ہے کہ" ان دیہاتوں کو اپنے مکانات ، باغات کی دیواروں ، بلکہ قبرستانوں اور قبروں کے کتبوں سمیت نیست و نابود کر دیا گیا۔ چنانچہ صحیح معنوں میں وہاں اب ایک پتھر تک نہیں بچا۔ چنانچہ آج کل جب وہاں کبھی کسی غیر ملکی کا گزر ہوتا ہے تو اسے (نہایت فخر کے ساتھ) یہ بتایا جاتا ہے۔ صاحب، یہاں پہلے تو کچھ بھی نہیں تھا، صرف اجاڑ بیاباں اور ویرانہ تھا۔"[1] اس رویے میں اور تباہی و بربادی کی اس پالیسی میں، جو اسرائیل نے (عرب ممالک کے خلاف چھ روزہ جنگ میں مکمل کامیابی حاصل کرنے کے بعد) ۱۹۶۷ء اور مابعد کے برسوں کے دوران میں مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں اختیار کی، بڑی ناخوشگوار مطابقت پائی جاتی ہے۔ لندن کے مؤقر اخبار " سنڈے ٹائمز" کے انیس جون ۱۹۷۰ء کے شمارے کے مطابق اسرائیل ۱۹۶۹ء کے اواخر تک ان علاقوں میں عربوں کے سات ہزار پانچ سو چون اور اگست ۱۹۷۱ء تک سولہ ہزار دو سو بارہ مکانات مسمار کر چکا تھا۔

(تباہی و بربادی کی) یہ (المناک) داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ انتہائی احتیاط اور باریک بینی کے ساتھ جو اعداد و شمار اکٹھے کئے گئے ہیں، ان کے مطابق ۱۹۴۸ء میں تقریباً سات لاکھ اسی ہزار عرب فلسطینیوں کو اپنے گھروں اور جائدادوں

---

[1] Documents from Israel, 1967-73: Reading for a Critique of Zionism" ed. Uri Davis Morton Mezuinsky [London: Ithaca Press, 1975], p.44

سے محروم اور بے دخل کیا گیا تاکہ فلسطین کی "تشکیل نو اور تعمیر نو" کے کام کو سہل بنایا جا سکے [1] یہی وہ فلسطینی پناہ گزیں ہیں، جن کی تعداد اب بیس لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۷ (کی جنگ) کے بعد جو علاقے اسرائیل کے قبضے میں چلے گئے (اور جن کے متعلق اسرائیل کا سابق دہشت گرد وزیر اعظم یہ دعویٰ کرتا رہا کہ انہیں "آزاد" کرا لیا گیا ہے)، ہمیں فلسطینیوں کی کل تعداد میں ان مقبوضہ علاقوں کے سترہ لاکھ باشندوں کو، جن میں وہ پانچ لاکھ نفوس بھی شامل ہیں، جو ۱۹۶۷ء کی جنگ سے قبل ہی اسرائیل میں محکومی کی زندگی گزار رہے تھے، شامل کر لینا چاہیے فلسطین کی یہ کایا پلٹ، جس کے نتیجے کے طور پر اسرائیل وجود میں آیا، ایک انتہائی اور غیر معمولی طور پر مہنگا منصوبہ ــ خاص طور پر فلسطینی عربوں کے لیے ــ ثابت ہوا ہے۔

Janet Abu-Lughod: "The Demographic Transformation of Palestine" ed. Ibrahim Abu-Lughod [Evanstion, Ill. Northnestern University Press, 1971], pp.,53-61

فلسطین اور مغرب کے لبرل حلقے

فلسطین کے متعلق جتنے منصوبے، ان میں صیہونیوں کے منصوبے بھی شامل ہیں، کبھی تجویز ہوئے ہیں، ان سب میں فلسطین کے موجود حقائق کو جھٹلانے کے لیے اس (بودی) دلیل کا سہارا لیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ ایک "بلند تر" (یا بہتر، زیادہ قابل قدر، جدید تر، موزوں تر، اس قسم کے تقابلی الفاظ کا ایک ذخیرہ ہے، جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا) مفاد، مقصد یا مشن کے لیے کیا گیا ہے۔ یہ "بلند تر" مقاصد ان کے مؤیدین اور محرکین کو (ان کی اپنی دانست میں) نہ صرف ان کو یہ دعویٰ کرنے کا حق دیتے ہیں کہ فلسطین کے مقامی باشندے، وہ جیسے بھی ہیں، اس قابل نہیں کہ ان کے متعلق کچھ سوچا جائے یا ان پر کچھ توجہ دی جائے۔ چنانچہ وہ عدم موجود ٹھہرتے ہیں، بلکہ یہ محرکین و مؤیدین یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انہیں یہ دعویٰ کرنے کا بھی حق حاصل ہے کہ فلسطین کے مقامی باشندوں کی جگہ قطعی طور پر نئے باشندے لے چکے ہیں اور خود فلسطین کی جگہ ایک نئی مملکت قائم ہو چکی ہے۔ دونوں چیزوں کی مکمل طور پر ماہیت قلب ہو چکی ہے، اسلیے انکی بحالی ایک ناممکن امر بن چکی ہے۔ یہ سب دعاوی عین اس وقت پیش کئے جا رہے ہیں جب یہی مقامی باشندے ان (دعاوی) کے بالکل برعکس ثابت کر رہے ہیں۔ یہاں

پھر عرب فلسطینی کا سامنا ایک ایسے حریف سے ہوگیا ہے جس کے برتر ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حریف جب شعوری طور پر اپنے آپ کو اور ایک فلسطینی کو اپنے تصور میں لاتا ہے تو وہ پوزیشن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ایک برتر مقام پر پاتا ہے۔ اس برتری کی، جسے مختلف صورتوں میں بیان کیا جاتا اور ثابت کیا جاتا ہے، ایک واضح مثال قدرتی طور پر اعلان بالفور ہے جسے برطانوی حکومت نے نومبر ۱۹۱۷ء میں لارڈ روتھ چائلڈ (جو اس زمانے میں یہودی مفادات کی ترجمانی اور نمائندگی کرتا تھا) کے نام ایک مراسلے کی صورت میں پیش کیا تھا اور جس میں اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ "فلسطین میں یہودیوں کی قومی مملکت کے قیام کا ہمدردی سے جائزہ لیا جائے گا"۔ اس اعلان کے مطابق جو باتیں اہم ہیں، ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ کافی مدت سے فلسطین پر صیہونی دعاوی کو ایک قانونی بنیاد فراہم کر رہا ہے اور دوسری بات یہ ہے (اور ہمارے مقاصد کے لیے یہ بات برہان قاطع کا درجہ رکھتی ہے) کہ یہ وہ بیان ہے جس کی پوزیشنل قوت کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب فلسطین کے مردم شماری سے متعلق اعداد و شمار یا وہاں کے انسانی حقائق سے نظریں چرائی نہ جائیں بلکہ ان حقائق کو واضح طور پر مدنظر رکھا جائے۔ پھر یہ کہ اس اعلان کو (۱) ایک یورپی قوم نے (۲) ایک غیر یورپی علاقے کے متعلق (۳) علاقے میں آباد مقامی اکثریت کی موجودگی اور آرزوؤں کو نہایت ڈھٹائی کے ساتھ نظرانداز کرتے ہوئے مرتب کیا اور (۴) اس نے اس خطے کے متعلق ایک غیر ملکی گروہ سے وعدے وعید کی صورت اختیار کرلی تاکہ یہ غیر ملکی گروہ لغوی طور پر اس خطے کو یہودیوں کے قومی وطن میں تبدیل کرسکے۔

آج اعلان بالفور جیسے بیان پر گریہ زاری کرنا لاحاصل ہے۔ زیادہ کارآمد

بات یہ نظر آتی ہے کہ اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ تاریخ کا ایک جزو ہے، چند ایسی خصوصیات کا اسلوب اور مجموعہ ہے جن سے مسئلہ فلسطین کی ناگزیر طور پر تشکیل ہوئی ہے کیونکہ اسے آج بھی زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ اس اعلان میں بالفور نے جن نکات کی تصریح کی ہے، ان میں اس مفروضے کو کسی حیل و حجت کے بغیر صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایک سامراجی طاقت کو یہ بلند تر حق حاصل ہے کہ وہ کسی علاقے کو جس طرح اس کا جی چاہے، ٹھکانے لگا سکتی ہے۔ جیسا کہ بالفور نے خود حتمی انداز سے کہا ہے کہ یہ بات اسی وقت خاص طور پر صحیح ہے جب جب معاملہ فلسطین جیسے اہم خطے اور صیہونیت جیسے عظیم تصور کا ہو، جس کے متعلق یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ یہ ایک ایسا عظیم تصور ہے جس کا مقصد ایک ایسے خطے کی بازیابی سے قطعاً کم نہیں جس کی وعید خود خداوند نے یہودی قوم کو دے رکھی ہے اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس تصورِ عظیم کو عملی جامہ پہنانے سے یہودی مسئلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ ان امور کے بارے میں خود بالفور کے ذہن میں قطعاً کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے جو دستاویز مرتب کی تھی، اس کے مندرجہ ذیل اقتباس پر غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کابینہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس نے مشرق وسطیٰ کے متحارب فریقین کے ساتھ جو مختلف اور متضاد وعدے کیے، وہ ان سے کسی حد تک بخوبی آگاہ تھا اور بالآخر جس بات کو اہمیت دی گئی، وہ وعدوں کی خلاف ورزی نہیں تھی بلکہ وہ کس طرح اہم ترجیحات کے بارے میں اس کی (یعنی ایک برتر سیاسی، ثقافتی بلکہ نسلی ذات کا بھی ایک مراعات یافتہ رکن ہونے کی حیثیت سے اس کی اپنی) سمجھ بوجھ تھی۔

مراسلہ میثاق[1] میں جو تضاد پایا جاتا ہے، وہ شام کی خود مختار قوم کی نسبت

---

[1] اس میثاق کے ذریعے برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں نے اپنے اس وعدے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰)

فلسطین کی خود مختار قوم کے ضمن میں اور بھی واشگاف انداز سے نظر آتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک فلسطین کا تعلق ہے تو ہم نے اس کے بارے میں اتنی بھی تجویز نہیں سوچی کہ اس ملک کے موجودہ باشندوں کی خواہشات ہی دریافت کر لی جائیں، اگرچہ امریکی کمشن بظاہر یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ ہم انہیں یہ بتائیں کہ آخر یہ (خواہشات) ہیں کیا۔ قطع نظر اس بات کے کہ صیہونیت غلط ہے یا صحیح، اچھی ہے یا بری، چاروں بڑی طاقتیں اس کی اور صرف اس کی حمایت کا عہد و پیمان کر چکی ہیں۔ صیہونیت کی جڑیں نہ صرف صدیوں پرانی روایات میں مضبوطی سے راسخ ہیں۔ بلکہ موجودہ ضروریات اور مستقبل کی امیدیں بھی انہیں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ان سات لاکھ عربوں کی، جو اس وقت اس مقدس سرزمین میں آباد ہیں، خواہشات اور تعصبات کی نسبت صیہونیت کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ میرے خیال کے مطابق یہی طرزِ عمل درست ہے۔[1]"

(زور کی خاطر الفاظ مصنف نے خط کشیدہ کیے ہیں)

تاہم یہ محض ایک (ذاتی) رائے کا اظہار نہیں بلکہ ایک (سوچا سمجھا) پالیسی بیان تھا۔ اس (بیان) نے اگر ساری دنیا کے لیے نہیں، تو کم از کم ان سات لاکھ عربوں اور ان کے اخلاف کے لیے، جن کی سرزمین کے متعلق فیصلے صادر کیے جا رہے تھے، یقیناً تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس قسم کے

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۵۹ کا اعلان کیا تھا کہ اگر عثمانی نو آبادیوں کے عرب اتحادی طاقتوں کی حمایت جاری رکھیں گے تو (پہلی) جنگِ عظیم کے اختتام پر انہیں آزادی دے دی جائے گی۔

[1] بالفور کے بیان کا یہ اقتباس کرسٹوفر سائیکس (Sykes) نے اپنی کتاب Crossroads to Israel, 1917-43 ناشر انڈیانا یونیورسٹی پریس، بلومنگٹن، انڈیانا، ۱۹۶۵ء) کے صفحہ نمبر ۵ پر نقل کیا گیا ہے۔

بیانات میں جو قوت مضمر ہے، اس کے ماخذ کے متعلق تو میں بعد میں بحث کروں گا۔ فی الحال میں اس نکتے کی، جو میں نے اوپر بیان کیا تھا کہ آویزش اور مقابلہ ایک مبینہ طور پر "بلندتر" اور ایک ادنیٰ حقیقت کے مابین ہے، وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

تقریباً عین اسی زمانے میں، جب بالفور اپنی دستاویز قلم بند کر رہا تھا، (فلسطین کے اندر) ایسے حقائق موجود تھے کہ جنہیں کیفیت (QUALITY) کے اعتبار سے تو مختلف تفاسیر و تشریحات کا تو ضرور لبادہ پہنایا جا سکتا تھا، لیکن جہاں تک کمیت کا تعلق ہے، تو اس پر کسی قسم کی بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ مردم شماری کے مطابق، جو اس زمانے کی آبادی کے حقائق[1] کے متعلق واحد قابلِ اعتماد ماخذ ہے، (ڈنڈی مارنے اور آبادی کے کئی طبقوں کی تعداد شماری نہ کرنے کے باوجود اسرائیلی مؤرخین نے بھی اس مردم شماری کے اعداد و شمار کو مسلسل استعمال کیا ہے) ۔ ۱۹۱۴ء میں فلسطین کی کل آبادی چھ لاکھ نواسی ہزار اور دو سو بہتر نفوس پر مشتمل تھی۔ اس میں یہودیوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی (شاید اس سے بھی کم ہو)"۔ ۱۹۲۲ء میں جو مردم شماری ہوئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "فلسطین میں اس سال مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ نوّے ہزار اور آٹھ سو نوّے تھی (یعنی کل آبادی کا اٹھتر فیصد)۔ عیسائیوں کی تعداد (ان میں بیشتر عرب تھے اگرچہ کچھ انگریز اور دوسرے یورپی باشندے بھی اسی زمرے

---

[1] ان حقائق سے میری مراد ان نفوس سے ہے جن کی گنتی کی جا سکتی تھی (اور امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۲ء کے دوران میں برطانوی حکومت نے مردم شماری کے ذریعے ان کی تعداد گنی تھی)۔ (مصنف)

میں شامل کر دیے گئے تھے) تہتر ہزار اور چوبیس تھی (یعنی کل آبادی کا ۶ء۹ فیصد) دس ہزار (ایک فیصد) سے بھی کم دوسرے مذاہب کے پیروکار تھے۔ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے، ان کی کل تعداد تراسی ہزار اور سات سو چورانوے (یعنی گیارہ فیصد) تھی۔ یہودیوں کی اس کل تعداد میں دو تہائی یورپی تارکین وطن اور ان کے اخلاف شامل تھے۔ ان تارکینِ وطن میں کچھ تو وہ لوگ تھے جو انیسویں صدی کے اواخر میں فلسطین میں وارد ہوئے تھے اور باقی برطانیہ کی عملداری کے بعد۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر غیر یہودی آبادی کا تناسب ستر فیصد تھا اور باقی تیس فیصد آبادی یہودیوں پر مشتمل تھی۔ اور ان یہودیوں میں سے بھی ستر فیصد کا ارتکاز شہروں اور دیہاتوں میں تھا نہ کہ "زمین پر" جس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ یہ تو محض اجاڑ بیابان تھا اور یہ یہودی تھے جنہوں نے اس ریگزار کو گل و گلزار میں تبدیل کر دیا[1]۔ مزید برآں اگر آبادی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ برطانوی حکومت جس پالیسی پر عمل پیرا تھی، اس کا اصل مقصد صیہونیوں کو منفعت پہنچانا تھا۔ آبادی میں فطری اضافہ عام طور پر ڈیڑھ فیصد سالانہ ہوتا ہے۔ لیکن برطانوی حکومت نے ملک میں زبردستی یہودی اکثریت بنانے کی جس پالیسی کو اپنا رکھا تھا، اس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۲۲ء اور ۱۹۴۶ء کے مابین یہودی آبادی میں نو فیصد سالانہ اضافہ ہو رہا تھا۔ صرف ۱۹۲۷ء کے ایک سال کے دوران میں یہ اضافہ ۷ء۴ فیصد اور ۱۹۳۴ء میں ۲۵ء۹ فیصد تک پہنچ گیا[2]۔

---

[1] Janet Abu Lughod "The Demographic Transformation of Palestine / A Survey of Palestine: Prepared in December 1945 and January 1946 for the Information of

بقیہ صفحہ نمبر ۶۳

مقامی اور غیر مقامی باشندوں کے مابین اس عدم تناسب کو پروان چڑھانے کے لیے جو استبدادی اور جابرانہ سیاسی ہتھکنڈے اختیار کیے گئے، انہیں صرف ایسی صورت میں قابلِ قبول بنایا جا سکتا تھا کہ ان کے حق میں وہی عقلی دلائل استعمال کیے جائیں جو بالفور نے استعمال کیے تھے۔ محض (کثیر) تعداد اور موجودگی کی بجائے برتر تصور کو فلسطین پر حکومت کرنا چاہیے اور یہی وہ تصور ——— یعنی صیہونیت ——— تھا جسے عین ۱۹۴۸ء تک اور اس کے مابعد قانونی طور پر جائز ٹھہرایا جاتا رہا۔ جہاں تک صیہونیوں کا تعلق ہے، وہ واضح طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اس نقطۂ نظر سے منفعت صرف انہی کو حاصل ہوگی۔ عربوں کی کثیر آبادی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ سرزمین تو پہلے ہی آباد ہے تو دور کی بات ہے، وہ یہودی آباد کار، جو ابتدا میں یہاں وارد ہوئے، وہ انہیں (عربوں کو) یوں نظر انداز کرتے تھے (جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو)۔ اس رویے کے حق میں مختلف دلائل دیئے جاتے تھے جو ان مفروضات پر مبنی تھے جن پر بالفور نے اپنے مؤقف کی عمارت تعمیر کی تھی۔ ایک اسرائیلی نے اسرائیلیوں کے متعلق حال ہی میں ایک کتاب تحریر کی ہے اس کتاب میں اس نے بیسویں صدی کے ابتدائی اور درمیانی برسوں کے دوران میں آنے والے یہودی آباد کاروں کی بے بصیرتی کا رونا تو رویا ہے لیکن وہ اس بے بصیرتی کے ڈانڈے بالفور اور استعماریت کی اخلاقی علمیات سے نہیں ملا سکا۔[ے] یہ بے بصیرتی جس طرح

Anglo-American Committee of Inquiry (Jerusalem 1946), p.146

[ے] Amos Elon: The Israelis: Founders and Sons [1971, reprinted New York: Bantam Books, 1972], pp. 194ff.

بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے بیر بوروچوف (Ber Borochov) جیسے فکریات کے بانیوں (ideologues) اور بائیں بازو ہی کی "ہے پوئل ہیت زائر" جیسی تحریکوں کے معاملے میں صحیح ہے اسی طرح دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ولادی میر جبوتنسکی [Jabotinsky] جیسے رومان پسندوں اور اس کے ترمیم پسندوں (Revisionists) (اسرائیل کے سابق وزیراعظم مناچم بیگن کے سیاسی اسلاف) کے متعلق بھی اتنی ہی درست ہے۔ جیسا کہ ایموس ایلون نے ثابت کیا ہے کہ صیہونی نہاں خانۂ دل سے یہ سمجھتے تھے کہ عرب مسئلہ ایک ایسی چیز ہے جس سے انہیں یا تو بالکل ہی صرفِ نظر کرنا ہے اور یا پھر اس سے کاملاً انکار (اور یوں انہیں اس پر تنقید کرنے میں آسانی رہے گی۔) اگرچہ جبراً و قہراً فلسطین کے متعلق صیہونی یہودیوں کے احساسات، تاریخ اور تاریخی تجربہ اور خیالات و تصورات مختلف تھے۔ پھر بھی بالغور جس نظریے پر کاربند تھا، اس کے اور صیہونی نظریے کے مابین کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔ اپنے تمام تر اختلافات (اور یہ اختلافات اچھے خاصے تھے) کے باوجود برطانوی استعمار پسندوں اور صیہونیوں کے ذہنوں میں مستقبل کے متعلق جو نقشے آتے تھے ان میں کلی مطابقت پائی جاتی تھی۔ دونوں کی یہ کوشش تھی کہ فلسطین میں عربوں (کی موجودگی) کو زیادہ سے زیادہ گھٹا کر پیش کیا جائے بلکہ اس کی بالکل ہی تنسیخ کر دی جائے کہ ان کی تو بس ثانوی حیثیت ہے اور یوں انہیں آسانی کے ساتھ نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے اذہان میں مستقبل کے متعلق جو نقشے تھے، دونوں کی نظروں میں ان کی اخلاقی معنی خیزی ایک ایسی سرزمین پر، جو بے پناہ اہمیت کی حامل تھی، مقامی باشندوں کی محض موجودگی سے کہیں بلند و برتر تھی۔ (جیسا کہ ہم باب دوم میں دیکھیں گے) بنیادی طور پر مستقبل کے متعلق ان دونوں آرزوؤں کا تعلق اہلِ یورپ کے اس اندازِ فکر

سے ہے جس کے مطابق وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں دنیا کو مہذب بنانے کا فریضہ سونپا گیا ہے ۔ اس انداز فکر کی تعمیر اس قسم کے تصورات پر کی گئی تھی کہ انسانوں، نسلوں اور تہذیبوں کے مابین عدم مساوات پائی جاتی ہے ۔ اس عدم مساوات کے نتیجے کے طور پر وہ خود اپنے آپ کو تو عظمت و توقیر کے ایک ایسے بلند مقام پر سرفراز کر سکتے تھے جس کا حقیقت سے شاید دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن جہاں تک بدقسمت مقامی باشندوں کا تعلق تھا، ایک طرف تو وہ ان کے وجود ہی سے انکاری تھے، دوسری طرف ان کے رویے میں تضاد کا یہ پہلو کتنا واضح ہے کہ جن باشندوں کے وجود کا اقرار کرنے سے وہ شرماتے تھے، انہیں تعزیر و تادیب کے انتہائی سخت شکنجوں میں کسنے میں انہیں مطلق کوئی عار نہیں ہوتا تھا ۔

پیش آمدہ مسائل سے نپٹنے کے لیے صیہونی جو منصوبے بناتے تھے اور ان کے یہ منصوبے جس طرح فلسطین کے مقامی باشندوں پر اثر انداز ہوتے تھے ۔ پھر ان مقامی باشندوں کے خلاف وہ جو تقریری کارروائیاں کرتے تھے، ان دونوں باتوں کا ذکر تو میں اپنی کتاب میں بعد میں کروں گا ۔ فی الحال میں جس امر کا خصوصی ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنی جدید تاریخ کی بیشتر مدت کے دوران میں فلسطین اور اس کے مقامی باشندوں کو جس چیز سے واسطہ پڑا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے وجود سے نہایت شدومد کے ساتھ انکار کیا گیا ہے ۔ چنانچہ ایک ایسی سرزمین پر، جس پر قبضہ کرنے کی انہیں شدید خواہش تھی، مقامی باشندوں کی کثیر تعداد کو قلیل بنا کر پیش کرنے کے لیے صیہونی اپنے آپ کو یہ یقین دلانے لگے کہ ان (مقامی باشندوں) کا تو کوئی وجود ہی نہیں اور اگر ان کا کوئی وجود ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر ہے ۔ پہلے ان کے وجود سے انکار کیا گیا، پھر ان کے راستے میں روڑے اٹکائے گئے ان کو سکیڑنے، ان کا منہ بند کرنے اور ان کے اردگرد گھیرا تنگ کرنے کی کوششیں کی

گئیں۔ یہ ایک انتہائی پیچیدہ پالیسی ہے کیونکہ اس پالیسی میں نہ صرف صہیونیوں کی وہ پالیسی بھی شامل ہے جو انہوں نے عربوں کے متعلق اختیار کر رکھی تھی بلکہ اس میں اسرائیل کی وہ پالیسی شامل ہے جو اسرائیل نے اپنے عرب نوآبادیوں کے متعلق اپنا رکھی ہے۔ پھر ۱۹۶۷ء سے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں اسرائیلی قابض فوجیں جس کردار کا مظاہرہ کر رہی ہیں، وہ بھی اسی پالیسی کا جزو ہے۔ یہ مسائل بھی ایسے ہیں کہ میں ان کا ذکر بعد میں اپنی کتاب میں کروں گا۔ تاہم یہاں یہ استفسار کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ آخر فلسطینی تجربے کے یہ پہلو اہل مغرب کی نگاہوں سے کیوں اوجھل ہیں اور وہ اس کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ صہیونی اور فلسطینی عمل اور ردِ عمل کے طور پر کس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، یہاں ہمارا واسطہ اسی کشمکش کے بعض پہلوؤں سے پڑتا ہے۔

جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ فلسطین ایک ایسی دھرتی ہے جہاں دو فریق ایک دوسرے کے خلاف بر سر پیکار ہیں۔ ان میں ایک فریق، تو مقامی باشندوں پر مشتمل ہے جو اس دھرتی پر موجود ہیں (یا تھے)۔ دوسرا فریق ان لوگوں پر مشتمل ہے جو باہر سے یہاں وارد ہوئے۔ یہ نو وارد بنیادی طور پر ترقی یافتہ ثقافت کی یورپی اور مغربی صورت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اس آویزش کا خاصا بڑا حصہ خود فلسطین کے باہر عمل میں آیا۔ ۱۹۱۸ء سے قبل فلسطین خلافتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ ۱۹۱۸ء کے بعد یہ سرکاری طور پر ان علاقوں میں شامل ہو گیا جو برطانیہ کے زیر اثر تھے۔ جہاں تک فلسطین کے اندر یہودی اقلیت کا تعلق ہے، صہیونیت کا اس کے ساتھ تعلق برائے نام تھا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دنیا جہاں کے یہودی اعلان بالفور میں دلچسپی لے رہے تھے خود فلسطین میں جو یہودی برادری موجود تھی، اس اعلان کی انہیں ہوا بھی نہ لگنے

دی گئی اور نہ اس کے متعلق وہاں کوئی پبلسٹی کی گئی[1] ۔ یہ رویہ اگر لفظی طور پر نہیں تو کم از کم معنوی طور پر ضرور بالفور کے اس نقطۂ نظر کے عین مطابق تھا کہ "مقامی باشندوں" سے کسی قسم کا صلاح مشورہ کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں (اتفاق سے اگر ان "مقامی باشندوں" میں کچھ یہودی بھی شامل تھے، تو بھی اس نقطۂ نظر پر کوئی حرف نہیں آتا) بعدازاں سپریم جنگی کونسل کے سامنے، جو پیرس امن کانفرنس منعقد کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، سلوین لیوی[2] نے صہیونی وفد کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس نے اپنی شہادت قلم بند کراتے ہوئے یہ دلیل پیش کی: "اگرچہ اخلاقی نقطۂ نظر سے صہیونیوں کا کاز بردست اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن فلسطین جس پر چھ لاکھ عرب باشندے آباد ہیں، ایک چھوٹا اور غریب ملک ہے۔ (چنانچہ) (نو وارد) یہودی، جن کا معیار حیات عربوں کے معیار زندگی سے کہیں بلند ہے، آہستہ آہستہ انہیں (عربوں کو) اپنے گھروں اور جائدادوں سے محروم کرنے پر مائل ہو جائیں گے۔"[3] ویزمان کے مطابق اس بیان

---

[1] دیکھیں ڈورین انگریمز (Doreen Ingrams) کی کتاب ۱۹۲۲-۱۹۱۷

"Palestine Papers 1917-22: Seeds of Conflict" ناشر: London: John Mawey 1972:

صفحات نمبر ۲۸، ۳۰

[2] Sylvain Levi ایک معروف فرانسیسی مستشرق۔ اس کتاب میں جو نکات اٹھائے گئے ہیں، ان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اس کا یہ بیان بہت اہم ہے۔ (مصنف)

[3] انگریمز: صفحہ نمبر ۵۸

نے صہیونیوں کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی اور انہیں اچھی خاصی کوفت ہوئی کیونکہ جیسا کہ اس نے بعد میں کہا تھا: "دنیا یہودی ریاست (اور غالباً صہیونی تحریک) کے متعلق اس وقت اپنا کوئی فیصلہ سنائے گی جب وہ یہ دیکھے گی کہ عربوں کے ساتھ یہ کس قسم کا برتاؤ کرتی ہے"۔ [۱] کیونکہ یہ حقیقتاً دنیا ہی تو تھی جس نے صہیونیت کی کامیابی کو ممکن بنایا اور صہیونیوں کے حامیوں اور سامعین کی حیثیت سے اہل دنیا کے متعلق صہیونیوں کی یہ سوجھ بوجھ ہی تھی جس نے فلسطین پر قبضہ کرنے کی جدوجہد میں اہم عملی کردار ادا کیا۔

اگرچہ یہ بات بھی درست ہے کہ انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں جان ہوبسن (HOBSON) جیسے سامراج مخالف مفکر بھی موجود تھے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ روئے زمین پر "غلام اقوام" موجود ہیں اور یہ کہ ترجیحات کی فہرست میں ان اقوام کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں، پھر بھی جس سفاکانہ انداز سے بالفور نے مقامی باشندوں کو بے وقعت اور حقیر جانا تھا اور یوں انہیں بالکل نظر انداز کر دیا تھا، باقی دنیا انہیں اس طور نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ تاہم صہیونی اور خود انگریز بھی یہ خوب سمجھتے تھے کہ مقامی باشندے (ایک نہ ایک روز کسی نہ کسی طرح ضرور نمودار ہوں گے اور جب وہ نمودار ہوں گے تو دنیا کو اپنی مزاحمت سے آگاہ کر دیں گے [۲]۔ جارج انتونیس [۳]

---

[۱] Chaim Weizmann.

"Trial and Error: The Auto biography of chaim Weizmann" [New York: Harper and Row, 1959), p.462.

[۲] یہ جو میں نے لفظ "نمودار" استعمال کیا ہے، اس سے میری مراد یہ ہے کہ مبصرین کو مقامی

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۶۹ پر

کی کتاب "عربوں کی بیداری" کے مطابق انگریز اور صیہونی اس امر سے نابلد نہیں تھے کہ عربوں کی نشاۃ ثانیہ انہیں (عربوں کو) اس ناممکن تضاد سے آگاہ کر دے گی جو ان دونوں منصوبوں کے مابین پایا جاتا ہے جو ایک طرف تو انہوں نے خود اپنے اور اپنے علاقوں (بشمول فلسطین) کے لیے تیار کیے ہیں اور دوسری طرف وہ جو صیہونیوں، بالفور اور فرانسیسیوں نے مرتب کیے ہیں۔ مزید برآں، دنیا کے یہودیوں کی بیشتر تعداد اُس وقت بھی اور اِس وقت بھی فلسطین میں نہیں بلکہ اس دنیا میں تھی اور ہے جسے یورپی/امریکی دنیا کہا جاتا ہے۔ اب کرنے کا کام یہ رہ گیا کہ (کسی نہ کسی طرح) فلسطین کو ایک یہودی مملکت میں تبدیل کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ اہتمام کر دیا جائے کہ دنیا مقامی باشندوں کے احتجاج کو سنجیدگی سے نہ لے سکے (اور بعد ازاں تو ایسے طریقے وضع کیے گئے کہ جن کے استعمال سے یہ فائدہ ہوا کہ کسی کو اس احتجاج کی کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی) جیسا کہ میں اوپر تحریر کر چکا ہوں کہ ایک منظم طریقے سے فلسطینیوں کے وجود ہی سے انکار کیا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک طرف تو فلسطینیوں کے گھروں اور جائدادوں کو نیست و نابود کیا جاتا تھا، ان کے راستے میں طرح طرح کی

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۶۸:۔ باشندے محض جسمانی طور پر ہی نظر نہیں آئیں گے بلکہ وہ اس سے کچھ آگے بھی دیکھ سکیں گے (یعنی بیرونی دنیا یہ سمجھ سکے گی کہ آخر یہ فلسطینی چاہتے کیا ہیں اور ان کی آرزوئیں اور امنگیں کیا ہیں)۔ (مصنف)

۳؎ عربوں کی جدوجہد آزادی کے بارے میں جتنی تصنیفات بھی منظر عام پر آئی ہیں، ان میں جارج انتونیئس (Antonius) کی کتاب "The Arab Awakening" بہترین ہے (مصنف)

رکاوٹیں کھڑی کی جاتی تھیں، ان کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگادی جاتی تھیں اور جہاں بس چلتا تھا انہیں زندانوں میں نظر بند کر دیا جاتا تھا۔ دوسری طرف کوشش یہ کی جاتی تھی کہ عالمی مجالس میں مسئلہ فلسطین کا کسی طور ذکر نہ ہونے پائے تاکہ فلسطینیوں کی کہیں شنوائی نہ ہو سکے۔ اس پر طرہ یہ کہ صہیونی اپنی آرام اور اپنی حقیقت کی وسیع پیمانے پر تشہیر کرنے اور فلسطینی عربوں کی آرام اور ان کی حقیقت پر پردہ ڈالنے میں کامیاب رہے۔ ایک منفی منصوبہ، جو ایک حقیقت سے انکار کرنے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں حائل کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا، ایک دوسرے منصوبے کی (جو اس کا ہم پلہ تھا اور جو ان معنوں میں اس کا الٹ بھی تھا کہ اس کا مقصد مثبت تھا جس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کرنا تھا) تخلیق کا موجب بنا۔

یہاں میں محض پراپیگنڈے کا ذکر نہیں کر رہا جو اگر زیادہ تر فلسطین کے متعلق دروغ گوئی ہی پر مبنی ہوتا تو اسرائیل کا روپ دھارنے میں صہیونیت کا کبھی مددگار نہ ہوتا۔ میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس پراپیگنڈے کے لیے جو لائحہ عمل اختیار کیا گیا، اس میں بے پناہ قوت تھی۔ اس پراپیگنڈے کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ فلسطین کو ایک صہیونی نوآبادی کے قالب میں ڈھالا جائے۔ وہاں اپنی کامرانیوں، کارناموں اور فقید المثال اداروں کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ یہ بالکل وہی اسلوب تھا جو آج بھی اسرائیل نے اپنا رکھا ہے کہ اسرائیل اپنے متعلق جو معلومات فراہم کرتا ہے، ان میں اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اپنی خودداری کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں، اپنی مصلحتوں کو بھی عزت نفس کا حصہ بنا کر پیش کیا جائے اور بڑھ چڑھ کر اس بات کی تشہیر کیجئے کہ "ہم ہی وہ لوگ ہیں جو "نئے راستے تراشتے ہیں۔ اور "نئے کاموں کا بیڑا اٹھاتے ہیں"۔ اس پراپیگنڈے کی قوت کا یہ عالم ہے کہ امریکی بالخصوص اس کی رَو میں

نہایت آسانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کا ہم خیال بنانے میں انہیں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس پراپیگنڈے میں جو قوت پنہاں ہے اور جس طرح وہ لوگوں کے دل و دماغ اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، اس کا اصل پہلو یہ ہے کہ اس نے فلسطین کی عرب حقیقت کو منظم طریقے سے دبا دیا ہے۔ ایک مثال پیش خدمت ہے۔ یہودیوں نے اجتماعی کاشتکاری کے زرعی فارم[۵۱] قائم کر رکھے ہیں۔ ان فارموں کے متعلق جتنی تحریریں قلمبند کی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر میں ان حقائق کا قطعاً ذکر نہیں کیا گیا کہ قیام اسرائیل سے قبل (بلکہ اس کے بعد بھی) عربوں کو کبھی بھی ان کی رکنیت کا اہل نہیں سمجھا گیا، یہ کہ ان فارموں کا وجود ان کرائے کے (عرب یا مشرقی یہودی) مزدوروں کا مرہونِ منت ہے جو سستے داموں مل جاتے ہیں اور یہ کہ یہ اجتماعی فارم ان زمینوں پر قائم کئے گئے یا قائم کئے جا رہے ہیں جو عربوں سے زبردستی چھینی گئی ہیں[۵۲]۔ صہیونیوں نے فلسطین کے مقامی عرب باشندوں کے متعلق جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس پر جو اعتراضات کئے جا سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ ان کا پیشگی جواب تیار کر سکتے، صہیونی ترجمان ان کا ذکر ہی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ یہودی تو بہت بے ضرر اور معصوم ہیں وہ تو اپنے یہ اجتماعی فارم

---

۵۱ اجتماعی کاشتکاری کے ان فارموں کو صہیونی کبتنز (Kibbutz) کہتے ہیں۔ اصل میں یہ عبرانی لفظ "قبتنظ" کی شکل ہے جس کے معنی اکٹھا کرنا ہے۔ پہلا کبتنز ۱۹۱۰ء میں جھیل طبریہ کے کنارے تعمیر کیا گیا تھا۔ چونکہ یہاں کی زمین دلدلی تھی اسلئے بہت سستے داموں مل گئی تھی۔ کبتنز پر محض کاشتکاری ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ کسانوں کو زبردست فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسرائیل کے بہترین فوجی دستے ان اجتماعی فارموں نے ہی مہیا کئے تھے۔ ان اجتماعی فارم کی قلمی ایک کتاب "The Candid Kibbutz Book" میں کھولی گئی ہے۔ اسے لندن کی ایک فرم MERAG نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا۔ (مصنف)

غیر آباد زمینوں پر قائم کر رہے ہیں۔ ہم جو یہودی آباد کاران پر بلا ترغیب و تحریص کام کر رہے ہیں اور یوں زبردست معاشرتی یونٹ قائم کر رہے ہیں۔

چنانچہ فلسطین میں یہ سلسلہ چلتا رہا اور اس ضمن میں آوودا اوریت[1] جیسی جماعتوں کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ الیموس الیون کے مطابق اس قسم کی جماعتوں کا

"مقصد نو واردان (فلسطین میں وارد ہونے والے یہودی صیہونی منصوبے کا جزو تھے) کے لیے مکمل طور پر علیحدہ معاشی شعبہ قائم کرنا تھا (اور بہانہ یہ بنایا گیا کہ) ملک کی تعمیر نو کی خاطر یہودیوں کو مقامی مزدوروں کا قطعاً "استحصال" نہیں کرنا چاہیے۔ یہودیوں کو سب کچھ خود ہی کرنا چاہیے۔ جہاں تک مقامی باشندوں کا تعلق ہے، جوں جوں ملک کے عام حالات بہتر ہوتے جائیں گے اور معاشی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائے گی، وہ بالواسطہ طور پر اس سے، بالخصوص تجارت سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ لیکن ابھی سے (ہر میدان میں) خود کفالت حاصل کرنے کی کوششوں میں تمام یہودیوں کو لازماً شریک ہونا چاہیے۔ ان پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے تمام جسمانی کام خود اپنے ہاتھوں سے کریں، یہ کام خواہ کتنے ہی دشوار ہوں، ان کا معاوضہ کتنا ہی حقیر ہو اور یہ کتنے ہی ارذل اور نیچ ہوں۔ اگر عرب محنت کا "استحصال" نہیں ہوگا تو عرب مزدور "معروضی طور پر" صیہونیوں کے مخالف نہیں بن سکیں گے ...... آوودا اوریت کی اساس جزدی طور پر غیر علمی اصول پرستانہ التباس پر استوار کی گئی تھی۔ عقلی اعتبار سے اس میں متناقض عناصر

---

[1] Avoda Irvit (یہودی مزدور تنظیم)

کی بجرا تھی۔ عملی طور پر اس نے ایک ایسی ذیلی ثقافت (سب کلچر) کو تخلیق کیا جو ایک وسیع تر معاشرے کے تقاضوں سے بے قید تھی اور اس کی خوشہ چینی بھی نہ تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے "حقیقت" ___ یہ حقیقت ترکی تھی، برطانوی تھی یا عرب ___ سے کچھ اس قسم کی مامونیت حاصل تھی جس نے اس کے ارکان کو اپنے خوابوں سے جی بہلانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا"۔ ؎

(اس رویے سے) مقامی باشندوں کو جو سب سے بڑا اور براہِ راست مائدہ حاصل ہوا، وہ یہ تھا کہ وہ اپنے وطن سے ہی محروم ہو گئے ___ تاہم ایلون نے جو نکتہ اٹھایا ہے، وہ عمومی طور پر درست اور معقول ہے۔ مقامی باشندوں سے زمینیں ہتھیانے کے لیے صہیونیوں نے آدودا اوریت جیسی تنظیمیں اور اس قسم کے جو دوسرے ذرائع استعمال کیے، ان کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ "معروضی طور پر" کسی قسم کے استحصال میں مصروف ہیں۔ اس سیاق و سباق میں لفظ "معروضی" نہایت واضح لیکن انتہائی سفاکانہ معانی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے (اور یہ تھا) کہ صہیونی اپنی تیاریاں مکمل کریں گے۔ وہ اپنی ابتدائی رزم آرائیوں کے فوائد معروضی طور پر اپنے دائرے کے اندر حاصل کریں گے اور ان کی ان رزم آرائیوں کا ہدف کوئی دوسرا نہیں ہو گا۔ یہاں بھی اور آئندہ بھی "کوئی دوسرا" سے مراد غیر یہودی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ ایلون کو بھی فلسطین میں برطانوی اور عرب "حقیقت" کے مابین کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اسے یہ بات سجھائی ہی نہیں دی کہ یورپ کی کسی سامراجی طاقت کے مقابلے میں مقامی باشندوں کو، جو کئی صدیوں سے مسلسل فلسطین میں رہتے

؎ امیوس ایلون: اسرائیلی: بانی اور بیٹے • صفحات ۲۲۰، ۲۲۲

چلے آرہے تھے، نسبتاً کہیں زیادہ اخلاقی اختیار حاصل تھا اور حاصل ہے اور یہی بات صہیونیوں کو بھی کبھی سجھائی نہیں دی جنہوں نے عرب فلسطینیوں کا معروضی طور پر قلع قمع کرنے کے لیے ۱۹۴۸ء سے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں۔ (وہاں) جو کچھ پیش آیا، اس کے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر ویزمان کے اس جملے سے ملتا ہے: "یہ تو ایک معجزہ تھا کہ خس کم ہوگیا اور جہاں پاک ہوگیا۔ یہ تو ایک معجزہ تھا کہ اسرائیل کا کام اتنا آسان ہوگیا"۔ [۱]

چنانچہ صہیونیت کی طرف سے جتنی بھی اپیلیں ہوئیں، وہ مجبوراً اور ضرورتاً بین الاقوامی اپیلیں تھیں۔ صہیونی جدوجہد کا مقام صرف جزوی طور پر فلسطین کے اندر تھا۔ ۱۹۴۸ء تک اور اس کے بعد بھی ——— اس ضمن میں خود ویزمان نے جو کچھ کیا، وہ اس جدوجہد کی بہترین مثال ہے ——— اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا کہ اس جدوجہد کو مغربی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں جاری رکھا جائے۔ وہیں سے اس مقصد کے لیے سرمایہ، رضاکار، پراپیگنڈے کے ذرائع اور دوسرے وسائل فراہم کیے جاتے تھے اور کیے جاتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ کیفیت تھی کہ صہیونیت کے خلاف مقامی باشندے جو مزاحمت کر رہے تھے، مغرب میں اسے یا تو سرے سے ہی نظرانداز کر دیا جاتا یا پھر اسے بہت گھٹا کر پیش کیا جاتا۔ دوسری طرف صہیونی مسلسل یہ دعویٰ کرتے رہتے کہ انگریز

---

[۱] ویزمان کے اس قول کا حوالہ جیمز میکڈانلڈ نے اپنی کتاب "My Mission to Israel" کے صفحہ نمبر ۱۷۶ پر دیا ہے۔ اس کتاب کو Simon Schuster نے ۱۹۵۱ء میں نیویارک سے شائع کیا تھا۔

ان کے فلسطین میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخل ہونے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں۔ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۴۷ء کے مابین دنیا فلسطین کے جس اہم مسئلے کا مشاہدہ کر رہی تھی وہ یہ نہیں تھا (جیسا کہ فلسطینی یہ تصور کرنے کی کوشش کریں گے) کہ یہ مقامی باشندوں اور نئے آبادکاروں کے مابین کسی آویزش کا مسئلہ تھا بلکہ دنیا کے سامنے یہ مسئلہ جس انداز سے پیش کیا جاتا تھا، اس سے یہ مسئلہ انگریزوں اور صیہونیوں کے مابین آویزش کا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اس عظیم الشان علمیاتی[1] کارنامے ——— میں یہ فلسفیانہ اصطلاح اس لیے استعمال کر رہا ہوں کیونکہ اور کوئی دوسری اصطلاح ایسی نہیں جس کے ذریعے مناسب طور پر یہ بتایا جا سکا کہ کس طرح تقریباً دس لاکھ مقامی باشندوں کو دنیا والوں کے اذہان سے کھرچ دیا گیا کہ وہ یہ بھول ہی گئے کہ یہ لوگ بھی کہیں موجود تھے ——— کی ستم ظریفی میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب ہمیں یہ یاد آتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیل نے یہ اعلان کیا کہ اس نے ایک مملکت کا روپ دھار لیا ہے تو قانونی طور پر یہ فلسطین کے چھ فیصد سے کچھ ہی زیادہ حصے کا مالک تھا اور اسکی یہودی آبادی فلسطین کی پوری آبادی کا ایک معمولی حصہ تھی۔ اس رویے اور آوودااردیت کے "اصولوں" کو بڑی استقامت اور تسلسل کے ساتھ اپنایا گیا اور ان سے سرمو انحراف نہیں کیا گیا یعنی دنیا کے سامنے یہی ڈھنڈورا پیٹتے رہو کہ ہم تو مظلوم ہیں۔ برطانیہ ہمارے خون کا پیاسا ہے کیونکہ وہ ایک سامراجی قوت

---

[1] علمیات (epistemology) فلسفے کی ایک شاخ ہے۔ اس کا مقصد علم کی نوعیت اور اس کے ماخذوں کی جانچ پڑتال کرنا ہے۔ چنانچہ یہ علم اس قسم کے امور سے بحث کرتا ہے کہ علم کیا ہے؟ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ کیا صداقت کا یقینی علم ممکن ہے؟ اسکی امکانی حدود کیا ہیں؟ علم صحیح عقل کی بنیاد پر ہے یا حواس پر؟ حسی تجربہ کس حد تک قابل اعتماد ہے؟ (بقیہ صفحہ ۷۶ پر)

ہے۔ اس کے ساتھ مقامی باشندوں کو نظر انداز کرتے رہو اور اس وقت تک کسی کو ان کے متعلق کچھ کہنے کا موقع نہ دو جب تک معروضی طور پر یہ نظر نہ آئے کہ آپ ان کا براہِ راست استحصال کر رہے ہیں (اور یہ تو آپ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ غیر یہودیوں کو اپنے کسی کام کے قریب مت پھٹکنے دو، کہیں آپ پر استحصال کا الزام نہ لگ جائے)۔

صاف ظاہر ہے کہ مغربی ممالک میں صیہونی پراپیگنڈے کا آغاز وہاں کے یہودی طبقوں نے کیا اور وہی اس میں پیش پیش تھے البتہ بعدازاں خود اہلِ مغرب بھی اس دوڑ میں شریک ہو گئے اور انہوں نے صیہونیوں کے ترکش کو اپنے تیروں سے بھر دیا۔ تسخیرِ فلسطین کے سلسلے میں صیہونیوں نے جس مہم کا آغاز کیا، اس کا بنیادی نکتہ یہ تھا اور اب بھی یہی ہے کہ یہ اپیل تو ایک مخصوص نوعیت کی چیز کے لیے ہے لیکن اس کے جواز کے لیے اسے ایک ایسا عمومی رنگ دے دیا گیا ہے کہ اس کی ہر قسم کی مخالفت ناممکن حد تک عمومی نظر آئے (یعنی اس مخالفت کا ہدف کوئی مخصوص چیز نہ بن سکے) اور یوں عمومی طور پر یہ (مخالفت) ناقابلِ قبول نظر آنے لگے (یعنی کوئی شخص بھی اسے صحیح ماننے پر تیار نہ ہو)۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کے وہ حلقے جو اپنے آپ کو لبرل[1] اور روشن خیال تصور کرتے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۵: عقل پر کس حد تک بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور کیا وجدان بھی علم کا ذریعہ ہے؟

[1] (Liberal) مغرب میں لبرل اس شخص کو کہتے ہیں جو یہ سمجھتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے ضمیر کے مطابق سوچنے اور عمل کرنے کا حق حاصل ہے لیکن لبرل شخص کا یہ فرض بھی بنتا ہے کہ وہ دوسروں کی آزادیٔ رائے کا احترام کرے اور کمزوروں کا تحفظ کرے جمہوری (بقیہ صفحہ ۷۷ پر)

تھے، وہ بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ ان چند مثالوں سے واضح ہو سکے گا جو میں یہاں دے رہا ہوں۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی کے دوران میں ہرزل نے صہیونیت کا جو تصور پیش کیا۔ اس کے مطابق یہ (صہیونیت) ایک تحریک کا نام تھا، اس کا مقصد یہودیوں کو آزادی دلانا اور مذہب میں یہود دشمنی کے مسئلے کو حل کرنا تھا بعدازاں جب اس تصور کی تشریحات کی گئیں تو اس کا مقصد فلسطین کا حصول قرار پایا تاکہ وہاں اس تصور کی مادی شکل دی جا سکے۔ (شروع میں اس مقصد کیلیے مشرقی افریقہ اور جنوبی امریکہ کے بعض علاقے بھی زیرِ غور آئے لیکن بعد میں انہیں ترک کر دیا گیا) فلسطین کو منتخب کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کیونکہ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں (ان کے بقول) خدا اور یہودیوں کے مابین ایک میثاق طے پایا تھا اور یوں اس سرزمین کے ساتھ ان کی ایک روحانی وابستگی وجود میں آ گئی تھی۔ پھر فلسطین کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ ایک ایسی سلطنت کا پسماندہ صوبہ تھا جو خود اس سے بھی زیادہ پسماندگی کا شکار تھی۔ چنانچہ ابتداہی سے صہیونیت کے وکیلوں اور مؤیدین کی یہ کوشش تھی کہ فلسطین پر اس بنا پر دعویٰ جتایا جائے کہ ایک تو یہ (ان کی نظروں میں) پسماندہ اور زیادہ تر غیر آباد خطہ ہے۔ دوسرے یہودیوں (بقول ان کے اپنے) کو چونکہ اس پر ایک منفرد تاریخی استحقاق حاصل ہے، اس لیے وہ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶: اقدار کو پروان چڑھائے۔ معاشرتی بہبود کے لیے سرکاری ذرائع کا استعمال اسکے نزدیک جائز ہے لیکن وہ کاروبار میں کسی قسم کی سرکاری مداخلت کا شدت سے مخالف ہے

برل اشخاص شہری آزادیوں کے علمبردار، غلامی کے مخالف اور عام لوگوں کو ووٹ کا حق دینے کے حامی ہیں۔ وہ مذہب کو شخصی چیز سمجھتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ وہ معاشرے میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں لیکن انقلابات اور قوت کے ذریعے تبدیلیوں کے عمل کے سخت مخالف ہیں۔

کی تشکیلِ نو کر کے اسے ایک یہودی وطن میں تبدیل کر سکیں گے۔
چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب میں جو شخص بھی اس تصور کی مخالفت کرتا، فوراً ہی اس پر یہود دشمنی کا ٹھپہ لگ جاتا۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کی حمایت کرتے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ آپ مقامی رہائشی باشندوں کے بنیادی طور پر غیر دلچسپ ٹولے کو محض بے دخل یا نظر انداز نہیں کر رہے بلکہ اس کی نسبت آپ متعدد کہیں زیادہ دلچسپ اور قابلِ قبول سرگرمیوں میں شریکِ عمل ہیں۔ ایک مرتبہ تان پھر اس بات پر ٹوٹ رہی تھی کہ ایک مخصوص مسئلے کو ایک مخصوص حل کے ذریعے طے کیا جائے۔ امید کی یہ ایک ایسی جھلک تھی ـــــــ جیسا کہ ابھی ہم دیکھیں گے ـــــــ جس میں انہیں اہلِ مغرب کو یہ دکھائی دیتا تھا کہ اس کے اندر نہ صرف ایک تعمیری نوآبادیاتی مہم کا نظریہ پنہاں ہے بلکہ اس میں ایک مثبت معاشرتی اور عقلی مسئلے کے متعلق ایک سائنسی اور منضبط رویے کا حامل ایک مثبت تعمیری معاشرتی حل بھی موجود ہے۔ مزید برآں فلسطین کے اندر ایک یہودی ریاست (یا اس ریاست کے حصول کے لیے یہودی تحریک) کے تصور کو ایک زبردست اخلاقی وقار کی خوشبو نے بھی معطر کر دیا تھا اور یہ خاص طور پر اس زمانے میں ہوا جب یورپ پر فاشزم[۱۰]

---

۱۰ فاشزم (Fascism)، فسطائیت یا فاشیت: محدود معنوں میں اس سے مراد وہ سیاسی اور اقتصادی نظام تھا جسے جنگِ عظیم اوّل کے بعد مسولینی نے اٹلی میں مروّج کیا لیکن وسیع تر معانی میں اس کے ڈانڈے ہٹلر کی نازیت (Nazism) ہسپانیہ کے جنرل فرانکو کی آمریت اور برطانوی سیاستدان سر آسوالڈ موزلے کی برطانوی یونین سے جا ملتے ہیں۔ یہ تمام تحریکیں، نسلی تفوق، حب الوطنی، یہود دشمنی (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۷۹ پر)

کے تاریک سائے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ یہاں مسئلہ (اہل مغرب کی نظروں میں) ایک ایسی قوم کا تھا جس کی شناخت از منۂ قدیم سے اسرائیل کی سرزمین سے پیوست تھی۔ اس کی شناخت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ یہ قوم اگرچہ زبردست اخلاقی اور ذہنی عظمتوں کی امین تھی لیکن اسے آزمائش و ابتلا کے ایک طویل دور میں سے گزرنا پڑا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے دور دراز مقامات کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور رہنا پڑا۔ چنانچہ صورت یہی دکھائی دیتی تھی کہ فلسطین ہی وہ جگہ ہے جہاں ان (یہودیوں) کی ضرورتوں کو مخصوص، احسن اور فراخدلانہ انداز سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر آپ مغرب میں اس منصوبے کی مخالفت کرتے تو آپ کو کہیں جائے امان نہ مل سکتی۔ جس طرح یہ بات کل درست تھی آج بھی اسی طرح صحیح ہے۔ صیہونیت ہمیشہ ہی مخصوص حلوں ——— ترک وطن، ہسپتالوں کی تعمیر، اور بعد ازاں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار، سرمایہ ——— کی متلاشی رہی ہے۔ (مسائل کے) اس قسم کے حلوں سے (لوگوں کی) تائید و حمایت حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ ان حلوں کی نفی کرتے ہیں، ان پر منفی اندازِ فکر اختیار کرنے کا الزام لگ جاتا ہے، ایک ایسا اندازِ فکر جو نہ صرف منفی ہے بلکہ تجریدی اور عمومی بھی ہے (اور یوں جس کا حقائق سے دُور کا بھی واسطہ نہیں)۔ خود جارج انتونیئس نے بھی اپنی بلند پایہ تصنیف میں عرب بیداری کو (نہ کہ فلسطینیوں کی موجودگی کو) بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ اس بیداری کو صرف اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد سارے مشرق قریب کو عربی اور اسلامی رنگ میں رنگنا ہے۔[1] (چنانچہ اس قسم

---

[1] مارکیت ، دشمنی اور قومی مفادات کے نظریوں پر بے دلی چڑھیں۔ ان تحریکوں کے رہنما خود کو سچے انقلابی تصور کرتے ہیں پارلیمانی جمہوریت سے نفرت کرتے اور اسے کم ظرف، فرسودہ اور غیر موثر تصور کرتے۔ یہ تحریکیں فی الفطرت دوسری جنگ عظیم بقیہ آگے۔

کے نقطۂ نظر پیش کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ) فلسطین میں صیہونی فتوحات اور کامرانیوں کے متعلق اگر کسی شخص کے ذہن میں کوئی تھوڑے بہت شکوک پیدا بھی ہوتے ہیں تو وہ بھی بدک جائے گا اور اسے لازماً اس "حقیقت" (جو صیہونیوں نے ان کے ذہنوں میں راسخ کر دی ہے) کا سامنا کرنا پڑے گا کہ میں جن شکوک کی آبیاری کر رہا ہوں، ان کا مطلب تو یہ ہوگا کہ میں تو ایک عمومی عرب اور اسلامی بلاک کی حمایت کر رہا ہوں۔ اس بلاک کی جس نے ابھی تک کوئی واضح شکل و صورت اختیار نہیں کی اور ایک محض تجریدی تصور ہے، محض تصور ہی کتنا بھیانک ہے۔ ایک طرف (یورپ میں بیٹھ کر اور یورپ اسلامی دنیا سے خاصے معقول فاصلے پر ہے) انہیں عالم اسلام ایک تیرہ و تار سمندر نظر آتا ہے اور دوسری طرف انہیں مٹھی بھر یورپی یہودیوں کی انتہائی دلفریب اور نفیس تصویر دکھائی جاتی ہے کہ وہ کس طرح جان جوکھم سے کام لے کر اس تیرہ و تار اسلامی دنیا کے عین قلب میں نفاست اور روشنی کی تہذیب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ (کون ہے جو پھر متاثر نہیں ہوگا؟) صیہونیوں کو (مغرب میں) ایک ایسا مقام حاصل تھا کہ (جس سے فائدہ اٹھا کر) وہ فلسطین اور اس کے حقائق کو اہل مغرب کے سامنے ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کر سکتے تھے جنہیں اہل مغرب مخصوص اور عمومی دونوں انداز سے سمجھ بھی سکتے تھے اور قبول بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے مغرب میں جس شخص نے بھی صیہونی دلائل کو قبول کرنے سے انکار کیا، اسے مطعون و مردود قرار دے دیا گیا، کبھی کہا جاتا کہ اس کا رویہ اور سوچ منفی ہے، کبھی اس پر یہود دشمنی کی چھاپ

بقیہ صفحہ ۷۹: یکسا ں دب گئیں لیکن کئی ممالک میں اب وہ دوبارہ سر اٹھا رہی ہیں۔

چونکہ بنیادی طور پر یہ تحریکیں لبرل نظریات اور روایات کی مخالف اور یہودیوں کی دشمن تھیں۔ اسی لئے یورپ اور امریکہ کے لبرل طبقوں کو یہودیوں کی حمایت کرنے میں کوئی عیب نظر نہ آیا۔ کیونکہ وہ انہیں "مظلوم" تصور کرتے تھے۔ یوں وہ ایک "مظلوم" طبقہ کی طرفداری کو اپنا اخلاقی فریضہ گرداننے لگے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ وہ اس طرح ایک اور مظلوم طبقہ (فلسطینی) کو وجود میں لانے کا حصہ دار بن گئے ہیں۔

لگا دی جاتی اور یوں اسے اسلام اور عربوں کا چمچہ بنا دیا جاتا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان میں سے جو بھی صورتِ حال ہو، صیہونیت کے متبادل کے طور پر جو بھی تجویز پیش کی جاتی اسے یا تو عمومی نوعیت (جس کا مسئلہ خاص سے کوئی تعلق نہیں) کی ٹھہرا دیا جاتا یا پھر اسے شرمناک قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا۔ اس کے مقابلے میں صیہونیت کے تصور کو اس طرح پیش کیا جاتا کہ یہ ایک مخصوص مسئلے کا مخصوص لیکن صاف ستھرا حل (یا جواب) پیش کرتا ہے۔ آخر (مغرب میں) کون شخص یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ عرب اور مسلمان کیا چاہتے ہیں، کیا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی منزل کیا ہے؟ اس زمانے میں (اور قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی) اس قسم کے محض سوالات اٹھا دینے سے یہ دلیل دینا ممکن ہو جاتا تھا کہ "عرب" عام طور پر ناپسندیدہ برائیوں کے پتلے ہیں۔ ان برائیوں کو جب مغرب کے عام باشندوں کے سامنے پیش کیا جاتا تو پڑھنے اور سننے والوں پر دہشت کا غلبہ ہو جاتا اور ان پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ (بدقسمتی سے) اصل بات یہ ہے کہ "عربوں" کی ہمیشہ دوسروں نے نمائندگی کی (یعنی انکے متعلق دوسرے ہی بتاتے رہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا چاہتے ہیں) خود انہیں کہنے کا کبھی موقع فراہم نہیں کیا گیا۔ اس میں اتنا اضافہ اور کر لیں کہ اگرچہ سیاسی طور پر فلسطینی عربوں کی موجودگی روز بروز عیاں سے عیاں تر ہوتی جا رہی ہے لیکن عجیب متناقض بات یہ ہے کہ ان کی یہی موجودگی ——— خواہ یہ خود فلسطین کی سرزمین پر ہی کیوں نہ ہو ——— انہیں حقیقتاً ایک باعزت مقام دلانے میں مانع ہے، بلکہ انہیں یہ مقام دلائے جانے کی شدت سے مخالفت کی جاتی ہے۔ مثلاً زمانۂ حال میں ایک سو سے زائد ممالک اور خود تمام فلسطینیوں نے تنظیم آزادئ فلسطین (پی ایل او) کو تمام فلسطینی باشندوں کی واحد جائز نمائندہ جماعت تسلیم کر رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ امریکہ اور نہ اسرائیل یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ

پی ایل او فلسطینیوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے برعکس کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے[1] نے بڑی ڈھٹائی اور رعونت کے ساتھ فلسطینی نمائندگی کا حق امریکہ، اسرائیل اور مصر کو بخش دیا۔

صہیونیت کو دلکش ——— یعنی اسے اس طرح خوبصورت غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا جائے کہ اسے صحیح معنوں میں سچی اور حقیقی حمایت حاصل ہو جائے ——— بنانے کے لیے اس کے رہنماؤں نے نہ صرف یہ کہ عربوں کو نظر انداز کر دیا بلکہ جہاں ان سے نپٹنا ناگزیر ہو جاتا وہاں وہ ان کی ترجمانی کا فریضہ خود ہی سنبھال لیتے۔ وہ اہل مغرب کے سامنے ان کی اس طرح تصویر کشی کرتے کہ انہیں ایک مخصوص رنگ کی عینک لگا کر ہی سمجھا اور ان سے نپٹا جا سکتا تھا۔ صہیونیوں اور اہل مغرب کے مابین زبان اور نظریے کا اشتراک موجود تھا اور یہ اشتراک ابھی تک موجود ہے۔ لیکن جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، وہ اس اشتراک کا جزو نہیں تھے۔ خاصی بڑی حد تک اس اشتراک کا انحصار اس عداوت کی، جو اہل مغرب کو اسلام سے بالخصوص اور مشرق سے بالعموم تھی، زبردست روایت پر ہے جو آج بھی مغرب میں موجود ہے۔ میں نے اس روایت کا تفصیلی ذکر (مکمل ثبوت کے ساتھ) اپنی ایک دوسری کتاب میں کیا ہے۔ میں اپنے قارئین سے درخواست کروں گا کہ اگر وہ تفصیلات کی گہرائی میں جانا چاہتے ہیں تو وہ اس چیز کا، جسے میں نے مشرقیت (اورینٹلزم) کا نام دیا ہے، مطالعہ کریں۔ میری اس کتاب میں آپ کو اس طویل اور تسلسل سے لبریز تاریخ کی داستان بھی مل جائے گی جس کی تان آج کل عربوں پر آن کر

---

[1] یہ معاہدہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر اسرائیل کے سابق وزیر اعظم مناحیم بیگن اور مصر کے مقتول صدر انوار السادات کے مابین طے پایا تھا۔ اس پر تفصیلی بحث اس کتاب کے آخری باب میں کی گئی ہے۔

ٹوٹی ہے ، یہ عرب واحد انسانی گروپ ہے جس کے آج بھی نسلی بنیادوں پر
نشانہ تضحیک بنائے جانے کے عمل کو مغرب میں برداشت کیا جاتا ہے
بلکہ عمداً اس عمل کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے[۱] ۔ موضوع عامیانہ ہو یا ظالمانہ ، تحریک
، بحث دانشوروں یا عام لوگ ، گفتگو ، تحریر اور تقریر ، ہر جگہ عربوں اور اسلام کو
بدخصالی ، خباثت ، بدی ، ذلت و خواری ، عیاشی و بدکاری ، بے وقوفی ، حماقت
اور کند ذہنی کا مرقع بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور انہی " اوصاف " کی وہ ہر مقام پر
نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ اپنے مغربی نظریاتی آباؤ اجداد کی طرح صہیونیوں
نے بھی اسلام اور عربوں کی اس مجموعی (اور بھیانک) تصویر کشی کو اپنے مقاصد
کے لیے استعمال کیا ۔ اس تصویر کشی کو انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے کیسے
استعمال کیا اور جب وہ یہ کام کر رہے تھے تو خود (اخلاقی اعتبار سے) کس مقام
پر کھڑے تھے ، ان باتوں پر یہاں توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ باتیں اس
امر کی ایک بے عیب مثال پیش کرتی ہیں کہ کس طرح پراپیگنڈہ ، سیاست
میں رچی بسی علمیت ، اور نظریاتی معلومات طاقت حاصل کرتی ہیں ، پالیسی نافذ
کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ " معروضی صداقت " کا لبادہ بھی اوڑھ لیتی ہیں ۔
صہیونیوں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ایک ایسی قوم کی حیثیت
سے جو خود بھی طور پر " مشرقی " تھی لیکن جو مشرق والوں کی بے اعتدالیوں اور خرابیوں
سے چھٹکارا پا چکی تھی ، اہلِ مغرب کے سامنے مشرقی (اورینٹل) عربوں کے طور
طریقوں کی تشریح و تصریح کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا ، وہ یہ بتانے لگے کہ

---

[۱] میں نے اس نکتے پر تفصیلی بحث اپنی کتاب " "Orientalism"
کے صفحات نمبر ۳۲۸ - ۲۸۴ پر کی ہے (مصنف)

عرب حقیقتاً کیا ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اہل مغرب کو اس بات کا کبھی ذرا سا احساس نہ ہونے دیا کہ خود ان کی طرح عرب بھی فلسطین میں موجود ہیں۔ اس طریق کار کا فائدہ یہ ہوا کہ صہیونیت ہمیشہ یوں نظر آتی جیسے یہ مشرق قریب کی زندگی کی مقامی حقیقتوں میں پوری طرح گھلی ملی ہوئی بھی ہے اور ایک لحاظ سے اسے ان پر برتری بھی حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ویزمان کے مندرجہ ذیل خط پر غور فرمائیں۔ یہ خط اس نے تیس مئی ۱۹۱۸ء کو بالفور کے نام تحریر کیا تھا اور اس کے مندرجات غیر معمولی انداز سے بہت سے حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں۔

"یہاں جو صورتِ حال پائی جاتی ہے اور صہیونی کمشن کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، میں ان کے متعلق نہایت ذمہ داری کے احساس کے ساتھ آپ کو یہ چند سطور لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں ....

عرب، جو سطحی طور پر ہوشیار اور تیز فہم نظر آتے ہیں، ایک اور صرف ایک چیز ــــ قوت اور کامیابی ــــ کی پرستش کرتے ہیں۔ چنانچہ اگرچہ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ فوجی محاذ پر کوئی پیش رفت نہ ہونے کی وجہ سے برطانوی وقار کو دھچکا لگا ہے لیکن یہ بات بھی یقیناً درست ہے کہ اس سے اس (برطانوی وقار) میں کوئی اضافہ بھی نہیں ہوا .... برطانوی حکام خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ غداری، دغابازی اور بے وفائی عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ انہیں اس بارے میں مسلسل چوکس اور محتاط رہنا پڑے گا کہ ان سے کوئی ایسی

حرکت نہ سرزد ہو جائے جس سے عربوں کو ذرا بھی شکوہ شکایت کا موقع مل سکے۔ دوسرے الفاظ میں عربوں کی "ناز برداری" کی جانا چاہیے تاکہ وہ فوج کی پشت میں چھرا نہ گھونپ سکیں۔ چونکہ عرب صورتِ حال کا (صحیح) اندازہ لگانے میں بہت ہوشیار واقع ہوئے ہیں اس لیے وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ حتی الامکان چیخ پکار بھی خوب کرتے ہیں اور موقع ملے تو بلیک میل کرنے سے بھی کبھی نہیں چوکتے۔

اس چیخ و پکار کی پہلی آواز اس وقت سنائی دی جب آپ اپنا اعلان (اعلان بالفور) منظرِ عام پر لائے۔ اس اعلان کو طرح طرح کے غلط معانی پہنائے گئے اور اس کی قسم قسم کی غلط توضیحات کی گئیں۔ وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ انگریز مفلوک الحال عربوں کو سرمایہ دار یہودیوں کے چنگل میں دے رہے ہیں۔ یہ سرمایہ دار یہودی جنرل ایلن بی لے کی فوج کی جلو میں اس بات کے منتظر ہیں کہ وہ گدھوں کی طرح آسان شکار پر جھپٹیں اور ہر شخص کو فلسطین کی سرزمین سے نکال باہر کریں ......

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تو روشن خیال اور دیانتدار انگریز افسر تعینات ہیں لیکن بقیہ انتظامی ڈھانچے کو یوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے اور ان تمام مناصب اور اسامیوں پر عرب اور شامی اہلکار

لے Allenby (۱۸۶۱-۱۹۳۶) بعد میں یہ شخص برطانوی فوج میں فیلڈ مارشل کے عہدے پر متمکن ہوا۔ جنگِ عظیم اوّل کے دوران میں اس نے مقامی عربوں کی مدد سے خلافتِ عثمانیہ کی فوجوں کو مشرقِ وسطیٰ کے میدانوں میں پے در پے شکستوں سے دوچار کیا۔

کام کر رہے ہیں ۔۔۔۔۔ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ یہ اہل کار بد عنوان اور نااہل ہیں اور ان بھلے وقتوں کی یاد میں آنسو بہاتے رہتے ہیں ۔ جب انتظامی امور صرف بخشیش کے بل بوتے پر انجام پاتے تھے ۔۔۔۔
۔۔۔۔ انگریزی حکومت جتنا انصاف پسند اور منصف مزاج بننا چاہتی ہے ، عرب اہل کار اتنا ہی رعونت پسند ہوتے جا رہے ہیں ۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ عرب اہل کار ملک کی زبان ، عادات واطوار اور طور طریقوں کو سمجھتے ہیں[1] ۔ یہ اہل کار برے درجے کے عیاش اور تماش بین ہیں ، اس لیے انہیں انصاف پسند اور صاف ستھرے ذہنوں کے مالک انگریز اہلکاروں کے مقابلے میں ، جو مشرقی اذہان کی عیاریوں اور روباہ کاریوں سے آشنا نہیں ہوتے ، زبردست فوقیت حاصل ہے ۔

اپنی موجودہ صورت میں انتظامیہ واضح طور پر یہود دشمن اور یہود مخالف ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انتظامیہ کے مختلف شعبوں کے انگریز سربراہ غیر متعصب اور منصب مزاج ہیں اور ملک کے دو بڑے فرقوں[2] کے مابین تعلقات میں باقاعدگی پیدا کرنے کے سلسلے میں وہ توازن

---

[1] ویزمان اس بات کو جیسقدر انوکھی بنا رہا ہے ، وہ حقیقتاً اتنی انوکھی ہے نہیں کیونکہ عرب اہلکار اسی ملک یعنی فلسطین کے باشندے تھے جو بہر حال ایک عرب ملک تھا (اور ہے) لیکن ویزمان کی چالاکی ملاحظہ فرمائیں کہ چونکہ عرب وہاں موجود ہیں اس لیے وہ اپنی اس موجودگی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ (مصنف)

[2] یعنی عرب اور یہودی ۔ ان دونوں فرقوں پر یکساں طور پر لفظ "بڑے" کا اطلاق کرنا مبالغہ آرائی کی تمام حدود کو پھلانگ جانے کے مترادف ہے تاہم ویزمن یہی حرکت کر رہا ہے (مصنف)

کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے بلکہ اس کی تمام جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اس مشکل صورتِ حال میں وہ صرف جس چیز سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں وہ اصولِ جمہوریت ہے۔ یہ وہ اصول ہے جو نسبتاً عددی قوت کو پیش نظر رکھتا ہے اور اعداد کی یہ سفاک اکثریت ہمارے خلاف جاتی ہے کیونکہ ایک یہودی کے مقابلے میں عرب تعداد میں پانچ ہیں ...
اگر حالات یوں کے توں رہے تو لازماً اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک عرب فلسطین وجود میں آجائے گا بشرطیکہ فلسطین میں عرب نام کی کوئی قوم ہوئی[1] لیکن حقیقتاً یہ نتیجہ برآمد ہوگا نہیں کیونکہ فلاحین[2] تو چار صدیاں پیچھے رہ چکے ہیں جب کہ وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ رہے آفندی[3] (برسبیلِ تذکرہ، یہاں میں یہ عرض کردوں کہ موجودہ نظام کا اصل فائدہ صرف انہی کو پہنچ رہا ہے) تو وہ نہ صرف نااہل ہیں بلکہ بے ایمان، حریص اور وطن دشمن بھی ہیں[4]

---

[1] یہاں ویزمان "قومیت" کا وہ پیمانہ استعمال کرتا ہے، جو انیسویں صدی کے دوران میں افریقہ کے سیاہ فاموں اور جنوبی امریکہ کے ریڈ انڈین باشندوں کو سفید فام نوآبادکاروں کے خلاف مزاحمت سے باز رکھنے کے لیے وضع کیا گیا تھا کیونکہ قوم کا لفظ صرف گوروں پر منطبق ہو سکتا تھا۔ (مصنف)

[2] عرب ممالک کے کاشتکار اور کھیت مزدور۔

[3] خلافتِ عثمانیہ کے عہد میں امرا کو جو خطابات دیئے جاتے تھے، ان میں سے ایک خطاب آفندی بھی تھا۔ خطاب کے ساتھ ان لوگوں کو جاگیریں بھی ملتی تھیں۔

[4] Ingram "Palestine Papers", pp. 31-32

ویزمان کی صاف گوئی سبق آموز ہے۔ اس کی بڑی لسانی شعبدہ بازی یہ ہے کہ اس نے بالفور کی طرح اپنی شناخت ایک یورپی (باشندے) کی حیثیت سے کرائی ہے جو مشرقی اور مغربی اذہان کے مابین فرق کو خوب سمجھتا ہے۔ اس امتیاز کے شناخت کرنے کے طور پر ہر قسم کے نتائج مستنبط ہو گئے ہیں چونکہ عرب مشرقی (اورینٹل) ہیں، اس لیے یورپی باشندوں اور صہیونیوں کے مقابلے میں وہ کمتر درجے کے انسان اور کم قابلِ قدر ہیں۔ وہ غدار ہیں، دھوکے باز ہیں، بے وفا ہیں، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ناقابلِ اصلاح وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس بات کے مستحق نہیں کہ کسی ملک کے مالک بن سکیں خواہ ان کی عددی اکثریت انہیں اس حق سے سرفراز ہی کیوں نہ کرتی ہو۔ درحقیقت ویزمان نمائندہ حکومت کے متعلق جان سٹوارٹ مِل[۱] کے دلائل کی جگالی کر رہا ہے جن کے مطابق ہندوستانیوں کو حکومت خود اختیاری کے حق سے محروم رکھنا اس لیے واجب قرار پایا کیونکہ وہ انگریزوں سے صدیوں "پیچھے" تھے[۲] یوں ویزمان کو صہیونیت کو سفید فام یورپ کی ثقافتی اور نسلی بالادستی کے گھناؤنے اور قبیح پہلوؤں کے متماثل قرار دینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس کے ساتھ وہ نہایت آسانی سے اپنے آپ کو ان لوگوں کا، جو مشرق کے متعلق ماہرانہ علم اور رائے رکھتے ہیں اور

۱؎ John STUART MILL (1806-73) برطانوی فلسفی اور ماہر اقتصادیات

۲؎ ایرک سٹوکس (Eric Stokes) نے اس موضوع پر اپنی کتاب "English Utilitarians and India" میں تفصیل سے بحث کی ہے یہ کتاب Clarendon Press نے ۱۹۵۹ء میں آکسفورڈ سے شائع کی تھی۔

جنہیں عام طور پر مستشرقین، ماہرینِ مشرق، شعبہ عرب کے کارکنوں'' جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے ، ہم شکل بنا لیتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے اسے بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔ جہاں تک مشرق کے رنگدار باشندوں کے خلاف، جن کا اصلی سیاسی دعویٰ عددی (ان کی '' بے رحم اور سفاک اکثریت'') معلوم ہوتا ہے ورنہ (صہیونیوں کے خیال کے مطابق) کمیت کے اعتبار سے اس دعوے میں کوئی جان نہیں ، جہاں تک محاذ آرائی کا تعلق ہے ، صہیونی اپنا رشتہ سفید فام یورپی باشندوں کے ساتھ جوڑ لیتے ہیں ۔ پھر صہیونی عربوں کی ترجمانی کے فرائض بھی سنبھال لیتے ہیں (کیونکہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ '' ہم مشرقی ذہن کو اندر سے جانتے ہیں) وہ اہلِ یورپ کے سامنے ان کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کے خیالوں ، آرزوؤں اور امنگوں کی تشریح و تعبیر کرتے ہیں ۔ یورپیوں اور صہیونیوں دونوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ منصفانہ برتاؤ ، تہذیب اور ترقی کے علمبردار ہیں اور یہ وہ تصورات ہیں جو مشرق کے باشندوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں ۔ جیسا کہ ویزمان خود بیان کرتا ہے کہ فلسطین میں جو آویزش جاری ہے ، وہ دراصل مقامی باشندوں سے زمین ہتھیانے کی جدو جہد ہے لیکن اس جدوجہد کو ایک تصور نے باوقار بنا دیا ہے کیونکہ تصور ہی تو سب کچھ ہوتا ہے ۔

ثانیاً ، فلسطین اور اس علاقے کے دوسرے مقامات پر صہیونیوں کی عربوں کے ساتھ جو آویزش چل رہی ہے ، اہلِ مغرب اس سے یہ مطلب نکالتے تھے (اور اس آویزش میں اپنی ہی بھلائی پاتے تھے) کہ یہ دراصل وہی پرانی آویزش ہے ، جو صدیوں سے مغرب اور مشرق کے ، جس کا سب سے بڑا قائم مقام (Surro gate) اسلام ہے ، مابین جاری ہے ۔ وہ (اہلِ مغرب) یہ سمجھتے تھے کہ اب یہ آویزش زیادہ وسعت پذیر ہو رہی ہے ، ایسا رُخ اختیار کرتی جا رہی ہے جیسے یہ ابد تک جاری رہے گی بلکہ اب تو اس کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے ۔ یہ محض ایک

نوآبادیاتی مسئلہ نہیں رہا تھا بلکہ اب اس نے ایک تہذیبی رُخ بھی اختیار کر لیا تھا۔ صہیونیوں نے جب اپنی منصوبہ بندی شروع کی تھی تو اس کے بالکل آغاز ہی سے بالفور جیسے صہیونیت کے مغربی حمائتیوں پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ مغربی طاقتوں کو اب یہ مقصد اپنے پیشِ نظر رکھنا پڑے گا کہ انہیں (ایک نہ ایک دن) فلسطین کو اپنی نوآبادی بنانا ہوگا۔ ہرزل نے (اس) تصور کو استعمال کیا۔ ویزمان نے اسے استعمال کیا اور بعد ازاں ہر سر کردہ اسرائیلی نے اسے استعمال کیا ہے۔ اسرائیل وہ آلہ تھا جس کے ذریعے اسلام ـــــ اور بعد ازاں سوویت یونین اور کمیونزم ـــــ کو پابہ زنجیر کیا جا سکتا تھا یا دور باش کہا جا سکتا تھا۔ صہیونیت اور اسرائیل کو روشن خیالی، حریت اور جمہوریت، علم اور روشنی کا گہوارہ تصور کیا جانے لگا۔ یعنی یہ تو وہی قدریں اور اصول ہیں جنہیں "ہم" (اہلِ مغرب) سمجھتے اور جن کے لیے "ہم" جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس کے مقابلے میں صہیونیت کے دشمن کیا ہیں؟ وہ تو بس مشرقی، مطلق العنانی، ظلم و ستم، نفسانیت، جہالت اور پسماندگی کی دوسری اقسام کی حامل اجنبی روحیں ہیں جو بیسویں صدی کا لبادہ پہن کر سامنے آ گئی ہیں۔ اگر وہ اس زبردست اور مہتم بالشان مہم، جس کا نام صہیونیت ہے، کو سمجھ نہیں پائے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ "ہماری" اقدار سے مایوس کن حد تک بے بہرہ ہیں۔ انہیں (اہلِ مغرب کو) یہ بات قطعاً اہم نظر نہیں آتی تھی کہ مسلمان پسماندہ ہی سہی لیکن ان کا ایک اپنا طرزِ حیات تھا اور انسان ہونے کے ناطے انہیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس طرزِ حیات کو اپنائے رکھیں اور اس پر چلتے رہیں۔ اور انہیں (اہلِ مغرب کو) اس بات میں بھی کوئی اہمیت نظر نہیں آتی تھی کہ "زمین" کے ساتھ ان (مسلمانوں) کی وابستگی اتنی ہی شدید ہو سکتی تھی جتنی کہ یہودیوں کی، بلکہ ایک لحاظ سے تو ان کی یہ وابستگی یہودیوں کی وابستگی سے بھی

شدید ترتھی کیونکہ وہ صحیح معنوں میں صدیوں سے یہاں رہتے چلے آرہے تھے اور اپنا سب کچھ اس میں لگا چکے تھے جب کہ یہودی تو جلاوطنی کے عالم میں صیہون کی محض تمنا ہی کر رہے تھے ۔ حقیقتاً (مغرب میں) جس بات کو اہم گردانا گیا وہ ان کے نسلی برتری کے تصورات تھے (صہیونیوں نے ان تصورات کو بلا پس و پیش ہتھیا لیا)۔ کیونکہ ان تصورات کے مطابق ایک ایسے خطے پر، جسے ان تصورات کے موافق مانا جاتا تھا، قانونی طور پر سفید فاموں کی برتری اور حق کو جتایا اور قائم رکھا جا سکتا تھا ۔

ان میں سے کتنے خیالات ایسے ہیں جو ان امریکی باشندوں کی، جو اپنے آپ کو روشن خیال سمجھتے ہیں اور لبرل جمہوریت کا علم اٹھائے پھر رہے ہیں، روزمرہ کی گفتگو اور ان کی تصانیف و تقاریر میں مسلمہ حقائق کا درجہ پا چکے ہیں؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کے خیالات کی فوراً اور قطعی انداز سے تحریری دستاویز تیار کی جائے ۔ یہاں میں جتنی بھی مثالیں پیش کروں گا، ان میں سے ہر ایک دو باہمی طور پر آپس میں مربوط طریقوں سے صہیونیت اور اسرائیل پر روشنی ڈالتی ہے ۔ اس سلسلے میں جو پہلا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ صہیونیت کو فی نفسہ نہایت حیرت انگیز اور قابلِ تعریف چیز ٹھہرایا جاتا ہے ۔ یہ کسی بھی شخص یا کسی بھی چیز کے سامنے جواب دہ نہیں کیونکہ یہ معاشرے اور انسان کے متعلق اہل مغرب کے خیالات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے دوسرا طریقہ جو اختیار کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو شخص یا ادارہ صہیونیت اور یا اسرائیل کی راہ میں روڑے اٹکاتا نظر آتا ہے، اس کے فعل کو نہایت معیوب، احمقانہ اور اخلاقی اعتبار سے نہایت نازیبا تصور کیا جاتا ہے اور ـــــ یہ بات بہت اہم ہے ـــــ ان کا (یعنی عربوں کا)

نقطۂ نظر کبھی براہِ راست نہ سنا جائے۔ صرف صیہونیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان کی ترجمانی کریں۔ پہلے طریقے کی وضاحت کے لیے رین ہولڈ نی بور[1] کی مثال ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ابتداً اس شخص کا عربوں یا اسلام کیساتھ دُور کا بھی تعلق واسطہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس نے ان (اسلام اور عربوں) کے متعلق (مروّج مغربی) خیالات آنکھیں بند کر کے اپنا لیے تھے۔ اس کے باوجود نی بور نے تقسیم فلسطین کے حق میں بعض دوسری اہم شخصیات کیساتھ کیس نومبر ۱۹۴۷ء کو "نیویارک ٹائمز" کے نام ایک طویل مراسلے پر دستخط ثبت کر دیئے۔ اس مراسلے میں جن دلائل کا سہارا لیا گیا، ان کا لبِ لباب یہ ہے۔

سیاسی طور پر ہم یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک اسی قسم کی جمہوریت پر عمل پیرا ہوں، جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہے۔ معاشرتی اور معاشی طور پر ہم یہ چاہیں گے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو اس طور ترقی کی شاہراہ پر ڈالا جائے کہ مقامی لوگوں کے حالات بہتر ہو جائیں اور اس خطے کے وسائل اور منڈیوں تک (ہماری) رسائی ہو سکے۔ ہم اس مسئلے کا خواہ کسی طریقے سے جائزہ لیں، دوسرے الفاظ میں طویل المیعاد نقطۂ نظر کے مطابق امریکی مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی کوششوں کے تمام دائروں میں مشرقِ وسطیٰ کو برق رفتاری کے ساتھ جدید بنا دیا جائے۔

جو شخص ذرا سا بھی معروضی اندازِ فکر اختیار کر کے مشرق وسطیٰ کے مسائل

---

[1] Reinhold Niebuhr (۱۸۹۲ - ۱۹۷۱) عیسائی دینیات (Theology) کا ایک امریکی ماہر۔

کا جائزہ لینا چاہتا ہے، اسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مشرقِ وسطیٰ میں ترقی اور جدیدیت کا صرف ایک ہی ہراول دستہ ہے اور وہ ہے یہودی فلسطین [1] ترقی کا دوسرا عنصر عیسائی لبنان ہے جسے فی الحال عرب لیگ [2] کے ہمہ عربیت [3] اور ہمہ اسلامیت [4] جیسے عقائد کو ماننے والوں نے لبنان کی عیسائی اکثریت [5] کی خواہشات اور جذبات

---

[1] بنیادی طور پر ایک نوآبادیاتی سکیم کو پروان چڑھانے کے لیے نیم ملکی زبان جس انداز سے استعمال کی گئی ہے، خدا اس پر غور فرمائیں۔ (مصنف)

[2] عرب لیگ: یہ تنظیم مصر، عراق، شام، لبنان، اردن، سعودی عرب اور یمن نے باہمی مذاکرات کے ذریعے ۱۹۴۵ء میں قائم کی تھی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد دوسرے عرب ممالک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ تنظیم کے مقاصد میں رکن ممالک کی پالیسیوں کے درمیان روابط پیدا کرنا شامل ہیں۔ اسرائیل کا مقاطعہ اس کا بنیادی مقصد ہے۔ پی۔ ایل۔ او بھی اس تنظیم کی رکن رہی ہے۔

[3] ہمہ عربیت (Pan-Arabism) وہ تحریک جس کا مقصد تمام عرب ممالک کا اتحاد ہے تاکہ وہ اپنی آرزوؤں اور امنگوں کی ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے تکمیل کر سکیں۔ اس کی اساس مشترکہ زبان، ثقافت اور تہذیب ہے۔

[4] ہمہ اسلامیت یا اتحادِ اسلامی (Pan-Islamism): یہ تحریک انیسویں صدی کے دوران میں وجود میں آئی۔ علامہ جمال الدین افغانی اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ مغربی استعمار اسے ہمیشہ ہی اپنا مدمقابل تصور کرتا رہا ہے۔ چنانچہ برطانیہ، فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک کی حکومتیں ہمیشہ اس کی راہ میں روڑے اٹکاتی رہیں۔

[5] لبنان میں سرکاری طور پر تین فرقوں، عیسائیوں، سنی مسلمانوں (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۹۴ پر

کے علی الرغم دبا کر رکھا ہوا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں یہودی فلسطین اور عیسائی لبنان ہی تو مغربی تہذیب کے دو جزیرے ہیں ورنہ امریکی نقطۂ نظر سے وہاں کے عرب مسلمانوں سے کسی قسم کی توقع وابستہ کرنا خام خیالی ہے۔ وہ ایک بالکل مایوس کن تصویر پیش کرتے ہیں۔

امریکہ کے ثقافتی حلقوں میں نی پوُر کی دانشوری سند کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ جو کچھ یہاں کہتا ہے، وہ پوری طرح مُستند ہے۔ جہاں تک فلسطینی عربوں کا تعلق ہے، جب تک وہ نی پوُر کی اس قسم کی مستند باتوں کا ہدف بنتے رہیں گے، وہ یہی سمجھیں گے کہ ان باتوں کے ذریعے تشدد اور صرف تشدد (اس سے کم اور کوئی بات نہیں) کا پرچار کیا گیا ہے۔ ان ممالک کے متعلق ———— جب نی پوُر ان کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، تو ان ممالک میں کروڑوں عرب مسلمان آباد تھے ———— جب آپ اس قسم کے الفاظ اور جملے "ہم یہ دیکھنا پسند کریں گے"۔ اور "ہم یہ چاہیں گے" استعمال کریں گے تو لازماً ان سے یہی مترشح ہوگا کہ اس بات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں کہ خود یہ ممالک کیا چاہتے اور کس بات کی تمنا رکھتے ہیں۔ "ہماری" خواہشات کو ان کی خواہشات پر غلبہ حاصل ہونا چاہیے۔ ایک ناقابلِ ترمیم فرمان کے ذریعے، جو بے شک بے اصولی پر مبنی ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۹۳: اور شیعہ مسلمانوں، کو اہمیت حاصل ہے۔ ملک کا صدر عیسائی، وزیراعظم سنی مسلمان اور پارلیمنٹ کا صدر شیعہ مسلمان ہوتا ہے۔ عیسائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ملک میں انہیں اکثریت حاصل ہے۔ لیکن عملاً اس دعوے کی تصدیق ممکن نہیں کہ وہاں کئی دہائیوں سے کوئی مردم شماری نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اب اکثریت ان کی ہے۔ وہ یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ عیسائی اسی لیے مردم شماری نہیں ہونے دیتے کہ کہیں ان کے دعوے کا پول نہ کھل جائے۔

"ہماری" خواہشات یہ فرماتی ہیں کہ ترقی کا "صرف ایک ہی ہراول دستہ ہے" جو دو حقیر اقلیتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بھی صرف ایک اقلیت مقامی ہے جب کہ دوسری درآمد شدہ ہے۔ اس مراسلے پر دستخط ثبت کرنے والوں میں سے کسی کو بھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ مشرق وسطیٰ کے باشندوں کی ایک زبردست اکثریت کی خواہشات بالکل "فطری" ہیں اور جس "مصنوعیت" کا ٹی بور اور اس کے دوست ذکر کر رہے تھے، اس کا اطلاق کہیں زیادہ مناسب انداز سے صیہونیوں اور مارونی عیسائیوں [1] پر ہو سکتا تھا۔ [2] مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک جو مایوس کن تصویر پیش کرتے ہیں، یہ "جزیرے" [3] اس کی شدت کو کم کر دیتے ہیں۔ یہ تصویر کن لوگوں کو اور کس مقصد کے پیشِ نظر مایوس کن نظر آتی ہے؟ جواب ہر مہذب مغربی شخص پر عیاں ہونا چاہیے، ٹی بور اسے زبان پر لانا مناسب نہیں سمجھتا ("مہذب" اہل مغرب کی نگاہوں میں) اسلام یہودیت اور نصرانیت کا دشمن ہے، اس لیے "ہماری" پالیسی یہ ہونا چاہیے کہ "ہم" یہودی فلسطین اور نصرانی لبنان کی حمایت کریں۔ یہ کہ اس علاقے میں، جس کا ذکر ٹی بور اتنی تحکم پسندی سے کرتا ہے، فی الحقیقت ایک جیتی جاگتی قوم بھی موجود ہو سکتی ہے، تو یہ امکان ہی اتنا لرزہ خیز ہے کہ اس کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ نظریاتی پردہ، جس کے ذریعے اس قوم کا وجود لغوی طور پر نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے، اسے اور اس کے دوستوں کو اس قسم کی

---

[1] لبنان کے عیسائی مارونی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ فرقہ پوپ کی بالادستی کو تو مانتا ہے لیکن عبادت اپنے طریقے سے اور عربی زبان میں کرتا ہے۔ اس کا بانی مارون تھا۔

[2] بعدازاں اسرائیل کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور لبنان پر خانہ جنگی کا جو عذاب نازل ہوا، یہ سودینا دانستہ طور پر ان کی پیش بینی کرتا نظر آتا ہے۔ (مصنف)

[3] اگر ان کی تعداد کم زمانہ ساز اور عیار ہوتا تو انہیں "جزیرے" نہ کہتا بلکہ "نوآبادیاں" کہتا (مصنف)

باتیں کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ صیہونیت ترقی اور جدیدیت کا دوسرا نام ہے ۔ اسلام اور عرب اس کے بالکل الٹ ہیں ۔ صرف نی بور کو تمام فریقوں کی ترجمانی کا حق حاصل ہے ۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ یہودیوں اور لبنانی عیسائیوں کی جس انداز سے حمایت کرتا ہے ، اس میں بھی بادشاہوں کے انداز کی شفقت جھلکتی نظر آتی ہے ۔

اس سے ایک سال قبل نی بور نے "فلسطین کے متعلق ایک نیا نقطہ نظر" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا تھا جو ایک برطانوی جریدے "سپیکٹیٹر" (Spectator) میں شائع ہوا تھا ۔ اس مضمون میں اس کا رویہ قدرے صلح جویانہ تھا کیونکہ یہ مضمون ایک ایسے زمانے میں تحریر کیا گیا تھا جب فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو محدود کرنے کا نامختتم مسئلہ ایک بحرانی صورت اختیار کر چکا تھا ۔ چنانچہ اسے یہ کہنا پڑا کہ "موجودہ صورت حال کے پیش نظر فلسطینی مسئلے کے متعلق کسی امریکی شہری کے مشورے یا نکتہ چینی کو برطانیہ میں پسند نہیں کیا جائے گا ۔ بایں ہمہ نی بور نے یہ محسوس کیا کہ "اگر میں کوئی مشورہ پیش نہیں کر سکتا تو بھی میرا یہ فرض تو بنتا ہے کہ میں کوئی نیا نقطہ نظر پیش کروں یا کم از کم ایسا نقطہ نظر جو برطانیہ کے لیے مفید ثابت ہو گا ۔" "نیویارک ٹائمز" میں جو مراسلہ شائع ہوا ، اس کے برعکس اس مضمون میں وہ ایک سامراجی طاقت سے براہ راست مخاطب ہو رہا ہے ۔ انداز بیان ایسا ہے جیسے ایک سامراجی ادارہ کسی دوسرے سامراجی ادارے سے مخاطب ہو ۔

میں جانتا ہوں کہ امریکہ میں نہ تو عربوں کے حقوق کو درخور اعتنا سمجھا جاتا ہے اور نہ ان پریشانیوں پر کوئی خاص توجہ دی جاتی ہے جو برطانیہ کو عالم عرب سے عہدہ برآ ہوتے وقت اٹھانا پڑتی ہیں ۔ اس کے برعکس

میرے لیے جو بات اُلجھن کا باعث بنتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں کا (یعنی برطانیہ کا) ایک عام شہری عرب "رائے" کا تو ذکر کرتا ہے لیکن اس بات کا مطلق ذکر نہیں کرتا کہ یہ رائے (عام عربوں کی رائے نہیں بلکہ) چند جاگیرداروں اور وڈیروں کی رائے ہے۔ اس علاقے (یعنی فلسطین) میں درمیانہ طبقہ تو بالکل ہی عنقا ہے اور رہے مفلوک الحال عام لوگ، تو وہ اذیت ناک غربت کی چکی میں اس بری طرح پس رہے ہیں کہ ان کے لیے رائے ایک ناممکن عیاشی ہے۔ عرب مسئلے کے ساتھ ایک مشکل یہ ہے کہ یہودی جس قسم کی تکنیکی اور حرکی (dynamic) تہذیب مقامی طور پر (یعنی فلسطین میں) روشناس کرانے میں ممد ثابت ہو سکتے تھے جسے امریکی سرمائے کی پشت پناہی حاصل ہونا چاہیے تھی اور جس کی مدد سے آبی وسائل کو ترقی دی جا سکتی تھی، اراضی کا تحفظ کیا جا سکتا تھا اور مقامی انسانی وسائل کو صحیح طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا، وہ تہذیب اگرچہ عرب عوام کے لیے تو مفید اور نفع بخش ہے لیکن وہ عرب چودھریوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ عارضی طور پر تو اسے زبردستی نافذ کرنا ہوگا۔ تاہم اس بات کا امکان موجود ہے کہ بالآخر عوام اسے قبول کر ہی لیں گے۔[۵]

قصہ اس مضمون کے تحریر کیے جانے سے پہلے کا ہو یا بعد کا، نی یورک کو اس بات کا کبھی مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ اس نے "عرب حقوق" کی حمایت تو رہی ایک طرف، جھوٹے منہ ہی سہی، کبھی ان کا ذکر تک کیا ہو۔ سیدھی سی بات ہے کہ اس سے یہ حرکت کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کا افتتاحی جملہ محض لفاظی ہے، اس سے زیادہ

---

[۵] سپیکٹیٹر مورخہ ۲ اگست ۱۹۴۶ء، صفحہ نمبر ۱۶۲

کچھ نہیں۔ اپنا یہ جملہ اس نے اپنی اصل بات کہنے کے لیے بطور ڈھال استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اپنے نہاں خانۂ دل کی جو بات وہ کہنا چاہتا ہے یہ ہے کہ عرب رائے عامہ کی قطعاً کوئی وقعت نہیں۔ (اپنی اس رائے کے حق میں اس نے جو عمرانی دلائل دیئے ہیں وہ بالکل لایعنی اور جعلی ہیں۔) اگر ان دلائل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ان کا مطلب یہ ہو گا کہ "مفلوک الحال عوام کو کسی قطعہ زمین کی بھی ضرورت نہیں (جہاں وہ اپنی جہالت، پسماندگی اور انحطاط پسندی کو ہی فروغ دے سکیں)۔ تاہم اس کے دل کی اصل بات یہ بھی نہیں۔ درحقیقت اصل بات، جس کا وہ کھلے بندوں اظہار کرنا چاہتا ہے، یہ ہے کہ عربوں کی (ذاتی) کوئی رائے ہے یا نہیں، انہیں اس امر کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی کہ یورپی یہودی جس نوع کی "تکنیکی اور حرکی تہذیب" فلسطین میں متعارف کرا رہے ہیں، وہ اس کے نفوذ کے راستے میں کوئی روڑے اٹکا سکیں۔ اس قسم کا نکتہ پیش کرنے میں زیادہ آسانی رہتی، اگر وہ مثال کے طور پر براہِ راست یہ دعویٰ کر سکتا کہ (الف) عرب اتنے کم تر ہیں کہ وہ اپنی قسم آپ ہیں اور روئے زمین پر کہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔ (ب) عام عربوں کی اپنی نہ تو کوئی رائے ہے اور نہ ارادہ، وہ تو اپنے آقاؤں کے بے دام غلام ہیں۔ ان کے یہ آقا مایوس کن حد تک انحطاط پسند اور زوال پذیر جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان کی اپنی تعداد بہت قلیل ہے لیکن وہ عام لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں۔ تو دو ٹوک اور صاف صاف بات کہنے کی بجائے نی بور نے جو رویہ اختیار کیا ہے اتفاقی اعتبار سے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ" ارشاد کرتا ہے کہ اس نے جو دلائل پیش کیے ہیں، وہ نہ صرف اس "تکنیکی اور حرکی تہذیب" کی، جو صیہونی اپنے ساتھ لائے ہیں، وکالت

کرتے ہیں بلکہ اس نے تو عام عربوں (کے مفادات) کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔
چلیں، ہم اس حقیقت کا ذکر نہیں کرتے کہ نی بور اگر چاہتا تو فلسطینی عربوں کی حالیہ تاریخ میں اسے متعدد ایسی مثالیں دستیاب ہو سکتی تھیں جن سے اس بات کی نشان دہی ہوتی کہ عرب صیہونیوں اور صیہونیت کے خلاف کئی مرتبہ بے ساختہ علم بغاوت بلند کر چکے ہیں یا یہ کہ عرب کسانوں نے غیر حاضر عرب جاگیرداروں کے خلاف کئی مرتبہ یہودی آبادکاروں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن لاحاصل۔ جو بات اسے نظر نہیں آتی ـــــ بالکل اسی طرح جس طرح مارکس کو نظر نہیں آئی تھی جب وہ آج سے سو سال قبل ہندوستان میں مقیم انگریزوں کے متعلق اپنے خیالات قلم بند کر رہا تھا ـــــ وہ یہ ہے کہ جب "تکنیکی اور عصری تہذیب" بھی "مفلوک الحال عوام" کی زندگیوں میں نوآبادیاتی انداز سے در انداز ہوتی ہے تو اس سے قومی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ توقع ہونا چاہئے تھی (اور بعد کے سالوں میں یہ توقع نقش بر آب ہی ثابت ہوئی) کہ عیسائی دینیات کے ایک ماہر عالم فاضل شخص کو ۵، جس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی، اپنے نقطۂ نظر سے ہی سہی، اس حقیقت کا ادراک حاصل ہو جائے گا کہ فلسطین میں ایک یہودی آبادکار کی آمد سے ایک یا متعدد عرب باشندے اپنے گھر بار اور جائیدادوں سے محروم ہوں گے اور اسی تناسب سے انسانی حقوق بھی پامال ہوں گے۔ اور آخر میں ہمیں یہ توقع ہونا چاہیے تھا کہ نی بور "مفلوک الحال عوام" کی کچھ سننے اور ان کی خواہشات معلوم کرنے کی کوشش کریگا

---

۵ یہاں اشارہ نی بور ہی کی طرف ہے۔

یا کم از کم وہ اتنا ہی فرض کرے گا کہ ان (عرب عوام) کی کم و بیش فطری خواہشات میں یہ خواہش تو ضرور شامل ہو گی کہ انہیں ان کے گھروں اور جائیدادوں سے بے دخل نہ کیا جائے یا انہیں ایک برتر تہذیب سے متشددانہ انداز سے "مستفید" نہ کیا جائے۔

اگر نی بور جنوبی افریقہ یا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی علاقوں کی صورتِ حال کا ذکر کر رہا ہوتا، تو اس کے اس مشفقانہ رویے اور اس رویے میں مضمر نسلی مفاہیم کو قطعاً برداشت نہ کیا جاتا۔ اس صورتِ حال کو صحیح انداز سے سمجھنے اور پرکھنے کی ضرورت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نی بور (اور اس کے متعلق یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) اپنے متعلق اس حسنِ ظن میں مبتلا ہے کہ وہ ایک ترقی یافتہ یا ترقی پسند لبرل نقطۂ نظر کی ترجمانی کر رہا ہے۔ خیر، پھر ہمارے اذہان میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہو سکتا ہے، نی بور کو اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ فلسطین میں ہو کیا رہا ہے؟ یا (اور میرے خیال میں اصل بات یہی ہے) وہ حقیقتاً یہی سمجھتا ہو کہ ثقافتی اعتبار سے صیہونیت "عرب انحطاط پسندی" سے برتر اور افضل ہے۔

اب موقع ہے کہ میں دوسرے طریقے کے بارے میں ایک مثال پیش کروں۔ اس مثال سے اس امر کی وضاحت ہو جائے گی کہ صیہونیت کو اپنے تمام مثبت اور ایجابی پہلوؤں سمیت (مغرب میں) جو حمایت حاصل ہوئی تھی، وہ اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ فلسطین میں عربوں کی موجودگی کا اعتراف تو صرف بے دلی سے کیا جاتا تھا لیکن اپنے اس احساس کا بہت مثبت اور پسندیدہ انداز سے اظہار کیا جاتا تھا کہ صیہونیوں نے بہت اچھا

کیا کہ عرب فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ میں اس ضمن میں جو مثال پیش کر رہا ہوں، وہ ایڈمنڈ ولسن ؂۱ کی ہے۔ ثقافتی اعتبار سے ولسن کو نی بور سے کوئی کمتر مقام حاصل نہیں تھا اور نہ اسے ثقافتی اور تہذیبی اقدار کا اس سے (یعنی نی بور سے) کوئی کمتر ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ ایک لحاظ سے اسے نی بور پر کچھ تفوق ہی حاصل تھا کیونکہ وہ ادبیات، معاشرے، تاریخ اور اخلاقیات کا نہایت سمجھدار اور باذوق نامی گرامی نقاد تھا۔ وہ ان لوگوں کی ایک جیتی جاگتی مثال تھا، جنہوں نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنالیا ہوتا ہے کہ وہ تمام عمر مغربی (اور عالمی) تہذیب کے ان عناصر کے مابین امتیاز تلاش کرتے رہیں گے جو ایک طرف تو وہ ہوتے ہیں جو زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں اور دوسری طرف وہ ہوتے ہیں جو زندگی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں "بلکہ اسے پیچھے دھکیلتے ہیں (میں نے زندگی کے متعلق جو تراکیب استعمال کی ہیں، وہ جذباتی ضرور ہیں لیکن بہرحال میں نے انہیں استعمال کردیا ہے)۔ ولسن اور کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اس نے کبھی بھی مملکت، یا کسی ایسی چیز کے ساتھ جس میں جارحانہ وطنیت (اشووِنیت ؂۲) کا ذرا سا شائبہ بھی پایا جاتا ہو، یا جو روایت یا

؂۱ Edmund Wilson (1895-1972) معروف امریکی ادیب اور نقاد تھا۔

؂۲ شوونیت (Chauvinism) جنگ جویانہ اور متشدد حب الوطنی کا جذبہ جو شہنشاہ فرانس، نپولین، کی فوج کے ایک داستانی سپاہی نکولس شاوں CHAVIN کے نام سے موسوم ہے۔ اس قسم کی حب الوطنی میں اپنے وطن اور قوم کی تعریف تو جارحانہ اور غیر تنقیدی انداز سے کی جاتی ہے لیکن دوسروں سے نفرت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ اب اس لفظ کا اطلاق ایسے گروہوں پر بھی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں، مثلاً اگر کوئی مرد عورتوں کی صلاحیتوں کے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲ پر)

رسم و رواج کا درجہ اختیار کر چکی ہو، اپنا سلسلہ نہیں جوڑا تھا اور نہ اس نے کبھی یہ کہا تھا کہ اسے ان چیزوں کے ساتھ اتفاق ہے یا ان کے ساتھ اس کا کوئی دور کا بھی واسطہ ہے۔ اس کا ہر قاری ——— اور اس ملک (امریکہ) کا وہ ایک ایسا ادیب تھا جس کی کتابیں سب سے زیادہ پڑھی جاتی تھیں ——— اس کے اس رد یے سے خوب آگاہ ہوگا۔ ولسن کو یہودیوں، عبرانی (ادب و ثقافت) اور عہد نامہ عتیق [1] سے بطور خاص دلچسپی تھی۔ جب وہ ساٹھ کے پیٹے میں داخل ہوا، تو اس نے یہودیوں کے متعلق ایک مقالہ سپرد قلم کیا۔ دوسری باتوں سے قطع نظر اس نے اس مقالے میں ایک دعویٰ یہ کیا کہ "عبرانی انجیل میں جو جملے، تراکیب اور اسالیب بیان استعمال کیے گئے ہیں، اس میں جو رویائے صادقہ بیان کیے گئے ہیں، ان سے دنیا کی کسی اور قوم کی تہذیب اتنا متاثر نہیں ہوئی جتنا کہ پہلے انگریزوں اور بعد میں امریکی پیوریٹنوں

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۰۱: متعلق اچھی رائے نہ رکھے تو کہا جاتا ہے کہ وہ ہے یا مردانہ شوونیت کا اسیر ہے۔

[1] عیسائیوں کی مقدس کتاب "انجیل" دو حصوں پر مشتمل ہے، عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید۔ "عہد نامہ عتیق" یہودیوں کی مقدس کتاب "توریت" پر مشتمل ہے۔ حضرت عیسیٰ اپنی زندگی میں اسی پر عمل پیرا رہے۔ "عہد نامہ جدید" ان کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کے بعد ان کے مختلف حواریوں نے تحریر کیا تھا۔

[2] (Puritans) انگلستان میں جب پروٹسٹنٹ مذہب کو فروغ حاصل ہوا تو اس میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو چاہتا تھا کہ ملک کے سرکاری مذہب کے جو کلیسائے انگلستان" کہلاتا ہے، رسوم و عقائد کو سادہ بنایا جائے اور مذہبی امور میں شدید نظم و ضبط پیدا کیا جائے۔ اس طبقے کے انتہا پسندانہ نظریات نے (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۰۳)

کی[1] اس نے جس انداز سے عبرانی ادب و ثقافت کا مطالعہ کیا اور پھر بحر مردار[2] کے اڑدس ٹروس میں دریافت ہونے والے صحیفوں[3] پر جو کتاب لکھی، اس سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ اس پر یہودیوں اور یہودیت کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ یہ بجا ہے کہ اس قسم کا رویہ عام طور پر دوسروں کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرتا لیکن معاملہ جب اسرائیل کا ہو تو صورتِ حال ایک نیا رُخ اختیار کر لیتی ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۰۲: ملک کے اکثر لوگوں کو ان کا مخالف بنا دیا اور ان میں سے بیشتر لوگ سترھویں صدی میں امریکہ چلے گئے تاکہ وہ کسی قسم کی مخالفت کے بغیر اپنے عقائد پر عمل کر سکیں۔ ان لوگوں کا پہلا جہاز "مے فلاور" جس پر ایک سو دو اشخاص (جن میں اکتالیس مرد اور باقی ان کے بیوی بچے تھے) سوار تھے۔ اکیس دسمبر ۱۶۲۰ء کو امریکہ کے مقام پلائی ماؤتھ پر لنگر انداز ہوا۔ یہیں انہوں نے امریکہ کی پہلی نوآبادی قائم کی۔ یہ لوگ جدید امریکہ کے بانی کہلاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر ان کی اولاد آج بھی اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر تصور کرتی ہے بلکہ وہاں کا برہمن طبقہ بن چکی ہے

[1] A Piece of My Mind: Renectins at sixty از ایڈمنڈ ولسن۔ ناشر ڈبل ڈے اینڈ کمپنی، نیویارک (۱۹۵۸ء) صفحہ نمبر ۸۵

[2] فلسطین اور اردن کے مابین کھارے پانی کی جھیل۔ اس میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ روئے زمین کا سب سے نچلا مقام ہے۔

[3] بحر مردار کے: الٹریٹیڈ ورلڈ انسائیکلوپیڈیا (ناشر: بوبلی پبلشنگ کمپنی، نیویارک) کے مطابق (صفحہ نمبر ۲۱۲) ابتدا میں انجیل کے جو نسخے تحریر کیے گئے، وہ استدادِ زمانہ کے ساتھ ضائع ہو گئے بیسویں صدی کے وسط تک جو نسخے دستیاب تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جو ۳۲۵ء سے قبل تحریر کیا گیا ہو گا۔ تاہم ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے سالوں میں بعض عرب چرواہوں کو بحر مردار کے آس پاس غاروں میں ایسی تحریریں ملیں جو چمڑے کے کاغذوں یا جھلیوں پر (باقی صفحہ ۱۰۴ پر)

اپنی کتاب " سیاہ ، سرخ ، بھورا اور زیتونی "[۱] میں ولسن نے ایک طویل باب تحریر کیا ہے جس میں اس نے ایک ایسے انداز میں جس میں مصنف اپنے موضوع سے بار بار بھٹک جاتا ہے ، اپنے دورۂ اسرائیل کی تفصیل شرح و بسط سے بیان کی ہے۔ اس نے اپنی یادداشتیں اور تاثرات روزنامچے کی صورت میں قلم بند کیے ہیں۔ اس کا اسلوب بیان واقعاتی ضرور ہے لیکن اس کا ایک جھول یہ ہے کہ اس میں زیادہ تر تکنیک سے کام لیا گیا ہے اور بے ترتیبی صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس نے اسرائیل کے متعلق جتنی باتیں بھی تحریر کی ہیں،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳ : لکھی ہوئی تھیں ان کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ انجیل کے بعض قدیم ترین حصوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے بعض کے متعلق یہاں تک دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے دو سو سال پہلے تحریر کیے گئے تھے۔ یہ نسخے حکومت اردن نے بیت المقدس میں محفوظ کر دیئے تھے لیکن ۱۹۶۷ء میں جب مشرقی بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا تو یہ نسخے بھی اس کی تحویل میں چلے گئے۔ لاہور کے انگریزی روزنامہ "نیشن" کی گیارہ جون ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں کیتھ نرس (NURSE) کا ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان نسخوں کا ابھی عشر عشیر بھی شائع نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسرائیل کے یہودی ان پر اپنا حق جتا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ترتیب و تدوین ان کی ذمہ داری ہے لیکن ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ان نسخوں کی اشاعت سے عیسائیت اور یہودیت کے بعض بنیادی عقائد پر زد پڑنے کا احتمال ہے ، اس لیے چالیس سال گزرنے کے باوجود یہودی اور عیسائی علماء ان کی اشاعت پر رضامند نہیں ہو سکے اور آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔

[۱] Black, Red, Blond and Olive ناشر : آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نیو یارک : ۱۹۵۶ء۔

ان میں سے بیشتر ایسی ہیں، جن پر اس کے عبرانی ادبیات کے مطالعے اور یہودیت میں اس کی دلچسپی کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے (یعنی اگر اس نے ان چیزوں سے پہلے ہی مطالعہ نہ کیا ہوتا اور ان سے وہ اتنا متاثر نہ ہو چکا ہوتا، تو اس کا رویہ قطعی مختلف ہوتا) ایک مقام پر وہ (صہیونیوں کی) دہشت گردی پر حاشیہ آرائی کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ اسرائیل کی مملکت اسی دہشت گردی کے بل بوتے پر معرضِ وجود میں آئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس سارے قضیے میں کچھ باتیں قابل ملامت بھی ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ صہیونیوں کی یہ دہشت گردی "نازیوں کے ظلم و ستم اور برطانوی پالیسی کا شاخسانہ تھی" تاہم وہ ناپسندیدگی کے انداز سے مزید کہتا ہے کہ (صہیونیوں میں) "دہشت گردی کی عادت راسخ ہو چکی ہے"۔ اس میں "شدید مذہبی تعصب کا عنصر" شامل ہو گیا ہے۔ ولسن محض یہیں پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ معاملے کو کافی آگے لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ "اسرائیلیوں نے عربوں کے بارے میں جس قسم کی سنگدلانہ اور بے رحمانہ عدم رواداری کی علامتیں ظاہر کی ہیں، وہ بالکل اس ظالمانہ اور بے رحمانہ رویّے کی یاد دلاتی ہیں جو اسرائیل نوازوں نے ان لوگوں (عربوں) کے متعلق اختیار کیا تھا، جنہیں انہوں نے اپنے گھروں اور جائیدادوں سے بے دخل کر دیا تھا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ بے دخلی کی حقیقت کے متعلق ولسن کوئی واضح موقف اختیار نہیں کر سکا ہے سوائے اس کے کہ اس نے انجیل کا یہ جملہ دہرا دیا ہے کہ "بس ایسا ہو گیا"۔ اس کے اس اندازِ فکر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بے دخلیوں کا عمل ہو رہا ہے، اس نے ان کے متعلق ایک خاص قسم کی غیر جانبداری اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن اس موقع پر ہمیں یہ بات رہ رہ کر یاد آ رہی ہے کہ جب ولسن اپنے ان خیالات اور تاثرات کو الفاظ کا جامہ پہنا رہا تھا، وہ حقیقتاً اس خطے میں موجود تھا جہاں بے دخلیوں اور عدم رواداری کا عملاً مظاہرہ ہو رہا تھا۔ ایک دو جملوں

کے بعد جب ہم اس کی مندرجہ ذیل تحریر پڑھتے ہیں تو (اچانک) ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ انجیل کا تو ذکر ہی نہیں کر رہا۔

چنانچہ اسرائیل میں عربوں ــ خاص طور پر جب ہم انہیں ملک کے اندر دیکھتے ہیں ــــ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک ایسی قوم نظر آتے ہیں جو تند خو اور آتش مزاج ہونے کے باوصف ابھی تک اپنی دلکشی اور دلفریبی تو برقرار رکھے ہوئے ہے لیکن ذہنی اعتبار سے اس کی صلاحیتوں کو زنگ لگ چکا ہے اور ان صلاحیتوں کو نکھارنے کا اسے یارا ہی نہیں رہا۔ ملک کے اکثریتی طبقے سے اس قوم کا تعلق منقطع ہو چکا ہے مگر مسلسل ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ عربوں کے عکہ جیسے بڑے قصبے کے پُر ہجوم گلی کوچوں کی غلاظت کو دیکھ کر ایک اسرائیلی کو بالکل اس طرح گھن آتی ہے جس طرح ایک مغربی سیاح کو۔ کیونکہ جب یہودی، جو خاندانی تعلقات کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں اور جنہوں نے اسرائیل میں پولینڈ اور جرمنی سے آنیوالے یتیموں اور ناگفتہ بہ تراش یمنیوں کے بچوں کو اتنی محنت سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا ہے، علم سے بے بہرہ اور بیماریوں کے ستائے ہوئے غلیظ اور گندے عرب بچوں کے غول کے غول دیکھتے ہیں جو تنگ و تاریک اور غلاظت سے بھرپور گلیوں میں چیختے چلاتے اور بھیک مانگتے پھرتے ہیں، تو ان پر ایک قسم کی اخلاقی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں یہودیوں کے فقیہوں نے شادی نکاح پر جو قدغنیں لگائی تھیں اور گوناگوں قسم کی جو کڑی شرائط عائد کی تھیں (آج کل کے زمانے میں) وہ ہمیں بہت سخت اور جابرانہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عربوں کو طلاق کی اتنی آسانیاں حاصل ہیں اور پھر انکی عادات بھی خانہ بدوشانہ ہیں جس سے کسی خاندان کے

باپ کو یہ ترغیب ملتی ہے کہ جب اس کا جی چاہے، وہ بیک جنبشِ ابرو اپنی بیوی اور آل اولاد کو چھوڑ سکتا ہے اور کسی دوسرے مقام پر جا کر کسی دوسری عورت کو اپنے گھر بسا سکتا ہے، تو ہمیں یہ برائی پہلی برائی سے بدتر محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہر اس شخص کے دل میں جس نے مغرب میں تربیت پائی ہے، عربوں کے لیے جو حقارت امنڈتی ہے، وہ فطری نہیں ہے اور نہ یہ بات ہے کہ اسرائیل جو ظالمانہ کارروائیاں کرتا ہے، باہر ملک میں آباد عرب پناہ گزیں اپنی احمقانہ ہٹ دھرمیوں سے ان کا احمقانہ جواب فراہم نہیں کرتے۔ اقوام متحدہ کی ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی نے انہیں بار بار یہ پیشکش کی کہ اگر آپ دوسرے مقامات پر آباد ہونا چاہیں تو ہم آپ کی ہر طرح کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن وہ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس قسم کی ہر پیشکش کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں اور طوطے کی طرح ایک ہی بات کی رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ ہم تو اسرائیل میں ہی اپنے دیہاتوں اور زمینوں پر واپس جائیں گے۔ یہاں میں اس خاص رویے کا ذکر کر رہا ہوں جو اسرائیل کے یہودیوں میں پنپ رہا ہے اور ان کا طرۂ امتیاز بنتا جا رہا ہے۔ یہ اسی رویّہ کا نتیجہ ہے کہ یہودی غیر یہودیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا نہیں چاہتے بلکہ وہ اسرائیل کو صرف اور صرف یہودی مملکت بنانے پر مُصر ہیں۔ یہ رویہ ایک قوم (یا شخص) کو خاص حد بندیوں میں جکڑ دیتا ہے اور بعض اوقات اس کے اثرات تباہ کن ہوتے ہیں۔ تاہم اس رویے کے برعکس یہودی روایت میں جو حیات بخش عناصر پائے جاتے ہیں، ان کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ ؎

؎ "Black, Red, Blond and Olive" صفحہ نمبر ۳۶۲-۳۶۲

جہاں تک یہودیوں کے اس رویے کا تعلق ہے جس کا ذکر ولسن نے اوپر کیا ہے کہ وہ غیر یہودیوں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہنا چاہتے، اگر وہ اس رویے کو عربوں کے بارے میں اپنائیں تو اسے (ولسن کو) ان کے اس رویے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اس نے عربوں کی جو مختصر تصویر کشی کی ہے، اس میں وہ مکمل طور پر کریہہ، بدصورت اور غیر دلکش نظر آتے ہیں۔ عربوں کی فلاکت اور مفلسی کے پس پردہ جو عوامل کار فرما ہیں، ولسن کو وہ اتنے اہم نظر نہیں آتے جتنی کہ اس فلاکت اور مفلسی کی موجودگی۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اسے ان عربوں کے بارے میں، جو اسرائیل میں موجود ہیں، حقائق معلوم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ جہاں تک عربوں اور خاندان کے بارے میں ان کے احساس (محبت یا لاتعلقی) کے متعلق اس (ولسن) کی باتوں کا تعلق ہے، تو یہ باتیں صرف اس طرح سمجھ میں آسکتی ہیں جس طرح کوئی اس قسم کی (مہمل اور بے سروپا) باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ "مشرقیوں" کو انسانی زندگی کا اتنا احساس نہیں جتنا کہ "ہمیں" ہے۔ دوسرے الفاظ میں ولسن کی باتوں کا مطلب یہ ہے کہ عرب بچوں کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ وہ محبت اور نفرت کے احساسات سے عاری ہیں۔ وہ تو بس ایسے جانور ہیں جن کا کام جلدی جلدی بچے پیدا کرنا ہے۔ عربوں کے متعلق جو ایک "خاص قسم کی حقارت" محسوس کی جاتی ہے، اس کا دائرۂ عمل اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ جب عرب فلسطینی کسی دوسرے مقام پر آباد ہونے سے انکار کرتے ہیں بلکہ اس معاملے میں "ہٹ دھرمی" کا مظاہرہ کرتے ہیں، تو ان پر "احمق" ہونے کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ لیکن آدمی کو شدید ترین غصہ اس وقت آتا ہے جب ذکر اس سلوک کا آتا ہے جو ۱۹۴۸ء اور اس کے بعد یہودیوں نے ان عربوں کے ساتھ روا رکھا تھا جو اپنے گھر بار چھوڑ کر

بھاگے نہیں تھے۔ یہاں وہ صریحاً بددیانتی اور جھوٹ کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ صرف یہ کہہ کر بات ٹال دیتا ہے کہ یہودی غیر یہودیوں کے ساتھ مل جل کر رہنا نہیں چاہتے۔ (حالانکہ حقائق محض یہی نہیں تھے بلکہ ان سے قطعی مختلف تھے)۔

جس زمانے میں ولسن اسرائیل کی سیر و سیاحت کر رہا تھا، عربوں پر جن قوانین کا اطلاق کیا جاتا تھا وہ ایمرجنسی ڈیفنس ریگولیشنز[۱] تھے۔ ابتداً یہ قوانین انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت کے دوران میں وضع کیے اور نافذ کیے تھے انگریزوں نے یہ قوانین عربوں اور یہودیوں دونوں کے خلاف استعمال کرنا تھے (جب اسرائیل کے قیام کے بعد حالات تبدیل ہو گئے تو) یہ قوانین علانیہ نسل پرستانہ صورت اختیار کر گئے کیونکہ اسرائیل میں انہیں کبھی بھی یہودیوں کے خلاف استعمال نہیں کیا گیا۔ اسرائیل نے ۱۹۴۸ء میں انہیں عربوں کو قابو میں رکھنے کے لیے برقرار رکھا۔ ان قوانین کے تحت انہوں نے عربوں کی آزادانہ نقل و حرکت پر پابندیاں لگائیں۔ اور انہیں زمینیں خریدنے، اپنی آبادکاری کرنے وغیرہ کے حقوق سے محروم کیا۔ برطانوی دورِ حکومت کے دوران میں یہودی نہایت باقاعدگی کے ساتھ ان قوانین کی مذمت کرتے رہتے تھے اور یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ یہ قوانین سامراجی اور نسل پرستانہ ہیں۔ لیکن جونہی ان کی مملکت، اسرائیل، معرضِ وجود میں آئی، انہی قوانین کو عربوں کے خلاف استعمال لیا گیا۔ ان باتوں کے متعلق ولسن کے پاس کہنے کو ایک لفظ بھی نہیں۔ ولسن نے جس فروگذاشت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ اگر حقائق چاہئیں تو وہ بآسانی صابری جریس کی کتاب 'اسرائیل کے عرب'[۲] میں دستیاب ہو سکتے

---

[۱] ہنگامی دفاعی قوانین۔

[۲] Sabri Jiryis: "The Arabs in Israel trans. Inea Engler (New York: Monthly Review Press, 1976)

ہیں - پھر خود صیہونیوں کی ایسی تصانیف کا فقدان نہیں جن میں صاف صاف اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ اسرائیلیوں نے عربوں کو دبانے اور اپنی مطلب براری کے لیے ان سابقہ سامراجی قوانین کو کس قدر غلط طریقے سے استعمال کیا۔

سب سے بڑھ کر ولسن کی اس تصنیف میں جو بات واضح ہو کر ابھرتی ہے، وہ یہ حقیقت ثابتہ ہے (اگرچہ وہ علانیہ تو اسے حقیقت ثابتہ نہیں کہتا لیکن بین السطور مطلب یہی نکلتا ہے) کہ جس شخص، خاص طور پر اگر وہ شخص روشن خیال اور انسان دوست ¹ لبرل ہو، کا جی چاہے، وہ مشرق وسطیٰ کے حالات کے متعلق اپنے خیالات کا تحریری اظہار کر سکتا ہے، تقریریں کر سکتا ہے، بحثیں کر سکتا ہے اور اپنی ماہرانہ رائے دے سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ انیسویں صدی میں اگر کوئی شخص مشرق وسطیٰ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا تو اس کی نگاہیں مستشرقین کی طرف اٹھتی تھیں کہ انہی کو ماہر علوم تصور کیا جاتا تھا۔

---

¹ یہ انگریزی لفظ humanistic کا ترجمہ ہے۔ humanism اصل میں ایک تہذیبی اور ذہنی تحریک تھی جو پندرھویں سولھویں صدی میں تحریک احیائے علوم کے شاخسانے کے طور پر وجود میں آئی۔ زمانۂ قدیم کے یونانی اور رومی ادبیات، فنون لطیفہ اور فلسفیانہ افکار کے مطالعہ نے مغربی دانشوروں اور مفکروں کو مذہبی نقطۂ نظر ترک کرنے اور سیکولر نقطۂ نظر اختیار کرنے کی طرف مائل کیا۔ اب خدا کائنات کا مرکز نہ رہا، بلکہ انسان اس کا مرکز قرار پایا، اس لیے توجہ بھی اسی کی بھلائی اور بہتری پر مرکوز ہونا چاہیے۔ چنانچہ مغرب میں لادینی خیالات پھیلانے میں اس تحریک نے اہم کردار کیا۔ تاہم اس تحریک کے محرکین اور مؤیدین اپنے آپ کو انسان دوست اور انسان شناس قرار دیتے ہیں اور انسانی اقدار کو پھیلانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مصنف نے یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

لیکن بیسویں صدی میں اس صورتِ حال میں زبردست تبدیلی رونما ہو گئی۔ فی زمانہ اگر کسی شخص کو مشرق (اور مشرقیوں) کے متعلق کوئی معلومات درکار ہوں، تو اس کی نگاہیں صیہونیوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ چنانچہ مشرق وسطیٰ میں ولسن جو کچھ دیکھتا ہے —— بلکہ اس بارے میں کوئی بھی مغربی شخص جو عام طور پر دیکھتا ہے —— وہ یہودی تناظر میں دیکھتا ہے۔ ان کے نزدیک اسرائیل ہی معیار ہے، اسرائیلی (موقع پر) موجود ہیں، ان کے خیالات و تصورات اور ادارے مستند طور پر مقامی ہیں۔ عرب وبالِ جان اور باعثِ آزار ہیں۔ فلسطینیوں کی حقیقت نیم افسانوی ہے (اور دلیل کو مزید آگے بڑھا کر یہاں تک فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے کہ ان کی حقیقت محض پراپیگنڈہ ہے ورنہ ان کا کوئی وجود نہیں) وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات تو فراموش کر دی جاتی ہے کہ اسرائیل معرضِ وجود میں کیسے آیا تھا۔ (البتہ تان جس بات پر ٹوٹتی ہے، وہ یہ ہے کہ) اسرائیل ایک مغربی جمہوریت ہے کہ یہود مخالف عرب خواہ مخواہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ یوں اصل حقیقت تو نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور اس کے بالکل برعکس جو صورتِ حال ہے، وہ مکمل حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آ جاتی ہے۔ میں نے اوپر کے صفحات پر کہیں یہ عرض کیا تھا کہ صیہونی "سچائی" کو تحلیل کرنے کے عمل میں مصروف رہتے ہیں، تو ولسن نے جو رویہ اختیار کیا ہے، وہ ان کے عمل کی عظیم ترین کامیابی کی مثال ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ولسن نے عربوں کے متعلق جو باتیں تحریر کی ہیں، وہ نادرست نہیں بلکہ وہ ان معنوں میں بالکل درست ہیں کہ وہ ان باتوں کی ہو بہو اور لفظ بلفظ نقل ہیں جو اسرائیلی (مغربی آبادکاروں کی حیثیت سے جو ایک پسماندہ خطے میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں) عربوں اور ان کی "خانہ بدوشانہ" عادات کے متعلق اپنے خیالات و محسوسات کے ذریعے انڈیلتے رہتے ہیں۔

لیکن (حقائق کی) تحریف اتنی مکمل ہے کہ ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اسرائیلیوں اور عربوں کے مابین جس قسم کے تعلقات پائے جاتے ہیں، وہ فطرت کے حقائق نہیں، بلکہ وہ نتیجہ ہیں ایک مخصوص اور مسلسل عمل کا، جس کے ذریعے لوگوں کو اپنے گھروں سے باہر نکال دیا جاتا ہے، انہیں اپنی املاک سے محروم اور بے دخل کر دیا جاتا ہے اور اس طرز عمل کے پیچھے جو عوامل کار فرما ہیں، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نو آبادیاتی اور عملاً (defacto) نسلی امتیاز پر مبنی ہیں، مزید بر آں، ہم یہ بھی فراموش کرنے لگتے ہیں کہ صیہونی (مقامی باشندے نہیں تھے بلکہ) یورپ سے فلسطین میں وارد ہوئے تھے۔

نیابت کا مسئلہ

یہاں میں جو بات کہنے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ ولسن جیسے اشخاص کی تحریریں عین عین اس سیاسی حقیقت کی عکاسی کرتی ہیں جس کا پرتو میرے خیال میں امریکہ کے اس طبقے کی جو اپنے آپ کو روشن خیال لبرل جمہوریت کا علمبردار تصور کرتا ہے، روزمرہ کی گفتگو اور تحریر و تقریر میں دکھائی دیتا ہے اور سیاسی حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے لبرل طبقے اور صیہونیوں اور اسرائیلیوں کے بالادستی کے نظریات کے مابین ایک کلی مطابقت بلکہ امتزاج موجود ہے۔ میں نے لفظ "بالادستی" عمداً استعمال کیا ہے اور جس طرح میں نے یہ لفظ استعمال کیا ہے، اس میں ان تمام مفاہیم کی گونج شامل ہے، جو اطالیہ کے اس عظیم مارکسی دانشور، انتونیو گرامشی[1]

---

[1] انتونیو گرامشی (۱۸۹۱ء-۱۹۳۷ء) ایک اطالوی مصنف۔ ابتدا میں جمالیات کے مشہور اطالوی ماہر کروچے سے متاثر ہوا۔ پھر مارکس اور اینگلز کا مطالعہ کیا اور کمیونسٹ بن گیا۔ لینن کے ساتھ بھی کچھ عرصہ کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۱ء میں بالمیرو تغلیاتی کے ساتھ (بقیہ صفحہ ۱۱۴ پر)

(Gramsci) کی، جس نے سیاست (کے میدان) میں ثقافت اور دانش وروں کی اہمیت کا تجزیہ کیا ہے، تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ "بالادستی" کے ایک مفہوم کی تفصیلی تشریح کرتے ہوئے گرامشی نے اس کے ساتھ رضامندی کا تصور منسوب کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، بالادستی محض تغلب سے ہی قائم نہیں ہوتی بلکہ (بعض اوقات) اس میں (مغلوب کی) رضامندی، تسلیم اور منظوری بھی شامل ہوتی ہے۔ جیسا کہ نی بور اور ولسن کی مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط تک مغرب کے لبرل طبقے اور صیہونیوں کے خیالات میں کسی قسم کا بُعد باقی نہیں رہا تھا بلکہ دونوں کے نقطۂ نظر میں برضا و رغبت اس قسم کی مماثلت پیدا ہو چکی تھی کہ من تو شدم، تو من شدی کی کیفیت ہو گئی تھی۔ یہ مماثلت کیوں پیدا ہوئی؟ اس کی وجوہ بہت پیچیدہ ہیں (اور اس کا شاید کوئی قابلِ قبول جواز بھی موجود ہو)، لیکن جہاں تک فلسطینی عربوں کا تعلق ہے، ان کے لیے اس بالادستانہ تعلق کا ٹھوس مطلب تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس بارے میں کوئی دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ صیہونیت اور مغرب کے لبرل ازم کے مابین جو مماثلت وجود میں آئی، اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ نکلتا تھا کہ جس حد تک کوئی عرب باشندہ فلسطین میں اپنی املاک اور گھر بار سے بے دخل اور محروم ہو چکا تھا۔ اسی

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۱۳: مل کر کمیونسٹ پارٹی آف اٹلی قائم کی۔ اسی سال وہ اٹلی کی پارلیمنٹ کا رکن بھی منتخب ہو گیا۔ چونکہ وہ کھلی تیغ رکھے اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی پر تنقید کرتا تھا۔ اس لیے ۱۹۲۶ء میں اسے نظر بند کر دیا گیا۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں اسے رہائی تو نصیب ہو گئی لیکن چند ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

گرامشی کمیونسٹ پارٹی کا نظریہ ساز تھا۔ اس کی مشہور ترین کتب "خطوطِ زندان" (۱۹۴۷ء) اور "جدید شہزادہ" (۱۹۴۹ء) اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔

حدتک وہ "ناشخص" (non person) بن چکا تھا کیونکہ (اب) فلسطین میں خود صہیونی (اس کی جگہ) واحد شخص بن چکا تھا اس بنا پر کہ عرب باشندے کی منفی شخصیت (مشرقی، انحطاط پسند، فروتر) عیاں تر ہو گئی تھی۔ لبرل مغرب کو صہیونیت میں تعقل، خرد اور عینیت [1] کی کامرانی نظر آتی تھی۔ لبرل ازم کو صہیونیت میں)

---

[1] عینیت یا مثالیت یا آئیڈیلزم (Idealism): فلسفے میں دو اصطلاحیں ـــ مادیت اور عینیت ـــ عام استعمال کی جاتی ہیں۔ "مادیت" کے ماننے والوں کے مطابق دنیا میں مادے کے سوا اور کوئی جوہر موجود نہیں۔ اس عقیدے کے مطابق شعور اور ارادہ بھی مادے ہی کے مظاہر ہیں۔ فلسفے کا آغاز بھی مادیت پرستی سے ہی ہوا تھا۔ جب پہلی مرتبہ انسان دیو مالائی طرزِ فکر و احساس سے آزاد ہوا اور اس نے دیوتاؤں کی مدد کے بغیر خود غور و فکر کا کام شروع کیا تو فلسفہ وجود میں آیا۔ یونان کے ابتدائی مفکرین سبھی کے سبھی مادہ پرست تھے۔ پھر افلاطون علمی افق پر نمودار ہوا۔ فلسفے کی تاریخ میں وہ پہلا شخص ہے جس نے مادی کائنات کو ایک عالم امثال کا عکس قرار دیکر مادیت کی روایت سے انحراف کیا اور عینیت (مثالیت) کی بنیاد ڈالی۔ مادیت پرستوں کے خیال میں مادہ تمام کائنات پر محیط ہے۔ مادہ ازلی اور غیر فانی ہے۔ مادے میں حرکت کی صلاحیت موجود ہے اور یہ حرکت مقررہ قوانین کے تحت ہو رہی ہے۔ دوسری اشیاء کی طرح شعور اور ذہن بھی ایٹمی ذرات سے مرکب ہیں لیکن کائنات میں کوئی ذہن یا شعور کارفرما نہیں دوسرے الفاظ میں اس کائنات پر کوئی آفاقی یا ربانی قوت حاوی نہیں۔

اس کے برعکس "عینیت پسندوں کا نظریہ یہ ہے کہ اصل حقیقت مادہ نہیں بلکہ خیال یا ذہن اصل حقیقت ہے، مادہ تو محض خیال کا عکس ہے۔ یہ مادی کائنات جسے ہم اپنے حواس کے ذریعے معلوم کرتے ہیں، اصل کائنات نہیں بلکہ یہ اس کائنات کا محض ایک عکس ہے جو ہماری مادی کائنات سے ماوراء ہے۔ چنانچہ اپنی نمود (بقیہ صفحہ نمبر ۱۱۶)

بس یہی کچھ دکھائی دیتا تھا اور کچھ نہیں (کیونکہ یہ زیادہ تر دیکھا ہی یہی کچھ جاتا ہے) - (دوسری طرف اصیہونیت کو لبرل ازم میں اپنے متعلق وہی کچھ نظر آتا تھا، جس کا عکس وہ دنیا پر ڈالنا چاہتی تھی۔ دونوں ہی صورتوں میں (بحیثیت انسان) عربوں کا اخراج ہو گیا۔ اب اگر ان کی کوئی تصویر باقی بھی ہے تو محض اتنی کہ وہ وبال جان ہیں، منفی سوچ اور کردار کے مالک ہیں اور اقدار "بد" کے نمائندے ہیں۔ سیدھی سادھی معاشیات پر نظریے نے کس طرح تفوق حاصل کیا، بلکہ اسے پاؤں تلے مسل ڈالا، یہ اس کی انوکھی اور بے نظیر مثال ہے۔ کیونکہ اب تک جو حالات رونما ہوئے ہیں، ان کے پیشِ نظر خالص معاشی وجوہ کی بنا پر (اور اسرائیل اور صیہونیوں کو جو بے حد و حساب امداد دی گئی ہے، اگر اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بھی) اسرائیل (کا قیام) ایک عظیم سانحہ ثابت ہوا ہے لیکن چونکہ اس کے متعلق یہ باور کیا جاتا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۱۵: کے لیے مادہ ذہن کا محتاج ہے اور یہ ذہن ہی مادے کا خالق ہے۔ کوئی شے موجود ہے یا نہیں، اس کا انحصار میرے علم پر ہے اور میرے پاس جو علم ہے، وہ میری ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ میری ذہنی کیفیت ہی کا وجود حقیقی ہے۔ اس نظریے کے ماننے والے ایک مقام پر پہنچ کر یہ دعویٰ بھی کرنے لگے کہ مادے کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ یہ جو خارجی کائنات ہے اور جسے عام طور پر مادے پر مشتمل سمجھا جاتا ہے، خلا (اور کسی حد تک انسان) کے ذہن سے آزاد اپنا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی۔

اپنی انتہا پر پہنچکر دونوں نظریات اخلاقیات کی تمام سرحدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ البتہ "عینیت" کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ نامطلق اقدار سے انحراف کرتا ہے اور نئی اقدار اور نئی منازل کی راہ دکھاتا ہے۔ یوں یہ انسان کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے آمادہ عمل کرتا ہے۔ اس کا یہ پہلو انسانی جد و جہد میں ہمیشہ مرکزی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ یوں صیہونیت بھی اس کے ماننے والوں کیلئے "عینیت" بنجاتی ہے

Rara.

کہ خرد و تعقل کے ہراول دستے کی حیثیت سے یہ کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے، اس لیے اس کو مزید اور مزید تر امداد دینے کا جواز موجود ہے اور اس کا قیام بھی صحیح سے صحیح تر ثابت ہو چکا ہے۔ حالانکہ جن وجوہ کی بنا پر اس کے قیام و بقا کو صحیح ثابت کیا جاتا ہے، وہ روز بروز سکڑتی جا رہی ہیں۔

ٹی گور اور ایڈمنڈ ولسن بالترتیب (موجودہ صدی کے) پانچویں اور چھٹے عشرے کی پیداوار ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اسرائیل کی سرحدیں بے حد وسیع ہو گئیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس کے زیر تسلط عرب باشندوں کی تعداد بھی بڑھ کر تقریباً دس لاکھ ہو گئی۔ فلسطینیوں کی اس نئی واقعیت سے کوئی شخص بھی، اور اسرائیل تو بالکل ہی نہیں، نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ اب ہر اس شخص پر، جو یہودی نہیں تھا، لفظ "عرب" چسپاں کرنے سے کوئی بات نہیں بنتی تھی۔ ایک طرف تو اسرائیل میں "پرانے" عرب موجود تھے۔ پھر (جنگ ۱۹۶۷ء کے بعد) مغربی کنارے اور غزہ کے نئے باشندے ان میں شامل ہو گئے۔ دوسری طرف جنگ جو حریت پسند (جنہوں نے بعد میں تحریک آزادی فلسطین ——— پی ایل او ——— کا روپ دھارا) اور کئی دوسری مختلف برادریاں اور طبقے تھے جو لبنان، اُردن، شام اور خلیجی ریاستوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ حقیقی (فلسطینی) علاقوں اور لوگوں پر اسرائیل کا فوجی تسلط بیس سال سے زیادہ عرصے سے قائم ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مغربی کنارے کو جودیہ اور سماریہ[1] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن وہاں جو لوگ موجود ہیں، انہیں آسانی سے، کم از کم فی الحال تو نہیں، تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ صیہونیت / لبرل ازم کے راستے کی نئی رکاوٹ قبضے کا مسئلہ

---

[1] یہودی دنیا نے اُردن کے مغربی کنارے کو جودیہ سماریہ کہتے ہیں۔ جبکہ فلسطینی اسے "الضفۃ الغربیہ" کہتے ہیں۔

ہے۔ اسرائیل یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ فوجی قبضے کا درحقیقت مطلب یہ ہے کہ "مل جل کر رہا جائے"۔ یہ تصور اتنا سہانا ہے کہ ایک مرتبہ "نیویارک ٹائمز" نے بھی اس پر نہایت جوش و خروش سے صاد کر دیا۔ چنانچہ اس نے اپنے ۲ مئی ۱۹۷۶ء کے شمارے میں اپنے اداریتی کالموں میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے "عربوں کا پراپیگنڈہ کرنے والوں" کی شدید مذمت کی اور ان پر الزام لگایا کہ وہ ہر قسم کی نہایت گھناؤنی اور ذلیل حرکتوں کا ارتکاب کر رہے ہیں (عربوں کے ان حامیوں کی "ذلیل ترین حرکت" یہ تھی کہ وہ کھلے بندوں اسرائیل کو اس بات پر مطعون کرتے تھے کہ اس نے عربوں کے علاقے پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے)۔ اس (نیویارک ٹائمز) نے اسرائیل کے سرکاری نقطۂ نظر کی جگالی کرتے ہوئے (بڑی ڈھٹائی کے ساتھ) یہ اعلان کیا کہ مغربی کنارے اور غزہ پر (اسرائیل کا) فوجی قبضہ سابق فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے مابین "آئندہ تعاون کے لیے ایک نمونہ اور مشعل راہ" ثابت ہوگا۔ کسی دوسرے متن کے حوالے سے اس قسم کی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ فوجی قبضے کو لوگوں کے مابین اچھے اور خوشگوار تعلقات کا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا، اسے ایک ایسی سکیم کے طور پر آگے بڑھایا گیا جس پر ایک مشترکہ مستقبل کی تعمیر کی جا سکتی تھی، بالکل اسی انداز سے، جس طرح "خود اختیاری" (آٹانومی) کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ ارتز اسرائیل[1] کے عرب حقیقتاً یہی چاہتے ہیں۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ ہمیں ایک مرتبہ پھر جس مسئلے کا جائزہ لینا ہوگا، وہ نمائندگی کا

---

[1] "ارتز اسرائیل": عبرانی ارتز لفظ "ارض" کی ہی ایک شکل ہے۔ چنانچہ لغوی طور پر ارتز اسرائیل کے معانی "ارض اسرائیل" ہی ہیں لیکن مجازاً (یہودیوں کے نزدیک) اس سے مراد وہ تمام علاقے ہیں جو کبھی یہودی مملکت کا حصہ تھے۔ چنانچہ آج کل اسے "عظیم تر اسرائیل" کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مسئلہ ہے ۔ اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمیشہ فلسطین کے مسئلے کے آس پاس گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے ۔ میں یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ صہیونیت ہمیشہ فلسطین اور فلسطینیوں کی ترجمانی کا فریضہ اپنے ذمے لیتی رہتی ہے ۔ اور اس کا مطلب ہمیشہ یہی رہا ہے کہ یہ ایک ناکے بندی کا عمل ہے ۔ یعنی اس عمل کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ عالمی سٹیج پر فلسطینیوں کی آواز براہِ راست نہیں سنی جا سکتی اور نہ وہ دنیا کے سامنے بلاواسطہ اپنی نمائندگی کر سکتے ہیں ۔ جس طرح ایک ماہر مستشرق کا یہ ایمان تھا کہ جن مقامی باشندوں اور قدیم قبیلوں (کی بود و باش ، رہن سہن ، طرزِ معاشرت وغیرہ) کا اس نے مطالعہ کیا ہے صرف وہی ان کی ترجمانی (گو پدرانہ شفقت کے ساتھ) کر سکتا ہے ـــــ اس کی موجودگی ، ان کی عدم موجودگی پر دلالت کرتی تھی ـــــ چنانچہ صہیونی بالکل اسی انداز سے دنیا کے سامنے فلسطینیوں کی ترجمانی کرتے تھے ۔ لیکن اس قسم کا رویہ ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے ممکن نہیں ۔ چنانچہ وہ تمام تحریکیں جو جنگِ عظیم دوم کے بعد مختلف قسم کی شورشوں اور باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوئیں ، اس امر کو بخوبی سمجھ چکی ہیں اور اسے اپنے حق میں استعمال کر چکی یا کر رہی ہیں ۔ ایک ایسے عہد میں ، جب اطلاعات دنیا کے گوشے گوشے میں بآسانی اور بعض اوقات فوراً اسی وقت پہنچ جاتی ہیں ، سنسنی خیز گوریلا کارروائیاں اور دہشت گردی کے "کارنامے" اپنی بات "براہِ راست" پہنچا سکتے ہیں ، اپنی نمائندگی بلاواسطہ کر سکتے ہیں ، خواہ ان کے اردگرد کتنے ہی حصار کیوں نہ کھڑے کر دیئے جائیں اور ان کے وجود کو نگاہوں سے اوجھل کرنے کے کتنے ہی جتن کیوں نہ کیے جائیں ۔ وقت آنے پر ، ان کی موجودگی ، جسے دبانے کی اتنی کوششیں کی گئیں ، چھن چھن کر باہر آنے لگتی ہے اور اپنے اردگرد باندھے ہوئے حصار یا ناکہ بندی کو توڑنے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے ۔ اور یہ بات اس وقت اور بھی صحیح ثابت ہوتی ہے جب ان کی موجودگی کا سرے سے ہی انکار کر دیا جائے

اسرائیلیوں کی ایک واضح اکثریت کے ساتھ یہی کچھ ہوا تھا۔ جن لوگوں کی موجودگی سے جو تازہ ترین انکار کیا گیا ہے، وہ فلسطینی ہیں۔ اپنے روزِ قیام سے صہیونیت نے جن جن غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے، یہ انکار اس کی عظیم ترین (لیکن ناگزیر ترین) غلطی ثابت ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تفصیلی ذکر میں اگلے باب میں کروں گا۔ یہاں میں صہیونیوں اور مغرب کے لبرل طبقے کی بالادستی کے بارے میں اتحاد کی چند حالیہ مثالیں پیش کروں گا، تاکہ مثالوں کا وہ سلسلہ، جن کا آغاز میں نے نی پورا اور ولسن سے کیا تھا، مکمل ہو جائے۔

میرا خیال ہے کہ یہ بات عمومی طور پر درست ہے کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ امریکی رائے عامہ کے نزدیک کون سے خیالات قابلِ قبول ہو سکتے ہیں اور سیاسی طور پر انہیں صحیح ہونے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے، تو آپ کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ کون کس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ صحیح نتیجے پر پہنچنے کا یہ تقریباً بے خطا پیمانہ ہے۔ امریکہ کے بعض چیدہ چیدہ حلقوں میں ویت نام کے قومی محاذِ آزادی (نیشنل لبریشن فرنٹ) کے مؤقف کو جو زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور اسے جس پرزور طریقے سے حق و انصاف کے عین مطابق ٹھہرایا گیا، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ویت نام میں امریکی مہم جوئی کے خلاف جن لوگوں نے آواز بلند کی، ان میں سے متعدد شخصیات ایسی تھیں، جو انتہائی بلند مقام کی حامل تھیں، تقریباً ہر شخص ان کے نام اور کام سے آگاہ تھا، ہر کوئی ان کے چہروں سے شناسا تھا، انہیں معاشرے میں شہرت اور عزت حاصل تھی۔ چنانچہ اگر ڈاکٹر سپوک [1]، جین فونڈا [2]،

---

[1] سپوک۔ پورا نام Benjamin McLane Spok ہے سالِ پیدائش ۱۹۰۳ رہے یہ شخص امراض اطفال کا ماہر معالج ہے تعلیمی امور پر سند کی حیثیت رکھتا ہے اور کئی کتابوں کا مصنف ہے۔

[2] جین فونڈا (Jane Fonda) مشہور و معروف امریکی ایکٹر ہنری فونڈا کی بیٹی (بقیہ صفحہ ۱۲۱ پر)

نوئیم چومسکی[1] اور سینٹر میک گورن[2] تمام کے تمام ایک ہی چیز کی مذمت کریں، توان کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جس بات کی وہ مذمت کر رہے ہیں، تو جو بات اس کے الٹ ہوگی، وہ صحیح ہوگی۔ اسرائیل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب اسرائیل کے حق میں یا اس کی جانب سے کسی چیز کا گرم جوشی کے ساتھ ذکر ہو تو مروجہ دستور کا تقاضا یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو سیاسی یا دانشورانہ محاذ پر سرگرم ہے، ہاں میں ہاں ملائے۔ جب عمومی فضا یہ ہو تو فلسطینیوں کے حق میں کلمۂ خیر کہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ بیان، جس سے اسرائیل کی تائید ہوتی ہے، فلسطینیوں پر دباؤ شدید اور مرکوز کرنے کا موجب بن جاتا ہے کہ وہ اپنی زبانیں بند رکھیں۔ اور ان پر جو جبر ہو رہا ہے، اسے چپ چاپ قبول کریں۔ چنانچہ اسرائیل کی حمایت کرنا اور فلسطینیوں کی مخالفت کرنا جائز اور قابل قبول ٹھہرتا ہے۔

یہ تو ٹھہرا ایک جامع مذہبی کلیہ، جس پر عمل کرنا ہر کسی کا فرض بنتا ہے۔ لیکن اس سے جز یادہ فعال اصول برآمد ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسرائیل کے متعلق اسرائیلیوں کے مضامین اور تحریریں تو آپ کو عام مل جائیں گی لیکن خود عرب اپنے متعلق جو تصانیف سپرد قلم کرتے ہیں، وہ آپ کو شاذ و نادر ہی کہیں دستیاب ہوں گی۔ یہ محض عددی اعتبار سے ہی شدید عدم تناسب نہیں ہے (اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں مقیم یہودی اور عرب طبقے نہ صرف تعداد کے اعتبار سے شدید عدم تناسب کا شکار ہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے ایک کو دوسرے سے کوئی

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۲۰: ہے اور خود بھی ایک مانی ہوئی اداکارہ ہے۔ ویت نام کی جنگ میں امریکی حکومت کے کردار کے خلاف امریکہ میں جو مہم چلائی گئی اس کی روحِ رواں یہی خاتون تھی۔

[1] چومسکی (Noam Chomsky) سال پیدائش ۱۹۲۸ء۔ امریکہ کا ماہر لسانیات۔

[2] میک گورن (George Stanley Mcgovern) سال پیدائش ۱۹۲۲ء امریکی سیاستدان۔ کئی سال امریکی سینیٹ کا رکن رہا۔ رچرڈ نکسن کے خلاف صدارتی انتخاب ہار گیا۔

نسبت نہیں۔ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے یہودیوں کو عربوں پر زبردست برتری حاصل ہے) بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۳ء کی جنگ کے دوران میں نیویارک ٹائمز سنڈے میگزین نے ایک ہفتے ایک نامور اسرائیلی وکیل کا ایک مضمون شائع کیا جس کا موضوع تھا: "معروف جنگ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟" بظاہر تناسب کی خاطر ایک اور مضمون شامل اشاعت کیا گیا لیکن اس کا مصنف (کوئی عرب نہیں بلکہ) شام میں متعین ایک سابق امریکی سفیر تھا۔ عربوں کے مؤقف کی وضاحت کے لیے اگر کبھی کسی عرب کا انتخاب عمل میں آتا بھی ہے، تو کسی ایسے شخص کو منتخب کیا جاتا ہے جس کی بات کا اثر کم سے کم ہو۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جب کبھی نمائندہ عرب نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے، تو پیش کرنے والا یا تو کوئی مغربی ماہر ہوتا ہے یا پھر کوئی نیم سرکاری عرب "بیان" جڑ دیا جاتا ہے۔ کمیت اور کیفیت دونوں کو برابر کے پلڑوں میں رکھا جاتا ہے۔

۱۹۶۷ء کے بعد کے عشرے کے دوران میں متعدد مشہور و معروف ہستیوں نے اسرائیل کا دورہ کیا۔ ان ہستیوں میں جو لوگ ادیب، صحافی اور مصنف تھے، انہوں نے اپنے تاثرات کو قلم بند بھی کیا۔ تازہ ترین مثال سال بیلو[۱] کی ہے۔ دوسروں میں سٹیفن سپینڈر[۲]، فرانسائنے دو پلے سی گرے[۳]، ریناٹا ایڈلر[۴] اور گری وِلز[۵]

---

۱ بیلو (Saul Bellow) ۱۹۱۵ء میں کینیڈا میں پیدا ہوا۔ امریکی شہری بنا۔ ناول نگاری کے ذریعے شہرت حاصل کی۔ ۱۹۷۶ء میں ادب کا نوبل انعام کا مستحق ٹھہرا۔ عقائد کے اعتبار سے یہودی ہے اور اکثر امریکی اسے موجودہ دور کا عظیم ترین ناول نگار مانتے ہیں۔

۲ سپنڈر (Stephen Spender) ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوا۔ شاعری میں نام کمایا ابتدا میں بائیں بازو کے خیالات سے متاثر تھا۔ اسی لیے ۱۹۳۰ء میں سپین کی خانہ جنگی میں فرانکو کی فوجوں کے خلاف لڑا۔ بعد میں ان خیالات سے تائب ہو گیا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد لندن کے مشہور جریدے Encounter کا کافی عرصہ (بقیہ حاشیہ جات صفحہ نمبر ۱۲۱ پر)

شامل ہیں۔ اس عہد کے برعکس جس کے متعلق ایڈمنڈ ولسن نے اپنے تاثرات رقم کیے تھے، ۱۹۶۷ء کے بعد مقبوضہ علاقوں یا وہاں کے عرب باشندوں کو نظر انداز کرنا یا ان سے پہلوتہی کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں اسرائیل کے دورے کے متعلق جتنی تحریریں بھی منظر عام پر آئیں، ان میں سے ہر ایک میں عربوں کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہے۔ تاہم ہر تحریر میں عربوں سے یا تو کسی عرب امور کے اسرائیلی ماہر کے ذریعے، جو عام طور پر چھٹا ہوا اور زمانہ ساز نوآبادیاتی افسر ہوتا ہے یا کبھی کبھار کسی علمی ادارے سے منسلک کسی شخصیت کے جس کا پس منظر فوجی سراغرسانی ہوتا ہے، نپٹا گیا ہے۔ اس معاملے میں سال بیلو اور سٹیفن سپینڈر دونوں کا رویہ بالکل ایک جیسا ہے، ہو بہو برابر فرق نہیں ہے۔ دونوں کی

بقیہ حاشیہ ۳ صفحہ نمبر ۱۲۲: ایڈیٹر رہا۔ تاہم جب اس جریدے پر الزام عائد ہوا کہ یہ سی آئی اے کے سہارے پر چل رہا ہے تو ادارت سے مستعفی ہو گیا۔ پھر لندن یونیورسٹی میں شعری ادب کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں چین کے دورے پر گیا اور اپنے تاثرات اپنی کتاب "چائینیز جرنل" میں قلمبند کیے۔ کمیونزم کے خلاف ایک کتاب The god that Faild کے نام سے مرتب کی جس میں مختلف مشاہیر کے مضامین ہیں۔ طبع زاد شعری مجموعے چھپوانے کے علاوہ گارشیا لورکا، رلکے، شلر اور بعض دوسرے یورپی شعراء کی نظموں کے تراجم بھی کیے۔ اس کی والدہ کا سلسلہ نسب جرمن یہودیوں سے جا ملتا ہے۔

۳

۴ تاریخ پیدائش ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء ناول نگار، رپوتاژ نویس اور صحافی۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران میں "نیویارکر" کی نمائندہ تھی۔

۵ تاریخ پیدائش ۲۲ مئی ۱۹۳۴ء امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض دیتا رہا ہے۔ آجکل بھی پڑھاتا ہے۔ صدر کینیڈی مرحوم کے متعلق اس کی تصانیف کا بڑا شہرہ ہے۔

۶۔ سال بیلو To Jerusalem and Back (بقیہ صفحہ نمبر ۱۲۴ پر)

عرب امور کے ماہرین کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ دونوں نے اپنی گفتگو میں یہ جتایا کہ وہ لبرل نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ اعلیٰ انسانی قدروں پر یقین رکھتے ہیں اور دونوں نے اپنی اس تشویش کا اظہار کیا کہ اسرائیل نے (عربوں کے علاقوں پر) جو فوجی قبضہ جما رکھا ہے، کیا اس سے اسرائیل کی جمہوریت پر تو کوئی حرف نہیں آتا؟ اس جمہوریت کی کوئی "ممکنہ" خلاف ورزی تو نہیں ہوتی؟ ان (نام نہاد) ماہرین نے جو عرب "حقیقت" ان کے سامنے پیش کرنے پر مامور تھے، ان کی تشویش دُور کر دی اور انہیں یقین دلایا کہ اسرائیل بھی انسان دوستی کی قدروں پر عمل پیرا ہے اور وہاں جمہوریت پر صحیح معنوں میں عمل ہو رہا ہے۔ اس قسم کے (لایعنی) جوابات سے مغربی دانشور اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ مقبوضہ علاقوں کے عرب فلسطینیوں کے متعلق اسرائیلی انہیں جو کچھ بتاتے ہیں کہ یہ (عرب فلسطینی) کیا ہیں، کیا چاہتے ہیں اور کیا محسوس کرتے ہیں، وہ اسے صحیح تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ مان لیتے ہیں کہ عرب فلسطینی دراصل وہی کچھ ہیں، جو کچھ اسرائیلیوں نے انہیں ان کے متعلق بتایا ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے کہ (جنوبی افریقہ کی حکومت) "سیاہ فاموں کے امور" کے کسی سفید فام "ماہر" کے ذمے یہ فرض لگا دے کہ دورے پر آئے ہوئے کسی مغربی دانشور کو وہ یہ سمجھائے کہ جنوبی افریقہ کی سیاہ فام اکثریت درحقیقت کیا ہے، وہ درحقیقت چاہتی کیا ہے اور درحقیقت محسوس کیا کرتی ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع آئے، تو سفید فام "ماہر"، سیاہ فاموں کے متعلق جو کچھ کہے گا، اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۲۳ لہ ناشر راوائی لنگ پریس نیویارک، ۱۹۷۶ء۔ سٹیفن سپنڈر، سپنڈر کا یہ مضمون Among the Israelis" نیویارک ریویو آف بکس نے چھ مارچ ۱۹۷۵ء کو شائع کیا۔ تاہم سال ہیلو کی کتاب پر نوئیم چومسکی نے لندن کے جریدے "نیو لیفٹ ریویو" شمارہ نمبر ۲ میں "What Every American Should Believe" کے عنوان سے جو تبصرہ کیا تھا، وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ (مصنف)

غلط بیانی سے کام لے رہا ہے اور یوں اس کی باتوں کو ناقابلِ یقین سمجھ کر مسترد کر دیا جائے گا۔ تاہم عربوں کے متعلق اسرائیلی جو کچھ کہتے ہیں، اسے بالکل صحیح سمجھ لیا جاتا ہے۔ بلو کی کتاب "ٹو یروشلم اینڈ بیک" کو جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ بھی یہ ہے یہ بات نہیں کہ اسرائیل کے اندر حقیقتاً جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے متعلق کوئی شہادت یا ثبوت نہیں ملتا۔ اسرائیلی امریکہ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں، ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے یہاں قیام کے دوران میں یہ بات بار بار کہی ہے کہ ایک اسرائیلی اور ایک صیہونیت کے امریکی حامی میں ایک بیّن فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کے مقابلے میں مؤخر الذکر اسرائیل اور اس کے عرب "مسئلے" کے متعلق کہیں کم صاف گو اور بے ریا ہے[1]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ (یورپ کے معاملے میں یہ بات اب اتنی درست نہیں ہے) میں اسرائیل اور صیہونیت کے مقاصد و منازل کو عملاً تقدیس کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اسرائیل کے قیام کا ذکر بالکل اسی انداز سے سرگوشیوں میں کیا جاتا ہے جس طرح مارشل پلان[2] کا ذکر ہوتا تھا۔ اور جو بلند مقام مارشل پلان کو دیا

---

[1] ملاحظہ فرمائیں آئی ایف سٹون کا مضمون "Confessions of a Jewish Dissident" اس کا یہ مضمون اس کی اپنی کتاب "Underground to Palestine, and Reflections Thirty Years Later" میں تتمے کے طور پر شامل ہے۔ یہ کتاب Pantheon Books نے ۱۹۷۸ء میں نیویارک سے شائع کی تھی۔

[2] دوسری جنگِ عظیم میں مغربی یورپ کے ممالک اقتصادی طور پر بالکل تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دینے کے لیے ۱۹۴۸ء میں امریکہ کے وزیر خارجہ جارج مارشل نے ایک منصوبہ بنایا، جو اسی کے نام پر منسوب ہوا۔ یہ امداد صحیح معنوں میں امداد تھی اور اس نے یورپی ممالک کی کایا پلٹ دی۔ آجکل امریکہ ترقی پذیر ممالک کو امداد کے نام پر جو قرضے دیتا ہے ان کا مقصد ان ممالک کو اپنے پاؤں پر کھڑے کرنا نہیں بلکہ اقتصادی طور پر انہیں مغلوب بنانا ہے۔

جاتا تھا، وہی قیام اسرائیل کو دیا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ سے جو لوگ وابستہ ہیں، ان کا تو ذکر ہی کیا، وہ لوگ بھی جو دانشور کہلاتے ہیں یا اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں، گروہ در گروہ اسرائیل کے ساتھ اپنے دیوانہ وار عشق کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اسرائیل اور اس کے مقاصد کے ساتھ ان کا رویہ ایسا ہوتا ہے جیسے اسرائیل کوئی مقدس گائے ہے جس کے حضور حاضری میں پوری رسوم کی بجاآوری ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ ذرا سی کوتاہی آبگینوں کو ٹھیس پہنچانے کا سبب بن سکتی ہے۔ کسی بھی دوسرے مقصد کو ان کے نزدیک اتنا تقدس حاصل نہیں جتنا اسرائیل کو حاصل ہے۔

۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں اقوام متحدہ اور اس کی ایک ذیلی تنظیم یونیسکو (اقوام متحدہ کا تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی امور کا ادارہ) نے صہیونیت کو ذرا سا لتاڑا تھا کہ یہ نسل پرستی کی ایک صورت ہے، بس پھر کیا تھا کہ مغرب میں ایک بھونچال آگیا۔ آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا بہانہ۔ ہر طرف ادیبوں، فنکاروں، سیاستدانوں، صحافیوں اور امورِ عامہ میں دلچسپی لینے والے اصحاب نے آسمان سر پر اٹھا لیا، ہاہاکار مچ گئی، دستخط شدہ بیانات جاری ہونے لگے۔ اقوام متحدہ اور یونیسکو کی مذمت ہونے لگی اور دعویٰ کیا گیا کہ اسرائیل کو "یونیسکو" سے "خارج" کیا جا رہا ہے۔ صرف کبھی کبھار کسی شخص —— جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں، نوئم چومسکی واحد شخص تھا، جس نے اس بارے میں آواز بلند کی —— نے یہ بتانے کی ضرورت محسوس کی کہ صہیونیوں اور اسرائیلیوں نے فلسطینی عربوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور اب تک وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں اور یہ کہ اسرائیل میں "غیر یہودیوں" کے خلاف جو امتیازی کارروائیاں جاری ہیں، دنیا کے دوسرے علاقوں میں نسلی بنیادوں پر ظلم و ستم کی جو کارروائیاں ہو رہی ہیں، انہیں کسی طرح بھی ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نوعیت کے اعتبار سے دونوں میں ذرا بھی فرق نہیں۔ اس کی بجائے ہمیں نظر کیا آتا ہے کہ

دنیا کے دوسرے مقامات پر کمینگی اور بدمعاشی کے جو مظاہرے ہوتے ہیں ڈینیل پیٹرک موئی ہان[1] ان کی تو فوراً مذمت کر دیتا ہے۔ لیکن اسرائیل اور صیہونیت کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتا ہے۔

جس چیز کو عام طور پر "کاز"[2] کہا جاتا ہے یا کم از کم ایک ایسا مسئلہ، جو اس حد تک صحیح ہو کر وہ "کاز" بن سکے، تو جہاں تک اس (یعنی کاز) کی عمرانیات کا تعلق ہے، وہ آج کل اسرائیل کے معاملے میں بالکل ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ یہ بات کم از کم اسرائیل کے کھلے عام ذکر اذکار کے ضمن میں بالکل درست ہے۔ اگر مسئلہ سوویت یونین، چلی یا افریقہ میں انسانی حقوق کی کاز کی حمایت کا ہو تو کوئی لبرل عہر بلب نہیں رہے گا۔ لیکن اگر مسئلے کا تعلق اسرائیل میں پیش آنے والے اسی قسم کے معاملات سے ہو، تو تقریباً سکوتِ مرگ طاری ہو جائے گا اور کوئی مائی کا لال اپنی

---

[1] امریکی یہودی، دانشور، سفارت کار اور سیاستدان۔ موئی ہان کا رویّہ اس کی کتاب "A Dangerous Place" مطبوعہ لٹل براؤن اینڈ کمپنی بوسٹن (۱۹۷۸ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

[2] "کاز" (Cause) انگریزی زبان کا ایک ہمہ گیر لفظ ہے۔ اس کا ایک مطلب تو وہ اصول، آدرش یا نصب العین ہے جس کے حصول کے لیے ایک شخص یا ایک گروہ تن، من، دھن سے کام کرنے پر تیار ہو جائے۔ اس کا دوسرا مطلب کسی شخص یا گروہ کا مفاد یا مفادات ہیں جن کے حصول کی خاطر وہ جدوجہد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مشہور امریکی رہنما ٹامس پین (Paine) کا یہ جملہ اس کی بہترین مثال ہے۔

"The Cause of America is in great measure the Cause of all mankind"

زبان کو ذرا سی جنبش دینے کی جرأت نہیں کرے گا۔ مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی فوجی حکومت جو گل کھلا رہی ہے، اسی فوجی حکومت کے ناطے وہاں جو جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اور انسانی حقوق کی جس طرح مٹی پلید ہو رہی ہے، اگر کوئی شخص یا ادارہ انہیں "کاغذ" میں تبدیل کرنے کی کوشش کرے، تو ایسی ہر کوشش کا نہایت ڈھٹائی کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا جاتا ہے۔ یہ بات ان کیسوں میں خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے جب اسرائیل کے وہ چند ایک نقاد، جن کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں کے برابر بھی نہیں، (اپنی معلومات کے ضمن میں) محض ذرائع کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ (کوئی آزاد و خود مختار ذرائع نہیں ہوتے بلکہ خود) اسرائیلی ذرائع ہی ہوتے ہیں۔ عربوں کے مکانات کا انہدام عربوں کی اپنی زمینوں سے بے دخلی، عرب کارکنوں کے ساتھ بدسلوکی، عرب باشندوں کی ناجائز نظر بندی اور انہیں ایذا پہنچانے کی کارروائیاں، یہ تمام امور ایسے ہیں جن کے متعلق انسانی حقوق کی اسرائیلی لیگ ؎۱ کئی برسوں سے اطلاعات فراہم کر رہی ہے۔ یہ کہ لیگ کی فراہم کردہ اطلاعات درست ہیں، اسرائیلی اخبارات اور جرائد میں شائع شدہ مضامین اور مواد کے تراجم پر مبنی دستاویزی ثبوت مہیا کیے جاتے ہیں۔ تاہم ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جس کا ذکر امریکہ کے ذرائع ابلاغ میں بھی کیا جاتا ہو۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ مواد (امریکی) ایڈیٹروں، کالم نگاروں، ٹیلی ویژن کے تبصرہ نگاروں، معروف اور (عام طور پر) صاف گو لبرل شخصیات تک پہنچایا نہیں جاتا۔ (نہیں، انہیں پہنچایا جاتا ہے لیکن مجال ہے کہ کوئی ایک شخص بھی اس کا ذرا سا بھی ذکر کر دے)۔ اقوام متحدہ کی رپورٹوں، اقوام متحدہ کے زیر اہتمام سرحدوں اور

Israeli League of Human Rights ؎۱

عارضی صلح سے متعلق امور کی نگرانی کرنے والے حکام کی تحریر کردہ روداروں، ایمنسٹی انٹرنیشنل[ا] اور ریڈ کراس جیسے بین الاقوامی اداروں کے معلوماتی مراسلوں اور درجنوں عربوں اور عرب امریکیوں کی تحریروں کا تو ذکر ہی کیا، خود اسرائیل کی بلا مبالغہ دسیوں خبر رساں ایجنسیاں، لبرل خبر نامے (نیوز لیٹرز) اور لبرل جرائد نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس (ناروا) سلوک کا تذکرہ کرتے ہیں جو جنگ ۱۹۶۷ء سے ماقبل اسرائیل اور اس جنگ کے بعد مقبوضہ علاقوں کے عرب باشندوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن امریکہ میں ان تمام معلومات کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے کبھی شائع کیا جاتا ہو یا جس کی کبھی وسیع پیمانے پر تشہیر کی جاتی ہو۔ اس فروگزاشت پر پردہ ڈالنے کے جو عمداً حرکات کی جاتی ہیں، ان کی تازہ ترین اور کئی لحاظ سے نہایت بھونڈی اور احمقانہ مثال اس حشر سے ملتی ہے جو اس رپورٹ کے ساتھ کیا گیا جو لندن کے مؤقر اخبار "سنڈے ٹائمز" نے ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو "اسرائیلی مظالم اور ایذا رسانیوں کا آنکھوں دیکھا حال" کے عنوان سے شائع کی تھی۔ "ٹائمز" کے رپورٹروں نے تحقیقاتی تکنیک کے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کرنے کے بعد ایک سیر حاصل رپورٹ تحریر کی اور اس میں یہ انکشاف کیا کہ اسرائیل میں باقاعدہ اور باضابطہ عربوں کو ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں اور یہ

ا Amnesty International (عفو عامہ کی بین الاقوامی تنظیم)۔ اس تنظیم کا صدر دفتر لندن میں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کی حامی ہے۔ چنانچہ یہ تنظیم سیاسی نظریات اور بین الاقوامی سرحدوں سے قطع نظر دنیا بھر کے سیاسی قیدیوں کی رہائی کی وکالت کرتی ہے۔ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق ہر سال ایک رپورٹ بھی شائع کرتی ہے۔

سب کچھ سرکاری منشا اور منظوری سے ہوتا ہے۔ یہ کہ سینکڑوں عربوں کو (مقدمہ چلائے بغیر) نظر بند کر دیا جاتا ہے اور جیلوں میں انہیں طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں۔ یہ کہ مملکت اس قسم کی تمام کارروائیوں سے چشم پوشی کرتی ہے کیونکہ ان کے ذریعے "مقامی" باشندوں کو ڈرایا دھمکایا، ان پر قابو پایا اور انہیں دہشت زدہ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ اس سلسلے میں جو شہادتیں اور ثبوت سامنے آئے ہیں وہ مکمل طور پر قابل یقین اور قابل اعتبار ہیں۔ "بوسٹن گلوب" کے علاوہ امریکہ کے کسی بھی بڑے اور با اثر اخبار (یا جریدے، ہفتہ وار خبر نامے یا ٹیلیویژن کے خبری پروگرام) نے اس رپورٹ کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اسے بالکل گول کر دیا۔ اس رپورٹ کے اشاعت پذیر ہونے کے بعد ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ریڈکراس نے اپنے طور پر تحقیقات کا آغاز کیا اور اپنے اخذ کردہ نتائج رپورٹوں کی صورت میں شائع کیے لیکن آفرین ہے امریکہ کے ذرائع ابلاغ پر، ان کے کانوں پر ذرا بھی جوں تک نہ رینگی اور وہ ان رپورٹوں کو بھی شیر مادر سمجھ کر ہضم کر گئے۔ امریکہ کے ذرائع ابلاغ نے اطلاعات کے محاذ پر اپنے فرائض کی ادائیگی میں جس مجرمانہ اور انتہائی ناروا غفلت کا ثبوت دیا، نکولس وون ہوفمین[1] نے اس کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا۔ وہ رقم طراز ہے کہ

"اسرائیلی حکام کو کم از کم اتنا تو کرنا چاہیے تھا کہ ان کے خلاف جو مواد اکٹھا کیا گیا ہے (اسرائیلی ایذا رسانیوں کے متعلق "سنڈے ٹائمز" کی رپورٹ)، اس کا وہ مطالعہ کرتے اور اس بیان کی نسبت کوئی زیادہ قابل قدر چیز پیش کرتے جو لندن میں ان کے سفارت خانے

---

[1] ہوفمین (Nicholas von Hoffman)

و نے جاری کیا ہے اور جس میں محض یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ گزشتہ چند سالوں کے دوران میں عرب اپنے پراپیگنڈے کے وسائل کے ذریعے اس نوعیت کے الزامات کی تکرار کرتے چلے آرہے ہیں حالانکہ مفصل اور دستاویزی شہادتوں کے بعد یہ (الزامات) بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں۔" اگر اسرائیلی محض دشنام طرازی کرتے رہے اور اپنی برأت کے سلسلے میں اپنی ہی تحقیقات پر انحصار کرتے رہے تو اس سے کوئی بات نہیں بنے گی ......
گیس کو ایذا رسانی کے آلے کے طور پر استعمال کرنے میں جو مضحک ستم ظریفی پائی جاتی ہے [1]، وہ ان اسرائیلی حکام کے لیے بھی، جنہیں یہ یقین ہے کہ انسانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے سے جمہوریت کی کاز کو فروغ حاصل ہوتا ہے، ناقابلِ برداشت ہونا چاہیے تھی۔

اگر امریکی اس ("سنڈے ٹائمز" کی رپورٹ) بارے میں کچھ بھی جان نہیں پائیں گے۔ اب تک صرف ایک اخبار "بوسٹن گلوب"

---

[1] صیہونیوں نے دنیا بھر میں کتابوں، جریدوں، فلموں اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے ذریعے یہ زبردست پراپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں ہٹلر اور اس کے حواریوں نے لاکھوں یہودیوں کو گیس چیمبرز میں بند کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ ہے جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اگر ان کے پراپیگنڈے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یورپ کی آدھی آبادی یہودی نکلے گی۔ ان کے اس جھوٹ کی کچھ قلعی حکیم محمد سعید نے اپنی کتاب "جرمنی نامہ" میں کھولی ہے۔ یہاں ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ جس بات پر وہ نازیوں کی مذمت کرتے نہیں تھکتے، تو وہی وہ عربوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔

نے اس رپورٹ کو شائع کرنا مناسب خیال کیا ہے۔ دوسروں نے اس معاملے میں جس تغافل اور بے نیازی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ جن صحافیوں نے یہ رپورٹ مرتب کی ہے، ان کی دیانتداری اور اہلیت مشکوک ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ) جن صحافیوں کی ٹیم نے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے، دنیا بھر کی صحافتی برادری ان کی معترف ہے اور ان کی عزت کرتی ہے۔

اس موقع پر دلچسپی کے جس فقدان کا مظاہرہ کیا گیا، اس کی وضاحت چھیاسی الفاظ پر مشتمل اس مضمون سے ہوجاتی ہے جو "نیویارک ٹائمز" کے صفحہ نمبر ۳۲ اے پر شائع ہوا ہے اور جس میں ایذا رسانی سے متعلق ان تحقیقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک حد تک یہ بات درست ہے کہ امریکہ میں صرف اسی خبر کو خبر تسلیم کیا جاتا ہے جسے "نیویارک ٹائمز" خبر تسلیم کرتا ہے لیکن اگر معاملہ غیر ملکی خبروں کا ہو تو یہ بات اور بھی صحیح ثابت ہوجاتی ہے کہ خبر وہی ہے جسے نیویارک ٹائمز خبر قرار دے... چنانچہ آپ امریکہ بھر میں گھوم جائیں آپ کو ایسے اخبارات، جرائد اور نشریاتی اداروں کے ایڈیٹروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ملے گی، جو خبروں کے معاملے میں آزادانہ فیصلے کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوں۔ وہ اتنے کردار اور قد و قامت کے مالک ہی نہیں کہ آزادانہ اپنی کوئی رائے قائم کرسکیں، وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ملک کا مؤقر ترین روزنامہ ان کی طرف سے فیصلے کرتا رہے کیونکہ انہیں اسی میں اپنی بھلائی نظر آتی ہے۔

اگر معاملہ اسرائیل جیسے مسئلے کا ہو، تو اس قسم کا رویہ اختیار کرنا اور بھی آسان نظر آتا ہے کیونکہ (انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ) اگر اس معاملے

میں انہوں نے کوئی مخالفانہ پبلسٹی کرنے کی جرأت کی، تو (بے چارے) ایڈیٹر کو ملک کی منظم ترین لابی[1] کی انتہائی پرشور دشنام طرازیوں کا سامنا کرنا پڑے گا (چنانچہ اُسے خیریت اسی میں نظر آتی ہے کہ وہ چُپ رہے)۔ دوسرے ممالک میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں کے ذرائع ابلاغ جمہوری عوام کے سامنے ایسی رپورٹیں پیش کرتے ہیں جو کہیں کم تعصب اور تنگ نظری پر مبنی ہوتی ہیں[2]۔

جس قسم کی روداد ہوفمین نے تحریر کی ہے، اس پر مبنی رپورٹ یا کالم کبھی کبھار شائع بھی ہو جائے تو بھی اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی رپورٹیں اتنی خال خال شائع ہوتی ہیں ـــــ یہ خال خال اس لیے شائع ہوتی ہیں کہ انہیں شائع کرنے کی کوئی روایت ہی نہیں بن سکی ـــــ کہ ان کے مؤثر ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں رہتا۔ اسرائیل کے متعلق امریکہ کے لبرل

---

[1] امریکہ میں قانون سازی کا اختیار سینٹ اور ایوانِ نمائندگان (جو مجموعی طور پر کانگرس کہلاتے ہیں) کے ارکان کو حاصل ہے۔ اپنے مطلب کی قانون سازی کرانے کے لیے مختلف گروہ مختلف طریقوں سے ان ارکان پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان گروپوں کو "لابی" کہا جاتا ہے۔ ان گروپوں کے ارکان ذاتی مراسم، رشوت، دھونس دھمکی، پراپیگنڈے، وعدے وعید، غرضیکہ اپنی مطلب برآری کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام گروہوں میں "یہودی لابی" سب سے طاقتور ہے۔ یہودی اپنی دولت کے بل بوتے پر نہ صرف ارکانِ کانگرس کے انتخاب پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی قانون سازی بھی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں اسرائیل کے خلاف کوئی بات کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

[2] نکولس وون ہوفمین: روزنامہ "پائلٹ" مورخہ ۶، جولائی ۷۷ ۱۹ء

حلقوں میں جو اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے اور ان میں یہ جو روایت راسخ ہو گئی ہے کہ وہ اسرائیل کے خلاف نہ کچھ کہیں گے اور نہ کچھ سنیں گے، پھر اسرائیلیوں اور برل حلقوں کے مابین جس مربوط انداز سے آپس میں تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا ہے، تو یہ انہی چیزوں کا اعجاز ہے کہ ہر اس شہادت یا ثبوت کو جو (اسرائیل کے) ذرا بھی ناموافق ہو، فوراً تلف کر دیا جاتا ہے یا غیر متعلق قرار دے کر نظروں سے اوجھل کر دیا جاتا ہے۔ مزید براں، ہر وہ چیز یا امر، جس کے متعلق کسی شخص کے ذہن میں یہ توقع پیدا ہو جائے کہ یہ اسرائیل کے لیے تباہ کن چیلنج ثابت ہو گی، اس کا اس طرح حلیہ بگاڑ دیا جاتا ہے، کہ وہی چیز جس سے پہلے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا، اب حمایت اور اعانت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ اس سلسلے کی تازہ ترین مثال مناچم بیگن کا انتخاب ہیں۔ سالہا سال سے ہر شخص کو یہ معلوم ہے کہ بیگن ایک دہشت گرد ہے اور خود اس نے بھی اس حقیقت پر کبھی پردہ ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی کتاب "بغاوت" (THE REVOLT) امریکہ کی ہر یونیورسٹی اور درمیانے درجے کی پبلک لائبریری میں موجود ہے اور اسے اس سیکشن میں رکھا جاتا ہے جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہاں مشرقِ وسطیٰ کے متعلق معیاری کتب ذخیرہ کی گئی ہیں۔ اپنی اس کتاب میں بیگن اپنی دہشت گردی ——— جس میں معصوم اور بے قصور خواتین اور بچوں کا قتلِ عام بھی شامل ہے ——— کا ذکر تکرار کرتا ہے اور اس انداز سے کرتا ہے جیسے اس نے کوئی نہایت زبردست نیکی کا کام (حقیقتاً دل و دماغ کو شل کر دینے والا) سر انجام دیا ہو۔ وہ کھلے بندوں اقرار کرتا ہے کہ اپریل ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے عرب گاؤں، دیر لیسین[۱] میں اڑھائی سو عورتوں اور

---

[۱] دیر لیسین فلسطین میں عربوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جب (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بچوں کا قتلِ عام ہُوا تھا، اس کا ذمہ دار وہ خود ہے ۔ لیکن مئی ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں اس کی پارٹی کو جب اکثریت حاصل ہوگئی اور وہ اسرائیل کا وزیر اعظم منتخب ہو گیا تو چند ہفتوں کے اندر اندر ہی یہ انقلاب رونما ہوا کہ نہ صرف اس کی دہشت گردی کو فراموش کر دیا گیا بلکہ (امریکی) اخبارات اسے اس طور ایک "مدبر" سیاستدان کی حیثیت سے پیش کرنے لگے گویا وہ اپنے زمانے کا جنرل ڈی گال[۵] تھا۔ ہم یہاں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس (بیگن) نے دہشت گردی کی جو کارروائیاں کی تھیں، ان کے ثبوت اور شہادتیں دبا دی گئی تھیں ۔ یہ ثبوت اور شہادتیں اپنی جگہ موجود تھیں، ہر وہ شخص، جو اسرائیل کے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا چاہتا تھا، اس کے سامنے بھی ہمیشہ موجود رہی تھیں اور باقاعدگی کے ساتھ ان کا حوالہ دیا جاتا رہا ہے (اور ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ بیگن اور اسرائیل کی بعض دوسری اہم شخصیات کے مابین جیسی کہ مثال کے طور پر ڈیوڈ بن گوریاں اور گولڈا میئر ہیں، ایک خطِ امتیاز کھینچا جا سکے۔ یہ مؤخرالذکر شخصیات ایسی ہیں جن کے متعلق یہ ہمیشہ فرض کیا جاتا رہا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں "مدبر" سیاست دان تھے) ۔ لیکن مغرب کے دانشوروں میں اس

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۳۴ : یہودیوں نے یکطرفہ اپنی آزادی اور اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا تو اس کے رہنماؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسرائیل سے تمام عرب باشندوں کو زبردستی نکال دیا جائے گا ۔ اس کا ایک طریقہ یہ سوچا گیا کہ عربوں کے خلاف اس قدر دہشت گردی کی جائے کہ وہ خود ہی اپنے گھروں سے بھاگ جائیں ۔ چنانچہ ایک روز جب دیریاسین کے بالغ مرد کھیتوں پر کام کرنے گئے ہوئے تھے، بیگن اور اس کے دہشت گرد ساتھی گاؤں میں آ دھمکے ۔ انہوں نے بچوں اور عورتوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور سب کو گولیوں سے بھون ڈالا ۔ یہ اتنی خوفناک کارروائی تھی کہ بے شمار عرب باشندے خود ہی خوف و دہشت کے عالم میں ملک سے راہِ فرار اختیار کر گئے ۔

[۵] فرانس کے سابق صدر ۔ وہ موجودہ زمانے کے عظیم ترین فرانسیسی مدبر سیاست دان تھے ۔

بات پر جو زبردست اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے کہ اسرائیل کے رہنما جمہوریت پسند ہیں، اپنی معاشرت، ثقافت، چال ڈھال، اور فکر او کار میں بالکل مغربی باشندوں جیسے ہیں اور ان سے اس قسم کی برائیوں کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا جو عام طور پر عربوں اور نازیوں کے ساتھ منسوب کر دی جاتی ہیں (مغرب والوں نے اسرائیل کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا ہے کہ اس کے قیام سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ یہودی ان خرابیوں اور برائیوں کی نفی کرتے ہیں جو نازیوں کا طرۂ امتیاز تھیں) وہ اتنا قوی اور توانا ہے کہ بیگن جیسا لقمہ بھی، جسے عام حالات میں حلق سے نیچے اتارنے اور ہضم کرنے میں شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا، جھاڑ پونچھ کر نئے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے اور اسے یوں پیش کیا جا رہا ہے جیسے ایک اور اسرائیلی مدبر رہنما منصۂ شہود پر نمودار ہوا ہو۔ (اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ اسے نہ صرف امریکہ کی نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی نے ۱۹۷۸ء میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا بلکہ اس پر طرہ یہ کہ بعد میں سویڈن نے بھی اسے امن کے نوبیل انعام کا جزوی طور پر مستحق قرار دیا)۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان لبرل دانش وروں کے پاس، جنہیں ہر جھاڑی کے پیچھے ظلم و ستم اور ایذا رسانی کے مناظر نظر آ جاتے ہیں اور جنہیں دنیا کے ہر خطے میں کوئی نہ کوئی "کاز" مل جاتا ہے، اسرائیل کے خلاف کہنے کو کچھ نہیں خواہ وہ کتنے ہی لوگوں کو ایذائیں پہنچاتا رہے اور دوسروں کے علاقوں کو اپنی مملکت میں ضم کرنے کی کتنی ہی بلا روک کارروائیاں کرتا رہے۔

یہی بات ان فلسطینیوں پر، جنہوں نے دوسرے ممالک میں پناہ حاصل کر رکھی ہے، صادق آتی ہے۔ اس بارے میں کچھ اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ ۱۹۴۸ء کے دوران میں کتنے فلسطینیوں کو مجبوراً اپنی زمینوں اور اپنے وطن کو چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنا پڑی مختلف اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد پانچ اور

آٹھ لاکھ کے مابین ہے ۔ (اسرائیلی ذرائع بھی تعداد کے بارے میں تو اختلاف کرتے ہیں لیکن خود خروج سے انہیں بھی انکار نہیں) تاہم اس بارے میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ پناہ گزیں موجود ہیں ۔ یہ حقیقت کہ انہیں اپنے وطن سے نکلے تقریباً تیس سال گزر چکے ہیں اور یہ کہ انہیں خود ارادیت کا حق استعمال کرنے کا ابھی تک کوئی موقعہ نہیں دیا گیا، ثابت کرتی ہے کہ ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ ناانصافی ضرور ہوئی ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ سوال پوچھ بیٹھے کہ انہیں پناہ گزیں بنانے کا ذمہ دار کون ہے تو اسرائیل کو نہ صرف بری الذمہ اور بے قصور ٹھہرایا جاتا ہے[۵] ۔ بلکہ امریکہ کی طرح اسرائیل کی بھی تعریفوں کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں کہ یہ بڑا انسان دوست ملک ہے ۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ تو آبادی کا "تبادلہ" تھا ۔ عرب ممالک سے جو یہودی ترک وطن کر کے اسرائیل وارد ہوئے ان کے بدلے کچھ فلسطینی عرب ممالک میں چلے گئے ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔ اور یہ فلسطینی عرب بھی تو اپنی مرضی سے ہی گئے تھے حالانکہ "ہگانہ[۶]" ان پر زور دیتی رہی کہ مت جاؤ، اپنے آبائی گھروں ہی میں مقیم رہو ۔ یہ کہ وہ لوگ جو

---

۵ مثلاً امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر نے یہی رویّہ اختیار کیا ۔ ویٹ نام میں امریکی مہم جوئی کے نتیجے کے طور پر جو تباہی و بربادی ہوئی، صدر کارٹر نے بعد میں امریکہ کو اس سے بھی بری الذمہ قرار دیدیا ۔

۶ یہودیوں کی ایک دہشت گرد تنظیم ۔ ۱۹۲۱ء میں قائم ہوئی ۔ صیہونیت کا یہ عسکری بازو تھی ۔ پینتیس ہزار مرد اور عورتیں اس کے فعال ارکان تھے اور تقریباً اتنے ہی محفوظ دستوں میں شامل تھے ۔ ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیل کا قیام عمل میں آیا تو اسی کے دستوں نے عرب فوجوں کا مقابلہ کیا تھا ۔ بعد میں اسے اسرائیل کی باقاعدہ فوج میں ضم کر لیا گیا ۔

وہیں (اسرائیل میں) مقیم رہے ان کی حالت اپنے ان بھائیوں کی نسبت کہیں بہتر ہے۔ جو پڑوسی عرب ممالک میں مقیم ہیں۔ یہ کہ یہودیوں کے لیے ملجا و ماوا صرف ایک ہی ہے جب کہ عربوں کے لیے بیس سے اوپر ممالک کے در کھلے ہیں پھر یہ عرب یہودیوں کا رویہ کیوں اختیار نہیں کرتے اور اپنے پناہ گزینوں کو کیوں قبول نہیں کرتے؟ کہ کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے مزید فلسطینی علاقوں پر جو قبضہ کیا، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عربوں اور یہودیوں کے مابین ایک "دو قومی" وجود ظہور پذیر ہوا ہے۔ یہ کہ مغربی کنارے پر اسرائیل کا جو قبضہ ہوا ہے۔ وہ اصل میں ان پیشین گوئیوں کی تکمیل ہے جن کا ذکر انجیل میں آیا ہے۔ یہ کہ ایک فلسطین تو اب بھی موجود ہے (لیکن وہ اسرائیل میں نہیں بلکہ) شرق اردن میں ہے۔ یہ کہ دوسرے ممالک کے تارکین وطن (مثلاً ہندوستان کے مسلمان، نازی جرمنی سے راہِ فرار اختیار کرنے والے افراد) دیگر ممالک میں آباد ہو گئے ہیں، پھر فلسطینیوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی اور وہ کیوں دوسرے ممالک میں آباد نہیں ہو جاتے۔ یہ کہ یہ فلسطینی تو محض سیاسی بساط کے مہرے ہیں جنہیں عرب ممالک کی حکومتیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہتی ہیں، چنانچہ اگر ایک مرتبہ یہ بات ان حکومتوں کے ذہن نشین کر دی جائے کہ وہ اپنے ان ہتھکنڈوں کو غیر معین مدت کے لیے استعمال نہیں کر سکتیں تو ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور یہ (فلسطینی) کوئی مسئلہ نہیں رہیں گے۔ تاہم یہ تمام باتیں ایک ہی مسئلے کے ارد گرد گھومتی ہیں جس کی کچھ اس انداز سے کایا پلٹ کی گئی ہے کہ وہ صیہونیوں کے اعلیٰ اخلاقی معیار، شرافت اور نیک چلنی کے ثبوت میں ڈھل گیا ہے۔

۴

فلسطینیوں کے حقوق

لیکن مسئلہ فلسطین کے اکثر دوسرے امور کی طرح یہاں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف باتوں کے مابین ایک رشتہ قائم کیا جائے اور ہم ان کے متعلق یہ مفروضہ قائم نہ کرلیں کہ یہ مخفی امور ہیں (میں یہاں جن شہادتوں کا حوالہ دوں گا، ان میں سے ایک بھی مخفی یا مبہم نہیں۔ ان میں سے بیشتر دستیاب دستاویزات میں بآسانی مل سکتی ہیں) بلکہ یہ تسلیم کرلیں کہ ان باتوں کو یا تو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا پھر ان کے وجود کو ماننے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ وہ مناسب و موزوں سیاق، جس کے اندر پناہ گزینوں کے مسئلے سے نپٹا جا سکتا ہے، ہمیں بآسانی دستیاب ہے۔ اوّل، کیا فلسطینی پناہ گزیں وطن واپسی چاہتے ہیں؟ وہ معاوضے کے طلبگار ہیں؟ یا وہ کسی دوسرے مقام پر آباد ہونا چاہتے ہیں؟ دوم، کیا ان سوالات کے نظری اور عملی دونوں جوابات کے متعلق کوئی بین الاقوامی اتفاقِ رائے یا اجماع موجود ہے؟ سوم، اسرائیل کے پاس وہ کون سی جادو کی چھڑی ہے جس کے ذریعے یورپ اور امریکہ سے وارد ہونے والے یہودیوں کو پہلے تو تارکین وطن قرار دیا جاتا ہے اور پھر انہیں ملک کا شہری بنا لیا جاتا ہے؟

پھر یہی جادو کی چھڑی عرب فلسطینی پناہ گزینوں کو فائدہ اٹھانے سے کس طرح روکتی ہے؟ بجا کہ ان تمام سوالات کے جوابات اخلاقی نوعیت کے ہیں لیکن اپنی سیاسی حقیقت کے پیشِ نظر یہ ہیں دلچسپ اور اہم۔ دوسرے الفاظ میں یہ سوالات علمی[1] نہیں، بلکہ یہ ایسے سوالات ہیں جو براہِ راست کروڑوں انسانوں کی زندگیوں، مملکتوں اور نظمِ عالم سے متعلق ہیں۔ آیئے اہم ان سوالات کا جذبات سے ماورا ہو کر جائزہ لیں۔

اس بارے میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ ۱۹۴۸ء سے قبل اس خطۂ زمین کے، جسے فلسطین کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بیشتر حصے پر عرب آباد تھے اور یہ کہ تعداد کے اعتبار سے یہ عرب اکثریت میں تھے۔ قیامِ اسرائیل کے بعد ان عربوں کو یا تو منتشر کر دیا گیا (یا تو وہ خود ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے گئے یا پھر انہیں اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا) یا پھر انہیں غیر یہودی اقلیت کی حیثیت سے مملکت میں محصور کر دیا گیا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے مزید عرب فلسطینی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج عرب فلسطینیوں کے تین طبقے وجود میں آگئے ہیں۔ ایک طبقہ تو ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۶۷ء سے قبل ہی سے اسرائیل میں موجود چلے آرہے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ان علاقوں میں رہائش پذیر ہیں جن پر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران میں قبضہ کیا تھا۔ رہا تیسرا طبقہ۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے وطن کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور

---

[1] یہاں مصنف نے انگریزی لفظ اکیڈمک (Academic) استعمال کیا ہے۔ بعض اوقات علما اور فضلا اتنی باریکیوں میں چلے جاتے ہیں اور یوں بال کی کھال اتارنے لگتے ہیں کہ ان کا تعلق عملاً دنیا اور دنیا کے امور سے کٹ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ امور جو غیر عملی ہوں، انہیں اکیڈمک کہا جاتا ہے۔

اب فلسطین سے باہر مختلف ممالک اور علاقوں میں زندگی کے دن گزا
اس قسم کی رائے شماری کا کبھی اہتمام نہیں کیا گیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ
کیا چاہتے ہیں! یہ استصواب کیوں نہیں ہو سکا؟ اس کی وجوہات صاف عیاں
ہیں ——— پہلی بات تو یہ حقیقت ہے کہ فلسطینی روئے عالم
پر موجود تو ہیں لیکن ایک مقام پر نہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ کوئی یہاں گرا اور کوئی وہاں۔
چنانچہ اب وہ مختلف مملکتوں میں مختلف حکومتوں کے دائرۂ اختیار میں رہائش پذیر
ہیں۔ اس سے بڑی پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے
کہ سیاسی طور پر اس قسم کے استصواب کا بندوبست کرنا ناممکن ہے۔ خاص طور پر
جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بے شمار فلسطینی ایسے ممالک میں مقیم ہیں جہاں استصواب
تو رہا ایک طرف، سرے سے انتخابات منعقد کرانے ہی کی کوئی روایت اور
ریت نہیں ہے۔ ان وجوہات کی فہرست کو خاصا طویل بنایا جا سکتا ہے ———
تاہم ان تمام وجوہ کا ماحصل یہ ہے کہ اس قسم کے استصواب کے راستے میں ایک
ایسی مشکل آن کھڑی ہوتی ہے جس کا فی الحال کوئی مداوا نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کا مطلب
یہ بھی نہیں کہ ایسے کوئی ذرائع بھی موجود نہیں جن کی مدد سے فلسطینی اپنے اس انتشار اور
جلاوطنی کی کیفیت میں بھی اپنی آزادی کا اظہار نہیں کر سکتے۔ وہ بالکل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم
کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں خاصی سہولت
رہے گی۔

فلسطینیوں کی اپنی قومی تنظیم ہے۔ اس کا نام تنظیم آزادیٔ فلسطین یا پی ایل او
ہے۔ یہ تنظیم فلسطینیوں میں بے حد مقبول ہے اور وہ صرف اس تنظیم کو اپنی جائز
تنظیم قرار دیتے ہیں۔

۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران میں اسرائیل نے جن فلسطینی علاقوں پر قبضہ کیا

تھا، وہاں اس نے فوجی حکومت قائم کر رکھی ہے۔ فلسطینی نہ صرف یہ کہ اس فوجی
حکمرانی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ اس کے خلاف مسلسل
مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

نہ صرف مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی آئے روز کے مظاہروں، ہڑتالوں
اور مزاحمت کے دوسرے سیاسی طریقوں کے ذریعے اسرائیلی حکومت کے
خلاف مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں بلکہ وہ عرب بھی جو ۱۹۶۷ء سے قبل ہی سے
اسرائیل میں مقیم ہیں، اسرائیلی حکومت کے خلاف مزاحمت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے
جانے نہیں دیتے۔

خود فلسطینیوں یا دوسروں نے فلسطینیوں کی حمایت میں جتنی بھی عوامی یا نجی
تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں، وہ سبھی کی سبھی مختلف طریقوں سے اسرائیل کے خلاف
مصروفِ جدوجہد ہیں۔

اگرچہ ایک قوم کے ارکان کی حیثیت سے فلسطینیوں کا مشترکہ تجربہ یہ ہے
کہ انہیں بے دخلی اور جلاوطنی سے دوچار ہونا پڑا اور ایک علاقائی وطن سے
محرومی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ پھر بھی اگر ہم محولہ بالا امور کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں یہ ثابت
کرنے کے لیے کافی شہادتیں مل جائیں گی اور اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دشواری
محسوس نہیں ہوگی کہ فلسطینی اپنی موجودہ حالت پر قطعاً قانع نہیں۔ اس کے برعکس
وہ بتکرار اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ انہیں (وطن) واپسی کا حق دیا جائے
اور ان کی خود ارادیت کے اظہار کی خواہش کا احترام کیا جائے اور چونکہ صیہونیت
ان کی زندگیوں پر بری طرح اثر انداز ہوئی ہے، چنانچہ وہ اس کے خلاف ڈٹ
کر مزاحمت کرتے رہیں گے۔

فلسطینی اپنے حقوق پر جو اصرار کر رہے ہیں، وہ کوئی ایسی بات نہیں کہ

جس کی کوئی نظیر ہی نہ ملتی ہو۔ اور نہ وہ کوئی بے سیاق کجی ہے۔ اس کی کامل تائید ہر اس بین الاقوامی قانونی اور اخلاقی میثاق سے ہو جاتی ہے، جس سے دنیائے جدید آشنا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کا جو اعلان نامہ منظور کیا، اس کی شق نمبر ۱۳ میں یہ واضح طور پر قرار دیا گیا ہے کہ

(۱) ہر مملکت کی حدود کے اندر ہر شخص کو نقل و حرکت اور رہائش کا حق حاصل ہے۔

(۲) ہر شخص کو کوئی بھی ملک، بشمول اس کا اپنا، چھوڑنے اور اپنے ملک میں واپس آنے کا حق حاصل ہے۔

۱۹۶۶ء میں شہری اور سیاسی حقوق کے متعلق جس بین الاقوامی میثاق کو حتمی طور پر منظور کیا گیا، اس میں ان بنیادی حقوق کا اعادہ کیا گیا۔ اس میثاق کو ۱۹۷۶ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں توثیق کے لیے پیش کیا گیا۔ چنانچہ اس میثاق کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے تقریباً متفقہ طور پر (صرف پانچ ارکان نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا، یعنی منفی ووٹ انہوں نے بھی نہیں دیا) منظور کیا گیا۔ اس میثاق کی شق نمبر ۱۲ میں کہا گیا ہے:

(۲) ہر شخص ہر ملک، بشمول اس کا اپنا، چھوڑنے میں آزاد ہوگا۔۔۔۔۔۔

(۳) کسی بھی شخص کو من مانے طریقوں سے اپنے ملک میں داخل ہونے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ اقوام متحدہ کا کمشن برائے انسانی حقوق ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کرتا ہے کہ

(د) ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے وطن لوٹ سکے اور اس ضمن میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتے جائے گا خواہ یہ امتیاز نسلی ہو، مذہبی ہو، جنسی ہو،

سیاسی ہو یا رنگ اور زبان کا یا کسی دوسری رائے کا، نہ یہ دیکھا جائے گا کہ واپس آنے والے کا قومی یا معاشرتی پس منظر یا اصل کیا ہے۔ جائداد، پیدائش، شادی یا کسی دوسری حیثیت کی بنا پر بھی کوئی تمیز روا نہیں رکھی جائے گی۔

(ب) اپنے وطن واپس لوٹنے کے حق سے محروم کرنے کے لیے اسے نہ تو من مانے طریقے سے اپنی قومیت سے محروم کیا جائے گا اور نہ اسے اپنی قومیت ترک کرنے کے لیے مجبور کیا جائے گا۔

(ج) کسی شخص کو مستبدانہ یا من مانے طریقے سے اپنے وطن میں داخل ہونے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

(د) کسی شخص کو محض اس بنا پر کہ اس کے پاس پاسپورٹ یا دوسری سفری دستاویزات نہیں ہیں، اپنے وطن واپس آنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائیگا۔[1]

اوپر جن حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، کم از کم فلسطینیوں کو ان سے محروم رکھنے کے لیے جن دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ تہیّہ یہ کیا گیا ہے کہ ساری توجہ چند گنے چنے دلائل و براہین ہی پر مرکوز کی جائے۔ ہمیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اگر ۱۹۴۸ء میں فلسطینی اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب ریاستوں نے انہیں ایسا کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ کیونکہ یہ (عرب ریاستیں) اس غلط فہمی میں مبتلا تھیں کہ انہیں اسرائیل کے خلاف

---

[1] کمشن برائے انسانی حقوق کی اس دستاویز کا حوالہ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب "The Rights of Return of the Palestinian People" کے صفحات نمبر ۶ اور ۷ پر موجود ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔

ایسی زبردست فتح حاصل ہو گی جس سے ان کی گردنیں تن جائیں گی اور وہ اس کے متعلق بڑی شیخی بگھار سکیں گی۔ یوں جب فلسطینی دوبارہ اپنے گھروں کو واپس لوٹیں گے تو وہ بھی کامیابی و کامرانی کے نشے میں چور ہوں گے۔ خود مجھ پر جو واردات گزری اور جو شہادتیں دستیاب ہیں، ان سب سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں فلسطینیوں کا جو خروج عمل میں آیا، اس کی فیصلہ کن وجوہ یہ نہیں تھیں بلکہ کچھ اور تھیں۔ لیکن جہاں تک فلسطینیوں کی واپسی کے حق کے متعلق صحیح استدلال کا تعلق ہے، تو ان کے ترک وطن کرنے کی وجہ خواہ کوئی ہو، وہ بالآخر غیر متعلق ہو جاتی ہے کیونکہ اہم بات یہ ہے کہ انہیں واپسی کا حق حاصل ہے۔ بین الاقوامی قانون کا تقاضا یہی ہے، اقوام متحدہ نے مختلف مواقع پر جو متعدد قراردادیں منظور کی ہیں (جن کے حق میں خود امریکہ ووٹ دیتا رہا ہے)، وہ بھی یہی عندیہ دیتی ہیں اور ان کی مرضی و منشا بھی یہی ہے (کہ فلسطینیوں کو اپنے گھروں کو لوٹنے کا حق حاصل ہے[ھ])۔ در آں حالانکہ بین الاقوامی طور پر ہر شخص کا یہ سیاسی اور اخلاقی حق تسلیم کیا جا چکا ہے کہ جس مقام پر وہ مسلسل رہائش پذیر رہا ہو، جب اس کا جی چاہے وہ وہاں واپس آ سکتا ہے، اسرائیل نے جو رویہ اختیار کیا ہے، اس سے (فلسطینیوں کی) واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ اول: اس نے پے در پے ایسے قوانین منظور کیے جن کے تحت

ھ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے پہلی مرتبہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو ایک قرارداد منظور کی تھی جس کے تحت فلسطینیوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو واپس جا سکتے اور اپنی جائدادوں کا قبضہ لے سکتے ہیں۔ اس قرارداد کی کم از کم اٹھائیس مرتبہ توثیق کی جا چکی ہے۔

(مصنف)

فلسطین میں وہ زمینیں جو عربوں کی ملکیت تھیں۔ انہیں خالی اور ان کے مالکوں کو "غیر حاضر" قرار دے دیا گیا۔ یوں جیوش نیشنل فنڈ[1] کو یہ موقع فراہم کر دیا گیا کہ وہ ان زمینوں کو ہتھیا لے۔ **دوم:** "واپسی کا قانون" منظور اور نافذ کیا گیا۔ اس قانون کی دفعات کے تحت ہر یہودی کو، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی تختے پر پیدا ہوا ہو، یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ جب اس کا جی چاہے، وہ فوری طور پر اسرائیل کی شہریت اور وہاں رہائش اختیار کر سکتا ہے (تاہم اس قانون کی رو سے کسی عرب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسرائیل کی شہریت اور وہاں رہائش اختیار کر سکے خواہ ناقابلِ تردید شہادتوں کے ذریعے یہ ثابت بھی کر دیا جائے کہ اس کا خاندان پشت در پشت فلسطین میں آباد رہا ہے) یہ دونوں قسم کے قوانین، جو تمام تر یہودیوں کے فائدے کے لیے وضع کئے گئے ہیں، نہایت منظم اور قانونی ہتھکنڈے اختیار کرنے میں اسرائیلی حکومت اور اس کے کارندوں کی اس طور مدد کرتے ہیں کہ فلسطینیوں کے لیے وجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ وہ واپس لوٹ سکیں، اپنی جائدادوں کا معاوضہ طلب کر سکیں اور اسرائیل میں ایک یہودی اسرائیلی کے شانہ بشانہ قانون کے تحت ایک برابر کے شہری کی حیثیت سے رہ سکیں۔

ایک اور دلیل جو دی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اتنے زیادہ فلسطینیوں کو، جو بنیادی طور پر (اسرائیل کے خلاف) مخاصمانہ رویہ رکھتے ہیں، واپس لوٹنے کی اجازت دے دی گئی، تو اسرائیل میں جو کچھ وقوع پذیر ہوگا تو اس کا

---

[1] جیوش نیشنل فنڈ اسرائیل کا ایک سرکاری ادارہ ہے۔ قانونی طور پر یہ ادارہ "تمام یہودی قوم کی طرف سے" اسرائیل کی زمینوں کا مالک ہے اور یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس کی کوئی نظیر کسی دوسری آزاد یا نیم آزاد مملکت میں نہیں ملتی (مصنف)

مطلب یہ ہوگا کہ اس (اسرائیل) نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری ہے۔
مزید برآں مملکتِ اسرائیل یہودیوں کے لیے قائم کی گئی ہے، چونکہ یہودیوں
کو ایک نہ ایک دن صہیون "واپس" آنا ہے، اس لیے انہیں ہمیشہ یہ اختیار
حاصل رہنا چاہیے کہ جب ان کا جی چاہے، وہ اپنی امکانی واپسی کے حق
کو استعمال کر سکیں۔ یہ دونوں دلائل جس انداز سے پیش کیے جاتے ہیں،
معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے جذبے کی قوت، بلکہ یقین اور شدت
کام کر رہی ہے۔ جس طرح یہ تصور کرنا لا حاصل ہے کہ اسرائیلی یہودی کبھی یہ
چاہیں گے کہ وہ ان مقامات یا ممالک کی طرف لوٹ جائیں جہاں سے وہ
آئے تھے اسی طرح اس بات کا کوئی فائدہ نہیں کہ عرب فلسطینی محولہ بالا دلائل
سے انکار کرتے رہیں۔ فلسطینیوں اور صہیونیوں کے مابین جو کشمکش جاری
ہے، اس کے متعلق کسی صحیح الدماغ اور صاحب رائے شخص کو جس ناامیدی
اور قنوطیت کا احساس ہوتا ہے، وہ فریقین کی یہ ناکامی ہے کہ ان میں سے
کوئی بھی ان حقائق سے سمجھوتہ نہیں کر پایا کہ اس سرزمین پر صرف وہی نہیں، بلکہ
ایک دوسری قوم بھی موجود ہے، یہ کہ اسے (دوسری قوم کو) جن مصائب و
آلام سے گزرنا پڑا ان کی بھی ایک پر ملال تاریخ محفوظ ہے، یہ کہ اس (دوسری
قوم) نے بھی جذباتی اور سیاسی طور پر بہت کچھ اس سرزمین میں لگا رکھا ہے"۔یا
اور ان سب سے بدتر بات یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر فریق یہ سچا جھوٹا یقین
کیے بیٹھا ہے کہ اس کا مخالف فریق اس کے لیے محض عارضی طور پر وبال جان
بنا ہوا ہے۔ اگر کوششیں جاری رکھی جائیں (اور ان کوششوں میں کبھی کبھی تعزیری
تشدد بھی شامل کرتے رہنا چاہیے) تو کچھ عرصے کے بعد وہ خود ہی منتشر ہو
اوجھل ہو جائے گا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ فلسطینی اور اسرائیلی یہودی

اب ایک دوسرے کی زندگیوں اور سیاسی مقدروں میں پوری طرح دخیل ہو چکے ہیں۔ اس بات نے قطعی انداز چاہے نہ اختیار کیا ہو ــــــــ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر معقول انداز سے بحث کرنا ممکن ــــــــ نہیں لیکن جہاں تک زمانۂ حال یا مستقبل قریب کا تعلق ہے، یہ بالکل درست ہے (تاہم ان امور کے باوجود) ایک شخص کو اتنی صلاحیت سے بہرہ ور ہونا چاہیے کہ وہ ان دو قسم کے لوگوں کے مابین حد امتیاز کھینچ سکے۔ ان میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس سرزمین پر) یلغار کی ہے، دوسروں کو (اپنے گھروں اور جائدادوں سے) بے دخل کیا ہے اور ان کی جگہ خود قابض ہو گئے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن پر یلغار ہوئی، جنہیں بے دخلی سے دو چار ہونا پڑا اور جن کی جگہ دوسرے قابض ہو گئے۔ دونوں برابر کی ٹکر نہیں اور نہ آخر کار ان میں سے ایک کبھی دوسرے پر غالب آسکے گا اور اس پر اپنا تسلط قائم کر سکے گا۔ چنانچہ صیہونی جس سیاسی، قانونی اور علمیاتی نظام کو دوام بخشنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا فوری (اس کا بتکرار اعادہ کیا جاتا ہے) بلکہ دور رس نصب العین بھی یہ ہے کہ فلسطین اور فلسطینیوں کو دور باش رکھا جائے اور انہیں نزدیک بھی پھٹکنے نہ دیا جائے، ایک ایسا امر ہے، جس کی، میرے خیال میں، مخالفت کی جانا چاہیے اور جس کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

ایسی مخالفت کا مطلب کیا ہے اور اس کی صورت کیا ہونا چاہیے؟ جن سیاسی اور علمیاتی حالات و کوائف کا میں ذکر کر رہا ہوں، ان کے پیش نظر (مغرب میں) اسرائیل اور صیہونیت سے متعلق کسی چیز کی مخالفت کا (فوری) مطلب یہ لیا جائے گا کہ آپ اور کچھ نہیں تو کم سے کم یہود مخالف ضرور ہیں اور اگر اس کی دوسری انتہا پر دیکھا جائے تو آپ قتلِ عام کی حمایت

کر رہے ہیں لے میں سمجھتا ہوں کہ میں یہودیوں کی جو مخالفت کر رہا ہوں ۔ وہ اصولی اور محتاط انداز کی ہے، اس لیے میری مخالفت سے یہ نتائج اخذ کرنا کہ میں یہودیوں کا مخالف ہوں یا ان کے قتل عام کا حامی، ایک مفسدانہ، شر انگیز، تخریبی اور مضرت رساں حرکت ہوگی لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس قسم کی حرکت نہ صرف ہو رہی ہے بلکہ آئندہ بھی کئی برسوں تک ہوتی رہے گی تاہم معقول بحث مباحثے کا تقاضا یہی ہے (اس قسم کے مباحث پر میرا یقین بہت پختہ ہے) کہ ان اصطلاحات اور تناظرات میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جن میں لیظاہر ناقابل حل مسائل کا ادراک کیا جاتا ہے ــــــ اور اسرائیلیوں اور فلسطینیوں دونوں نے مل جل کر ایسا ہی لاینحل مسئلہ کھڑا کر دیا ہے، اس لیے دونوں ہی اس قسم کی عقلی تبدیلی کے محتاج ہیں۔

اس قسم کی تبدیلی کے لیے ایک زبردست موقعہ اس وقت میسر آیا تھا

لے اصل میں یہودیوں کی کثیر آبادی کو بابل کے بادشاہ بخت نصر اور بعد میں رومیوں نے حضرت عیسیٰ کے ظہور سے قبل ہی فلسطین سے نکال دیا تھا اور یوں وہ یورپ اور افریقہ کے مختلف ممالک میں منتشر ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ تاہم یورپ کے باشندوں نے یہودیوں کو کبھی بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا اور وہ انہیں ہمیشہ سود خوار تصور کرتے رہے۔ چنانچہ ان پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاتی رہیں اور ان کے خلاف معاشرتی اور قانونی، دونوں سطحوں پر، امتیاز برتا جاتا رہا۔ یورپ والوں کے اس رویے کو یہود دشمنی یا سامیت دشمنی (Anti-Semitism) کہا جاتا ہے۔ تاہم تحریک احیائے علوم اور تحریک اصلاح مذہب کے بعد یورپ والوں کا رویہ تبدیل ہونے لگا۔ اب وہ اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی کے لیے ان کی جائز ناجائز ہر طرح حمایت کرتے ہیں۔

جب یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء کو سوویت یونین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ نے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا تھا۔ اس اعلامیے کی ایک اہم شق یہ تھی کہ اس میں فلسطینیوں کے (محض مفادات کا نہیں بلکہ) حقوق کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ اعتراف کیا گیا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کا جو بھی قطعی پُرامن حل تلاش کیا جائے گا، اس میں ان امور پر لازماً غور کرنا ہوگا۔ یہودیوں کی منظم رائے عامہ نے اس اعلامیہ کا جن دشنام طرازیوں اور مجنونانہ یاوہ گوئیوں کے ساتھ خیر مقدم کیا، وہ بہت حوصلہ شکن تھیں۔ نہ صرف یہ کہ امریکہ کے یہودیوں کا رویہ ہتک آمیز اور بے ہودہ تھا بلکہ اپنے اس طرزِ عمل پر انہیں ندامت تو کیا ہوتی، الٹا اس پر فخر کا اظہار کیا گیا اور یہ لاف زنی کی گئی کہ ہم نے ہزاروں خطوط اور ٹیلی فون کالوں کے ذریعے وائٹ ہاؤس[1] کا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ جو سبق سکھایا جانا مقصود تھا، وہ یہ تھا کہ یہودیوں اور اسرائیل کے حمائتیوں کو ذرا بھی اس بات کا احساس ہوا کہ اسرائیل کے وجود کو کوئی ظاہری یا باطنی خطرہ لاحق ہے، تو وہ حکومت کے خلاف لام بند ہو جائیں گے اور اس کا جینا حرام کر دیں گے[2]۔ اس ڈانٹ ڈپٹ اور تخویف کا مفہوم یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کو محض خارجہ پالیسی کا ایک مسئلہ نہ سمجھا جائے بلکہ اسے امریکی سیاست میں ایک داخلی مسئلے کا مقام حاصل رہے۔ تاہم اس کا دوسرا

---

[1] امریکی صدر کی سرکاری رہائش گاہ۔ اس عمارت کی تعمیر ۱۷۹۹ء میں مکمل ہوئی اور جان ایڈمز پہلے صدر تھے، جنہوں نے اس میں رہائش اختیار کی۔

[2] امریکہ کے یہودی امریکی حکومت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہر طرح سے اسرائیل کی ناز برداری کرے گی اور اسرائیل جو کچھ کرے یا کہے اسے بلا چون و چرا اور غیر مشروط طور پر تسلیم کرے گی اگر اس سے رویے میں انہیں بال برابر بھی انحراف نظر آتا ہے، تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے چلانے لگتے ہیں کہ اسرائیل خطرات میں گھر گیا ہے۔

مفہوم یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کو خوف و ہراس کی بنیاد پر آمادۂ پیکار کرنا بہت آسان کام ہے۔

تاہم دل میں یہ جاننے کی کرید ضرور پیدا ہوتی ہے کہ خوف و ہراس، جبر و تشدد اور کھلم کھلا عقلیت پسندانہ تشدد کی کوئی وجہ جواز بھی ہے یا یہ تقریباً ناقابلِ یقین حد تک کوتاہ اندیشی اور انجام کار کوتاہ عقلی پر مبنی مفاد کی آبیاری کرتے ہیں؟ کیا فلسطینیوں کے متعلق بحث مباحثے کا واحد متبادل یہی رہ گیا ہے کہ ایسی ایسی دھمکیاں دی جائیں کہ جنہیں اگر عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ امریکہ کی حکومت اور امریکہ کے یہودی طبقے کے مابین خانہ جنگی کے مترادف ہوگا یا یہ کہ اسرائیل عربوں کے خلاف ایسی جنگ شروع کر دے جسے اخبارات کے بقول اسرائیلی اور امریکی حکام امکانی طور پر کامل تباہی و بربادی کی جنگ قرار دیتے ہیں۔[1] آخر وہ کون سی ایسی مہیب اور ڈراؤنی چیز ہے جو اس قسم کے متشددانہ ردعمل کو انگیخت دیتی ہے؟ اور اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ کیا اس چیز کو جنگ کی دھمکیوں یا فی نفسہٖ جنگ کے ذریعے معدوم کیا جا سکتا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ فلسطینیوں کا مسئلہ تعقلی انداز سے نپٹانا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو جنگ یا قتل عام کے متعلق باتیں کرنے سے اجتناب برتنا ہوگا اور سیاسی حقائق سے سنجیدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ حقائق چلا چلا کر یہ کہہ رہے ہیں کہ فلسطینی قوم موجود ہے، فلسطینیوں کی زمینوں پر یہودیوں نے قبضہ جما رکھا ہے، ایسے بھی فلسطینی موجود ہیں جن پر اسرائیل نے بزورِ شمشیر

---

[1] اگر آپ مثال دیکھنا چاہیں تو صفِ اوّل کے صحافی جم ہوگ لینڈ (Hoagland) کا وہ مضمون ملاحظہ فرمائیں جو امریکہ کے مشہور روزنامے "واشنگٹن پوسٹ" میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو شائع ہوا تھا۔ (مصنف)

فوجی تسلط قائم کیا ہوا ہے، ایسے فلسطینی ــــــــ ساڑھے چھ لاکھ ــــــــ بھی موجود ہیں جو اسرائیل کے شہری ہیں اور جو اسرائیل کی کل آبادی کے پندرہ فیصد حصے کی تشکیل کرتے ہیں۔ پھر فلسطینیوں کی اچھی بھلی تعداد جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جنہیں امریکہ اور دنیا کے بیشتر ممالک تسلیم بالواسطہ یا بلاواسطہ کر چکے ہیں اور خود اسرائیل بھی تو انہیں قبول کرتا ہے اگرچہ اس کے قبول کرنے کا انداز انوکھا ہے۔ کبھی وہ ان کے وجود سے انکار کرنے لگتا ہے، کبھی وہ انہیں مسترد کرتا ہے، کبھی جنگ کی دھمکیاں دیتا ہے اور کبھی انہیں سزائیں دیتا ہے۔ گزشتہ چالیس برس کی تاریخ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ فلسطینیوں پر آپ جو بھی ظلم و تشدد کرنا چاہیں، کریں، انہیں جس قسم کی مشکلات و مصائب میں سے گزارنا چاہیں، گزاریں، سیاسی طور پر وہ پنپے ہی ہیں، سکڑے نہیں۔ یہودیوں کی تاریخ نے بھی یہ حقیقت واشگاف طور پر عیاں کر دی ہے کہ فلسطین کی سرزمین کے ساتھ، جو بھرپور تاریخ کی حامل سرزمین ہے، وابستگی میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ جب تک فلسطینیوں کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں دیا جاتا، وہ موجود رہیں گے اور ان معاملات کے بارے میں کہ ان کی نمائندگی کون کرے گا، وہ کہاں آباد ہونا چاہیں گے، وہ اپنا قومی اور سیاسی مستقبل کس طرح استوار کرنا چاہیں گے، وہ اپنے خیالات اور اپنی سوچوں کے آپ مالک رہیں گے۔

چنانچہ فی زمانہ اگر کوئی شخص صہیونیوں یا صہیونیت کو ہدفِ تنقید بناتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی تصور یا نظریے پر نکتہ چینی کی جا رہی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تنقید کا ہدف وہ دیوار ہے جو میں "نہ مانوں" کی رٹ نے کھڑی کر رکھی ہے۔ آپ لاکھوں فلسطینیوں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ دفع

ہو جائیں گے یا آپ نے ان کی زمینوں پر جو قبضہ جمالیا ہے، اس پر وہ صاد کر دیں گے، یا ان کے مقدر، ان کی حکومت "خود اختیاری" (اٹانومی) یا یہ کہ انہیں جسمانی طور پر کہاں جانا چاہیے، کے متعلق کوئی اسرائیلی، مصری یا امریکی اپنا کوئی فیصلہ سناتا ہے، تو وہ آنکھیں بند کر کے اسے قبول کریں گے۔ یہ (تنقید) اس بات کا اعلان بھی ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ فلسطینی اور اسرائیلی باہم سر جوڑ کر بیٹھیں، اور ان کے مابین جو تصفیہ طلب امور ہیں، ان پر آپس میں گفتگو کریں۔ تصفیہ طلب امور یہ ہیں:

اپنے آبائی اوطان کو چھوڑ کر فلسطین میں آباد ہونے کا حق کن لوگوں کو حاصل ہے ؟ فلسطینی عربوں کی جو جائدادیں تباہ و برباد ہوئیں یا ان سے چھین لی گئیں، ان کے معاوضے کی کیا صورت ہوگی ؟ وغیرہ وغیرہ

مستقبل کے امن کے متعلق جو عمومی بحث ہوگی، اس کے حوالے ہی سے ان امور پر غور و فکر کیا جا سکے گا۔ اس کے ساتھ ہی صیہونیوں کو ذہنی طور پر یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ جس چیز کو وہ بعض اوقات یہودیوں کی قومی آزادی کا نام دیتے ہیں، اس کی تعمیر کسی مجرد چیز پر نہیں بلکہ ایک دوسری قوم کے وجود کے کھنڈرات پر ہوئی تھی۔ اور آخر میں اس (تنقید) کا مقصد یہ اعتراف کرانا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ محض اتنا نہیں کہ صیہونی بیرونی خیالات و اثرات سے بے نیاز ہو کر سادھوؤں کی طرح محض آپس میں یہ بحث کرتے رہیں کہ اس سرزمین پر، جو کسی زمانے میں فلسطین کے نام سے موسوم کی جاتی تھی، صیہونیت اور اسرائیل نے نظری طور پر کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔ بلکہ یہ ایک انتہائی اہم سیاسی مسئلہ ہے جس میں دو فریق عرب اور یہودی شامل ہیں جو ایک ایسے خطے پر آباد ہیں جو مشترکہ طور پر دونوں کے لیے نہایت وقیع ہے۔

یہاں ہمیں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسائل کو یوں دیکھا، پرکھا اور مرتب نہ کیا جائے کہ وہ محض مشرق وسطیٰ کے لوگوں کے مابین مقامی نوعیت کے مسائل نظر آئیں، بلکہ جیسا کہ میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے، یہ مسائل دو ایسی قوموں کے مسائل ہیں جو اپنے متعلق یہ سمجھتی ہیں کہ وہ دونوں ہی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی ہیں، پھر یہ وہ قومیں ہیں جن کی باہمی پرخاش اور جھگڑوں نے دنیا کو بین الاقوامی طور پر الجھا رکھا ہے۔ جھگڑے کا ایک فریق صیہونیت، یہودی میثاق اور یہودی تاریخ کو ماننے والوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ فریق ہے جو اس انتہائی المناک سلوک کی، جو دنیا کی کسی بھی قوم کے ساتھ روا رکھا گیا، بچی کھچی نشانیوں سے عبارت ہوا ہے۔ (جھگڑے کا) دوسرا فریق ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو استعمار اور نوآبادیاتی نظام کے دشمن ہیں اور اس کا تعلق تیسری دنیا سے ہے۔ یہ فریق اپنے لائحہ عمل کے لیے جن امور کو اساس بناتا ہے، ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

ایک قوم کی حیثیت سے ان کی اپنے گھروں اور جائدادوں سے بے دخلی۔
ان کی طرف سے نسلی امتیاز، دوسروں کے علاقوں کو زبردستی ہتھیانے اور فوجی قبضے کی مخالفت۔

یہ وہ امور ہیں جن کی نوعیت عالمگیر ہے۔ چنانچہ ان کی وجہ سے ساری دنیا ہی کسی نہ کسی نوعیت کی جدوجہد میں شریک ہونے پر مجبور ہے۔ اور اگرچہ اس بات کا ہمیشہ کھٹکا رہتا ہے کہ اگر چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے تو وہ لاینحل ہو جاتے ہیں۔ تاہم یہ بات بھی درست ہے کہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے ایک فائدہ بھی ہوتا ہے کہ ہم ان تمام مسائل اور تصورات کو جو جھگڑے میں جان ڈالتے ہیں، کچھ نہ کچھ ضرور سمجھ جاتے ہیں۔

لیکن اس غالباً بھاری بھرکم تنازعے کی شدت کم کرنے کی کوئی نہ کوئی صورت تو لازماً ہوگی۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اگر فلسطینی اور فلسطین کے یہودی دونوں اپنی

اس مشترکہ صورتِ حال کا محض اپنے ہی قومی تناظر میں ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس انسانی حقوق کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیں، تو (پھر جس نتیجے پر وہ پہنچیں گے اس سے) بظاہر انہیں کچھ خسارہ تو ہوگا لیکن منفعت بھی بہت زیادہ حاصل ہوگی ۔ یہ امر اکثر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ جدید مشرقِ وسطیٰ نے انیسویں صدی کی استعماریت سے خوف ناک حد تک اختلافات کو جنم دینے والا سیاسی ورثہ پایا ہے اور اس پر تقریباً کسی شخص نے بھی اعتراض کی انگلی نہیں اٹھائی یہ مسئلہ خواہ سلطنت عثمانیہ کا ہو یا اس کے ان علاقوں کا جو (جنگ عظیم اوّل کے بعد) مغربی اقوام کے تسلط میں آ گئے تھے ، یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ ان علاقوں پر حکمرانی کا حق اصولی طور پر (صرف) اقلیتوں کو حاصل تھا جن کے مقامی مفادات نو آبادیاتی طاقت کے ساتھ وابستہ تھے ۔ آج بھی لبنان ، اردن ، شام ، اسرائیل ، کویت اور سعودی عرب میں صرف اقلیتیں حکومت کر رہی ہیں ۔ (اس) علاقے کی اکثریت سنّی مسلمانوں پر مشتمل ہے ، تاہم ان میں سے ہر ملک کی حکومت پر یا تو کوئی غیر سنّی (اقلیتی) گروہ قابض ہے یا پھر کسی ایک ہی خاندان کے افراد یا چند دوسرے گنے چنے افراد[1] ۔ جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے ، انہیں ان حکومتوں کے امور و معاملات میں کوئی دخل حاصل نہیں ۔

---

[1] یہاں مصنف نے انگریزی کا لفظ "Oligarchy" استعمال کیا ہے ۔
یہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں اختیارات چند افراد یا خاندانوں کے ہاتھوں میں مجتمع ہوتے ہیں ۔ ارسطو کا خیال ہے کہ یہ اشرافیہ کی گراوٹ کی شکل ہے کیونکہ اس میں عوام الناس کی فلاح و بہبود کی بجائے ذاتی یا گروہی مفادات کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے شام کی "دروزی" حکومت اسی قسم کی ہے ۔

اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اکثریت کے بارے میں اس علاقے کی مرکزی
حکومتوں کا رویہ جابرانہ اور متشددانہ ہے اور یہ بات واضح طور پر عرب ممالک
کے متعلق ہی صحیح نہیں بلکہ اسرائیل پر بھی اس کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔
ایک طرف تو ذہن کا یہ اقلیتی سانچہ ہے، دوسری طرف مملکت کی غیر تنقیدی
انداز سے توصیف برائے توصیف کی جاتی ہے۔ ان دونوں چیزوں کی
شراکت نے ایک فرد کی حیثیت سے ایک عام شہری کی زندگی کو اجیرن اور
غیر یقینی بنا دیا ہے اور اسے دوسروں کے رحم و کرم کا پابند کر دیا ہے —
اسرائیل ہی کی مثال لے لیں۔ ایک تو یہ مملکت ویسے ہی یہودیوں اور غیر یہودیوں
کے مابین رسہ کشی کا اکھاڑہ بن چکی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی
بات یہ ہے کہ یورپی اور مشرقی یہودیوں کے مابین امتیاز کی ایک خلیج وجود میں
آ چکی ہے۔ یوں ان کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں وہ ویسے ہی
ہیں جیسے یہودیوں کے غیر یہودیوں کے ساتھ ہیں۔ جہاں تک اس خطے کے
دوسرے ممالک کا تعلق ہے تو وہاں کے شہریوں کے حقوق کا دار و مدار اس
بات میں نہیں کہ مملکت کے قانون میں ان کی کوئی ضمانت فراہم کی گئی ہے بلکہ
ان حقوق کا سراسر انحصار مرکزی حکومت کی صوابدید پر ہے جس کے اختیارات
کا نہایت چوکسی اور ہوشیاری کے ساتھ تحفظ کیا جاتا ہے۔ اس لیے اگر ہم
اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے تنازعے کے بارے میں مخلص ہیں اور نیک
نیتی سے یہ چاہتے ہیں کہ فریقین کے ساتھ انصاف ہو اور اس تنازعہ کا
کوئی نہ کوئی حل نکل آئے، تو اس سلسلے میں جو بھی قدم اٹھایا جائے گا، اس
کا تقاضا یہ ہوگا کہ دونوں فریقین کے مابین اس مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے،
اس کی دوبارہ اس نہج پر تشکیل کی جائے کہ یہ ایک ایسا تنازعہ دکھائی دے،

جس میں وہ لوگ ملوث ہیں جو اس امید پر زندگی بسر کر رہے ہیں کہ کبھی تو وہ وقت آئے گا کہ جب خطے کے تمام حقیقی (سابقہ اور موجودہ) باشندوں کو ان کے (بنیادی) حقوق کی ضمانت مل سکے گی - ہاں، جب کبھی ایسا وقت آئے گا تو اسرائیل محض پوری یہودی قوم کا، اس کے افراد وہاں رہائش پذیر ہوں یا نہ ہوں، وطن نہیں رہ سکے گا بلکہ یہ اس کے موجودہ یہودی اور غیر عرب شہریوں کا وطن ہوگا - یہی بات علاقے کے دوسرے ممالک کے بارے میں بھی درست ہوگی [1] -

تاہم فی الحال اتنا بنیادی اقدام بھی عملی طور پر ناممکن ہے - اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے مابین تعلقات اس قدر شعلہ افشاں ہو چکے ہیں کہ مسئلے کا حل اور اس میں حق و انصاف سے ملتی جلتی کسی چیز کا اختیار کیا جانا ہے، ناممکنات میں سے ہے - لیکن یہ صورت حال صرف عارضی نوعیت کی ہے میرے خیال میں ہر انسان کا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، طویل المیعاد نصب العین ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ سیاسی طور پر اسے خوف، عدم تحفظ، دہشت گردی اور ظلم و تعدی سے نجات حاصل ہو اور یوں وہ ہر قسم کے خدشات سے آزاد

---

[1] صیہونی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ اسرائیل کی مملکت پوری یہودی قوم کے لیے قائم کی گئی ہے - چنانچہ وہ یہودی بھی جو ابھی تک دنیا کے دوسرے ممالک میں آباد ہیں، یہ حق رکھتے ہیں کہ جب ان کا جی چاہے وہ ترک وطن کر کے اسرائیل آ جائیں اور اس ملک کی شہریت انہیں خود بخود حاصل ہو جائے گی - یہاں مصنف جو بات کہنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کا جامع اور منصفانہ حل تلاش کیے جانے کے بعد صرف وہی یہودی اسرائیل (یا فلسطین) کے شہری رہ سکیں گے جو سمجھوتے کے وقت وہاں آباد ہوں گے

رہ کر زندگی گزار سکے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسروں پر غیر مساویانہ یا غیر منصفانہ تسلط کرنے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ عام انسانوں کے اس طویل المیعاد نصب العین کے معانی فلسطینی عربوں کے نزدیک کچھ ہیں اور اسرائیلی یہودیوں کے نزدیک کچھ اور۔ جہاں تک مؤخر الذکر کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں یہود دشمنی کے خوفناک تاریخی دباؤ سے، جس کا انجام نازیوں کے ہاتھوں ان کے بھائی بندوں کے قتل عام پر ہوا، نجات حاصل ہو۔ انہیں عربوں سے جو خوف لاحق رہتا ہے، وہ اس سے بھی چھٹکارا چاہتے ہیں۔ پھر ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت صیہونی جس طرح غیر یہودیوں کے خلاف اندھا دھند کارروائیاں کر رہے ہیں، وہ ان سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے، ان کا طویل المیعاد نصب العین یہ ہے کہ انہیں جلاوطنی اور بے دخلی سے چھٹکارا حاصل ہو۔ تاریخی طور پر (یورپی باشندوں کے مقابلے میں) وہ جو فرو ماندہ رہ گئے ہیں اور اس فرو ماندگی کے نتیجے کے طور پر انہیں جن ثقافتی اور نفسیاتی تباہ کاریوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، وہ ان سے بھی چھٹکارا پانا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایذا رساں اسرائیل کے خلاف انہیں جو غیر انسانی رویے اختیار کرنا پڑتے ہیں اور ظالمانہ کارروائیاں کرنا پڑتی ہیں، ان سے بھی ان کی خلاصی ہو۔ موجودہ رکاوٹوں کے بیچ میں میری، آپ کی، ہم سب کی ان طویل المیعاد منصوبوں کے متعلق کیا رائے ہے؟

اس سلسلے میں جو اولین، اور غالباً نہایت چھوٹا سا، قدم اٹھایا جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمیں سارے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میں کہیں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ صیہونیت کا مطالعہ اور اس پر گفتگو کچھ اس طور کی جاتی ہے گویا اس کا تعلق صرف اور صرف یہودیوں سے ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے

کہ صہیونیت کے لیے جو غیر معمولی انسانی قیمت چکانا پڑی ہے، اس کا بیشتر بار فلسطینیوں کو اٹھانا پڑا ہے اور یہ قیمت نہ صرف کہ بہت گراں ہے بلکہ اس کا (ابھی تک) اعتراف بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہم پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم صہیونیت سے کوئی تصفیہ کرنے کی کوشش کریں جس نے ایک تصوری (نظریہ۔ اصول) ایک آئیڈیالوجی (آدرش، فکر حیات) اور ایک تاریخی اور سیاسی عمل کے پروگرام کی حیثیت سے فلسطینی عربوں کے لیے بھی اور اسرائیلیوں اور دوسرے یہودیوں کے لیے بھی واضح نتائج پیدا کیے۔ اگر ایک مرتبہ اس حقیقت کو بحث وتمحیص اور تعقلی تفہیم میں پذیرائی حاصل ہو جائے تو پھر ہمیں ان امور کا ادراک کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی جو عربوں کی زندگی میں روح پھونکتے ہیں۔ یہاں میرا مقصد یہ ہے کہ اس حقیقت پر

——— یعنی عرب فلسطینی، میں خود بھی ایک عرب فلسطینی ہوں

بحث وتمحیص ہو سکے جس کو ماننے سے بہت انکار کیا گیا ہے، جس کو دبانے کی بہت کوشش کی گئی ہے۔

جب ایک مرتبہ اوّلین قدم اٹھا لیے جائیں تو یہ بات اتنی معمولی اور محض علمی نوعیت کی نہیں رہ جائے گی، جتنی کہ بظاہر ابتدا میں نظر آتی ہے۔ جس مقدمے (بنیادی نکتہ (PREMISE) پر میں نے اپنی بحث کا دارومدار رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ خود فلسطین اور فلسطین کے بارے میں جو بحث وتمحیص ہوتی ہے، ان کے متعلق تو بہت دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن اس کامل انسانی حقیقت کے متعلق سنجیدگی سے کوئی توجہ نہیں دی جاتی کہ ایک فلسطینی عرب ایک محض بے لگام، سرکش، اڑیل یہود دشمن دہشت گرد پناہ گزیں ہی کی علامت نہیں بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے اس کے بھی کچھ حقوق ہیں تاہم قدرت کا یہی منشا تھا کہ ماضی میں ایسا موقعہ کبھی نہ آئے کہ اس قسم کی بحث وتمحیص نتیجہ خیز تو ایک طرف

رہی، ممکن بھی ہو پاتی۔ اگرچہ یہ امکانات اپنی جگہ موجود ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں
مزید کوئی جنگ چھڑ جائے یا "امن کے عمل" [۱] کے متعلق مزید بے معنی گفتگو
کا راستہ کھل جائے، پھر بھی کبھی کبھار صلح جوئی کی فضا پیدا ہو ہی جاتی ہے،
ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ مسائل پر توجہ دیں،
ان پر غور کریں اور انہیں (صحیح معنوں میں) سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا ارادہ یہ ہے
کہ آئندہ کے صفحات پر دو اجزا پر مشتمل تفہیم کی کوشش کی جائے۔ اولاً، باب دوم
میں صہیونیت کا اس انداز سے جائزہ لیا گیا ہے کہ اس نے فلسطینی عربوں کو، جو
اس کے منتفع نہیں بلکہ اس کے ستم رسیدہ ہیں، کس طرح متاثر کیا۔ دورِ جدید میں
فلسطینیوں کو تجربے کی جس بھٹی میں سے گزرنا پڑا ہے، باب سوم میں بیانیہ انداز سے
اس کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ فلسطینیوں کی حیاتِ اجتماعیہ، ثقافت، سیاسی
اور معاشرتی اداروں کی موجودہ زمانے میں حقیقت کیا ہے، اس کا تجزیہ بھی
اسی باب میں شامل ہے۔ باب چہارم میں مشرقِ وسطیٰ کے متعلق امریکہ کی گزشتہ
اور موجودہ حکمت عملی کے متعلق مباحث کو سمیٹا جائے گا اور اس بات پر غور
کیا جائے گا کہ اگر اس امر پر بالآخر سنجیدگی سے توجہ دینے پر اتفاق ہو جائے
کہ وہ کون سی راہِ عمل ہے جس پر چل کر فلسطینیوں کے لیے امن کے حالات پیدا
کیے جا سکتے ہیں، تو پھر کون سے مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔

---

[۱] یہاں مصنف کا اشارہ ان مذاکرات کی طرف ہے جو امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر، مصر کے
مرحوم صدر انور السادات اور اسرائیل کے سابق وزیر اعظم بیگن کے مابین کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر ہوئے
ان مذاکرات کا یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا کہ مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ لیکن مشرقِ وسطیٰ کے
مسئلہ کا کوئی حل پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔ یوں یہ مذاکرات "بے معنی" ثابت ہوئے۔

دوسرا باب

صیہونیت

اس کے ستم رسیدگان کے نقطۂ نظر سے

۱
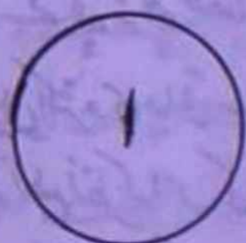
صیہونیت اور یورپی استعمار کے رویّے

ہر خیال یا خیالات کا نظام کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اس کا تانا بانا تاریخی حالات میں گندھا ہوا ہے۔ یہ اس چیز کا، جسے عام فہم الفاظ میں "حقیقت" کا نام دیا جا سکتا ہے، جزو ہے۔ وہ عینیت، جو محض اپنا الّو سیدھا کرنے یا محض اپنی مطلب برآری کے لیے وضع کی جائے، اس کا ایک زندۂ جاوید وصف یہ تصور ہے کہ خیالات محض خیالات ہیں اور یہ کہ وہ محض خیالات کی قلم رو میں ہی موجود ہوتے ہیں۔ خیالات کے متعلق یہ سمجھ لینے کا رجحان، کہ ان کا تعلق محض تجریدات کے عالم سے ہوتا ہے، ان لوگوں میں اور بھی فزوں تر ہو جاتا ہے جن کے نزدیک خیال بنیادی طور پر کامل، بے عیب، نفیس اور انسانی خواہش یا ارادے کی آلائشوں سے پاک صاف ہوتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کی تطبیق اس وقت بھی ہوتی ہے جب خیالات کے متعلق یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ وہ قبیح ہیں، اپنی قباحت میں بالکل کامل ہیں اور علیٰ ہذا القیاس۔ جب کوئی خیال مؤثر بن جاتا ہے ——— یعنی اسے اتنی قبولیت عامہ حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے طفیل اس کی قدر و قیمت حقیقتاً ثابت ہو جاتی ہے ——— تو اس پر کچھ نہ کچھ نظر ثانی کی ضرورت کا احساس ہونے لگے گا کیونکہ خیال کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے بے رحم حقیقت کے کچھ نہ کچھ خصائص ضرور اپنے اندر جذب کر لیے ہوں گے۔ چنانچہ یہ دلیل اکثر دی جاتی ہے کہ ایک ایسا خیال جیسا کہ صہیونیت ہے، اس امر کے قطع نظر کہ اس کی خاطر لوگوں کو سیاسی طور پر بیشمار آلام و مصائب میں سے گزرنا پڑا اور اس کی خاطر انہیں (جان لیوا) جدوجہد کرنا پڑی، بنیادی طور پر ایک غیر متبدل خیال ہے جو یہودیوں کی اس آرزو کا مظہر ہے کہ وہ اپنی قومی شخصیت کی تعمیر کریں گے اور اس مقصد کے لیے وہ ارضِ موعود پر سیاسی اور مذہبی طور پر خود فیصلہ کریں گے۔ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ اسرائیل کی تخلیق کے ساتھ صہیونیت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے، پھر بھی یہ دلیل دی جاتی ہے کہ چونکہ تاریخی اعتبار سے خیال کو عملی جامہ پہنایا جا چکا ہے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کی روح ناقابلِ تبدیل ہے اور اس (خیال) کی تکمیل کے لیے جو ذرائع استعمال میں آئے، ان کی اہمیت بھی کوئی کم نہیں ہے۔ لیکن غیر یہودیوں کے لیے جنہیں اس کا سامنا کرنا پڑا صہیونیت کے نتائج کیا نکلے، اس کے متعلق خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے اور شاذ ہی کبھی کوئی بات کہی جاتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صہیونیت کا ورود کہاں ہوا[1] اور انیسویں صدی کے یورپ کے تاریخی سیاق و سباق میں اس

---

[1] یہودی تاریخ میں صہیونیت کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۶۳ پر)

نے کہاں سے قوت حاصل کی، تو ان باتوں کو بھی گول کر دیا جاتا ہے اور ان کا مطلقاً ذکر نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صہیونیت (ان کے نہیں بلکہ) کسی اور کے خیال کی پیداوار ہے، جسے فلسطین میں درآمد کیا گیا اور جس کی خاطر ہر فلسطینی مرد و زن کو قیمت چکانا پڑی اور مصائب و آلام کی بھٹی میں سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ صہیونیت کے متعلق یہ بھولی بسری باتیں (جن کا ذکر اوپر آیا ہے) ہی اصل چیزیں ہیں اور انہی کی اصل اہمیت ہے۔

قصہ مختصر، ضرورت اس بات کی ہے کہ صہیونیت جیسے مؤثر سیاسی خیالات کو کھنگالنے اور ان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے دو طریقے استعمال کیے جائیں۔ ان میں سے پہلا طریقہ نسباتی ہے۔ اس طریقے کے ذریعے ہم یہ واضح کر سکیں گے کہ ان خیالات کی اصل یا ماخذ (Origin) کیا ہے، ان سے ملتے جلتے خیالات کون سے ہیں اور ان خیالات نے کن دوسرے خیالات کو جنم دیا ہے۔ پھر دوسرے خیالات اور سیاسی اداروں دونوں کے ساتھ یہ کس طرح ملحق ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان خیالات کی بنا پر وہ کون سے عملی نظام وجود میں آئے جن کی اعانت سے قوت و اختیار کا ارتکاز ممکن ہوا، یکے بعد دیگرے دوسروں کی زمینوں پر قبضہ

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۶۲: کہ اس نے عملاً شکل کہاں اختیار کی۔ ظاہر ہے، اس کا جواب انیسویں صدی کا یورپ ہے۔

۵ نسباتی (Geneology) وہ علم جس کے ذریعے کسی شخص، جانور یا پودے کا حسب نسب معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ہوا اور اپنے آدرش کو صحیح ثابت کرنے میں آسانیاں فراہم ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے لوگوں اور دوسری قسم کے خیالات کی بے دخلی عمل میں آئی اور جو چیز پہلے جائز طور پر موجود تھی، اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ موجود زمانے کے سیاسی اور ثقافتی حقائق نے اس قسم کے جائزے کے کام کو غیر معمولی طور پر دشوار بنا دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مغرب کے صنعتی طور ترقی کرنے کے بعد صہیونیت نے وہاں کے لبرل حلقوں میں ایک ایسا بالادست مقام حاصل کر لیا ہے کہ کوئی اسے چیلنج کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنی ایک بنیادی نظریاتی خصوصیت سے ہم آہنگ ہو کر صہیونیت نے ان باتوں پر یا تو پردہ ڈال دیا ہے اور یا پھر انہیں نظروں سے اوجھل کر دیا ہے کہ وہ کون سے حقیقی تاریخی عوامل تھے جو اس کی نمو میں کارفرما ہوئے، یہ کہ فلسطین کے مقامی باشندوں کو اس کی وجہ سے سیاسی طور پر کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے اور یہ کہ یہ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین کن تشدد آمیز ظالمانہ طریقوں سے امتیاز برتتی ہے۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کی ایک متوحش اور چونکا دینے والی مثال پر غور فرمائیں۔ یہ مثال مناحم بیگن کی ہے۔ صہیونیت کیا ہے اور کیا چاہتی ہے بیگن کو اس کی علامت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بیگن (کچھ عرصہ قبل اسرائیل کا وزیر اعظم بھی رہ چکا ہے) کسی زمانے میں یہودیوں کی ایک دہشت گرد تنظیم ارگن (Irgun) کا سربراہ تھا۔ اس تنظیم کے ارکان نے ماضی میں بیشمار شقاوت اور سنگدلی سے بھرپور قتل و غارت گری کی وارداتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا (ان میں اکثر وارداتیں ایسی تھیں جن کا اعتراف خود یہ تنظیم بھی کر چکی ہے)۔ ایک طرف تو بیگن کا یہ (مکروہ) ماضی تھا۔ دوسری طرف امریکہ میں اسکی یوں قدر و منزلت

کی جاتی ہے کہ مئی ۱۹۸۰ء میں نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی اسے اسرائیل کے وزیر اعظم کی حیثیت سے قانون کی ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازتی ہے۔ حالانکہ یہ وہ "رہنما" تھا جس کی فوجوں نے صرف ایک ماہ قبل جنوبی لبنان پر بھرپور حملہ کیا اور چشم زدن میں تین لاکھ لوگوں کو بے گھر اور بے در بنا دیا تھا۔ اور یہ وہی شخص تھا جو بتکرار چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ "جودیہ اور سماریہ[1] مملکت یہود کے "جائز" حصص ہیں۔ لیکن امریکہ کے اخبارات اور دانشوروں کے طبقے بھی خوب ہیں، وہ مطلقاً یہ ظاہر ہونے نہیں دیتے کہ (۱) مناحیم بیگن کو جو باعزت مقام حاصل ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی "خیالات کی منڈی" میں عربوں کی قطعاً شنوائی نہیں ہوتی (یعنی نہ ان کا نقطۂ نظر منظر شہود پر آتا ہے اور نہ کسی کو یہ معلوم ہونے دیا جاتا ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یوں مناحیم بیگن، اس کے چیلے چانٹوں بلکہ تمام یہودیوں کے لیے میدان صاف ہے، وہ جو چاہتے ہیں، چھپواتے اور نشر کراتے ہیں اور اس طرح یک طرفہ پراپیگنڈے سے امریکیوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں) ۔(۲) یہ کہ ۱۹۴۸ء سے قبل فلسطین میں جو یہودی مملکت وجود میں آئی تھی، وہ واقعہ آج سے دو ہزار سال قبل پیش آیا تھا اور یہ کہ اس کی مدت صرف ساٹھ سال تھی[2] اور یہ

---

[1] اسرائیل جن علاقوں کو "جودیہ اور سماریہ" کہتا ہے، یہ اصل میں فلسطین کا وہ علاقہ ہے جو دریائے اردن کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ واقع ہے اس لیے عموماً اسے "مغربی کنارہ" ہی کہا جاتا ہے۔ اسرائیل نے اس علاقے پر ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران میں قبضہ کیا تھا۔ اب اکثر اسرائیلی یہ کہتے ہیں کہ یہ اسرائیل کا "اٹوٹ انگ" ہے۔ وہ یہ دعاوی "عہد نامہ عتیق" کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ لیکن اس سرزمین پر جو لوگ (یعنی فلسطینی) آباد ہیں، ان کا قطعاً ذکر نہیں کرتے گویا یہ لوگ وہاں موجود ہی نہیں اور یہ علاقہ بالکل بے آباد ہے۔

کہ فلسطینیوں کو جس طرح منتشر ہونا پڑا، وہ کوئی خدائی تقاضا نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ ایک مخصوص قسم کی طاقت اور حیلوں کا شاخسانہ تھا۔ صہیونی اپنی تاریخ کی جس طرح پردہ پوشی کرتے ہیں، وہ اب محض ان کی ہی عادتِ ثانیہ نہیں بن چکی بلکہ دوسرے بھی اس حرکت کے ارتکاب میں کچھ پیچھے نہیں رہتے۔ مشرقِ وسطیٰ میں "ہمہ گیر اور جامع امن" کے حصول و قیام کے سلسلے میں جو گفتگوئیں، مذاکرات اور بحث مباحثے ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں، ان کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو (صہیونیوں کا) اپنی تاریخ کو اس انداز سے پیش کرنا ان کی طرف سے ایک مخصوص قسم کی ذہنی اور سیاسی کارروائی ہے حالانکہ اس تاریخ کو فلسطین اور فلسطینیوں سے بزور چھپایا گیا ہے کیونکہ یہی وہ ستم رسیدگان ہیں جن کی تاریخ اور حالات و کوائف کو پردۂ اخفا میں رکھا گیا ہے اور اسی امر پر صہیونیت اور اسرائیل نے اپنی بقار کا انحصار کیا ہے۔

قسم قسم کی وجوہات کے پیشِ نظر اس بحث و تمحیص میں امریکہ کو جو خصوصی بلکہ امتیازی مقام حاصل ہے، وہ بہت مرعوب کن ہے۔ امریکہ کے علاوہ دنیا کا کوئی اور ملک ایسا نہیں جہاں صہیونیت کو تبرک کا درجہ دیا جاتا ہو، یعنی اسے ایک ایسی چیز سمجھا جاتا ہو، جس کی پاکیزگی، تقدس اور نفاست کی خود دیوتا بھی قسم اٹھاتے ہوں اور جس پر معمولی سے معمولی اعتراض کو بھی بے ادبی گردانا جاتا ہو۔ پھر پوری دنیا گھوم جائیے، آپ کو کوئی ایسا ملک نظر نہیں آئے گا جہاں طاقتور اداروں اور مفادات ــــــ اخبارات و جرائد، لبرل دانشوروں، فوجی اور صنعتی کارخانوں اور اداروں، اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور منتظمین، مزدوروں کی تنظیموں ــــــ کا اتنا زبردست گٹھ جوڑ دیکھنے کو ملے۔ یہ ادارے، تنظیمیں اور اشخاص یہ باور کرتے ہیں (اور اس

کا ذکر میں باب اوّل میں بھی کر چکا ہوں) کہ وہ جس قدر آنکھیں بند کر کے صہیونیت اور اسرائیل کی حمایت کریں گے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک ان کا وقار اتنا ہی بلند ہوگا۔ اگرچہ حالیہ برسوں کے دوران میں اس مہتمم بالشان اتفاق رائے میں تبدیلی کے کچھ خفیف سے آثار دکھائی دینے لگے ہیں [۱] لیکن اسرائیل کی طرف جو واضح جھکاؤ موجود ہے، وہ ابھی تک پوری طرح جاری و ساری ہے۔ یہ جھکاؤ کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ ثقافتی طور پر اس (جھکاؤ) کی جڑیں یورپ میں بالعموم اور امریکہ میں بالخصوص بہت گہری ہیں کہ کلّی تاریخی حقیقت کے مقابلے میں اس نے جو منفی، ممانعتی [۲] کردار اختیار کر رکھا ہے، وہ بہت منظم اور مربوط ہے۔

---

[۱] یہ تبدیلی کیوں آئی ہے، اس کی وجوہ مختلف ہیں۔ اس میں کچھ تو عرب تیل کا ہاتھ ہے، پھر مصر اور سعودی عرب جیسی قدامت پسند مملکتوں کے ظہور نے بھی کچھ کردار ادا کیا ہے۔ یہ مملکتیں امریکہ کی حلیف ہیں اور اسرائیل مخالف پلڑے میں ان کا وزن پڑنے سے اسرائیل کے خلاف فضا سازگار کرنے میں کچھ مدد ملی ہے۔ پھر فلسطینی عوام اور ان کی نمائندہ جماعت، پی ایل او نے سیاسی اور فوجی اعتبار سے اپنی جو زبردست ساکھ منوائی ہے، وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ (مصنف)

[۲] اصل میں یہاں مصنف نے انگریزی زبان کا لفظ Interdictory استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کے ساتھ کچھ تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ رومن کیتھولک کلیسا جس شخص یا مقام کے متعلق ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا اسے مذہبی فرائض کی بجا آوری کے حق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اس شخص کا مردہ بھی خراب ہوتا تھا کیونکہ اس کی تدفین پر مذہبی رسوم ادا نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اس فعل کو interdict، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تاہم اس زبردست تاریخی حقیقت سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں کہ آپ
جب فلسطینی عوام کے متعلق ان حقائق سے، جنہیں صہیونیت نے اخفائے راز
میں رکھا ہے، عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں گے تو آپ کی ان کوششوں کے
ڈانڈے ایک طرف تو یہود دشمنی کے پورے تباہ کن مسئلے سے جا ملیں گے
اور دوسری طرف ان باہمی پیچیدہ تعلقات کے ساتھ جو فلسطینیوں اور عرب
ملکوں کے مابین پائے جاتے ہیں، ہر وہ شخص جس نے ۱۹۷۸ء کے موسم بہار کے دوران میں ٹیلیوژن پر
امریکہ کی نیشنل براڈکاسٹنگ کارپوریشن (این۔ بی۔ سی) کی فلم قیامتِ صغریٰ[1] دیکھی تھی، اس بات سے
آگاہ تھا کہ اس فلم کے پیش کرنے کا کم از کم جزوی مقصد یہ تھا کہ اس کے
ذریعے صہیونیت کا جواز ڈھونڈا جائے اور ناظرین کو اس کا قائل کیا جائے
حالانکہ جس زمانے میں یہ فلم دکھائی جا رہی تھی، عین انہی
ایام کے دوران میں خود اسرائیلی فوجوں نے لبنان میں ایک قیامت صغریٰ
برپا کر رکھی تھی وسیع و عریض علاقے تباہ و برباد کر دیے گئے، ہزاروں شہری
باشندوں کو یا تو موت کی نیند سُلا دیا گیا یا گھائل کر دیا گیا اور لاکھوں لوگوں کو بے پناہ
مصائب و آلام جھیلنا پڑے۔ یہ تباہی اتنی ہمہ گیر اور اتنی شدید تھی کہ بعض جرأتمند

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۶۷: کہا جاتا تھا۔ چونکہ مغرب کے لوگ بھی صحیح تاریخ
کو نہیں مانتے اور فلسطینیوں کے متعلق ایک منفی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہا
جا سکتا ہے کہ جس طرح رومن کیتھولک کلیسا کی نظروں میں وہ شخص "معدوم" ہو جاتا تھا جسکو
یہ سزا دیتا تھا۔ اسی طرح مغرب کے لوگوں کی نظروں میں فلسطینیوں کا شاید کوئی وجود نہیں۔

[1] انگریزی میں اس فلم کا نام "Holocaust" ہے اس میں اس "قتل عام" کا ذکر ہے جو کہا
جاتا ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں جرمن نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کا ہوا تھا۔

رپوٹرز اس کا موازنہ اس تباہی و بربادی کے ساتھ کیے بغیر نہ رہ سکے جو امریکہ نے ویٹ نام میں روا رکھی تھی [۱] ——— اسی طرح ۱۹۷۰ء کے اوائل میں جس پیکیج ڈیل [۲] کے تحت اسرائیل، مصر اور سعودی عرب کو امریکی جنگی طیارے فروخت کرنے کی راہ ہموار ہوئی، اس پر وہ ہنگامہ کھڑا کیا گیا کہ عربوں کی آزادی کے لیے کام کرنے والی تحریکوں کی اس مشکل میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی کہ وہ دائیں بازو والی عرب حکومتوں کے ساتھ اپنا رشتہ کیسے استوار کریں ایسے معاملات میں تنقید کا کام یا بالفاظِ دیگر تنقیدی شعور کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ جہاں پہلے امتیازات اور اختلافات موجود نہیں۔ وہاں وہ امتیازات ڈھونڈے، اختلافات پیدا کرے۔ فلسطین میں صہیونیت نے جو گل کھلائے ہیں، اگر کوئی شخص ان کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے تو اس کا مطلب نہ کبھی یہ تھا

---

[۱] اس قسم کی امریکی اخبارات میں جو رپورٹیں شائع ہوئیں، ان میں سے ایک رپورٹ ایک صحافی ایچ ڈی ایس گرین وے نے مرتب کی تھی اور یہ "واشنگٹن پوسٹ" کے ۵ مارچ ۱۹۷۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا عنوان تھا:

"Vietnam-style Raids Gut South Lebanon: ISRAEL LEAVES A PATH OF DESTRUCTION.

[۲] Package Deal مختلف اشیاء پر مشتمل پیشکش۔ پیش کرنے والا جن اشیاء کی پیشکش کرتا ہے، ان میں سے کچھ وصول کنندہ کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور کچھ غیر ضروری۔ کوالٹی کے اعتبار سے بھی بعض اچھی ہوتی ہیں اور بعض واجبی۔ لیکن وصول کنندہ کو سبھی کی وصولی کے متعلق اتفاق کرنا پڑتا ہے، ورنہ پیش کش منسوخ کیے جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

اور نہ کبھی یہ ہے کہ وہ شخص یہود دشمن ہے۔ اس کے برعکس فلسطینیوں کے حقوق اور ان کے حق رائے شماری کی بازیابی کے لیے جو جدوجہد کی جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کی جدوجہد میں حصہ لینے والا شخص سعودی شاہی خانوادے کی تائید و حمایت کر رہا ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اکثر عرب ممالک کے فرسودہ اور جابرانہ ملکی ڈھانچوں کو مضبوط بنا رہا ہے۔

تاہم ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ صہیونیوں کی یہ جو عادت ہے کہ وہ ہر اس شخص کو جو صہیونیت کی مخالفت کرتا ہے، یہود دشمن قرار دے دیتے ہیں۔ (مغرب کے تمام لبرل بلکہ بڑے بڑے انتہا پسندوں (RADICALS) کی کثیر تعداد بھی اسی علت میں گرفتار ہے اور وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر نیک نیت شخص جنوبی افریقہ یا خود امریکہ کی نسل پرستی کی بھی مخالفت کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ زبان کو جنبش دیئے بغیر اس نسلی امتیاز کی حمایت بھی کر سکتے ہیں جس کا ارتکاب فلسطین میں صہیونی غیر یہودیوں کے خلاف کر رہے ہیں۔ حال یہ ہے کہ غیر صہیونیوں نے تاریخ کے متعلق جو کتابیں تحریر کی ہیں، امریکہ میں وہ کہیں بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ ذرائع ابلاغ کا رویہ یہ ہے کہ وہ پیچیدہ اور گنجلک مسائل (مثلاً یہودی بمقابلہ عرب) کو سہل اور آسان تر بنا کر پیش کرنے کی روش پر گامزن ہیں۔ دباؤ ڈالنے کے لیے یہودیوں نے جو مختلف گروپ تشکیل کیے ہوئے ہیں، وہ سنگی موقع پرستی سے کام لیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ساتھ جو دانشور وابستہ ہیں، ان میں یہ رجحان عام پایا جاتا ہے (اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ رجحان ان

کی طبیعتوں کا خاصہ ہے) کہ وہ جانچے پرکھے بغیر پیش پا افتادہ جملوں اور فرسودہ سیاسی نعروں کی جگالی کرتے رہتے ہیں ۵؎ ۔ ایک ایسے زمانے میں جب یہودیوں کا نام و نشان تک مٹا دینے کے لیے ان کا "قتل عام" کیا جا رہا تھا ، خود یہودی ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے تھے ، جو ان کے زخم خوردہ اور ستائے ہوئے تھے ، اس کا ذکر تک نہیں کیا جاتا اس بات کو انتہائی حساس تسلیم کیا جاتا ہے کہ لوگ ان کا ذکر کرتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں

——— ان تمام امور نے مل جل کر ایسے اسباب فراہم کر دیئے ہیں جن کی مدد سے لوگوں کے ذہنوں میں کوڑا ابھرا جا سکتا ہے اور ان کے دماغوں پر قفل لگائے جا سکتے ہیں اور یوں ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت ہر کس و ناکس کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ بلا چون و چرا اسرائیل کی حمایت کرتا رہے اور اس کا دم بھرتا رہے ۔ لیکن جیسا کہ آئی ایف سٹون نے حال ہی میں یہ تبصرہ کیا ہے کہ جس اتفاق رائے سے صہیونیت کی حمایت و تائید کی جاتی ہے ، خود اکثر اسرائیلی بھی اس (صہیونیت) کی اتنی حمایت نہیں کرتے ہوں گے ۔

یہاں تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش نظر رہنا چاہیے ۔ ایک خیال کی حیثیت سے یہودیوں کے لیے صہیونیت میں جو قوت و طاقت ہے ، اسے نظر انداز کرنا ناانصافی ہوگا ۔ پھر صہیونیت کی خوبیاں بیان کرنے ، اس کے صحیح معانی متعین کرنے ، اس کے مسیحائی مقدر پر زور دینے اور اسی قسم کی دوسری باتیں کرنے

۵؎ یہ وہی رول ہے جو گرام شی نے روایتی دانش وروں کے کھاتے میں ڈالا تھا یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو کسی چیز کو جائز بنانے یا اس کا جواز ڈھونڈنے کے ماہر ہیں ۔ (مصنف)

کے لیے صہیونی جو آپس میں مباحث کرتے ہیں، ان کی اہمیت کو گھٹا کر پیش کرنا بھی زیادتی ہوگا۔ صہیونیت کیا ہے؟ اس کی "تعریف" کیا ہوسکتی ہے، ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنا تو بہت دور کی بات ہے، عربوں کے لیے اس موضوع کا ذکر چھیڑنا بھی سخت تکلیف دہ امر ہے۔ تاہم اس کا دیانتداری سے جائزہ لینا ایک ناگزیر معاملہ بن چکا ہے۔ یہاں میں اپنے آپ کو ہی بطور مثال پیش کرتا ہوں۔ میری بیشتر تعلیم اور اساسی طور پر میری تمام ذہنی اور تعقلی ساخت مغربی سانچوں کی مرہون منت ہے۔ جو کچھ میں پڑھتا ہوں، جو کچھ میں لکھتا ہوں، بلکہ سیاسی طور پر بھی جو کچھ میں کرتا ہوں، میں ان تمام امور میں ان رویوں سے شدید طور پر متاثر ہوں جو مغرب والوں نے بحیثیت مجموعی یہودیوں کی تاریخ، یہود دشمنی اور یورپی یہودیوں کی تباہی و بربادی کے متعلق اپنا رکھے ہیں۔ بیشتر عرب دانشوروں کے برعکس، ظاہر ہے کہ ان کی اکثریت کا پس منظر وہ نہیں جو میرا ہے، مجھے یہودی تاریخ اور تجربے کے ان پہلوؤں کا براہ راست مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے جو یہودیوں اور مغرب کے ان غیر یہودیوں کیلئے، جو یہودی تاریخ کا مطالعہ کرتے اور اس کے متعلق سوچ بچار کرتے رہتے ہیں، ما غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ مغرب کے کسی بھی تعلیم یافتہ شخص کی طرح میں بھی یہ بات بخوبی جانتا ہوں کہ یہودیوں کے لیے "یہود دشمنی"[1]، خاص طور پر موجودہ صدی میں، کیا نتائج لے کر آئی تھی۔ چنانچہ میں اس دہشت اور انبساط کو، جو (یہودیوں کے معاملے میں) آپس میں گھتے ہوئے ہیں اور جن کے ملغوبے سے صہیونیت نے نشوونما پائی ہے، سمجھ سکتا ہوں۔ اور میرا خیال

---

[1] Anti-Semitism

ہے کہ میں اس بات کا بھی ادراک کر سکتا ہوں کہ یہودیوں، بلکہ مغرب کے روشن خیال لبرل طبقے کی نگاہوں میں بھی، اسرائیل کیا معنی رکھتا ہے۔ پھر بھی، چونکہ میں ایک عرب فلسطینی ہوں، میں دوسری چیزیں بھی دیکھ اور محسوس کر سکتا ہوں ——— اور یہی وہ باتیں ہیں جو معاملات کو اس قدر پیچیدہ اور گنجلک بنا دیتی ہیں کہ وہ میرے لیے اس امر کا موجب بن جاتی ہیں کہ میں صیہونیت کے دوسرے پہلوؤں پر بھی اپنی توجہ مرکوز کروں، اس سے جو نتیجہ برآمد ہوا ہے، میرے خیال کے مطابق وہ اس قابل ہے کہ اسے (کھول کر) بیان کیا جائے۔ بیان کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ جو کچھ میں سوچتا ہوں وہ کوئی بہت اہم ہے بلکہ میرے اندازے کے مطابق اس کی وجہ یہ بنتی ہے کہ فائدہ اس میں ہے کہ ہر معاملے کو اس طور دیکھنا پرکھنا چاہیے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کی تکمیل تو ضرور کرتے ہیں لیکن عام حالات میں ان کا آپس میں کوئی ربط ضبط نہیں ہوتا۔

ہم اپنی بات کا آغاز ایک ادبی مثال ——— جارج ایلیٹ [۵]

---

۵ جارج ایلیٹ (۱۸۸۰-۱۸۱۹ء) جارج ایلیٹ کا اصل نام میری این ایونز (Mary Ann Evans) تھا۔ اس نے جب اپنا پہلا ناول تحریر کیا تو ناکامی کا خوف اتنا زیادہ تھا کہ اس نے ایک مردانہ نام قلمی نام کی حیثیت سے اختیار کر لیا اور اسی نام سے اس نے شہرت پائی۔ وہ انگریزی کے عظیم ترین ناول نگاروں میں شمار ہوتی ہے۔ انگریزی زبان و ادب کے ایک "پھنے خان" نقاد ایف آر لیوس تو اسے ان چار ناول نگاروں میں شمار کرتا ہے جنہوں نے انگریزی ناول نگاری کی عظیم روایت قائم کی ہوئی ہے اس کے مشہور ترین ناولوں میں

The Mill on the Floss، "Silas Marner" Adam Bede

"Middle march" اور

بقیہ اگلے صفحہ پر

کے آخری ناول ڈینیل ڈرونڈا _______ سے کر سکتے ہیں۔ اگرچہ جس شخص نے بھی ایلیٹ کے اس سے پہلے لکھے گئے ناولوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس ناول میں بھی نہایت آسانی کے ساتھ اس کے اصل اور بڑے موضوعات کی پہچان کر سکتا ہے، تاہم اس کتاب کا ایک غیر معمولی وصف یہ ہے کہ اس کا اصل موضوع صہیونیت ہے۔ ایلیٹ کو عینیت میں جو عمومی دلچسپی تھی اور روحانی تشنگی کو دور کرنے کی وہ جس قدر آرزو مند تھی، ان کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انیسویں صدی کے باشعور طبقے نے، جو ابھی تک یہ امیدیں لگائے بیٹھا تھا کہ ایک سیکولر مذہبی معاشرے کی تعمیر و تشکیل ممکن ہے دنیا کی فلاح و بہبود کے متعلق جو منصوبے تراشتے تھے، صہیونیت انہی منصوبوں کی ایک کڑی تھی اور خود ایلیٹ اس معاملے میں اس طبقے سے متفق تھی۔ مختلف منصوبوں کیلئے مختلف لوگوں میں جو جنون اور اشتیاق پایا جاتا تھا، جارج ایلیٹ نے اپنی سابقہ کتابوں میں ان میں سے کسی ایک کا مطالعہ پیش کیا تھا۔ ان منصوبوں کا مقصد و مدعا یہ تھا کہ انہیں منظم مذہب کی جگہ مروج کیا جائے ایسے منصوبوں میں ان لوگوں کے لیے بہت کشش کا سامان تھا جو اگر مربوط عقائد کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے۔ تو (اپنے کارناموں اور قربانیوں کے طفیل) اپنے زمانے کے سینٹ ٹریسا[1] کا درجہ حاصل کر لیتے۔ ایلیٹ

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۷۱: شامل ہیں اس کا ناول "Daniel Deronda" ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں اس کا کوئی نہ کوئی ناول۔ ایم اے (انگریزی) کے نصاب میں شامل ہے

[1] سینٹ ٹریسا (Saint Teresa) سینٹ ٹریسا (۱۵۸۲-۱۵۱۵ء) ایک ہسپانوی راہبہ اور مصلح۔ وہ ہسپانیہ کے شہر اویلا (Avila) میں پیدا ہوئی۔ وہ بچپن سے ہی مذہب کی طرف مائل تھی چنانچہ اس نے ترک دنیا اختیار کی اور ایک خانقاہ سے وابستہ ہو گئی۔ (بقیہ صفحہ ۱۷۵ پر)

نے سینٹ ٹریسا کا حوالہ اولین بار اپنے ایک ابتدائی ناول "مڈل مارچ"۔۔
میں دیا تھا۔ اپنے اس ناول کی ہیروئن[۱] ڈروتھیا بروک کے خدوخال ابھارنے
کے لیے جارج ایلیٹ نے اسے (سینٹ ٹریسا کو) استعمال کیا تھا
لیکن اس عمل کے ذریعے وہ درحقیقت اس امر کی تحسین کرنا چاہتی تھی کہ
باوجودیکہ دنیائے جدید میں ان ضمانتوں اور یقین دہانیوں کا فقدان تھا جو عقیدے
اور علم کی ترویج کے لیے ضروری ہوتی ہیں، خود اس نے اپنی بصیرانہ[۲] اور اخلاقی
قوتوں کو برقرار رکھا تھا۔ ناول کے اختتام پر ڈوروتھیا ایک ایسی خاتون کے روپ

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۷۴ : ۱ جب یورپ میں مارٹن لوتھر کے زیر اثر پروٹسٹنٹ
فرقہ فروغ حاصل کرتا جا رہا تھا تو رومن کیتھولک فرقے نے اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔ ہسپانیہ میں
اس نئے فرقے کے راستے میں جو لوگ مزاحم ہوئے، ان میں ٹریسا کا نام سب سے اوپر آتا ہے۔ اس نے پندرہ خانقاہیں
خود قائم کیں، اور سترہ دوسروں سے قائم کرائیں۔ اس نے بیشمار لیکچر دیئے اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۶۲۲ میں اسے
سینٹ کا رتبہ دیا گیا۔

سلہ ۲ : ترجمے میں جو الفاظ "بصیرانہ اور خواب" استعمال کیے گئے ہیں، وہ دراصل
انگریزی کے الفاظ "Visionary" اور "Vision" کا
غیر تسلی بخش ترجمہ ہیں۔ انگریزی میں "Vision" مختلف معانی میں استعمال
ہوتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ بعض اوقات صوفیائے کرام کی طرح کسی شخص پر
جذب و کیف کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ یہ دعوے کرتا ہے کہ میں فوق
الفطرت ہستیوں یا اشیاء کو ایسے ہی دیکھ سکا ہوں جیسے عام انسان اپنی آنکھ سے کسی
مادی اشیاء کو دیکھتے ہیں، تو اس فعل کو اس کا "Vision" کہا جائے گا۔
یہاں "Visionary" انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں ظہور کرتی ہے جس کا مختلف النوع عذاب اور سختیاں جھیلنے کے بعد تزکیۂ نفس ہو چکا ہے، جو اس بات پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اس نے "بھرپور" زندگی گزارنے کے متعلق جو عظیم الشان خواب بنے تھے، ان سے دستبردار ہو جائے اور اس کے عوض ایک ایسی گھریلو زندگی قبول کرلے جس میں بیوی اور ماں کی حیثیت سے اسے نسبتاً معمولی قسم کی کامیابی کی ضمانت مل سکتی تھی۔ حالات و واقعات کے متعلق یہاں جو پست نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے، جسے "ڈینیئل ڈرونڈا" (بحیثیت ایک ناول) اور خاص طور پر صہیونیت نے، نظر ثانی کے بعد بلندی کی طرف اٹھادیا ہے۔ اس نظر ثانی شدہ نقطۂ نظر کا مقصود یہ ہے کہ ایک ایسا پُر امید معاشرتی اور مذہبی منصوبہ پیش کیا جائے کہ ایک فرد کی قوتیں اور صلاحیتیں ایک اجتماعی قومی خواب میں ضم ہو جائیں اور وہ اپنی شناخت محض اسی کے حوالے سے کرنا شروع کردے۔ اس سارے منصوبے نے یہودیت کی کوکھ سے جنم لینا تھا۔

ناول کی کہانی باری باری دو اجزاء کے گرد گھومتی ہے۔ جزو اول میں برطانیہ کے اونچے بورژوا طبقے کے، جو حیران کن حد تک اپنی جڑوں سے محروم ہے، آداب و شعائر کا تلخ انداز سے مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ جزو دوم میں ناول کے ہیرو، ڈینیئل ڈرونڈا ـــــــ جو ایک بدیسی قوم کا نوجوان فرد ہے،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۱: بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی شالی شے یا شالی صورت حال کا نقشہ اپنے تصور میں باندھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ کے آپ، آپ کے معاشرے اور ملک وقوم کے لیے اس سے بہتر شے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی "ویژن" ہے، ویژن والے لوگ ہی قوموں اور ملکوں کی تقدیر تبدیل کرتے ہیں۔ متن میں اس کا ترجمہ "خواب" کیا گیا ہے۔

اور جس کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ماں باپ کون تھے لیکن جو ایک
برطانوی ارسٹوکریٹ [1]، سر ہوگو میلنگر کی تولیت میں ہے ——— کو
بتدریج اپنی یہودی شناخت سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اور جب وہ موڑڈیکائی
ایزرا کوہن کا روحانی مرید بن جاتا ہے تو اسے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ایک
یہودی کی حیثیت سے اس کا مقدر کیا ہے۔ ناول کے اختتام پر ڈینیل موڑڈیکائی
کی ہمشیرہ سے شادی کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس بات کا پابند کر لیتا ہے کہ
موڑڈیکائی نے یہودیوں کے مستقبل کے بارے میں جو امیدیں اس سے وابستہ
کی تھیں، وہ ان کی تکمیل کرے گا۔ جب نوجوان جوڑا شادی کے بندھنوں میں بندھ
چکتا ہے، موڑڈیکائی انتقال کر جاتا ہے۔ تاہم اس کے انتقال سے بہت
قبل ہی یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہوتی ہے کہ اس کے صہیونی خیالات ڈینیل
کے دماغ اور روح میں پوری طرح سرایت کر چکے ہیں۔ ڈینیل ان خیالات سے
کس حد تک متاثر ہو چکا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ

---

[1] ارسٹوکریٹ: برطانیہ اس لحاظ سے دنیا کا غالباً انوکھا ملک ہے جہاں دو قسم کے طبقے پائے
جاتے ہیں۔ ایک تو عوام الناس کا طبقہ ہے لیکن دوسرا طبقہ "اشرافیہ" یا "ارسٹوکریسی" کے افراد
پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس طبقے میں شامل ہونے کے لیے دولتمند ہونا مفید ہے لیکن محض دولت
ہی کافی نہیں۔ بادشاہ جس شخص سے خوش ہوتا تھا، اسے خطاب اور اکثر اوقات جاگیر دے
دیتا تھا۔ مدتیں گزرنے کے بعد اس شخص یا اس کی اولاد کی چال ڈھال، آداب، طرزِ عمل،
بود و باش وغیرہ میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا ہو جاتا، تب وہ صحیح معنوں میں "طبقہ اشرافیہ"
میں داخل ہوتا۔ "دار الامرا" کے ارکان، جج، کلیسا کے اعلیٰ عہدیدار، بڑے بڑے فوجی افسر، بادشاہ کے درباری
اور بڑے بڑے جاگیردار، اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں۔

نوبیاہتا جوڑے کو شادی کے موقع پر جو "زبردست تحائف" ملتے ہیں، ان میں سے ایک تحفہ "مکمل سفری سامان" پر مشتمل ہے۔ انہیں یہ تحفہ سر ہوگو اور لیڈی میلنگر نے دیا ہے۔ اب ڈینیل اور ان کی زوجہ فلسطین کے سفر پر روانہ ہوں گے اور اس سفر کا مقصد غالباً صیہونی منصوبے پر عمل درآمد کی راہ ہموار کرنا ہے۔

ناول میں صیہونیت کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس کے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ اس میں جس ماحول اور گرد و پیش کی نقشہ کشی کی گئی ہے، وہ بے وطنی اور بے خانمانی کی عمومی کیفیت ہے۔ ناول میں نہ صرف یہودیوں بلکہ متمول، صاحب حیثیت اور عالی نسب انگریز مردوں اور عورتوں کی بھی کچھ اس طور تصویر کشی کی گئی ہے، جیسے ان کا نہ کوئی گھر ہو نہ بار، نہ دوست ہو نہ سنگی، جو بس ایک اجنبی ماحول میں بھولے بھٹکے پھر رہے ہیں۔ اگر ناول میں ایک طرف مسز ڈیوی لو اور اس کی بیٹیوں جیسے مفلس و نادار انگریزی کردار ہیں جنہیں ہمیشہ کرائے کے ایک مکان سے دوسرے مکان کی تلاش میں خوار ہوتے دکھایا گیا ہے، تو متمول اور کھاتے پیتے اونچے طبقے کے لوگ بھی اپنے مستقل گھروں سے کچھ کم کٹے ہوئے نہیں ہیں، چنانچہ ایلیٹ نے یہودیوں کی حالت زار کو اپنے مقصد کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ وہ دکھانا یہ چاہتی ہے کہ انیسویں صدی کے لوگوں کو ایک مستقل گھر اور ٹھکانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور یہ بات عالمگیر طور پر درست ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ نفسیاتی اور روحانی طور پر ان لوگوں کی کوئی جڑیں نہیں۔ یہ لوگ جس طرح اپنی جڑوں سے محروم ہو چکے ہیں، اس کا انعکاس اس کے کرداروں کی اس جسمانی بے چینی سے ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ (جسمانی بے چینی) ان کے وجود کا لازمی جزو ہو۔ ایلیٹ کو صیہونیت میں جو دلچسپی تھی، اس کا سراغ اس کی اس سوچ سے لگایا جا سکتا

ہے، جس کا ذکر ناول کے ابتدائی حصے میں ملتا ہے:

میں سمجھتی ہوں کہ انسانی زندگی کی جڑیں آبائی وطن کے کسی گوشے میں پیوست ہونا چاہئیں۔ یہی وہ گوشہ ہے جہاں اسے اس نرم، ملائم اور کومل رشتے کی محبت مل سکتی ہے، جو اس کا روئے زمین کے ساتھ، اس محنت و مشقت کے ساتھ، جو انسان جھیلتے ہیں، ان آوازوں اور لہجوں کے ساتھ، جن کی گونج ہر وقت وہاں سنائی دیتی ہے، اور ہر اس چیز کے ساتھ، جو اس کے ابتدائی گھر کو مستقبل میں حاصل ہونے والے وسعت پذیر علم کے مابین، جاننے پہچاننے اور مغالطے سے پاک انداز سے (دوسروں کے گھروں یا اوطان سے) مختلف بنا دیتی ہے، استوار ہوتا ہے[۵]

"ابتدائی گھر" تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں ابتداً انسان کو وہی سکون حاصل تھا، جو ہو بہو گھر میں ملتا ہے یہ وہ کام ہے جو کبھی تو افراد کرتے ہیں اور کبھی ایک "قوم" یا "گروہ"۔ چنانچہ تاریخی اعتبار سے مناسب بات یہی ہے کہ اس کام کا بیڑا اٹھانے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو افراد اور "قوم" موزوں ترین ہیں، وہ یہودی ہوں۔ صرف یہودی ہی وہ لوگ ہیں جن میں ایک قوم کی حیثیت سے (اور نتیجتاً افراد کی حیثیت سے) یہ دو باتیں ابھی تک موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں احساس ہے کہ ان کا ابتدائی (اور اصلی) گھر صیہون ہے اور دوسرے وہ ہر دور میں اور ہمیشہ اپنے اس نقصان کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ اس بات کے باوجود کہ ہر جگہ "یہود دشمنی"

---

۵ "ڈینیل ڈرونڈا" از جارج ایلیٹ۔ مطبوعہ پینگوئن کتب، لندن (۱۹۶۷ء) صفحہ نمبر ۵۰

کے جذبات کا چلن ہے۔ یہودی "غیر یہودیوں" کے منہ پر ایک طمانچہ ہیں کیونکہ ان غیر یہودیوں نے مدتوں سے ان اجتماعی عقاید پر "عمل کرنا" چھوڑ رکھا ہے، جو انسانوں کی تربیت کرتے ہیں اور انہیں شائستہ و متمدن بناتے ہیں۔ چنانچہ مورڈیکائی ان جذبات کو موجودہ زمانے کے یہودیوں کے لیے ایک واضح پروگرام کے طور پر قطعی انداز سے پیش کرتا ہے:

یہ (غیر یہودی) ہمارے لوگوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ہم جاہلانہ رسوم و قیود کی پابندی کرتے ہیں۔ لیکن (ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ) بدترین جہالت وہ ہے جس میں کوئی عمل یا پابندی نہیں ——— یہ اتنی اسفل ترین چیز ہے کہ اس کا درجہ گھٹ کر لومڑی کے مکارانہ حرص و طمع کی سطح تک پہنچ جاتا ہے جس کے نزدیک تمام قوانین کی حیثیت کسی پھندے یا کسی پریشان کرنے والے شکاری کتے کی چیخ چنگھاڑ سے زیادہ نہیں۔ حافظہ کی عمیق گہرائیوں میں ایک ایسی رذالت بھی موجود ہوتی ہے جو مرجھا کر توہم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تین براعظموں میں جہلاء کے اس انبوہ کثیر کے عین درمیان، ان لوگوں میں جو ہماری رسوم کی پابندی کرتے ہیں اور الوہی وحدت کا اعتراف کرتے ہیں، یہودیت کی روح مردہ نہیں ہوئی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم نامیاتی مرکز کا احیا کریں وحدتِ اسرائیل کو، جس نے ہمارے مذہب کی نشوونما کی اور اسے ایک صورت عطا کی، ایک خارجی حقیقت کا روپ پہنائیں۔ ہمارے لوگ جو دنیا کے کونے کونے میں منتشر ہو چکے ہیں، جب ان کا دھیان اس امر کی طرف منعطف ہو گا کہ ہمیں ایک وطن،

ا؎ ضمیمہ ۲۔ ملاحظہ ہو

ایک منظم معاشرے اور ایک منظم سیاسی نظام کی تشکیل کرنا چاہیے تو وہ ایک ایسی پُروقار قومی زندگی میں شریک ہو سکیں گے جس کی آواز مشرق اور مغرب کی اقوام میں سنائی دے گی۔ جب یہ نیا نظام وجود میں آئے گا تو وہ ہماری نسل کی عقل و خرد، دانشمندی اور مہارت کی اس طور آبیاری کرے گی کہ وہ عہدِ عتیق کی مانند ابلاغ اور تفہیم کا ذریعہ بن جائے گی (یعنی ہماری آواز ہر جگہ پہنچ سکے گی اور ہر کوئی ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھ سکے گا)۔ ہم ایسا وقوع پذیر ہونے تو دیں، پھر تم دیکھو گے کہ جیتی جاگتی حرارت نے اسرائیل کی کمزور و ناتواں انتہاؤں کو بھی چھو لیا ہے (یعنی کمزور سے کمزور یہودی بھی اس نظریے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا)۔ اور پھر ہر قسم کے توہمات معدوم ہو جائیں گے۔ یہ مرتدین اور منحرفین کی لاقانونیت اور مادر پدر آزادی کے ذریعے نہیں ہوگا بلکہ ان عظیم حقیقتوں کی درخشانی کے ذریعے ہوگا، جو احساسات کو وسعت بخشتے ہیں اور تمام علم کو محبوب یادداشتوں کی نوخیز کلیوں کی طرح زندہ بنا دیتی ہیں۔[۵]

"عظیم حقائق کی درخشانی، جو احساسات کو وسعت بخشتے ہیں": ایلیٹ کی ایک مخصوص ترکیب ہے اور اس بات میں قطعاً کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ وہ اپنے صیہونیوں کو بنظرِ تحسین و پسندیدگی دیکھتی ہے اور لاریب اس کی تحسین و پسندیدگی کا سبب یہ ہے کہ اسے اس بات کا کامل یقین ہے کہ یہ لوگ ایک ایسے گروہ کی تشکیل کرتے ہیں جو احساسات کی وسعت پذیر

۵۔ "ڈینیل ڈرونڈا"۔ صفحہ نمبر ۵۹۲

زندگی کے متعلق خود اس کے اپنے بلند و بالا خیالات کی عکاسی کرتا ہے تاہم
یہاں "مغرب کی اقوام" کا جس انداز سے ذکر ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک
ایسی حقیقت ہیں جو محسوس ہوتی ہے۔ لیکن "مشرق کی اقوام" کے متعلق جو رویہ
اختیار کیا گیا ہے اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی حقیقت نہیں جو محسوس ہوتی ہو۔ یہ درست
ہے کہ انکا نام لیا گیا ہے لیکن انکی حیثیت ایک لفظی ترکیب سے بڑھکر کچھ نہیں۔ "ڈینئل ڈرونڈا" میں مشرق
کے متعلق جو چند ایک حوالے دیئے گئے ہیں انسے ہمیشہ مراد انگلستان کی ہندوستانی نوآبادیاں (مقبوضات)

میں ان مقبوضات کے باشندوں ——— باشندوں کی حیثیت سے ان کی
بھی اپنی کچھ آرزوئیں، کچھ قدریں، کچھ امنگیں ہوں گی ——— کے متعلق ایلیٹ
نے مطلق خاموشی کے ذریعے کامل بے نیازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ حقیقت کہ
"صیہون کا پودا" مشرق میں لگایا جائے گا، ایلیٹ کی نظروں میں کوئی خاص
اہمیت کی حامل نہیں تھی، اس لیے وہ اس کا تفصیل سے ذکر نہیں کرتی۔ گویا
کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ "مشرق و مغرب کی اقوام" کی ترکیب میں وہ چیز شامل
ہے جو کم از کم علاقائی طور پر ایک نا وابستہ افتتاحی حقیقت ہوگی۔ اور جب نئی
مملکت کا قیام عمل میں آجائے گا اور وہ "ترسیل اور تفہیم" کا ذریعہ بن جائے گی
تو وہ وقت آجائے گا جب یہی "نا وابستہ افتتاحی حقیقت" ایک مستقل کارنامے
کا روپ دھار لے گی (اور کوئی اس میں تبدیلی نہیں لا سکے گا)۔ اور اگر ایلیٹ یہ
تصور نہ کر سکی کہ اتنے عظیم فوائد کے حامل منصوبے جو بظاہر سب کی بھلائی کے
لیے بنائے جا رہے تھے، مشرقی لوگوں کی نگاہوں میں بھی کھٹکنے لگیں گے اور
وہ ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیں گے، تو اس میں بھلا اس بے چاری کا کیا قصور؟

مورڈیکائی کی تقریر ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تاہم وہ ان امور پر جس انداز سے
بار بار اصرار کرتا ہے، وہ پریشان کن ہے۔ اس کے نزدیک صیہونیت کا مطلب

یہ ہے کہ "ہماری نسل ایک مرتبہ قومیت کی خصوصیات اور امتیازی نشانات اختیار کرے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کاوش اس طویل کرب کا قابل قدر ثمر ہو گی، جو ہمارے آباؤ اجداد کو بھگتنا تو ضرور پڑا لیکن اس کے ذریعے انہوں نے دروغگوئی اور ریاکاری کی سہولت اور عافیت کو تج کر اپنے علیحدہ تشخص کو برقرار رکھا۔
صیہونیت نے بنی نوع انسان کے لیے ایک "ڈرامائی" سبق بننا ہے۔ ہورڈیکائی اپنے نظریے کی وضاحت کے لیے جو طریقہ استعمال کرتا ہے، اس میں جس چیز پر قاری کو خاص طور پر توجہ دینا چاہیے، وہ اس کی وطن کی نقشہ کشی ہے:

یہودیوں کے پاس اتنی کافی دولت ہے کہ وہ انتہائی آسانی سے اس دھرتی کو عیاش اور کنگال حکمرانوں کے قبضے سے چھڑا سکتے ہیں۔[1] ترکیبیں نکالنے اور منصوبے وضع کرنے کے لیے وہ صاحبان تدبیر و تدبر کی حکمت اور مہارت سے بہرہ ور ہیں۔ دوسروں سے اپنی بات منوانے کے لیے ان کے پاس شعلہ بیان مقرر کی زبان ہے۔ اور کیا ہمارے مابین کوئی ایسا پیمبر یا شاعر موجود نہیں جو عیسائی مغرب کو اس بھیانک بات پر شرم دلا سکے کہ تم تو آپس میں تو تکار کرتے ہو اور ایک دوسرے پر سب و شتم بھیج رہے ہو جب کہ ترک، جنہوں نے تمہیں درندوں کی طرح آپس میں لڑنے بھڑنے کے لیے ایک اکھاڑہ مہیا کر دیا ہے، تمہیں دیکھ رہے ہیں اور تماشے سے محظوظ ہو رہے ہیں۔[2]

---

[1] یہاں کنگال اور عیاش حکمرانوں سے مراد خلافتِ عثمانیہ کے عمال ہیں کیونکہ انیسویں صدی میں فلسطین سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا۔

[2] یہاں اشارہ مقدس سرزمین کے متعلق یورپی مناقشات کی طویل تاریخ کی طرف ہے۔

ہیں؟ ہمارے پاس عقل و خرد اتنی وافر مقدار میں موجود ہے کہ ہم ایک نیا منظم یہودی معاشرہ اور مملکت قائم کر سکیں جو اتنی ہی رفیع الشان اور عظیم ہوگی جتنی کہ عہدِ عتیق میں تھی ——— ہم ایک ایسی جمہوری مملکت کا قیام عمل میں لائیں گے جہاں ہر شخص کو مساوی طور پر عافیت حاصل ہوگی، یہ مساوات بالکل ایسی قسم کی ہوگی جو جھومر ہی کہ ہماری قدیم قوم کی پیشانی پر ستارے کی مانند چمکتی تھی۔ حالانکہ (ہماری) یہ (قدیم قوم) چاروں طرف سے مستبد اور مطلق العنان حکومتوں میں گھری ہوئی تھی بلکہ عافیت کی مساوات نے اس کے افراد کی آزادی کو وہ چمک دمک عطا کر دی تھی کہ جو (آج) اہل مغرب کی آزادی میں بھی نظر نہیں آتی۔ پھر ہماری نسل کے پاس ایک نامیاتی مرکز، ایک قلب و دماغ ہوگا، جو ہماری خبر گیری کرے گا، ہماری رہنمائی کرے گا اور منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔ پھر ان یہودیوں کو جن کے حقوق پامال کیے گئے ہوں، قوموں کی عدالت میں صفائی کا حق حاصل ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان انگریزوں اور امریکیوں کو حاصل ہیں، جن کے حقوق پامال کیے گئے ہوں۔ جوں جوں اسرائیل ترقی کی طرف قدم بڑھائے گا دنیا بھی اسی رفتار سے آگے بڑھے گی۔ چونکہ مشرق کے ہراول میں ایک ایسی قوم ہوگی جس کا سینہ ہر عظیم قوم کی ثقافت اور ہمدردیوں سے لبریز ہوگا، چنانچہ اس کی سرزمین ایک ایسی سرزمین ہوگی جہاں ہر قسم کی دشمنیاں اور عداوتیں دم توڑ دیں گی۔ مشرق کے لیے یہ ایک ایسی قسم کا غیر جانبدار میدان فراہم کرے گی جیسے مغرب کے لیے بلجیم ہے۔ مشکلات؟ میں جانتا ہوں کہ منزل کے راستے میں مشکلات ضرور آئیں گی، لیکن ہمارے

مابین جو عظیم ہستیاں موجود ہیں، انہیں اس جذبے سے سرشار ہوجانا چاہیئے کہ (ایک نہ ایک روز) رفیع و برتر کامیابی ان کے قدم چومے گی (ایک مرتبہ یہ جذبہ بیدار ہوگیا، پھر کام کا آغاز ہوجائے گا)[1]۔
بعض عبارتیں مصنف نے خط کشیدہ کی ہیں۔)

سرزمین زیر بحث کی خصوصیات دو مختلف طریقوں سے گنوائی گئی ہیں ایک طرف تو اسے عیاش اور کنگال حکمرانوں کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اسے ایک ایسا اکھاڑہ بنا کر پیش کیا گیا ہے جو ترکوں نے عارضیتاً متحارب درندوں کی تحویل میں دے رکھا ہے اور یہ سرزمین اس مشرق کا حصہ ہے جہاں استبدادی اور مطلق العنان حکمرانوں کا سکہ رواں دواں ہے۔ دوسری طرف اس کا سلسلہ "مغربی آزادی کی چمک دمک" انگلستان اور امریکہ جیسی اقوام اور غیر جانبداری کے تصور (بلجیم) کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ قصہ مختصر مشرق و مغرب کے ساتھ اس کے روابط اور رشتے جس انداز سے استوار کیے گئے ہیں، ان میں مشرق کی حیثیت یہ بنتی ہے کہ وہ رذیل اور ناقابلِ اعتبار ہے جب کہ اس کے مقابلے میں مغرب فضیلت مآب اور روشن خیال ہے۔ مشرق و مغرب کے ان دو متحارب فریقین کے مابین پل کا فریضہ صہیونیت سرانجام دے گی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ ایلیٹ کے دل میں صہیونیت کیلئے تحسین و توصیف کے جذبات موجزن ہیں، لیکن اپنے ان جذبات کو وہ ہمیشہ برقرار نہیں رکھ سکتی، وہ اس کی تحسین و توصیف صرف اسی وقت کرتی ہے جب اسے یہ مشرق کو مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کا ذریعہ نظر آتی ہے۔ لیکن ایسا کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسے صہیونیت یا خود صہیونیوں کے

---

[1] "ڈینیل ڈیرونڈا"۔ صفحات ۵۹۴-۵۹۵

ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اسے یہ ہمدردی ہے۔ لیکن یہودی تجربے اور تگ و تاز کا میدان بہت وسیع و عریض ہے۔ اس کے ایک سرے پر تو ان کی یہ شدید خواہش موجزن ہے کہ وہ اپنے لیے ایک وطن حاصل کریں (اور یہ ایک ایسی خواہش ہے جسے یورپ کے غیر یہودی باشندوں سمیت ہر شخص محسوس کرتا ہے)۔ میدان کے دوسرے سرے پر جو چیز موجود ہے، وہ اس خواہش کا (عملی) حصول ہے۔ اس خواہش کا عملی حصول یا تکمیل کیسے ممکن ہو گی، اس کے متعلق ایلیٹ کا ذہن واضح نہیں، چنانچہ اس ضمن میں اس کے خیالات بہت دھندلے ہیں۔ ورنہ وہ اتنی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے کہ یہ سمجھ سکے کہ صہیونیت ایک ایسا تصور ہے جسے مغربی افکار (جو مشرقی افکار کی ضد ہیں،) کی مختلف صورتوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ مغربی افکار کے بعض اہم پہلوؤں کے مطابق

مشرق قعر مذلت میں گر چکا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاست کے متعلق مغرب نے جو روشن خیال تصورات وضع کیے ہیں، ان کے مطابق اس کی تعمیر نو کی جائے۔

مشرق کے جس خطے کی اس طرح تعمیر نو ہو گی، وہ چند ایک معمولی استثناؤں کے ساتھ اپنے باشندوں کے لیے بعینہٖ "اتنا ہی انگلستان بن سکے گا جس قدر کہ خود انگلستان انگریزوں کے لیے انگلستان ہے۔"

تاہم ایک بات جو ہمارے ذہن میں کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس قسم کے افکار میں مشرق، بالخصوص فلسطین کے اصل باشندوں کے متعلق کسی قسم کے تصور کا قطعی فقدان پایا جاتا ہے۔ جہاں تک کہ ڈینیل ڈرونڈا

کے صیہونی اور انگلش کرداروں کا تعلق ہے، ان دونوں کے لیے یہ (فلسطین کے اصل باشندے) قطعی غیر متعلق ہیں۔ جہاں تک چمک دمک، آزادی اور شفاعت کا تعلق ہے، اگرچہ ایلیٹ کے نزدیک یہ کلیدی امور ہیں، لیکن وہ ان کا دائرہ صرف یورپی باشندوں اور یہودیوں تک محدود کر دیتی ہے۔ یہاں یہودیوں کو اس لیے شامل کیا گیا ہے کیونکہ جہاں تک مشرق کو نوآبادی بنانے کا تعلق ہے وہ (یہودی خود بھی یورپی نمونے میں یہ عجیب بات ہے کہ ایلیٹ جب یہودیوں کا ذکر کرتی ہے تو وہ اپنا سارا زورِ بیان ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر صرف کر دیتی ہے کہ وہ "مشرقی" ہیں اور یورپی ماحول میں اجنبی۔ لیکن جب کبھی کسی غیر یورپی (یہودیوں سے قطع نظر) کو زیرِ غور لانے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو وہ زبردست ناکامی کا شکار ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت اور ہمدردی ایسے اوصاف اور محاسن ہیں جن سے صرف مغربی ذہنیت ہی مزیّن ہے۔ باقی رہا استبدادی اور مطلق العنان مشرق، وہاں ایسے اوصاف و محاسن کا دستیاب ہونا تو دور کی بات ہے، انہیں تلاش کرنا بھی سعی لاحاصل اور اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

یہاں دو باتوں کا فوری ذکر ہو جانا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایلیٹ کا رویہ ہمدردی انسانیت اور تفہیم کے دوسرے پیمبروں کے رویے سے قطعی مختلف نہیں۔ ان تمام پیمبروں کے نیک جذبات اور خواہشات یا تو یورپ تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہیں یا پھر (ان کے خیال کے مطابق) لائحہ عمل کے طور پر ان کا یورپ سے باہر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ جان سٹوارٹ مل[1] اور کارل مارکس

---

[1] مل (John Stuart Mill) (۱۸۲۹ - ۹۶) انگریز فلسفی اور ماہر معاشیات۔

کی سبق آموز مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں [1]۔ ان دونوں مفکرین کی عام شہرت یہی ہے کہ دونوں ناانصافی اور جبر و استبداد کے اس حد تک مخالف ہیں کہ ان کی یہ مخالفت عقیدے کی تقدیس کا درجہ اختیار کر گئی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں کا اس بات پر ایمان تھا کہ حریت، نمائندہ حکومت اور انفرادی مسرت جیسے تصورات کا اطلاق مشرق پر ہرگز نہیں ہونا چاہیے کیوں ؟ اگر آپ وجوہ جاننا چاہیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ تو وہی ہیں جنہیں آج کل ہم "نسل پرستی" کہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کا یورپی کلچر نسل پرستانہ تھا۔ یہ نسل پرستی کس حد تک زہر آلود اور کینہ پرور تھی۔ اس میں کمی بیشی کا انحصار ہر شخص کی انفرادی سوچ پر تھا (اس نسل پرستی کا مظاہرہ کوئی کم کرتا تھا اور کوئی زیادہ، لیکن اس سے محفوظ کوئی بھی نہیں تھا) مثلاً ارنسٹ رے نان [2] کھلم کھلا یہود دشمن تھا اور جہاں تک ایلیٹ کا تعلق ہے تو ان نسلوں کے متعلق جنہیں یورپی افکار کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا تھا، اس کا رویہ بے نیازی اور بے اعتنائی کا تھا۔

یہاں ہم دوسرے نکتے کی طرف آتے ہیں۔ "ڈینیل ڈرونڈا" میں ایلیٹ نے صہیونیت کی جو تصویر کشی کی ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس زمانے میں یہودی / صہیونی سوچ کی جو لہریں چل رہی تھیں، ان کے متعلق یہ

---

[1] جان سٹوارٹ مِل اور کارل مارکس کے ان رویوں کے متعلق میں نے اپنی کتاب "اورینٹلزم" کے صفحات نمبر ۵۷-۱۵۳، ۲۱۴، ۲۲۸ پر بحث کی ہے (مصنف)

[2] Joseph Ernest Renan (۹۲-۱۸۲۳) ۔ فرانسیسی فلسفی مورخ اور ماہر لسانیات۔

عندیہ دیا جائے کہ ان کے بارے میں (مغرب کے) غیر یہودیوں کا ردِ عمل مثبت ہے اور وہ یہودیوں کی سوچ سے اتفاق کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ ناول اس عندیے کے اظہار کا فریضہ سرانجام دیتا ہے کہ (یہودیوں کو یہ بتایا جائے کہ) صیہونیت کے وہ کون سے عناصر ہیں، جو یورپی فکر کے مطابق جائز ٹھہرائے جا سکتے ہیں بلکہ ایک لحاظ سے ان کا ڈھنڈورا بھی پیٹا جا سکتا ہے یہودی اور غیر یہودی صیہونیت کی جو اپنی اپنی تعبیر کرتے تھے، ان دونوں میں ایک اہم نکتہ ایسا تھا، جس پر فریقین کو کامل اتفاق تھا۔ یہ نکتہ کیا تھا؟ دونوں فریقین کا نکتۂ نظر یہ تھا کہ مقدس سرزمین مکینوں سے لازمی طور پر خالی ہے۔ وہ ایسا کیوں سمجھتے تھے؟ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں واقعی کوئی مکین نہیں تھے ——— مکین تو وہاں موجود تھے اور بے شمار سفرناموں، بنجمن ڈیزرائیلی کے "Tancred" جیسے ناولوں اور سیاحوں کی رہنمائی کے لیے جو کتابچے[1] تحریر کیے جاتے تھے، ان سب میں ان مکینوں کا اکثر ذکر ہوتا رہتا تھا ——— بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کو ماننے سے منظم طریقے سے انکار کیا جاتا تھا کہ انہیں خودمختار اور انسانی مکینوں کا کوئی درجہ حاصل ہے۔ اگرچہ اس نکتے کے بارے میں یہودی صیہونیوں اور

---

[1] انیسویں صدی کے دوران میں مختلف ممالک کی سیاحت پر روانہ ہونے والوں کی رہنمائی کے لیے کتابیں اور کتابچے شائع کرنے کا کام کا آغاز ایک جرمن باشندے کارل بیڈیکر (Karl Baede Ker) (۱۸۰۱ - ۵۹) نے کیا۔ یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ یورپ کی زبانوں میں ایک نئے لفظ Baedeker کا اضافہ ہو گیا اور اس کے معنی "گائیڈ بک" (کتابِ رہنمائی) قرار پائے۔ ڈکشنری بھی اس کے معنی یہی بتاتی ہے اور مصنف نے بھی متن میں یہی لفظ استعمال کیا ہے۔

غیر یہودی صہیونیوں (یہ غیر یہودی صہیونی عرب مکینوں کو مختلف وجوہ کی بنا پر نظر انداز کرتے تھے) کے (نقطہ نظر کے) مابین اختلاف تلاش کرنا ممکن ہے، پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود تھی کہ فلسطینی عربوں کو بہرحال نظر انداز کیا جاتا تھا۔ وہ نکتہ جس پر زور دیا جانا چاہیے، یہ ہے کہ یہودی اور غیر یہودی صہیونیت کی جڑیں کس حد تک بلند پایہ لبرل اور سرمایہ دارانہ نظام کے کلچر میں پیوست ہیں اور یہ کہ جارج ایلیٹ جیسے صف اوّل کے لبرل مفکرین نے اس کلچر کے نسبتاً کم دلکش رجحانات کو کیسے توانا و مضبوط بنایا بلکہ غالباً پروان بھی چڑھایا۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، اس میں سے کسی بات کا بھی مناسب طور پر اطلاق اس امر پر نہیں ہوتا کہ خود یہودیوں کے نزدیک صہیونیت سے کیا مراد ہے اور نہ اس امر پر کہ جو شئے غیر یہودیوں کے لیے ایک ترقی یافتہ فکر کی حیثیت سے یہ کن امور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کا اطلاق صرف ان بدنصیب انسانوں پر ہوتا ہے جو بدقسمتی سے اس سرزمین پر موجود تھے اور جن کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ جس امر کو کافی طویل عرصے سے فراموش کیا جاتا رہا ہے کہ جب سرکردہ یورپی مفکرین اس بات پر سوچ بچار کر رہے تھے کہ فلسطین کا خاطر خواہ اور بعد ازاں امکانی مقدر کیا ہو سکتا ہے، اس سرزمین پر کھیتی باڑی ہو رہی تھی، دیہات اور قصبات کی تعمیر جاری تھی اور اس پر لاکھوں مقامی باشندے زندگی بسر کر رہے تھے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ یہ سرزمین ان کا وطن ہے۔ دریں اثنا جہاں تک ان کے حقیقی جسمانی وجود کا تعلق ہے، اسے مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا۔ بعد ازاں یہ ایک تکلیف دہ قوم بن گیا۔ چنانچہ یہ بات نمایاں طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آتی

ہے کہ ایلیٹ بھی ہو بہو انہی خیالات کا اظہار کرتی ہے جس کا پرچار موزز ہیس[1] (Moses Hess) جیسے ایک اوائلی عینیت پسند نے کیا تھا اور جس نے اپنی کتاب "روم و یروشلم" (۱۸۶۲ء) میں بالکل وہی نظری زبان استعمال کی ہے جو بعد ازاں مورڈیکائی کوہن کے منہ میں ڈالی جانا تھی:

"یہودی قوم کے احیائے نو کے سلسلے میں فی الحال ہمیں جو کچھ کرنا ہے، وہ یہ ہے۔

اول: اپنی قوم کی سیاسی نشاۃ ثانیہ کی امید زندہ رکھی جائے۔

دوم: جن لوگوں کے دلوں میں یہ امید خوابیدہ ہو چکی ہے، ان میں اسے دوبارہ بیدار کیا جائے۔

"جب مشرق میں سیاسی حالات ایسی صورت اختیار کر لیں کہ یہودی مملکت کی تجدید و بحالی کے کام کے آغاز کو منظم کرنا ممکن ہو جائے

---

[1] موزز ہیس (۷۵-۱۸۱۲ء): ایک جرمن سوشلسٹ۔ اسی نے اینگلز کو سوشلسٹ بنایا تھا اور خود مارکس کو بھی اسی نے معاشرتی اور سیاسی مسائل کے حل لو پر آمادہ کیا تھا۔ اپنی کتاب "روم اینڈ یروشلم" میں اس نے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام پر زور دیا تھا۔

تو اس کارِ خیر کی ابتدا، اپنے آباد و اجداد کی سرزمین پر یہودی بستیوں کی تاسیس سے ہوگی۔ اس مہم میں فرانس یقیناً ہمارا ہاتھ بٹائے گا۔ محبوب دوست فرانس وہ نجات دہندہ ہے جو تاریخِ عالم میں ہماری قوم کو اس کا کھویا ہوا مقام دوبارہ دلائے گا۔ جس طرح ایک زمانے میں ہم نے مغرب کی جانب ہندوستان کا راستہ دریافت کرنا چاہا تھا، تو حسنِ اتفاق سے ہم نے ایک نئی دنیا دریافت کرلی۔ چنانچہ اسی طرح آج ہندوستان اور چین کا سفر اختیار کرنے کے لیے جس نئے راستے کی تعمیر ہو رہی ہے، اس پر چل کر ہم اپنی گم گشتہ مادرِ وطن کو دوبارہ دریافت کریں گے[1]

ہیس نے یہ جو فرانس کی قصیدہ گوئی کی ہے، وہ ابھی جاری ہے (چونکہ ہر صیہونی کسی نہ کسی استعماری طاقت کو اپنا مربی گردانتا تھا، اس لیے اسے مکھن لگانا اپنا فرض سمجھتا تھا)۔ چنانچہ وہ ارنسٹ لاہارانے[2] کی کتاب "نیا مشرقی مسئلہ" THE NEW EASTERN PROBLEM سے تفصیلی حوالے دیتا ہے۔ اس نے لاہارانے کے مندرجہ ذیل پیراگراف کی بالخصوص تعریف کی ہے اور اپنی کتاب کا اختتام بھی اسی پر کیا ہے:

"منشائے ربی یہی ہے کہ یہودیوں سے ایک بڑا کام لیا جائے اور

---

[1] حوالے کے لیے آرتھر ہرٹزبرگ Hertzberg کی مرتبہ کتاب "The Zionist Idea: A Historical Analysis and Reader" کا صفحہ نمبر ۱۳۳ ملاحظہ فرمائیں۔ اسکے ناشر ATHENEUM نیویارک ہیں

[2] ایک فرانسیسی ادیب اور مفکر۔

وہ کام یہ ہے کہ وہ تینوں براعظموں کے مابین ابلاغ کا ذریعہ بن جائیں آپ ان اقوام تک، جو ابھی ناتجربہ کار اور ناکندہ تراش ہیں، تہذیب پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیں گے اور یورپی علوم میں، جن کے فروغ میں آپ کی نسل نے قابلِ قدر حصہ لیا ہے، ان کے اساتذہ بنیں گے۔ آپ یورپ اور مشرق بعید کے مابین مصالحت کنندہ کا کردار ادا کریں گے۔ ان راستوں کی تعمیر کریں گے جو ہندوستان اور چین کو جاتے ہیں ——— ہندوستان اور چین، ہاں، وہی نامعلوم اور اَنجانے خطّے، جنہیں بالآخر تہذیب کا درس دینا ہی ہوگا۔ صدیوں کی شہادتوں کے زرنگار تاج اور تمغے اپنے سروں اور سینوں پر سجائے آپ اپنے آباء و اجداد کی سرزمین پر قدم رکھیں گے اور بالآخر اپنے تمام مصائب و آلام سے مکمل نجات حاصل کریں گے۔ آپ کا سرمایہ ویران و بنجر اراضی کے وسیع و عریض قطعات پھر ایک مرتبہ زیرِ کاشت لے آئیگا۔ آپ کی محنت و مشقت اور جفاکشی ارضِ قدیم کو صحرائی ریت کی دسترس سے چھڑا لے گی اور اسے ایک مرتبہ پھر سرسبز شاداب اور ثمر بار وادیوں میں تبدیل کر دے گی اور دنیا ایک مرتبہ پھر اپنی قدیم ترین قوم کو نذرانۂ عقیدت پیش کرے گی۔ [1]

ہیس اور ایلیٹ باہمی طور پر اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ صیہونیت کے منصوبوں کی تکمیل یہودیوں کو یورپ کی عظیم طاقتوں کی مدد سے کرنا ہوگی اور یہ کہ صیہونیت "گم گشتہ مادرِ وطن" کی تجدید و بحالی کا کام سرانجام دے گی اور

---

[1] حوالے کے لیے ہرٹزبرگ کی مرتبہ مولہ بالا کتاب ہی کا صفحہ نمبر ۱۳۴ ملاحظہ فرمائیں۔

یوں وہ مختلف تہذیبوں کے مابین مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرے گی۔ یہ کہ موجودہ زمانے کے فلسطین کو مزارعت، تہذیب اور تعمیر نو کی ضرورت ہے۔ یہ کہ صہیونیت اپنی جلو میں بالآخر ان مقامات کو روشن خیالی اور ترقی سے روشناس کرائے گی۔ وہ تین تصورات، جن کا ہیس اور ایلیٹ کے ہاں ـــــ اور بعد ازاں ہر صہیونی مفکر یا نظریے کی ترویج کرنے والے کے ہاں ـــــ ایک دوسرے پر انحصار تھا، یہ ہیں:

ا:۔ ناپید عرب مکیں۔

ب:۔ ایک "خالی" سرزمین کے متعلق مغرب اور یہودیوں کا رویہ۔ ان میں سے ایک کا رویہ دوسرے کے رویے کی تکمیل کرتا ہے۔

ج:۔ بحالیٔ نو کا صہیونی منصوبہ، جو ایک گم شدہ یہودی مملکت کی تعمیر نو کر کے اسے دوبارہ بروئے کار لائے گا اور اسے علیحدہ علیحدہ لیکن منضبط بستیوں، اور حصول اراضی کے خصوصی ادارے جیسے جدید عناصر سے مربوط کر دے گا۔

تاہم ان میں سے کسی ایک تصور کو بھی اس وقت تک نہ تو قانونی جواز فراہم کیا جا سکتا تھا اور نہ اس کا عملی نفاذ ممکن تھا جب تک اسے ایک بین الاقوامی سیاق و سباق میں رکھ کر پیش نہ کیا جاتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ ان تصورات کا سانچہ بھی اسی سیاق و سباق میں ڈھالا جاتا اور وہ (تصورات) رجوع بھی اسی کی

---

۵ یہاں مصنف کے خیال کے مطابق لفظ "بین الاقوامی" محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مطلب "غیر مشرقی" یعنی "یورپی" ہے۔ یورپ جس بات پر صاد کر دے، وہ "بین الاقوامی" حیثیت اختیار کر جائے گی۔

طرف کرتے۔ یہ سیاق وسباق ایک حقیقت تھا۔ اور یہ سیاق وسباق حقیقت محض اس بنا پر نہیں تھا کہ اس سارے منصوبے کو بروئے کار لانے اور اسے پروان چڑھانے کے لیے جس استدلالی حکمت کا سہارا لیا جا رہا تھا، اس کی اساس نسلی تفاخر پر تھی، بلکہ اس کے پیچھے یہ زبردست حقائق بھی کام کر رہے تھے کہ یہودی مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے[۵] (اور وہ کہیں بھی اکثریت میں نہ تھے) اور یورپی ثقافت پر کلی طور پر سامراجی بالادستی اور سیادت کی چھاپ لگ چکی تھی۔ تاہم یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ صیہونیت نے فلسطین پر قبضہ جمانے کا جو خواب دیکھا تھا، اس کا انداز استعماری تھا[۶]۔ اس کا یہ رویہ انیسویں صدی کی یورپی طاقتوں کے رویے سے قطعی مختلف تھا کیونکہ وہ ان اپنے مقبوضات کے باشندوں کے متعلق یہ سمجھتی تھیں کہ وہ جو دنیا کو مہذب بنانے اور یوں اس کی نجات کا فریضہ سرانجام دینے نکلے ہیں، ان میں (ان کے مقبوضات کے) یہ باشندے بھی شامل ہیں۔

اپنے جدید ارتقا کے دوران میں صیہونیت کو مختلف مراحل میں سے گزرنا پڑا ہے۔ تاہم تحریک کے آغاز سے لے کر اس وقت تک جب اس کا نقطۂ عروج اسرائیل کے قیام کی صورت میں سامنے آیا، صیہونیت یورپی باشندوں

---

[۵] جب بخت نصر نے، جو بابل کا حکمران تھا، بیت المقدس پر قبضہ کر لیا، تو اس نے یہودیوں کو فلسطین سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ یہودیوں کی بیشتر تعداد مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور یورپ کے مختلف ممالک کی طرف کوچ کر گئی۔ چنانچہ یہ یہودی جو انتشار کی حالت میں غیر یہودیوں کے مابین زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے، انہیں اور ان کی اس حالت کو diaspora کہا جاتا ہے۔

[۶] صیہونی فلسطین کو اسی طرح غیر آباد تصور کرتے تھے جس طرح ابتدائی گورے آباد کار امریکہ کو غیر آباد تصور کرتے تھے۔ (مصنف)

کے لیے ہمیشہ باعثِ کشش رہی جن کے نزدیک سمندر پار مقبوضات اور ان مقبوضات کے مقامی باشندوں کی مختلف غیر مساوی طبقوں میں تقسیم ایک مذہبی تقدیس کا درجہ رکھتی تھی اور بالکل "فطری" تھی۔ یہی وجہ ہے کہ (مثال کے طور پر) آج افریقہ اور ایشیا کے سابقہ نو آبادیاتی خطوں کی ہر مملکت یا تحریک فلسطینی جد وجہد کی ہم خیال ہے۔ اس کی پوری طرح حمایت کرتی ہے اور اس کا ادراک رکھتی ہے۔ بہت سی مثالیں ایسی مل جائیں گی ——— مجھے امید ہے کہ میں ابھی ان کا ذکر کر پاؤں گا ——— جہاں آپ کو ان تجربات میں، جو ایک طرف عرب فلسطینیوں کو صہیونیت کے ذریعے ہوئے اور دوسری طرف ان تجربات میں، جو سیاہ، زرد اور گندمی رنگت کے باشندوں کو ہوئے جنہیں انیسویں صدی کے سامراجی حقیر اور انسانی درجے سے کم تر مخلوق گردانتے تھے، ایک صریحی اور مغالطے سے پاک مماثلت ملتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ صہیونیت کو فروغ ایک ایسے عہد میں ہوا جب مغرب میں یہود دشمنی کی انتہائی زہریلی لہر چل رہی تھی لیکن یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہی وہ عہد ہے کہ جب ایک طرف تو صہیونیت فروغ پذیر تھی، تو دوسری طرف افریقہ اور ایشیا میں یورپی اقوام کو مقبوضات کے حصول میں بے مثال کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ حصول اور قبضے کی یہی وہ عمومی فضا تھی جب تھیوڈور ہرزل نے صہیونیت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے اولین اقدامات کیے۔ اپنی نو آبادیات کو توسیع دینے کے لیے جب یورپ اپنے عظیم ترین دور میں سے گزر رہا تھا، تو اسی دور کے آخری حصے میں صہیونیت نے بھی پر پرزے نکالے اور ایشیا کے ایک خاصے بڑے رقبے پر قبضہ جمانے کے سلسلے میں اہم ابتدائی کارروائیاں کیں۔ یہاں یہ

یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ سمندر پار مقبوضات کے حصول کے ضمن میں اہل یورپ میں جو جوش و خروش پایا جاتا تھا، صہیونی اس میں پوری طرح شریک تھے اور انہوں نے کبھی یہ غیر مبہم طور پر نہیں کہا تھا کہ صہیونیت کی تحریک کا مقصد یہودیوں کی آزادی ہے بلکہ وہ ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ وہ مشرق میں نو آبادیاں تعمیر کرنا اور وہاں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ ان ستم رسیدہ فلسطینیوں کے نزدیک، جنہیں صہیونیوں نے بے دخل کر کے خود ان کی جگہ لے لی، یہ کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ صہیونی یورپ کی یہود دشمنی کی روایت کے شکار تھے (اس لیے وہ فلسطینیوں کو بے گھر کرنے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے میں حق بجانب تھے) اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسرائیل جس تسلسل کے ساتھ فلسطینیوں کے درپے آزار ہے تو یہ بات ہماری سمجھ میں آجائے گی کہ ایسا فلسطینی ڈھونڈے سے بھی کیوں نہیں ملتا جو اپنی موجودہ حقیقت سے ماورا دیکھ سکتا ہو کیونکہ اس کا تو یہی تجربہ ہے کہ مغربی یہودی جو خود کبھی ستم رسیدہ تھے، اب ستم شعار بن چکے ہیں (اور ان کے ستم کا نشانہ صرف فلسطینی عرب ہی نہیں بلکہ مشرقی یہودی بھی بنتے ہیں)

ان معروضات کا مقصد یہ نہیں کہ ہم محض ماضی کی طرف دیکھتے رہیں اور (اس میں کیڑے نکالتے رہیں)۔ ان بھولے بسرے واقعات کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے کیونکہ یہ ان واقعات کی، جو آج کل مشرق وسطیٰ میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں، توضیح بلکہ تعین کرتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ اسرائیل کی آبادی کا کوئی قابل ذکر طبقہ ابھی تک یہ اہلیت حاصل نہیں کر سکا کہ وہ اس خوفناک معاشرتی اور سیاسی ناانصافی کا سامنا کر سکے جو مقامی فلسطینیوں سے روا رکھی گئی ہے، اس بات کی علامت ہے کہ استعماری تناظرات جن پر صہیونیت

کی اساس رکھی گئی ہے لے ۔ دنیا کے متعلق ان (اسرائیلیوں) کا مخصوص نقطۂ نظر اور ان کا یہ احساس کہ ان کے مقابلے میں دوسرا مقامی فریق حقیر اور فروتر ہے، کس قدر ان کے ذہنوں میں راسخ ہو چکا ہے ۔ یہ حقیقت بھی کہ ایک بھی فلسفی، اس بات سے قطع نظر کہ سیاسی اعتبار سے وہ کس مکتب فکر کا پیروکار ہے، ابھی تک اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکا کہ وہ صہیونیت کو کسی نہ کسی صورت میں قبول کر لے، اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اس (فلسطینی) کے نزدیک یہ (صہیونیت) ایک ایسے دستور العمل کا روپ اختیار کر چکی ہے جو مزاج کے اعتبار سے خالصتاً استعماری ہے، جو اپنوں اور غیروں کے مابین سختی سے تفریق کرتا ہے اور جو بے لوچ انداز کے صرف یہودیوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہے اور دوسروں کو اپنے دائرۂ عمل سے خارج کر دیتا ہے ۔ فلسطین میں مراعات یافتہ یہودیوں اور ہر قسم کی مراعات سے محروم غیر یہودیوں کے مابین صہیونیت جو انتہا پسندانہ امتیاز روا رکھتی ہے، وہ اس قدر زبردست اور قوی ہے اور اسے اس قدر بلا جھجک اور اتنی مستعدی سے بروئے کار لایا جاتا ہے کہ وہاں کوئی دوسری چیز ظہور پذیر نہیں ہو سکی اور اس طریقے سے وہاں جو دو فریق وجود میں آئے ہیں وہ اس المیے کا صحیح معنوں میں ادراک نہیں کر سکے جس کا مصیبت زدہ انسانوں کو سامنا کرنا پڑا ہے ع

لے اور اب تو یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ استعماری تناظرات بذاتِ خود غیر طبعی اور بے ضابطہ اشیاء ہیں (مصنف)

ع تفصیل کے لیے صابری جریس کی تصنیف "اسرائیل کے عرب" ("The Arabs in Israel") ملاحظہ کریں ۔ یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں منتھلی ریویو پریس نیویارک نے شائع کی تھی ۔ اس سلسلے میں ایک یہودی مصنف اسرائیل شہاک (Shahak) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ نہ تو یہودیوں کے لیے یہ ممکن ہوا ہے کہ وہ اس انسانی المیے کو سمجھ سکیں جس کا فلسطینیوں کے لیے صہیونیت موجب بنی اور نہ ہی یہ فلسطینیوں کے لیے ممکن رہا ہے کہ وہ صہیونیت کو اس کے علاوہ بھی کچھ اور سمجھ سکیں کہ یہ محض ایک ایسا نظریۂ حیات اور ایک ایسا دستور العمل ہے جس کا مقصدِ وحید انہیں اور اسرائیلی یہودیوں کو پابندِ سلاسل کرنا اور محبوس رکھنا ہے۔ تاہم تذلیلِ انسانیت کے اس آہنی دائرے کو توڑنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ جائزہ لیں کہ یہ دائرہ وجود میں کیسے آیا۔ یہاں ہمیں یہ نظر آئے گا کہ یہ افکار اور کلچر ہی ہیں جو اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ہرزل ہی کو لیں۔ اگر یہ درے فوس [۱] کا معاملہ تھا جس نے اولین طور پر

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۹۸: نے بھی اپنی کتاب "The Non-Jew in a Jewish State: A Collection of Documents" میں زبردست دلائل دیئے ہیں۔ شہاک نے یہ کتاب نجی طور پر غیر با بطے نورا سٹریٹ یروشلم سے ۱۹۷۵ء میں شائع کی تھی۔ (مصنف)

[۱] الفرڈ درے فوس (Drefus) ایک معمولی فرانسیسی فوجی سپاہی تھا۔ اس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ ۱۸۹۴ء میں اس پر اس الزام میں مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے بعض حساس رازِ جرمنوں کے حوالے کر دیئے اور یوں اپنے وطن سے غداری کا ارتکاب کیا ہے۔ الزام ثابت ہو گیا اور اسے حبسِ عبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔ اس نے یہ سزا جنوبی امریکہ کے ایک ملک فرانسیسی گی آنا کے ساحل کے قریب ایک سنسان اور بے آباد جزیرے "جزیرۂ شیطان" Devil's Island کی جیل میں کاٹنا تھی۔ اس سزا کے خلاف تمام یورپی ممالک کے یہودیوں نے واویلا بپا کر دیا اور الزام لگایا کہ درے فوس بیگناہ ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

س کے اندر یہودی شعور پیدا کیا تو یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ تقریباً اسی زمانے میں یہ خیال بھی اس کے ذہن میں جاگزیں ہوا کہ یہود دشمنی کا تریاق یہ ہے کہ یہودیوں کو استعماری انداز سے سمندر پار آباد کیا جائے۔ فی نفسہٖ یہ تصور، ایک تصور کے طور پر ہی سہی، یہودیوں میں انیسویں صدی کے اختتام تک مقبول ہو چکا تھا۔ ہرزل نے اوّلین اہم رابطہ جس شخص کے ساتھ قائم کیا، اس کا نام نواب (Baron) مورس ڈی ہرش تھا۔ ہرش ایک متمول اور مخیر شخص تھا۔ وہ کچھ عرصے سے اس یہودی جماعت[1] کا سرپرست تھا، جس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مشرق کے یہودیوں کو ترک وطن کرنے اور ارجنٹائن اور برازیل میں آباد ہونے کے لیے امداد فراہم کی جائے۔ بعد ازاں خود ہرزل یہ سوچتا رہا کہ اگر جنوبی امریکہ یا افریقہ میں یہودیوں کی بستیاں تعمیر ہو جائیں اور وہاں وہ اپنی ایک نوآبادی قائم کریں، تو مناسب رہے گا۔ یہ دونوں علاقے ایسے تھے جو یورپی نوآبادکاری

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۹۹: اور اسے یہ سزا محض اس لیے دی گئی ہے کیونکہ وہ یہودی ہے۔ اور تو اور فرانس کا شہرت یافتہ ناول نگار ایمیل زولا بھی ان کے بھرتے میں آگیا اور اس نے اس سزا کے خلاف ایک طویل مضمون "I Accuse" لکھ مارا۔ مضمون لکھنے کی پاداش میں زولا خود تو جیل چلا گیا لیکن فرانسیسی حکومت کو مجبور کر گیا کہ چار سال کے بعد ڈرے فوس کے مقدمے پر نظرثانی کا حکم دے۔ ڈرے فوس پر دوبارہ مقدمہ چلایا گیا اور ایک بار پھر اسے مجرم ٹھہرایا گیا۔ تاہم دس دن بعد فرانس کے صدر نے اسے معاف کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کی تحقیقات میں اسے بے گناہ قرار دے دیا گیا۔ ڈرے فوس ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۱۹۳۵ء میں انتقال کیا۔

[1] اس یہودی جماعت کا نام Jewish Colonization Association تھا۔

کے لیے عام طور پر قابلِ قبول تسلیم کیے جاتے تھے اور اگر ہرزل کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا کہ اپنے زمانے کے قدامت پسندانہ استعماری طور طریقے اپنائے جائیں، تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ تاہم "مقامی باشندوں" اور ان کے "علاقوں" کے متعلق جو استعماری تناظر ظہور میں آیا تھا، اسے جس طرح ہرزل نے اپنے ذہن و روح میں جذب کیا اور جس طرح اپنی ذات کا ایک حصہ بنا لیا، وہ بہت متاثر کن ہے۔

ہرزل کے ذہن میں اس بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں فلسطین قطعاً غیر آباد نہیں تھا بلکہ اس میں انسان رہتے بستے تھے۔ یہ درست ہے کہ یہ خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں تھا (اور اس لیے پہلے ہی ایک نو آبادی تھا)، لیکن اسے بے شمار سفر ناموں کا موضوع بنایا جا چکا تھا۔ ان سفر ناموں کے مصنفین کے سر فہرست نام لامارتین، شاتوبری آں، فلوبیر[1] اور چند دوسرے لوگوں کے تھے۔ اگر اس نے ان مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ نہیں بھی کیا تھا، تب بھی یہ یقین دہانی کرنے کے لیے کہ (۱۸۸۰ء کی دہائی میں) فلسطین میں واقعی ساڑھے چھ لاکھ باشندے، جن کی غالب تعداد عربوں پر مشتمل تھی، آباد ہیں ایک صحافی کی حیثیت سے بیڈیکر کی شائع کردہ کوئی نہ کوئی گائیڈ بک تو ضرور پڑھی ہوگی۔ تاہم اس بات نے اسے وہ طریقے سوچنے سے باز نہیں رکھا جن کی مدد سے ان (فلسطینیوں) کی موجودگی سے نپٹا جا سکتا تھا۔ اس نے جو طریقے سوچے اور بعد میں جو کچھ حقیقتاً فلسطین میں پیش آیا، اس نے انہیں قدرے خون کو منجمد کر دینے والی پیش بینی کے ساتھ اپنی ڈائری میں بہت صراحت اور درستگی سے بیان کر دیا ہے۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ غریب اور مفلوک الحال مقامی باشندوں کو اپنی جائدادوں سے بیدخل

---

[1] : گستاو فلوبیر (۱۸۲۱ - ۱۸۸۰ء) فرانس کا شہرہ آفاق ناول نگار "مادام بواری" کا مصنف۔

کردیا جائے (بعد میں صہیونیوں نے اس پر حرف بحرف عمل کیا) اور ان جائیدادوں پر زبردستی قبضہ کر لیا جائے۔ اس نے مزید تحریر کیا کہ "مفلوک الحال (مقامی باشندوں) کی بے دخلی اور ان کی جائیدادوں پر قبضے کی کارروائی لازماً بڑی سوجھ بوجھ، احتیاط اور ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔" اس مقصد کے لیے اس نے جو طریقِ کار تجویز کیا، وہ یہ تھا کہ "مفلوک الحال (مقامی) باشندوں کو سرحد پار دھکیل دیا جائے۔ انہیں پڑوسی ممالک میں روزگار دلایا جائے لیکن، ہمارے اپنے ملک میں ان پر ہر قسم کے روزگار کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔" ایک ایسی کلبیت کیساتھ جو ناقابلِ یقین حد تک صحیح ثابت ہوئی، ہرزل نے یہ پیشین گوئی کی کہ "جہاں تک جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے چھوٹے سے طبقے کا تعلق ہے، تو انہیں باسانی قیمت دے کر خریدا جا سکتا ہے" ——— اور واقعی انہیں خرید لیا گیا۔ افریقہ کے وسیع و عریض قطعات پر قبضہ جمانے کے لیے اس زمانے میں جو منصوبے ترویج پا رہے تھے، فلسطین کی مقامی آبادی کو بے دخل کر دینے میں یہ ساری سکیم ان سب پر بازی لے گئی اور ان سے کہیں آگے نکل گئی۔ جیسا کہ ڈیزمنڈ سٹیوارٹ[1] نے بالکل بجا کہا ہے کہ

> معلوم ہوتا ہے کہ ہرزل نے یہ نکتہ بھانپ لیا تھا کہ اس وقت تک استعمار پسند اور آبادکار افریقہ میں جو کچھ کر چکے تھے، اس نے اگر اس سے ذرا بھی قدم آگے بڑھایا، تو عارضی طور پر وہ مہذب دنیا (یعنی یورپ) کو برگشتہ کر دے گا (اور یوں ان کی ہمدردیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا) (اپنی ڈائری کے) ان صفحات پر جہاں اس نے تخیر ارادی بے دخلیوں

---

[1] Desmond Stewart ہرزل کا سوانح نگار۔

اور سلی جابلو" کا ذکر کیا ہے، وہاں وہ رقم طراز ہے کہ سرراہے میں یہ عرض کر دوں کہ ابتدا" لوگ ہم سے دُور دُور رہیں گے۔ ہم فی الحال معتوب و مقہور ہیں اور ہماری ہوا ابھی اچھی نہیں بندھی۔ لیکن جب تک عالمی رائے عامہ کو ہمارے اپنے حق میں تشکیل کرنے کا کام مکمل ہوگا، ہم اپنے وطن میں اپنے قدم مضبوطی سے گاڑ چکے ہوں گے۔ اس وقت ہمیں غیر ملکیوں کی جوق در جوق آمد سے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا بلکہ ہم اپنے مہمانوں (سیاحوں) کا نوابانہ فیاضی اور پُر تمکنت تلطف و شفقت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے۔"

یہ کوئی ایسا نقشہ نہیں تھا جو ارجنٹائن کے کسی مزدور یا فلسطین کے کسی فلاح کے لیے مسحور کن ہوتا (اور وہ اس پر واری صدقے ہو جاتا) لیکن ہرزل کا یہ قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اپنی ڈائری کو فوراً شائع کر دیا جائے۔[۱]

ہرزل اور سٹیوارٹ کے لہجوں میں جو سازش جھلک رہی ہے ضروری نہیں کہ ہم اس پر آمنّا و صدّقنا ہیں۔ تاہم ہمیں ویسے ہی یہ تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے کہ فلسطین پر قبضہ کرنے اور فلسطینیوں کی جائدادوں کو ہڑپ کر جانے کے لیے صیہونیوں نے جتنے بھی منصوبے بنائے اور انہیں پروان چڑھانے کے لیے انہوں نے جتنی کوششیں بھی کیں، عالمی رائے عامہ ان کے متعلق عام طور پر بے نیازی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ صورتِ حال میں

---

[۱] "تھیوڈور ہرزل"، مؤلف: ڈیزمنڈ سٹیوارٹ، ناشر: ڈبل ڈے اینڈ کمپنی نیویارک، سن اشاعت ۱۹۷۴ء، صفحہ نمبر ۱۹۳۔

تبدیلی صرف اس وقت آئی جب فلسطینیوں نے موجودہ صدی کے ساٹھ اور ستر کے عشروں کے دوران میں عالمی سیاست میں بزور بازو اپنا وجود منوالیا۔ میں پیشتر ازیں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس ضمن میں صہیونیوں کی سب سے بڑی کامرانی یہ تھی کہ انہوں نے جو کچھ کر دکھایا، بین الاقوامی طور پر اسے جائز اور صحیح تسلیم کرالیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ صہیونیوں کے کارناموں کی تکمیل کیلئے فلسطینیوں کو جو قیمت چکانا پڑی، وہ غیر متعلق دکھائی دینے لگی۔ لیکن ہرزل کی سوچ سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ صہیونی اپنے ان مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہو پاتے اگر اہل یورپ میں یہ پیشتر رجحان نہ ہوتا کہ وہ ابتدا ہی سے مقامی باشندوں کو غیر متعلق عنصر سمجھنے لگے تھے۔ بہ الفاظِ دیگر، یہ مقامی باشندے اس قابلِ قبول منظم درجہ بندی کے چارٹ میں صحیح بیٹھتے تھے جس کے مطابق وہ بے مثال طور پر مغربی یا سفید فام باشندوں سے کم تر ٹھہرتے تھے اور درجہ بندی کا یہی وہ چارٹ (نقشہ) ہے جسے ہرزل جیسے صہیونیوں نے چرا کر اپنا بنالیا۔ ہرزل اور اس کے پیروکاروں کا کمال یہ ہے کہ ان کے زمانے میں ثقافت کی جو عمومی فضا قائم تھی، اس کے اندر انہوں نے اس درجہ بندی کی کچھ اس طرح تراش خراش کی کہ وہ ایک ترقی پذیر یہودی قومیت کی بے نظیر ضرورتوں کے مطابق ڈھل گئی۔ یہاں اس بات کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کر دینا چاہیے کہ صہیونیت یہودی روایت کے جائز اور برحق مقاصد کے حصول میں ممد ثابت ہوئی۔ مقاصد یہ تھے: یہودیوں کو ایک قوم کی حیثیت سے بے خانمانی اور یہود دشمنی سے بچانا اور ان کی قومیت بحال کرانا۔

اس کے ساتھ ہی اس (صہیونیت) کا غالب مغربی ثقافت (جس میں صہیونیت بطور ایک ادارہ سانس لیتی تھی) کے ان پہلوؤں کے ساتھ پورا گٹھ جوڑ

تھا، جو اہلِ یورپ کے لیے یہ سمجھنا ممکن بنا دیتے تھے کہ غیر یورپی (ان کے مقابلے میں) کمتر، گھٹیا، حقیر اور غیر متعلق ہیں۔ چنانچہ یہی وہ گٹھ جوڑ ہے جو فلسطینی عربوں کے لیے بہت اہم ثابت ہوا، نہ کہ وہ فوائد جو اس گٹھ جوڑ کے نتیجے میں یہودیوں کو حاصل ہوئے۔ شفیق اور مہربان صہیونیت کا ـــــــ جس کے فوائد صرف یہودیوں تک محدود رہے ـــــــ عربوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا، البتہ انہیں مغرب کے کلچر کی ـــــــ جو بنیادی طور پر ناروا تفریق کا قائل ہے اور نہایت طاقتور ہے اور جس کی صہیونیت فلسطین میں ایجنٹ ہے ـــــــ مار ضرور سہنا پڑی۔

یہاں مجھے موضوع سے ذرا ہٹ کر یہ بات واضح کر دینا چاہیے کہ صہیونیت کے نتیجے کے طور پر فلسطینیوں کو جو کچھ بھگتنا پڑا، اس کے متعلق کوئی چیز رقم کرتے وقت جو بڑی مشکل پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ صہیونیت کو اپنے مقاصد میں زبردست کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر، میرے ذہن میں اس بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ یہودیوں کی اکثریت صہیونیت اور اسرائیل کو لازمی طور پر یہودی زندگی کے انتہائی اہم حقائق گردانتی ہے، خاص طور پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ صدی کے دوران میں یہودیوں کے ساتھ کیا کچھ پیش نہیں آیا تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عناصر (صہیونیت اور اسرائیل) ان (یہودیوں) کے لیے دوچند اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ مہتم بالشان فوجی فتوحات سے قطع نظر، جو اب تک اسے حاصل ہوتی رہی ہیں، اسرائیل کے کھاتے میں زبردست سیاسی اور ثقافتی کامرانیاں بھی آتی ہیں۔ اور پھر (مغربی نقطۂ نظر سے) اسرائیل ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق مثبت رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں ہمیں (مغربی

باشندوں کو) اتنا اگر مگر سے کام نہیں لینا پڑتا، جس کا تجربہ عربوں کے متعلق سوچ بچار کرتے وقت ہوتا ہے جو (عرب) کہ بہر حال انجانے، پرائے اجنبی، عجیب الوضع اور پر عناد مشرقی ہیں۔ یقیناً اس شخص کے لیے جو مغرب کا باسی ہے، یہ حقائق کھلی کتاب کی طرح واضح اور روشن ہیں۔ صہیونیت کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی جلو میں جو نقطۂ نظر ابھر کر سامنے آیا ہے اور جس کا آج کل چلن ہے، مکمل طور پر فاتح کے حق میں جاتا ہے اور ستم زدگان سے قطعی انداز سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ستم زدگان، جب صہیونیوں کو فلسطین میں وارد ہوتے دیکھتے تھے، تو کیا محسوس کرتے تھے؟ آج جو صہیونیت کی توضیح و تشریح کی جاتی ہے، اس کو جب وہ پڑھتے اور دیکھتے ہیں، تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ صہیونیت کی جڑیں تلاش کرنے اور خود ان (فلسطینی عربوں) کے ساتھ اس (صہیونیت) نے جو برتاؤ روا رکھا ہے، اس کے ماخذ تلاش کرنے کے لیے وہ اس (صہیونیت) کی تاریخ کے کون سے اوراق کا مطالعہ کرتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو (مغرب میں) کبھی اٹھائے نہیں جاتے ——— اور بالکل یہی وہ سوالات ہیں جنہیں میں صہیونیت اور یورپی استعمار کے مابین روابط کی کڑیوں کا جائزہ لینے کے دوران میں اٹھانے کی جسارت اور ان کے جوابات فراہم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری دلچسپی صرف اتنی ہے کہ میں ان اثرات کا ایک خاکہ پیش کروں جو صہیونیت نے اپنے ستم زدگان پر مرتب کیے ہیں۔ نسبی طور پر ان اثرات کا مطالعہ انہیں صرف اسی چوکھٹے (فریم ورک) میں رکھ کر کیا جا سکتا ہے جو انیسویں صدی میں بھی استعمار نے صہیونیت کو، جب وہ ابھی محض ایک تصور تھی اور اس نے اسرائیلی نام کی ایک مملکت کا روپ نہیں دھارا تھا،

فراہم کیا تھا۔ ان فلسطینی مردوں اور عورتوں کے لیے، جو یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کی اپنی تاریخ ان کے لیے کن معانی کی حامل ہے، ناقدانہ انداز سے کچھ تحریر کرتے ہیں اور جو یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ——— جیسا کہ اس وقت میں یہ کوشش کر رہا ہوں ——— کہ فلسطینیوں کے لیے صیہونیت کیا معانی رکھتی ہے، انتونیو گرامشی کی یہ رائے بڑی باموقع اور برمحل ہے کہ "اگر آپ اس بات کا شعور حاصل کرنا چاہتے ہیں تو "آپ کو اپنے متعلق یہ سمجھنا" پڑے گا کہ آپ اس تاریخی عمل کی پیداوار ہیں، جو اب تک وقوع پذیر ہو چکا ہے اور جس نے آپ کی ذات پر لاتعداد اثرات ثبت کر دیے ہیں لیکن آپ کو اتنا موقع بھی نہیں دیا کہ آپ یہ معلوم کر سکیں کہ ان اثرات کی کل تعداد اور ان کی نوعیت کیا ہے"۔ وہ مزید رقمطراز ہے کہ پہلا ضروری کام یہ ہے کہ (ان اثرات کی) "مکمل فہرست" تیار کی جائے۔ چنانچہ یہاں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ صیہونیت کے ہاتھوں اس کے ستم رسیدگان (یہاں بات ان لوگوں کی نہیں جو اس سے فیضیاب ہوئے) نے جو کچھ برداشت کیا، اس کی ایک مکمل فہرست تیار کی جائے، کیونکہ اس قسم کی فہرست شاید ہی کبھی عوام کے سامنے پیش کی گئی ہوگی۔[1]

---

[1] Antonio Gramsci; 'The Prison Note books: Selections', ed and trans by Quintin Hoare and Geoffrey Huwell Smith (New York: International Publishers Co., 1971)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

فکریات (آئیڈیالوجی) یا نظریے (تھیوری) اور عمل (پریکٹس) کے مابین جو باریک فرق پایا جاتا ہے، اگر ہم اسے سمجھنے کے عادی ہو گئے ہوں تو بھی تاریخی اعتبار سے درست بات یہ ہے کہ ہم اس یورپی استعمار کے بارے میں جس نے انیسویں صدی کے دوران میں واقعتاً دنیا کے بیشتر حصے پر اپنا قبضہ اور تسلط قائم کر لیا تھا، فرق کی ان باریکیوں کا چرب زبانی کے ساتھ ذکر نہ کریں، استعمار یا سامراجیت ایک ایسا سیاسی فلسفہ (تھا اور اب بھی ہے) جسکا بنیادی مقصد اور ہدف علاقائی توسیع اور توسیع کے اس عمل کو جائز اور واجب ٹھہرانا ہے۔ تاہم لفظ "علاقے" کو اگر بالکل ہی لغوی معانی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ استعمار کو اسی طرح نہیں جو وہ حقیقتاً ہے، بلکہ اسے گھٹا کر پیش کر رہے ہیں۔ استعمار یا سامراج کے لیے انگریزی زبان میں لفظ "امپیریلزم" (Imperialism) استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ لاطینی لفظ Imperium (جس کے اصل معنی "حکم" ہیں) سے مشتق ہے۔ لغت کے مطابق اس کے معانی ہیں (۱) "مطلق العنان حکومت" یا "اختیاراتِ کُلی اور (۲) وہ علاقہ یا خطہ جس پر کسی شخص یا گروہ کو اختیارات کلی حاصل ہوں"۔ چنانچہ "امپیریم" Imperium کو حاصل کرنے اور اس پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک خطۂ زمین کو اپنا زیرنگین بنا رہے ہیں اور اس پر اپنا تسلط قائم کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۰۶: تاہم تن گرامشی کی اصل اطالوی کتاب

Quaderni del Carcere

مطبوعہ Turin Einandi Editore کی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۳۶۳ اپریل سیگا (مصنف)

لیے آپ جو کارروائیاں کرتے ہیں، منجملہ دیگر باتوں کے، ان میں یہ امور بھی شامل ہیں ۔

آپ اس خطۂ زمین کی تشکیل کرتے ہیں (اور مختلف انتظامی وحدتوں کا قیام عمل میں لاتے ہیں)۔ اس کے باشندوں کا ارتکاز کرتے ہیں۔

اس خطۂ زمین، اس کے عوام اور ان کے خیالات پر اپنا تسلط قائم کرتے ہیں۔

اس خطے کی زرعی اور دوسری زمین، یہاں کے عوام اور ان کے خیالات میں اس قسم کی تبدیلیاں لاتے ہیں جن سے ان منصوبوں کو پروان چڑھانے اور ان کے مقاصد کو حاصل کرنے میں مدد مل سکے، جو سامراج اپنی بالادستی اور سیادت کے لیے وضع کرتا ہے۔

اور یہ سب کچھ اس بات کے نتیجے کے طور پر ہوگا کہ سامراج حقیقت سے مناسب طور پر عہدہ برآ ہونے کی اہلیت سے بہرہ ور ہو۔ چنانچہ ایک خیال، جس کے متعلق آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ آپ کا اپنا خیال ہے، اور اس قطعۂ زمین کے مابین، جس پر آپ محض اس بنا پر اپنا دعویٰ جتاتے ہیں کہ اس پر آپ کا حق بنتا ہے (حالانکہ اس قطعۂ زمین پر کام کرنے والے وہاں کے مقامی باشندے موجود ہیں)، خطِ امتیاز حقیقتاً معدوم ہو جاتا ہے۔ کم از کم انیسویں صدی والے (مغربی) کلچر کی دنیا میں یہی کچھ ہوا اور یہی وہ کلچر ہے جس میں استعمار کو فروغ حاصل ہوا۔ کسی خیال پر یہ دعوےٰ جتلانا کہ یہ میرا خیال ہے اور کسی علاقے پر یہ دعویٰ جتلانا کہ یہ میرا علاقہ ہے ——— انیسویں صدی میں یہ باتیں اس لیے ممکن تھیں کیونکہ یورپ میں اس تصور کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہو چکی تھی کہ یورپ سے باہر جو دنیا ہے، وہ بس اس انتظار میں ہے کہ اہل یورپ

آئیں، اس پر اپنا دعویٰ جتائیں، اس پر قبضہ کریں اور اس پر حکومت کریں
———— ایک ہی کارروائی کے، جو بنیادی طور پر تشکیلی کارروائی
تسلیم کی جاتی تھی اور جس کے پیچھے سائنس کی فراہم کردہ قوت، وقار اور
اختیار کام کر رہا تھا مختلف پہلو تصور کیے جاتے تھے۔ مزید برآں چونکہ حیاتیات
لسانیات اور ارضیات جیسے علوم میں سائنسی شعور کا عمل دخل زیادہ تر تشکیل نو،
بحالی اور استحالہ سے متعلق تھا اور یوں علوم کا پرانا قالب اتار کر انہیں نئے
قالب میں پیش کیا جا رہا تھا، اب ایک طرف تو کھلم کھلا استعماری رویہ تھا جو
مشرق کے دور دراز علاقوں کے متعلق اپنا لیا گیا تھا، اور دوسری طرف
یہ بات کہ مختلف نسلوں کے مابین جو "عدم مساوات" موجود ہے، اس کے
متعلق سائنسی رویہ کیا ہونا چاہیے۔ چنانچہ سائنسی ترقی کے اس دور میں طے یہ
پایا کہ ان دونوں رویوں کے مابین کڑی یہ ہوگی کہ ان دونوں رویوں کا انحصار یورپی
"منشار" پر ہوگا۔ کیونکہ یورپی "منشار" ہی وہ طاقت تھی جس نے یہ فیصلہ کرنا
تھا کہ وہ پرانی حقیقتیں، جو ذہن میں محض انتشار پیدا کرتی ہیں اور جو اپنی افادیت
کھو کر بیکار ہو چکی ہیں، کس طرح نئی درجہ بندیوں کے منظم، منضبط اور مربوط نظام
میں ڈھالی جائیں اور انہیں یورپ کے لیے مفید بنایا جائے۔ چنانچہ کیرولس لینائس[۱]
ژارژ بوفاں[۲] اور ژارژ کوویئر[۳] کے افکار میں سفید فام اقوام، سرخ، زرد، سیاہ

---

[۱] لینائس (Carolus Linnaeus) (۱۷۰۷-۷۸ء) سویڈن کا ماہر نباتیات۔

[۲] بوفاں (Comte Georges Buffon) (۱۷۰۷-۸۸ء) فرانسیسی سائنسدان۔
فطرت کے مطالعے کے لیے مشہور تھا۔

[۳] کوویئر (Baron Georges Cuvier) (۱۷۶۹-۱۸۳۲ء) ایک اور
فرانسیسی سائنسدان۔ یہ بھی مطالعۂ فطرت کے لیے مشہور ہوا۔

اور بھوری رنگت کی اقوام سے سائنسی طور پر مختلف ہو گئیں۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر، وہ علاقے جو ان اقوام کے زیر قبضہ تھے، نئے نئے خالی ہو گئے تاکہ اہل مغرب وہاں اپنی نوآبادیاں بنا سکیں، (اپنی مرضی کے مطابق) وہاں تعمیر و ترقی کے کام کر سکیں، انہیں زیر کاشت لا سکیں اور آبادکار وہاں جا کر آباد ہو سکیں۔ مزید براں، ان کم مساوی نسلوں کو یوں سود مند بنا لیا گیا کہ ان کی اس طریقے سے کایا پلٹ کر دی گئی اور انہیں وہ کچھ بنا دیا گیا جس کے متعلق سفید فام قوم پہلے ہی سوچ بچار کر چکی تھی اور اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ یہ کایا پلٹ) اس کی نسلی اور ثقافتی بالادستی کا جزو ہے (جوزف ڈی ٹروبینو[1] اور آسولڈ سپنگلر[2] کی تحریروں میں یہی رویہ ملے گا) یا پھر پوری ڈھٹائی سے کام لے کر کھلم کھلا استعماری ہتھکنڈے اور طور طریقے اختیار کیے جانے لگے اور ان کم تر نسلوں کو سلطنت (ایمپائر) کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے براہِ راست استعمال کیا جانے لگا۔ اور جب ١٩١٨ء میں ژارژ کلیمنسو[3] نے یہ اعلان کیا کہ "میرا یہ ایمان ہے کہ اگر مستقبل میں

---

[1] ڈی ٹروبینو (Joseph Arthur de Gobineau) (١٨١٦-٨٢ء)
فرانسیسی سفارت کار، شاعر، ناول نگار اور مورخ۔ اس نے ایرانیوں کی تاریخ بھی لکھی۔

[2] سپنگلر (Oswald Spengler) (١٨٨٠-١٩٣٦ء) جرمنی کا ایک فلسفی اور فلسفہ تاریخ کا ماہر۔ اس کی کتاب "زوال مغرب" ایک تہلکہ انگیز تصنیف تھی۔ اس کے خیال کے مطابق مغربی تہذیب اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے اور اب اس کا زوال لازمی ہے۔

[3] کلیمنسو (Georges Clemenceau) (١٨٤١-١٩٢٩ء) اس نے تعلیم طب میں پائی لیکن طب کو بطور پیشہ نہ اپنایا۔ وہ ایک مصنف، صحافی اور مدیر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا لیکن اس نے اصل شہرت بحیثیت سیاستدان حاصل کی اور متعدد مرتبہ فرانس کا وزیر اعظم رہا۔ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر امن کانفرنس کی صدارت اسی نے کی تھی۔

جرمنی نے فرانس پر حملہ کیا تو مجھے یہ لامحدود حق حاصل ہے کہ میں یورپ میں فرانسیسی علاقے کے دفاع کے لیے سیاہ فام فوجیں جھونک دوں"، تو درحقیقت اس کے اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ کسی سائنسی حق کی بنا پر فرانس کے پاس یہ علم اور طاقت ہے کہ بقول ریمان پون کارے[1] کہ وہ سیاہ فام باشندوں کو سفید فام فرانسیسیوں کے لیے توپ کے چارے کی معاشی صورت میں تبدیل کر دے[2]۔
یہ درست ہے کہ استعماریت کا الزام سائنس کے کندھوں پر نہیں دھرا جا سکتا لیکن دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ سائنس کو اس کی شکل بگاڑ کر نسبتاً نہایت آسانی کے ساتھ سامراجی تسلط و تغلب کی عقلی طور پر توضیح کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

فطرت میں حیوانات اور نباتات کی جو انواع بندی پائی جاتی ہے، اس کی شکل بگاڑ کر اسے معاشرتی بشریات[3] میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس عمل کا اصل مقصد معاشرے پر اختیار حاصل کرنا تھا اور اس کام میں لسانیات کی انواع بندی نے پورا پورا ہاتھ بٹایا۔ فرانز بوپ[4]، ولیم جونز[5] اور فریڈرخ وان شلیگل[6]

---

[1] پون کارے "(Raymond Poincare)" (۱۸۶۰-۱۹۳۴) تین مرتبہ فرانس کا وزیر اعظم رہا۔ جنگ عظیم اوّل کے دوران میں ملک کا صدر تھا۔ جنگ کے اختتام پر وہ جرمنی کو سخت سزا دینے کے حق میں تھا لیکن معاہدہ وارسائی میں اس کی ایک نہ سنی گئی اور وہ ۱۹۲۰ء میں عہدۂ صدارت سے مستعفی ہو گیا۔ لیکن ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک وزیر اعظم رہا۔ اس نے جرمنی کے علاقے روہر پر قبضے کے لیے فوجیں بھی بھیجیں۔

[2] تفصیل کے لیے حنا ارنٹ (Hanna Arendt) کی کتاب The Origins of Tolalitarianism" "مطبوعہ ہارکورٹ براس" نیویارک کا صفحہ نمبر ۱۲۹ ملاحظہ کریں۔

[3] یعنی انسانی معاشروں کو بھی اسی قسم کی انواع میں تقسیم کر دیا گیا (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر)

جیسے لسانی ماہرین نے السنہ (زبانوں) کے مختلف خاندانوں یا گروہوں کے مابین جب ساخت کی مماثلت دریافت کی تو لسانی گروہوں کے متعلق اس تصور کو ناجائز اور ناروا طور پر گھسیٹ گھساٹ کر انواع انسانی کے نظریوں میں تبدیل کرنے کا عمل شروع ہوگیا اور دعویٰ کیا جانے لگا کہ ہر نوعِ انسانی طے شدہ گروہی، ثقافتی اور نسلی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ ایک مثال پیشِ خدمت ہے۔ ۱۸۰۸ء میں شلیگل کو ایک طرف ہند جرمن (یا آریائی) زبانوں اور دوسری طرف سامی/افریقی زبانوں کے مابین ایک واضح اختلاف نظر آیا۔

---

۴ فرانز بوپ (۱۷۹۱-۱۸۶۷) جرمن ماہر لسانیات۔ اس نے اپنی کتاب "تقابلی گرامر" میں ہندوستانی اور یورپی زبانوں کے مابین رشتے تلاش کیے۔

۵ ولیم جونز (Sir William Jones) (۱۷۴۶-۹۴) لسانیات اور قانون کا ماہر وہ گیارہ سال تک کلکتہ سپریم کورٹ کا جج رہا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ثابت کیا کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی زبانوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔ چنانچہ اسے جدید تقابلی لسانیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

۶ شلیگل (Friedrich von Schlegal) (1772-1839)
جرمن نقاد اور ماہر جمالیات۔ اسے جرمن رومانی تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے ۱۸۰۲ء میں تاریخ، زبان اور ادب پر پیرس میں جو خطبات دیے، انہیں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ قدیم ہند و ثقافت اور سنسکرت کے مطالعہ کے متعلق اس کی کتاب On Language and Wisdom of India بڑی معرکۃ الآرا تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اول الذکر زبانیں تخلیقی، تجدیدی (REGNERATIVE) زندگی سے بھرپور اور جمالیاتی طور پر مسرت آگیں ہیں جب کہ مؤخر الذکر زبانیں اپنے عمل کے اعتبار سے میکانکی، تجدیدی فعل سے عاری اور مجہول ہیں۔ اس قسم کے امتیاز و تفریق سے پہلے شلیگل اور بعد ازاں رینان نے یہ عمومی اصول وضع کرنا شروع کر دیے کہ اعلیٰ آریائی اور ادنیٰ غیر آریائی دماغ، ثقافت اور معاشرے میں بہت بُعد پایا جاتا ہے۔

سائنس کو مسخ کر کے یا اس کی قلب ماہیت کر کے اسے ایک ایسی صورت میں ڈھالنے کا عمل، تاکہ وہ صحیح طور پر سیاسی نظم و نسق سے مشابہ ہو جائے ایسے شعبوں میں خاص طور پر رونما ہوا، جن کی کوئی واضح شکل متعین نہیں کی جا سکتی اور جن میں اصولِ قانون (فقہ)، عمرانی فلسفہ اور سیاسی نظریہ بھی کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے فلسفیانہ تجربیت کی ایک خاصی مؤثر اور بارسوخ روایت (جس کا حال ہی میں ہیری بریکن نے مطالعہ کیا ہے [۱]) نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک قسم کے نسلی امتیاز کے حق میں آواز اٹھائی جو انسانوں کو برتر اور فروتر نسلی انواع میں تقسیم کرتا تھا۔ تین سو سالہ ہندوستانی امپائر (سلطنت) سے عہدہ برآ ہونے کے ضمن میں جو اصل مسائل (زیادہ تر انگلستان میں) سامنے آئے اور نئے سے نئے علاقے دریافت کرنے کے لیے جو لاتعداد بحری سفر اختیار کیے گئے، ان چیزوں نے مل ملا کر یہ ثابت کرنا ممکن بنا دیا کہ بعض ثقافتیں

---

[۱] یہ Harry Bracken: "Essence, Accident and Race" یہ مضمون ایک جریدے "Hermathena" کے شمارہ نمبر ۱۱۶ زمستان، ۱۹۷۳) کے صفحات نمبر ۸۱-۹۶) پر شائع ہوا تھا۔

ترقی یافتہ اور مہذب ہیں جب کہ دوسری پسماندہ اور غیر مہذب - ان خیالات کا اور ان کے ساتھ ہی ان دائمی معاشرتی معانی کا جو جان لاک[1] اور ڈیوڈ ہیوم[2] جیسے فلسفیوں نے (انسانوں کے) رنگ (اور اس کے تتمے کے طور پر نسل) کو پہنائے، نتیجہ یہ نکلا کہ انیسویں صدی کے وسط تک عام اہلِ یورپ اس بات کو ایک بدیہی کلیہ تسلیم کرنے لگے کہ یورپی باشندوں کو غیر یورپی باشندوں پر ہمیشہ حکومت کرتے رہنا چاہیے -

اس اصول کو چند دوسرے طریقوں سے بھی مضبوط و توانا بنایا گیا - میرے خیال میں ان طریقوں میں سے چند ایک ایسے ہیں جو اس خواب پر جو صیہونیوں نے فلسطین کے متعلق دیکھا اور اس عمل پر جو انہوں نے وہاں اختیار کیا، براہِ راست اثر انداز ہوئے اور انہوں نے ان کا رُخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا - مہذب اور غیر مہذب اقوام کے مابین مفروضہ قانونی بنیادوں پر جو امتیازات قائم کیے گئے، ان میں ایک زمین کے متعلق رویّہ بھی تھا - یہ ایک ایسا رویّہ ہے جس میں زمین کی تعریف و توصیف بالکل ایسے ہی کی جاتی ہے جیسے مناجات و حمد میں اللہ تعالیٰ کی ثنا کی جاتی ہے اور غیر مہذب لوگوں کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا کہ وہ اس رویے (اور جذبے) سے تہی دامن ہیں - اس بات کو ایمان کا درجہ دیا جاتا تھا کہ ایک مہذب شخص تو زمین پر قلبہ رانی کر سکتا ہے کیونکہ یہ اس کے لیے کچھ معنی رکھتی ہے چنانچہ اس (مہذب شخص) نے فنون اور صنعت و حرفت کی آبیاری

---

[1] جان لاک (۱۷۰۴-۱۶۳۲ء) - انگریز فلسفی -

[2] ڈیوڈ ہیوم (۷۶-۱۷۱۱ء) سکاٹش فلسفی اور مورخ -

کی، تخلیقی کام سرانجام دیئے، کچھ کارنامے سرانجام دیئے، کچھ تعمیر کیا۔
لیکن جہاں تک غیر مہذب لوگوں کا تعلق ہے، انہوں نے قلبہ رانی تو
کی لیکن بڑے طریقے سے (یعنی مغربی معیاروں کے مطابق انہوں نے
نااہلی کا ثبوت دیا) یا پھر انہوں نے اسے گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔
خیالات کی یہی وہ مالا تھی جن کی مدد سے ان پورے پورے مقامی معاشروں
کو، جو صدیوں سے امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے خطوں میں آباد تھیں، اچانک
ان زمینوں پر اپنی زندگی بسر کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ تب جدید یورپی
استعمار کی ایسی تحریکیں وجود میں آنے لگیں جن کا مقصد مقامی باشندوں کو بیدخل
کرنا اور انکی اکھاڑ پچھاڑ کرنا تھا۔ اس بیدخلی اور اکھاڑ پچھاڑ کی متعدد صورتیں تھیں۔ اس مقصد کے
حصول کے لیے کئی منصوبے بروئے کار لائے گئے۔ کہیں تو زمین کی بحالی
اور اسے دوبارہ قابل کاشت بنانے کا کام کیا گیا، (اور یوں) مقامی باشندوں
کو نئے سرے سے آباد کیا گیا۔ کہیں ان مقامی باشندوں کو "مہذب بنانے"
اور ان کے "وحشیانہ رسوم ورواج" کا ڈنک نکالنے کی سعی کی گئی۔ تاہم ان
تمام منصوبوں کا مقصد صرف یہی تھا کہ مقامی باشندوں کو یورپی حکمرانی کے زیر سایہ
کارآمد انسانوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ ایشیا، افریقہ، جنوبی امریکہ اور شمالی امریکہ
کی زمینیں اس لیے تھیں کہ یورپی باشندے ان سے فائدہ اٹھا سکیں کیونکہ جس
انداز سے زمین کی قدر و قیمت وہ سمجھتے تھے، وہ مقامی باشندوں کے لیے
ناممکن تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام پر جوزف کونریڈ[۱] نے اس فلسفے

---

[۱] کونریڈ (Conrad) (۱۹۲۴-۱۸۵۷ء) اصل میں پولینڈ میں پیدا ہوا تھا
لیکن وہ اوائل عمر میں ہی انگلستان آگیا تھا۔ وہ سترہ سال کی عمر میں انگلستان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کو اپنے ناول "قلبِ ظلمت" ("Heart of Darkness") میں ڈرامائی صورت میں پیش کیا اور اسے اپنے ایک کردار کرٹز (Kurtz) کی شخصیت میں سمو کر اسے پرزور انداز سے ایک ایک جیتی جاگتی چیز بنا دیا۔ کرٹز وہ شخص ہے جس نے زمین کے تاریک مقامات" کے متعلق استعماری خواب دیکھے تھے، اور اس نے یہ خواب اس لیے بُنے تھے کیونکہ "سارا یورپ" ہی اس کام میں مصروف تھا لیکن کونریڈ نے جس چیز سے اکتساب کیا، بلکہ حقیقتاً صیہونیوں نے بھی جس سے اکتساب کیا، وہ اس قسم کا فلسفہ تھا جسے رابرٹ ناکس (Knox) نے اپنی کتاب "انسانی نسلیں"[1] میں پیش کیا تھا۔ اس فلسفے کی رو سے انسانوں کی دو نسلیں بنتی ہیں۔ ایک نسل سفید فام اور ترقی یافتہ باشندوں کی ہے۔ یہ لوگ پیداواری عمل میں مصروف ہیں۔ دوسری نسل سیاہ فاموں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ادنیٰ ہیں اور ان کا کام (وقت، روپیہ، اشیاء) محض ضائع کرنا ہے۔ یعنی جان ولیسٹ لیک[2] اور اس سے پہلے ایمرڈی وٹیل[3] جیسے مفکرین نے دنیا کے مختلف علاقوں اور

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۱۶ :۔ کے تجارتی بحری جہازوں پر ملازم ہو گیا اور ترقی کرتے کرتے کپتان بن گیا۔ اپنے مختلف سفروں کے دوران میں اسے کئی مہموں میں سے گزرنا پڑا اور ایسے کئی انوکھے تجربات ہوئے۔ انہی کو بنیاد بنا کر اس نے ناول نویسی کے میدان میں قدم دھرا۔ اس کے مختلف ناول اور کہانیاں شہکار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ الیف آر لیوس کے مطابق انگریزی ناول کی جو عظیم روایت وجود میں آئی، اس کے چار ستونوں میں کونریڈ بھی ایک ہے۔

[1] ناکس کی اس کتاب کا ایک اہم اقتباس کرٹن (Curtin) کی کتاب "امپیریلزم" کے صفحات نمبر ۵-۱۰۱، ۹۳ پر موجود ہے۔ رابرٹ ناکس (۱۸۶۲-۱۷۹۱ء) ایڈنبرا یونیورسٹی میں اناٹومی اور علم الانسان ETHNOLOGY (انسانی نسلوں کی خصوصیات کا علم) (بقیہ حواشی آگے)

خطوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک تو وہ خطے اور علاقے تھے (جہاں اگرچہ خانہ بدوش اور ایک قسم کے فروتر معاشرے آباد تھے، اس لیے) جو نہیں تھے۔ دوسری قسم کے علاقے اور خطے تہذیب یافتہ تھے۔ جہاں تک اول الذکر خطوں کا تعلق ہے، ان پر "نظر ثانی" کی گئی اور ان کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا کہ چونکہ اہل یورپ تہذیب یافتہ اور بلند تر ہیں، اس لیے انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان (اول الذکر) علاقوں کو اپنی تحویل میں لے لیں۔

تناظر کی یہ جو کایا پلٹ ہوئی جس کی مدد سے ترقی یافتہ یورپ سے باہر لاکھوں کروڑوں ایکڑ اراضی کو اس طرح خالی اور غیر قابض قرار دے دیا گیا، وہاں کی اقوام اور معاشروں کے متعلق یہ فرمان صادر کر دیا گیا کہ وہ ترقی اور نمو کے راستے میں رکاوٹ ہیں اور ان کی زمینوں کے متعلق بڑے تیقن کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ یورپ کے سفید فام آبادکاروں کے لیے دستیاب ہیں تاکہ وہ انہیں بہتر طریقوں سے کام میں لا سکیں اور وہاں تہذیب پھیلا سکیں۔ میں نے ان تمام امور کو کچھ زیادہ ہی عام فہم انداز سے پیش کر دیا ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ۱۸۷۰ کے عشرے کے دوران میں یورپ میں جغرافیائی انجمنوں کی بھرمار ہونے لگی اور ہر ہما شما انہیں قائم کرنے لگا۔ یہ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۱۷: کا پروفیسر تھا۔ وہ بدنام چوروں برک (Burke) اور ہیر (Hare) سے لاشیں خریدا کرتا تھا۔ یعنی لاشیں انسانوں کو قتل کر کے حاصل کی جاتی تھیں۔ وہ یہ خود بھی بدنام ہو گیا۔

۲؎ جان ویسٹ لیک (Westlake) (۱۸۲۸-۱۹۱۳) ویسٹ لیک کیمبرج یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون کا پروفیسر تھا۔ اس نے بین الاقوامی قانون پر کئی کتابیں بھی تحریر کی تھیں۔

۳؎ وٹیل (Emer de Vattel)

بات کی علامت تھی کہ لارڈ کرزن[۱] کے بقول جغرافیہ تمام علوم سے آگے نکل گیا ہے اور عالم گیر دلچسپی کا حامل بن گیا ہے [۲] " قلبِ ظلمت "، کا ایک کردار مارلو یوں یہ اعتراف نہیں کرتا :-

میں نقشوں کے پیچھے پاگل ہو گیا تھا۔ میں گھنٹوں (نقشے پر) جنوبی امریکہ، افریقہ یا آسٹریلیا کو دیکھتا رہتا اور نئے نئے علاقے دریافت کرنے میں جو شان و شکوہ میسر آتا ہے، اس کے خیال میں کھویا رہتا۔ اس زمانے میں بے شمار ایسے مقامات تھے، جو ابھی خالی تھے (یعنی وہاں صرف مقامی باشندے ہی آباد تھے) اور جب مجھے نقشے پر کوئی مقام ایسا نظر آتا ہے جو خاص طور پر جاذب نظر دکھائی دیتا (لیکن نقشے پر دیکھنے میں تو یہ سارے ایک جیسے ہی نظر آتے ہیں)، تو میں اس پر اپنی انگلی رکھ دیتا اور کہتا کہ جب میں بڑا ہوں گا، تو وہاں جاؤں گا۔ [۳]

---

[۱] لارڈ کرزن (George Nathaniel Curzon) (۱۸۵۹-۱۹۲۵) برطانوی سیاستدان اور نوآبادیاتی منتظم۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا۔ اسی کے عہد میں تقسیم بنگال عمل میں آئی (اس لحاظ سے وہ مسلمانانِ بنگال کا محسن تھا)۔ اس کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ برصغیر کے آثار قدیمہ (تاج محل، شالامار باغ وغیرہ) کی مرمتوں اور حفاظت کے لیے محکمہ قائم کیا گیا۔

[۲] Curzon: "Subjects of the Day: A selection of His Speeches and Writings" (London: George Allen & Unwin, 1915): pp. 155-56

[۳] Conrad: "Youth and Two other Stories" New york, (Doubleday, 1925), p.52

جغرافیے اور نقشوں کے پیچھے پاگل ہونے کی کیفیت نے ایک منظم صورت اختیار کر لی - ان تمام لوگوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ کسی نہ کسی سمندر یا وسیع علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا جائے اور کونریڈ ہی نے یہ بھی تحریر کیا:

زمین کی تسخیر، جس کا زیادہ تر مطلب یہ ہے کہ آپ اسے ان لوگوں سے چھین رہے ہیں جن کا رنگ ہمارے رنگ سے قدرے مختلف ہے اور یا جن کی ناکیں ہماری ناکوں سے ذرا چپٹی ہیں، جب اسے خوب کھنگال کر دیکھیں، تو یہ آپ کو اچھا کام نظر نہیں آئے گا - اس (حرکت) کی جو چیز تلافی کرتی ہے، وہ محض ایک خیال ہے - ہاں، اس (حرکت) کے پیچھے ایک خیال کار فرما ہے - کوئی جذباتی حیلہ نہیں بلکہ صرف ایک خیال ——— ایک ایسی چیز، جس کی آپ تنصیب کر سکتے ہیں، جس کے سامنے اپنا سر جھکا سکتے ہیں اور جسے بھینٹ پیش کر سکتے ہیں - [۱]

میرا خیال ہے کہ کونریڈ نے کسی دوسرے شخص کی نسبت بات زیادہ واضح اور بہتر انداز سے پیش کی ہے - کسی خطے کی تسخیر کے لیے جس طاقت اور قوت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ محض جزوی طور پر طبعی طاقت و قوت ہے - اس کے علاوہ اخلاقی اور عقلی قوت و طاقت کا عنصر بھی ہوتا ہے - یہی وہ عنصر ہے جو فی نفسہٖ تسخیر کو کسی خیال کے سامنے ثانوی بنا دیتا ہے - یہ خیال ہے جو سائنس، اخلاقیات اور عمومی فلسفے سے دلائل کا اکتساب کر کے خالص طاقت و قوت کو پُر وقار بنا تا ہے (بلکہ اس کی رفتار بھی تیز کر دیتا ہے)

---

[۱] Ibid., pp. 50-51

مغربی ثقافت کی ہر وہ چیز جو امکانی طور پر اس قابل تھی کہ مقبوضات کے حصول کو پُر وقار بنا دیتی ـــــــ مثلاً ہر نئی سائنس اپنے لیے ایک نئی تعقلی قلم رو حاصل کر لیتی ہے ـــــــ اسے نوآبادیاتی مہم جوئی کی خدمت پر مامور کیا جاتا تھا ـــ اور مامور کیا جاتا تھا۔ "خیال" ہمیشہ تسخیر کے عمل میں رُوح پھونک دیتا اور اسے کاملاً خوشگوار بنا دیتا ۔ آج جس چیز کو استعماری جارحیت قرار دے دیا جائے گا۔ اس کو انیسویں صدی میں بالکل صحیح قرار دیا جاتا تھا اور اس کے بالکل عام جواز میں جس قسم کے "خیال" کو بے حجابانہ اور کھلے بندوں پیش کیا جاتا تھا، اس کی ایک مثال پال لیرائے بولیو[1] کی تحریروں سے مندرجہ ذیل اقتباسات سے فراہم ہوتی ہے ۔

ایک معاشرہ تبھی دوسرے علاقوں کو اپنی نوآبادیاں بنانے کے کام میں مشغول ہوتا ہے، جب یہ خود بلوغ اور پختگی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتا ہے، یہ تولیدی سرگرمیوں میں معروف ہو جاتا ہے، یہ پاسبانی اور حفاظت کے فرائض سر انجام دیتا ہے، یہ ترقی اور نمو کے لیے سازگار ماحول اور حالات پیدا کرتا ہے اور جس نئے معاشرے کو اس نے جنم دیا ہوتا ہے، اسے تندرست و توانا بنا دیتا ہے ۔ نوآبادیت معاشرتی عضویات کا ایک انتہائی پیچیدہ اور نازک مظہر ہے ۔

جس خطے میں ایک نئے معاشرے کو جنم دینا مقصود ہوتا ہے، وہاں کے

---

[1] بولیو (Paul Leroy Beaulieu) انیسویں صدی کا ایک ممتاز فرانسیسی جغرافیہ دان ۔

مقامی باشندوں سے صلاح مشورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - اہم بات صرف یہ ہے کہ جدید یورپی معاشرے میں اتنی کافی توانائی اور تعقل موجود ہے کہ "جب وہ بیرونی ممالک میں اپنی کثیر النوع سرگرمیوں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ مصروف ہوتا ہے، تو پہلے سے کہیں زیادہ بڑا بن جاتا ہے۔" اس قسم کی سرگرمیاں اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل تعریف ہی ہوں گی، تبھی تو ان پر یقین کیا جاتا ہے - ان کی اس لیے بھی تحسین کی جاتی ہے کیونکہ ان کے متعلق یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ اپنے اندر ایک مکمل ترقی یافتہ تہذیب کی لہر سموئے ہوئے ہیں - چنانچہ لیراے بولیو مزید رقمطراز ہے:

جب کوئی قوم نو آبادیاں قائم کرنا شروع کرتی ہے، تو اس سے اس کی وسعت پذیر قوت کا اظہار ہوتا ہے - یہ (نو آبادیاں قائم کرنا) اس کی افزائش نو کی قوت ہے - یہ اس کا وہ فعل ہے جس کے ذریعے وہ دھرتی پر اپنی توسیع کرتی ہے اور اپنی تعداد کو پہلے سی کئی گنا بڑا بناتی ہے - اس کے ذریعے کائنات یا کائنات کا ایک وسیع و عریض حصہ اس قوم کی زبان، رسوم، خیالات اور قوانین کے زیر نگیں لایا جاتا ہے - [۱]

استعماریت ایک نظریہ تھا اور نو آبادیت ایک عمل سو اس عمل کے ذریعے دنیا کے ان خطوں کو، جو بے مصرف طور پر خالی پڑے تھے، اس انداز سے

---

[۱] Agnes Murphy: "The Ideology of French Imperialism, 1817-1881" (Washington: The Catholic University of America Press, 1948) pp.110,136,189

تبدیل کرنا مقصود تھا کہ وہ یورپ کے شہری معاشروں کا مفید طور پر ایک نیا روپ بن جاتے۔ ان علاقوں کی ہر اس چیز کو، جس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ بیکار پڑی ہے، خواہ مخواہ ضائع ہو رہی ہے، بے ترتیبی کی مظہر ہے، حالانکہ یہ لامتناہی وسائل کا ذریعہ بن سکتی ہے، اسے اس طریقے سے تبدیل کیا جانا تھا کہ وہ افزائش کا موجب بن جاتی، اس میں ترتیب پیدا ہو جاتی، اس سے ٹیکس وصول کیا جا سکتا اور اسے امکانی طور پر دولت کمانے کا ذریعہ بنایا جا سکتا۔ آپ ایسے تمام انسانوں اور حیوانوں سے نجات حاصل کریں جو کام کے نہ کاج کے لیکن دشمن اناج کے ہیں اور جنہیں دیکھ کر گھن آتی ہے[1] اور اس طرح جو انسان اور حیوان باقی بچ رہیں، انہیں مخصوص علاقوں[2]، خاردار تاروں سے گھرے ہوئے کیمپوں، مقامی وطنوں[3] وغیرہ میں دھکیل دیں اور انہیں وہیں

---

[1] یہ انسان اور حیوان جن سے چھٹکارا پانا مقصود تھا، یا تو ہڈ حرام بن کر بیکار ایک جگہ پڑے رہتے تھے اور یا پھر بے مقصد ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہتے تھے، یہ نہ تو کسی پیداواری عمل میں شریک ہوتے تھے اور نہ ان کی کبھی گنتی ہوتی تھی (یہاں یہ خیال رہے کہ ان کے متعلق یہ رائے مغربی سامراجیوں کی ہے) ۔ (مصنف)

[2] امریکی اصطلاح میں ایسے علاقوں کو Reservations کہا جاتا ہے۔ امریکہ کی وفاقی حکومت نے ملک کے مختلف حصوں میں ایسے بعض علاقے مقامی ریڈ انڈین باشندوں کے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔

[3] جنوبی افریقہ دنیا کا وہ بدقسمت خطہ ہے جہاں گوروں کی ایک قلیل تعداد نے ملک کے نظم و نسق اور تمام وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ملک کے مقامی سیاہ فام باشندے، آبادی کے لحاظ سے جن کی زبردست اکثریت ہے، ملک میں دیدم وم نہ کشیدم کی تصویر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

محدود کر دیں تو پھر ان کی گنتی بھی کر سکیں گے، ان پر ٹیکس بھی لگا سکیں گے، ان
انہیں منفعت بخش طریقے سے استعمال بھی کر سکیں گے اور یوں ان علاقوں میں،
جو آپ نے اس طریقے سے خالی کرائے ہیں، ایک نئے معاشرے کی تعمیر
کر سکیں گے۔ چنانچہ یہی وہ طریقے ہیں جن کی امداد سے ممالک غیر میں یورپ
کی تشکیل نو کی گئی، دھرتی پر یورپی باشندوں کی تعداد میں "کئی گنا" اضافہ کرنے کے
منصوبوں کو پروان چڑھایا گیا اور ان کا بندوبست کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا
کہ چھوٹے چھوٹے یورپوں کے متعدد متنوع گروپ وجود میں آگئے جو ایشیا، افریقہ
جنوبی امریکہ اور شمالی امریکہ کے براعظموں میں دور دراز بکھرے پڑے ہیں۔ ان
میں سے ہر گروپ اپنے آبائی کلچر، اپنے اولین پیشروؤں، اپنے ہراول میں آنے
والے آبادکاروں کے حالات اور ان کے مخصوص ہتھکنڈوں کا عکاس ہے۔[ا]

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۲۳: بنے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ امتیاز اس حد تک برتا جاتا ہے کہ انہیں
گوروں کی آبادیوں میں رہائش اختیار کرنا تو کجا، ان کے ساتھ بسوں، ٹرینوں وغیرہ پر سفر کرنے، ریستورانوں
میں ان کے ساتھ کھانا کھانے، ان کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے اور ان کے ساتھ گرجوں میں عبادت
کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ گوروں کے علاقوں میں انہیں صرف مشقت طلب یا ادنیٰ نوعیت کے کام
کرنے ہی کی اجازت ہے۔ ملک کے بعض بنجر علاقوں میں ان
کی نام نہاد حکومتیں قائم کردی گئی ہیں۔ ان علاقوں کو ان کے مقامی وطن (Native
homelands) کہا جاتا ہے۔

ا اسرائیل کا ایک ممتاز ناول نگار (Amos Oz) اس بات کو خوب صورت انداز سے پیش کرتا
ہے: "جب تک میری سانس کی ڈوری صحیح سلامت ہے، ان لوگوں کی داستانیں مجھ میں
ولولہ پیدا کرتی رہیں گی جو موجودہ سرزمین میں اس لیے آئے تاکہ وہ اسے ایک زرعی جنت
میں تبدیل کردیں یا یہاں (مشہور روسی ناول نگار) ٹالسٹائی کے اصولوں کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اپنے تمام اختلافات کے باوجود، جو اچھے خاصے تھے، ان تمام گروپوں میں ایک بہت بڑی قدر مشترک تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ اپنا کاروبار حیات یوں چلاتے تھے جیسے ہر چیز نارمل (معمول کے مطابق) ہو۔ یورپ کی مضحک ترین اور بے ہودہ ترین نقول (جنوبی افریقہ، روڈیشیا[1] وغیرہ) موزوں اور مناسب قرار پائیں۔ مقامی باشندوں کے خلاف جو بدترین امتیازات روا رکھے گئے اور انہیں جن طریقوں سے دُور دُور رکھا گیا، انہیں بالکل معمول کے مطابق تصور کیا گیا لیکن "سائنسی طور پر" ایسی حرکات جائز اور صحیح تھیں ایک ایسے خطے میں، جو چاروں طرف سے دوسری مملکتوں میں گھرا ہوا ہو (محوطہ) اور جو جغرافیائی اور ثقافتی اعتبار سے یورپ سے کوسوں دور ہو، ایسے مقامی باشندوں کے مابین جو آپ سے عناد بھی رکھتے ہوں اور جو آپ کے رویوں کو سمجھنے سے قاصر بھی ہوں، ایک بدیسی طرز حیات اختیار کرنے میں جو تضاد پایا جاتا ہے،

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۲۴: مطابق مساوات پر مبنی کمیون قائم کریں یا اسے ایک ایسے محوطے کی شکل دے دیں جہاں وسطی یورپ سے آیا ہوا اعلیٰ تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اسے ایک نیا آسٹریا یا بویریا بنا دے۔ میں ان لوگوں کی بھی تہہ دل سے قدر کرتا ہوں جو یہاں اس لیے آئے تاکہ وہ یہاں مارکسی اصولوں کے مطابق ایک جنت ارضی تخلیق کریں، جنہوں نے یہاں کتاب انجیل میں مذکور مقامات پر اجتماعی زرعی فارم (کبتس) قائم کیے اور جن کی شدید پوشیدہ خواہش یہ تھی کہ کسی روز خود شالن چل کر یہاں آئے اور اعتراف کرے، "واہیات یہودیو، تم نے کمال کر دیا ہے۔ تم ہم سے بھی بازی لے گئے ہو"۔ ہفت روزہ "ٹائم" مورخہ ۵ مئی ۱۹۷۸ء، صفحہ نمبر ۶۱

[1] روڈیشیا نام کے اصل میں دو ملک تھے، شمالی روڈیشیا اور جنوبی روڈیشیا، دونوں پر اقلیتی گوری حکومتیں مسلط تھیں۔ لیکن اب دونوں ممالک آزادی حاصل کر چکے ہیں۔ شمالی روڈیشیا کو اب "زیمبیا" اور جنوبی روڈیشیا کو "زمبابوے" کہتے ہیں۔

اس نے تاریخ کے متعلق ایک خاص قسم کے احساس، ایک ڈھیٹ قسم کی منطق، ایک مخصوص نوع کی معاشرتی اور سیاسی کیفیت کو جنم دیا۔ ان تمام باتوں نے مل ملا کر یہ حکم لگایا کہ موجودہ نو آبادیاتی مہم نارمل ہے، جائز ہے، مفید اور کار آمد ہے۔

اگر فلسطین کے خاص حوالے سے بات کی جائے، تو مقامی فلسطینیوں کے متعلق صہیونیوں کے جو مخصوص رویے بننا تھے اور ان صہیونیوں نے "نارمل" زندگی کے متعلق جو مفروضہ دعاوی کرنا تھے، ان کے بیج ان برطانوی عالموں، منتظمین اور ماہرین کے، جو انیسویں صدی سے فلسطین کے استحصال اور اس پر حکمرانی کے عمل میں سرکاری طور پر شامل تھے، رویوں اور عملوں میں بوئے جا چکے تھے، ذرا غور فرمائیں کہ ۱۹۰۳ء میں بشپ آف سالسبری[1] نے "پیلسٹائن ایکسپلوریشن فنڈ"[2] کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے کیا کہا تھا:

میرا خیال ہے کہ اب تک جو کچھ دریافت کیا گیا ہے، اس کے پیشِ نظر ہمیں اس بات پر قطعاً کوئی افسوس یا ملال نہیں ہوتا کہ اسرائیلی تہذیب

---

[1] سالسبری وسطی انگلستان کے ایک حلقہ انتخاب کا نام ہے۔ بشپ کو اردو اور عربی میں اسقف کہتے ہیں، عیسائیت میں مذہبی رہنماؤں کی وہی درجہ بندی ہوتی ہے جو ہمارے ہاں انتظامیہ میں ہوتی ہے۔ بشپ متعدد کلیساؤں کا انچارج ہوتا ہے۔ عہدے کے لحاظ سے اسے اپنے علاقے کا ڈپٹی کمشنر سمجھیں۔

[2] Palestine Exploration Fund ایک برطانوی تنظیم، جس کا اصل مقصد فلسطین کے وسائل کا استحصال کرنا تھا۔ اور اس کے قیام میں یہودی پیش پیش تھے۔

نے کنعانی تہذیب[1] کو کیوں کچل ڈالا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔(جو کھدائیاں کی گئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ) انجیل مقدس نے جن قبیح پہلوؤں کا، جو اسرائیلی تہذیب نے نیست و نابود کر دیے تھے اور جن کی جگہ اس نے خود لے لی تھی، ذکر کیا ہے انہیں اس (انجیل مقدس) نے غلط انداز سے پیش نہیں کیا ۔

ایک نوجوان امریکی عالم، مریم روزن، نے فلسطین کے متعلق مخصوص برطانوی رویوں کی ایک روح فرسا اور لرزہ خیز فہرست مدون کی ہے ۔ حقیقتاً یہی وہ رویے ہیں جو مقامی فلسطینیوں کے متعلق دیزمان سے لے کر بیگن تک سرکاری یہودی رویے کی غیر معمولی انداز سے نشان دہی کرتے ہیں ۔ مریم روزن نے جو اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ۔

ٹرائی وِٹ ڈریک، جس نے مغربی فلسطین کا سروے کیا تھا، تحریر کیا:
فلاحین کا یہ خوف کہ ملک کی تسخیر نو کے لیے ہم نے خفیہ منصوبے ترتیب دے رکھے ہیں، ہمارے راستے میں مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر دیتا ہے ۔ اگر ان کا یہ اندیشہ دور کر دیا جائے تو پھر ہمیں نری بونگی حماقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ وہ سیدھے سادے سوالوں کا سیدھا جواب نہیں دیتے ۔ وہ ان سوالوں

---

[1] یہودی ارض مقدس کو کبھی "فلسطین" کے نام سے نہیں پکارتے ۔ پرانے زمانے میں وہ اسے کنعان کہتے تھے ۔ اب بھی اگر انہیں کبھی تلخ گولی نگلنا ہی پڑے اور اسے "اسرائیل" پکارنے سے بات نہ بنتی ہو ۔ تو اسے "کنعان" کہنا ہی پسند کریں گے ۔ یہ صورت زیادہ تر اسرائیل کے قیام سے قبل قائم تھی ۔

کا صحیح مقصد سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ الٹا وہ خود سوال داغ دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آخر ایک فرنگی کو کیا ضرورت پیش آئی ہے کہ وہ ہمارے ملک کی کسی غیر اہم وادی یا پہاڑی کا نام پوچھتا پھرتا ہے؟"

مشرق میں مجھے جس قسم کے انسانوں سے واسطہ پڑا ہے، فلاحین ان میں بدترین لوگ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فلاحین ہر نوع کے اخلاق احساس سے بالکل عاری ہیں۔

"پیلسٹائن ایکسپلوریشن فنڈ" کو ملک کے سروے کے دوران میں، جن "مزاحمتوں" کا سامنا کرنا پڑا، ان کے متعلق ڈین آف ویسٹ منسٹر[1] ارشاد فرماتے ہیں:

آپ کو اپنے کام میں یہ تمام مشقتیں جھیلنا پڑیں۔ آفرین ہے کہ پھر بھی آپ اپنے کام میں جتے رہے لیکن ان لوگوں کی مدد سے نہیں جو موقع پر موجود تھے (یعنی وہاں آباد تھے) بلکہ ان تمام مزاحمتوں اور رکاوٹوں کے باوجود، جو ان لوگوں کی عیاری، جہالت اور حماقت نے ایک عجیب طریقے سے مل جل کر آپ کے کام میں ڈالی تھیں اس قسم کی جہالت، حماقت اور عیاری صرف مشرق کے باشندوں ہی میں ملے گی۔

الجلیل[2] کے سروے کے متعلق لارڈ کچز[3] نے کہا:

---

[1] لندن کا وہ علاقہ جہاں پارلیمنٹ کی عمارات واقع ہیں ویسٹ منسٹر کہلاتا ہے ان عمارات کے قریب ہی ایک تاریخی گرجا ہے جسے ویسٹ منسٹر ایبے (Abbey) کہتے ہیں۔ یہی وہ گرجا ہے جہاں انگلستان کے حکمرانوں کی تاجپوشی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ انگلستان کی بعض نامور ہستیاں بھی اسکے اندر مدفون ہیں۔ گرجے کے اندر داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوتا ہے۔ بڑے گرجوں میں کئی عہدیدار کام کرتے ہیں۔ اسکے سربراہ کو ڈین کہتے ہیں۔ ویسٹ منسٹر کے ڈین کو سرکاری طور پر اہم مقام حاصل ہوتا ہے اور وہ دارالامرا کا رکن بھی ہوتا ہے۔ [2] الجلیل (گلیلی) فلسطین کا ایک علاقہ

[3] ہوریشو ہربرٹ کچز، ارل آف خرطوم اینڈ بروم (۱۸۵۰ – ۱۹۱۶) ۔ آئرش نژاد برطانوی فوجی افسر اور نوآبادیاتی حاکم۔ سوڈان کے مہدی کو اسی نے شکست دی تھی۔

ہمیں امید ہے کہ ہم فلسطین کے ان دلچسپ ترین کھنڈرات کو، جنہیں ہمارے آقائے ولی نعمت، یسوع مسیح کے قدموں نے مقدس بنا دیا تھا، ان بے درد اور سفاک تخریب کاروں، یعنی غیر تعلیم یافتہ اور اُجڈ عربوں کے پنجے سے چھڑالیں گے۔ میرا اشارہ اس یہودی معبد کی طرف ہے جو کیپر نام میں واقع ہے۔ یہ معبد تیزی سے نابود ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اس کے پتھروں کو جلا کر چونا بنایا جا رہا ہے۔

سی آر۔ کونڈر نامی ایک شخص اپنی تصنیف "فلسطین کی موجودہ حالت" میں رقمطراز ہے:

معامی غلامین صرف اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر محض چند الفاظ میں کردیا جائے۔ وہ وحشیانہ طور پر اجڈ، جاہل اور متعصب ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بلا کے جھوٹے اور دروغ گو ہیں۔ تاہم ان میں چند خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر ان کی مناسب تربیت کی جائے، تو وہ کام کے انسان بن سکتے ہیں۔ (اس نے انکی جو خوبیاں گنوائی ہیں، ان میں وہ ان کی زیرکی، تیز فہمی، توانائی، مصائب و آلام، گرمی وغیرہ برداشت کرنے کی ہمت شمار کرتا ہے)۔

سر فلنڈرز پیٹری[1] کے الفاظ میں،

عربوں کے ساتھ خواہ مخواہ اتنی رومانی داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں، حقیقتاً دوسری وحشی اقوام کی طرح وہ اس قدر نااہل اور نکمے ہیں کہ ان سے کراہت ہونے لگتی ہے۔ جس طرح براعظم امریکہ کے ریڈ انڈین یا

---

[1] پیٹری (Sir Flinders William Mathew Petrie) مصریات کا ماہر۔

نیوزی لینڈ کے ماؤری باشندوں کے ساتھ کوئی رومانی کہانیاں منسوب
کرنا ممکن نہیں، اسی طرح یہ عرب بھی اس قابل نہیں کہ ان کے ساتھ ایسی
داستانیں وابستہ کی جائیں۔ ان کے مقابلے میں مصری زیادہ سمجھدار اور
زیرک ہیں اور ان کے ہاں دوبارہ جانے میں مجھے بہت خوشی محسوس
ہوگی۔

"فلسطین کے عربوں" کے متعلق چارلس کلرماں ژانو[۱] کے تاثرات:

عرب تہذیب محض فریب اور ڈھکوسلا ہے ——— عرب
فتوحات کی ہولناکیوں کی طرح اس کا وجود بھی اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔
یہ یونانی اور رومی تہذیب کی محض آخری لو ہے جو اسلام کے بے سکت
لیکن مؤدب ہاتھوں میں آہستہ آہستہ بجھتی جا رہی ہے۔

یا اس ملک کے متعلق سٹینلے کک[۲] کا نظریہ:

.... سرعت پذیر زوال و انحطاط، جسے (بظاہر تو یہی نظر آتا
ہے) وقتی طور پر جوشیلے اور مستعد صلیبیوں نے روک دیا تھا۔ دورِ
جدید کے سیاحوں نے مقامی باشندوں کے کردار کی خلقی کمزوریوں کی اکثر

---

۱ (Charles Clermont Ganneau) (۱۸۴۶ - ۱۹۲۳) ایک فرانسیسی
سفارت کار اور مستشرق۔ ۱۸۷۴ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین میں آثارِ قدیمہ
کے ماہرین کی ایک جماعت بھیجی تھی۔ یہ شخص اس جماعت کا سربراہ تھا۔

۲ کک (Stainley Arthur Cook) (۱۸۷۳ - ۱۹۴۰) ایک برطانوی یہودی۔
یہ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۳۸ء تک کیمبرج یونیورسٹی میں عبرانی زبان و ادب کی تعلیم دیتا رہا۔
یہ آثارِ قدیمہ کا ماہر اور مقامی تہذیب و تمدن، انجیل مقدس اور تقابلی مذاہب پر سند
سمجھا جاتا تھا۔

تشنہ دہی کی ہے اور رابنسن کی طرح ان سب کو یہ احساس ہے کہ اگر اس خطے کو دوبارہ خوشحال بنانا مقصود ہے تو پھر انسانی ہاتھوں کے علاوہ، جو زمین پر ہل چلا سکیں، اور کسی چیز کی ضرورت نہیں "

اور آخر میں آر۔ اے۔ ایس میکالسٹر[1] کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں:

اگر یہ کہا جائے کہ ان طول طویل صدیوں کے دوران میں فلسطین کے مقامی باشندوں نے مادی تہذیب کی ترقی اور فروغ کے سلسلے میں ایک تنکا تک نہیں توڑا، تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ روئے زمین پر یہ غالباً واحد ملک تھا جہاں قطعاً کسی قسم کی کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اس کی تہذیب سراسر خوشہ چینی پر مبنی تھی اور دوسروں کی رہین منت[2]۔

تو یہ چند بڑے بڑے نکات ہیں جنہیں یورپ کے استعماری یا نوآبادیاتی رویوں پر استوار صیہونیت کے پس منظر کے متعلق پیش کرنا ہوگا۔ صیہونیت نے یہودیوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی کیا ہو، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ فلسطین کو بالکل اسی نگاہ سے دیکھتی تھی جس سے یورپ کے استعمار پسند دیکھتے تھے۔ یعنی اس کے نزدیک یہ ایک بے آباد خطہ تھا۔ لیکن اس سوچ میں ایک تضاد تھا اور وہ تضاد یہ تھا کہ ایک طرف تو وہ کہتے نہیں تھکتی تھی کہ

---

[1] ایک انگریز سیاح (۱۸۷۰ - ۱۹۵۰ء) (R.A.S. Macalister)

[2] ۱۹۷۶ء میں امریکہ کے ہنٹر کالج کی ایک طالبہ مریم روزن (Miriam Rosen) نے اپنے ایم۔ اے کے امتحان کے سلسلے میں ایک مقالہ (Thesis) بعنوان "The Last crusade: "British Archeology in Palestine" تحریر کیا تھا۔ یہ مقالہ بہت عمدہ اور قابل قدر ہے۔ میں نے اوپر جو اقتباسات دیئے ہیں، وہ اسی کے صفحات نمبر ۱۸۰۔۲ سے لیے گئے ہیں (مصنف)

یہ خطہ بے آباد ہے لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ خطہ مقامی لوگوں سے "پُر" تھا، بے شک یہ مقامی لوگ اس کی نظروں میں رذیل تھے اور ان کے متعلق وہ یہ بھی باور کرتی تھی کہ ان (مقامی لوگوں) سے غالباً جان چھڑائی جا سکے گی۔ جیسا کہ جنگِ عظیم اوّل کے بعد شائم ویزمان نے بالکل واضح طور پر کہا تھا اس (صیہونیت) نے فلسطین میں ایک نئی یہودی مملکت کے قیام کے سلسلے میں اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے استعماری طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تھا اور جہاں تک "مقامی باشندوں" کا تعلق ہے، ان کے متعلق اس کا رویہ ہمیشہ منفی رہا۔ ان "مقامی باشندوں" کے بارے میں یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا کہ یہ تو بس اللہ میاں کی گائیں ہیں، چنانچہ ان کے وطن کے متعلق جو بھی منصوبے وضع کیے جائیں، وہ انہیں آنکھیں بند کر کے قبول کریں گے اور ذرا چوں چرا نہیں کریں گے۔

جیسا کہ یہوشوا پوریتھ (Porath) اور نیول مینڈل (Mandel) جیسے یہودی مورخین نے بھی، جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کی بنا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ (جنگِ عظیم اوّل سے کہیں قبل) فلسطین میں یہودی نوآبادکاروں کے تصورات کو بلا مغالطہ زبردست مقامی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مزاحمت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مقامی باشندے یہودیوں کو از راہِ بد سمجھتے تھے بلکہ یہ تھی کہ مقامی باشندوں کی اکثریت کو یہ بات قطعاً ناپسند تھی کہ بدیسی اور غیر ملکی لوگ ان کی سرزمین پر آباد ہوں[1]۔ مزید براں، صیہونیت نے جب

---

[1] See Neville J. Mandel, "The Arabs and Zionism before World War I (Berkeley: University of California Press, 1976) and Yehoshua Porath, "The Emergence of the

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہودی قوم کے تصور کی تشکیل کی کہ اس کا مقصد اپنے (گم گشتہ) علاقوں کی "بازیافت" تھی، تو اس نے نہ صرف یورپی تہذیب کے انسانی نسلوں کے متعلق اس تصور کو من وعن تسلیم کر لیا کہ اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ہر نسل دوسری نسل سے مختلف ہوتی ہے بلکہ اس نے اس امر کو بھی بطور حقیقت قبول کر لیا کہ در حقیقت فلسطین میں جو لوگ آباد ہیں، وہ ترقی یافتہ نہیں بلکہ پسماندہ ہیں، چنانچہ (اس کا یہ حق بنتا ہے) کہ اسے ان پر تسلط و تغلب حاصل ہو۔ چنانچہ بین السطور تسلط و تغلب کا یہ مفروضہ ہی تھا جس نے صہیونیت کو بالخصوص اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مقامی باشندوں کو زیادہ تر اس طور نظر انداز کرتی رہے گویا وہ اس قابل ہی نہیں کہ ان پر سنجیدگی کیساتھ کوئی توجہ دی جائے[1]۔ چنانچہ صہیونیت نے جس نہج پر نمو پائی، اس میں اسے اپنی ذات کے متعلق تو بے نظیر وقوف تھا لیکن جہاں تک بدنصیب مقامی باشندوں کا تعلق ہے، ان کے لیے کچھ بھی نہ بچا اور اگر کچھ بچا بھی تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا، ان مقامی باشندوں کے بارے میں صہیونیت نے جس بے نیازی کا مظاہرہ کیا، اس کے متعلق میکسم روڈنسن نے بالکل

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۳۲: Palestinian Arab National Movement Vol.I 1918-1929 (London: Frank Cass Company, 1974)

[1] ملاحظہ فرمائیں ایموس ایلون (Elon) کی تصنیف The Israelis: Founders and Sons", مطبوعہ ہنیم کس نیویارک، ایڈیشن ۱۹۷۱، صفحات ۲۱۸-۲۲۴۔ یہاں مصنف نے تاریخی حقائق کھرے کھرے انداز سے پیش کیے ہیں۔ (مصنف)

Y611 ck a4y naty we

بجا کہا ہے :

یہ ایک ایسی بے نیازی تھی جو یورپی بالادستی سے منسلک تھی جس سے یورپ کے پرولتاری طبقے اور پسی ہوئی اقلیتیں بھی مستفید ہوئیں۔ درحقیقت اس امر کے بارے میں قطعاً کسی قسم کے شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر (یہودیوں کے) "آبائی وطن پر ان قوموں میں سے کسی ایک قوم کا، جو صنعتی طور پر بہت مستحکم ہو چکی تھیں اور جو اس زمانے میں دنیا پر حکومت کر رہی تھیں، قبضہ ہو جاتا اور یہ قوم اس علاقے میں پورے طور پر آباد ہو جاتی اور یہاں کے باشندوں میں زبردست قومی شعور پیدا کر دیتی، تو جاہل سے جاہل اور مفلس سے مفلس صیہونی کے شعوری ذہن میں جو مسئلہ در آتا، وہ یہ ہوتا کہ جرمنوں، فرانسیسیوں یا انگریزوں کو کیسے نکال باہر کیا جائے اور اپنے (آبائی) وطن میں ایک نیا، قومی اعتبار سے مربوط عنصر کیسے داخل کیا جائے[۱]"

قصہ مختصر، صیہونی توانائیوں کے جتنے بھی اجزائے ترکیبی تھے، ان سب کی اساس "انحراج موجودگی"، پر تھی یعنی فلسطین کے "مقامی باشندوں" کے ساتھ کچھ اس قسم کا برتاؤ کیا جائے کہ وہ کسی بھی ایسی جگہ کے، جہاں کسی بھی نوعیت کا کوئی کام رہا ہو، قریب بھی نہ پھٹک سکیں اور یوں ثابت کر دیا جائے کہ وہ عدم موجود ہیں۔ ایسے ادارے قائم کیے گئے جن سے عمداً مقامی باشندوں کو دور رکھا

---

[۱] میکسیم روڈنسن "A Colonial Settler State?" (Rodirson)
مترجم: ڈیوڈ تھورس ٹیڈ (Thorstad)
مطبوعہ: موناڈ (Monad) پریس آف دی ایگزامنر فاؤنڈیشن،
نیویارک، سالِ اشاعت ۱۹۷۳، صفحہ نمبر ۳۹

گیا ۔ قیام اسرائیل کے بعد ایسے قوانین وضع کیے گئے جن کے ذریعے اس بات کا پکا بندوبست کیا گیا کہ مقامی باشندے اپنے "عدم مقام" (NONPLACE) پر رہیں گے اور یہودی اپنے مقام پر، وغیرہ وغیرہ ۔ چنانچہ ہمیں اس امر پر قطعاً کسی قسم کا تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ آج ایک معاشرے کی حیثیت سے اسرائیل میں جو مسئلہ ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، وہ فلسطینیوں کا مسئلہ ہے جن کے وجود کی نفی صیہونیت نہایت استقامت اور تسلسل کے ساتھ کرتی چلی آ رہی ہے ۔ غالباً صیہونیت کا یہی وہ ناگوار پہلو ہے جو اسے ناگزیر طور پر استعمار کے ساتھ نتھی کر دیتا ہے ۔ کم از کم جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے وہ تو یہی سمجھتے ہیں ۔ میں ایک مرتبہ پھر روڈنسن کے الفاظ کا حوالہ دے رہا ہوں:

> وہ عنصر، جس نے روس اور دوسرے ممالک کے یہودی دکان داروں، خوانچہ فروشوں، کاریگروں اور دانش وروں کی امنگوں کو استعمار کے تصوریری مدار کے ساتھ منسلک کرنا ممکن بنایا، محض ایک معمولی سی بات تھی جو نفسہٖ کسی خاص اہمیت کی حامل معلوم نہیں ہوتی تھی ۔ بہرحال وہ بات (جو ان کے ذہنوں میں جاگزیں ہو گئی) یہ تھی کہ
>
> فلسطین میں ایک دوسری قوم آباد تھی ۔ [۱]

۱؎ میکسم روڈنسن: A COLONIAL SETTLER STATE RODINSON
مترجم: ڈیوڈ تھورسٹیڈ THORSTAD
مطبعہ: مونا ڈ MONAD
پریس آف دی اینکر فاؤنڈیشن، نیویارک ۔ سال اشاعت ۱۹۷۳ء، صفحہ نمبر ۳۹
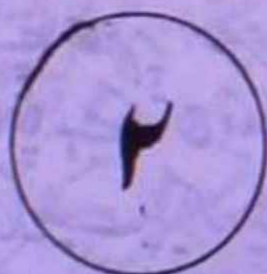
صہیونیوں کی آبادی، فلسطینیوں کی بربادی

میں اس ناہمواری (عدم مساوات) کا ذکر تصوراتی اصطلاحات میں کرتا رہا ہوں جو صہیونیت کے رویے میں پائی جاتی ہے۔ ایک طرف تو یہودیوں کا اسے اتنا خیال ہے اور دوسری طرف وہ غیر یہودیوں یا مقامی عرب باشندوں سے تقریباً کامل اغماض برتتی ہے۔ جہاں تک مقامی رہائشی باشندوں کا تعلق ہے، تو ان کے متعلق صہیونیت اور یورپی استعمار نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے وہ علمیاتی اور چنانچہ تاریخی اور سیاسی طور پر بالکل یکساں ہے۔ بہ الفاظ دیگر، وہ اس معاملے میں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ لیکن یہ استعماری نقطۂ نظر، جسے آسان، سہل اور مختصر الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، لیکن جو دنیائے سیاست اور ان لوگوں کی زندگیوں پر، جن کے نزدیک علمیات ایک غیر متعلق چیز تھی اثر انداز ہوتا تھا۔ اس بات کا جواز فراہم کرتا ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ آخر یہ علمیات ہے کیا؟ اس دنیا میں اور ان اشخاص کی زندگیوں پر، جن میں لاکھوں فلسطینی بھی شامل تھے، استعمار اور صہیونیت جس طرح اثر انداز ہوئی، اس

کے نتائج کی جزئیات و تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔ یہ کام محض نظری اعتبار سے ہی نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس میں یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ صیہونیت کاری زخم لگانے میں کس حد تک مؤثر ثابت ہوئی۔ صیہونیت کے متعلق عام فلسطینیوں کا ردِ عمل کیا تھا، میرے خیال میں اس کی ایک مکمل جھلک مندرجہ ذیل جملے میں مل جاتی ہے جو ۱۹۲۲ء میں سرونسٹن چرچل[1] کے قرطاسِ ابیض کے جواب میں عرب وفد نے استعمال کیا تھا۔

"یہودیوں کا قومی وطن قائم کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ عربوں کی آبادی، ثقافت اور زبان یا تو بالکل معدوم ہو جائے گی اور یا پھر یہ دوسروں کے "رحم و کرم" پر ہوگی، فلسطینی عرب جس چیز کا نسل در نسل مشاہدہ کر رہے تھے، وہ، وہ منصوبہ تھا جس کی گہری جڑیں یہودی تاریخ اور اس خوفناک تجربے میں جو انہیں یورپ میں ہوا، پیوستہ تھیں جن کی گرہیں اب آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھیں۔ عربوں کو اب یہ صاف صاف نظر آرہا تھا کہ صیہونی منصوبہ ایک مجسم سفاک نظریہ (doctrine) ہے جو خانقاہی ضبطِ نفس اور ماحول سے سرد مہرانہ بے تعلقی کا حکم لگاتا ہے۔ یہودی جو اپنے آپ کو سوشلسٹ کارکن کہلا کر اتراتے تھے، وہ اخوت کی تعبیر خالصتاً قومی یا نسلی بنیادوں پر کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک اخوت یہودیوں کے ساتھ ہو سکتی تھی، عربوں کے ساتھ نہیں چونکہ وہ اراضی پر کام اپنے ہاتھوں کرنے پر مصر تھے کیونکہ

---

[1] چرچل، جو بعد میں برطانیہ کا نامور ترین وزیر اعظم ثابت ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وزیر نو آبادیات تھا

[2] ڈیوڈ وینز (Waines) نے اس کا حوالہ اپنے مضمون "The Failure of Nationalist Resistance" میں دیا ہے۔ یہ مضمون ابراہیم ابو العلود کی مرتبہ کتاب "Transformation of Palestine" مطبوعہ نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی پریس میں شامل ہے۔ صفحہ نمبر ۲۲۴

دوسروں کا استحصال ان کے لیے مردود تھا، اس لیے وہ اپنی قلمرو سے عربوں کو خارج کر دیتے تھے .... وہ مساوات پر یقین تور کھتے تھے لیکن صرف اپنے لیے۔ وہ یہودی روٹی کھاتے تھے جو یہودی اراضی سے حاصل کی جاتی تھی اور اس اراضی کا تحفظ یہودی رائفلیں کرتی تھیں"۔ [۱]

فلسطینی تجربے کی جو "فہرست" میں یہاں مرتب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ اس سادہ سچائی پر مبنی ہے کہ فخر و انبساط سے سرشار یا (بعد ازاں) خوف و دہشت سے مرعوب یہودی، جو فلسطین میں وارد ہوتے تھے، اصلاً غیر ملکی گردانے جاتے تھے لیکن وہ اعلان یہ کرتے تھے کہ ہمارا مقدر یہ ہے کہ ہم ایک یہودی مملکت تخلیق کریں۔ لیکن عربوں کا، جو وہاں موجود تھے، کیا بنتا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اب ہمیں اپنے آپ سے لازماً پوچھنا ہو گا۔ (اس سوال کے جواب میں) ہمیں جو کچھ معلوم ہو گا، وہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز، جو صیہونی نقطۂ نظر سے مثبت تھی مقامی عرب فلسطینیوں کے تناظر میں کاملاً منفی تھی۔

اس کی وجہ؟ صیہونیوں نے جو عظیم خواب بُنا تھا، اس میں ان کا کبھی کہیں مقام نہیں بن سکتا تھا۔ محض اس لیے نہیں کہ یہ "خواب" ایک محض نظری معاملہ تھا، یہ تو وہ تھا، لیکن چونکہ اس ("خواب") نے بعد ازاں مقامی عرب فلسطینیوں کے متعلق اسرائیلی حکومت کی حکمت عملی کے خدو خال ہی نہیں بلکہ اس کی تفصیلات بھی طے کرنا تھیں۔ یہ "خواب" وہ انداز

---

[۱] ایضاً۔ صفحہ نمبر ۲۱۳

بھی فراہم کرتا تھا جس سے صیہونی رہنما عرب فلسطینیوں کو دیکھتے تھے تاکہ بعدازاں (اور اس زمانے میں یقیناً) ان سے نپٹا جا سکے۔ چنانچہ، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، میرے ذہن میں وہ ساری جدلیات موجود ہے جو نظریے (تھیوری) اور روزمرہ کے حقیقی مؤثرات کے مابین پائی جاتی تھی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ایک منظم معاشرے (polity) کی حیثیت سے اسرائیل نے اس صیہونی دعوے[1] (Thesis) سے نمو پائی کہ فلسطین میں جو نوآبادکاری ہوگی، وہ یہودیوں کی ہوگی اور یہودیوں کے لیے ہوگی، یہ نوآبادکاری فلسطینیوں کی اکھاڑ پچھاڑ سے ہوگی اور یہ دونوں کام بیک وقت سرانجام دینا ہوں گے۔ مزید برآں، فلسطین کے متعلق صیہونیت نے جو خیالات شعوری طور پر اپنائے یا جن خیالات کا اس نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا، ان کے مطابق اس کا ارادہ یہ تھا کہ کوشش یہ کی جائے کہ (فلسطین میں) مقامی باشندوں کی تعداد کم سے کم ہو جائے اور بعد میں انہیں بالکل ہی نکال باہر کیا جائے۔ تاہم اگر کوئی بات بنتی نظر نہ آئے تو انہیں (مقامی باشندوں کو) مطیع و محکوم بنا لیا جائے تاکہ اس امر کی ضمانت مل سکے کہ اسرائیل محض اپنے شہریوں (جن میں عرب بہرحال شامل تھے) کی مملکت نہیں ہوگا بلکہ یہ "پوری یہودی قوم" کی مملکت ہوگا۔ یوں اسے سرزمین اور اقوام پر اس طرح کا اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو جائے گا جو کسی دوسری قوم کو نہ تو کبھی حاصل ہوا اور نہ اب حاصل ہے۔

---

[1] یہاں تھیسس کا ترجمہ نظریہ یا اصول بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک مفروضہ ہوتا ہے جو بحث کا آغاز کرنے اور اسے آگے بڑھانے کے لیے پیش کیا جاتا ہے مقدمہ منطق کی اصطلاح ہے۔ منطق کی بحث تین قضیوں پر مشتمل ہوتی ہے، ان میں پہلے دو کو تو مقدمات اور تیسرے کو نتیجہ کہتے ہیں۔

یہی وہ بے ضابطگی (anomaly) ہے، جس کے خلاف عرب فلسطینی اس زمانے سے مزاحمت کر رہے ہیں اور اس کا ایک متبادل پیش کرنے میں مصروف ہیں ۔

وہ صیہونی رہنما، ہرزل کے بعد جن کا کام منصوبے کو عملی جامہ پہنانا تھا اور جنہیں حکمت عملی کے اعتبار سے اہم مقام حاصل ہوا، مختلف مواقع پر اپنے جن خیالات کا اظہار کرتے رہے، ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے اور معلوم کر سکتے ہیں ۔ اس ضمن میں جس شخص کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے، وہ شائم ویزمان ہے ۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی غیر معمولی اور بھاری بھرکم شخصیت ہے ۔ لیکن اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اسے صیہونیت کو ایک تصور سے ایک فاتح سیاسی ادارے میں تبدیل کرنے میں زبردست کامرانیاں حاصل ہوئیں ۔ فلسطین کی سرزمین کے متعلق اس نے جو نقشہ پیش کیا، وہ اس لحاظ سے انکشاف انگیز ہے کہ اس میں ہرزل کی روح بول رہی ہے :

> معلوم ہوتا ہے کہ خداوند نے فلسطین کی سرزمین کو اس لیے چٹانوں اور دلدلوں اور ریت سے ڈھانپ دیا ہے تاکہ اس کے حسن کی نقاب کشائی (صرف) وہ لوگ کر سکیں جو اس کی محبت و الفت سے سرشار ہیں اور جو اس کے (رستے) زخموں کا مداوا کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں گے ۔[1]

---

[1] شائم ویزمان "Trial and Error" ویزمان کی خود نوشت سوانح حیات مطبوعہ ہارپر اینڈ رو نیویارک ، ۱۹۵۹ء، صفحہ نمبر ۳۷۱

تاہم یہ کلمات ایک ایسے موقعہ پر کہے گئے تھے، جب ایک متموّل غیر حاضر جاگیردار (لبنان کا سرسک[1] خاندان) نے ایک ویران، اجاڑ دلدلی قطعۂ زمین کو، جس کے سرسبز ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، صیہونیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ویزمان اقرار کرتا ہے کہ یہ مخصوص قطعۂ زمین فلسطین کا کچھ حصہ تو ضرور تھا لیکن کسی بھی اعتبار سے یہ اس کا کوئی بڑا حصہ نہیں تھا۔ لیکن جو تاثر وہ دیتا ہے، اس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا یہ سارے کا سارا علاقہ بیکار پڑا تھا، کوئی اس کی قدر نہیں کرتا تھا اور جیسے کسی نے صحیح انداز سے سمجھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کے باوجود جو فلسطین میں آباد تھے، اسے (فلسطین کو) کارآمد بنانا تھا، اس کی قدر کرنا تھا، اور اسے اس قابل بنانا تھا کہ اسے صحیح انداز سے سمجھا جا سکے۔ کسی عجیب و غریب طریقے سے یہ باور کر لیا گیا کہ وہ تاریخ کے ہم رکاب نہیں رہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ وہ حقیقتاً وہاں موجود ہی نہیں۔ اگر آپ ویزمان کی مندرجہ ذیل عبارت پر جس میں اس نے فلسطین کے ۱۹۰۷ء کے کوائف بیان کیے ہیں، جب اس نے پہلی مرتبہ وہاں کا سفر اختیار کیا تھا ذرا غور فرمائیں گے کہ اس نے گزشتہ عدم توجہی، سہل انگاری اور بے چارگی

---

[1] سرسک خاندان، یہ بیروت کا ایک نہایت ہی متموّل خاندان ہے۔ بیروت کا ایک خاصا بڑا بازار اسی کے نام پر ہے۔ لبنان کے کئی دوسرے خاندانوں (ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل تھے) کی طرح اس خاندان کی بھی فلسطین میں کافی زمینیں تھیں جو انہوں نے صیہونیوں کے ہاتھ فروخت کر دیں اور یوں بالواسطہ صیہونیت کے فروغ میں ممد ثابت ہوا۔ مسلمانوں میں صائب سالم (لبنان کا ایک سابق وزیر اعظم) اور کئی دوسرے سیاسی خاندانوں نے بھی یہی حرکت کی تھی۔

کا موجودہ (وہ یہ عبارت ۱۹۴۱ء میں تحریر کر رہا تھا) "فضا اور ترقی پسندانہ جذبے" کے ساتھ جس طرح موازنہ پیش کیا ہے، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مقصد غیر ملکی نو آبادیوں اور بستیوں کی تعمیر کا جواز ڈھونڈنا ہے

مجموعی طور پر یہ وحشت ناک اور تیرہ و تاریک ملک تھا، یوں تو ساری کی ساری ترکی سلطنت کے (امور و مسائل کے) متعلق بے توجہی اور اغماض برتا جاتا ہے لیکن یہ خطۂ زمین تو اس سلطنت کا ایک ایسا گوشہ تھا، جس پر سرے سے کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی لے اس کی کل آبادی چھ لاکھ سے کچھ زیادہ تھی، اس میں تقریباً اسی ہزار یہودی تھے، موخرالذکر زیادہ تر شہروں میں رہائش پذیر تھے۔ لیکن جہاں تک توانائی، فضا، رنگ و روپ اور ترقی پسندانہ جذبے کا تعلق ہے، تو نہ تو نو آبادیاں اور نہ شہری بستیاں ہمارے زمانے کی نو آبادیوں اور بستیوں سے کوئی میل کھاتی تھیں ۲ے۔

ایک مختصر المیعاد فائدہ یہ ہوا کہ "صیہونیت" نے زمین ..... کی

لے ویزمان یہاں "بے توجہی اور اغماض" کے الفاظ مقامی باشندوں کے سلسلے میں استعمال کرتا ہے۔ ان باشندوں کا فلسطین میں رہائش پذیر ہونا اس امر کا کافی ثبوت نہیں تھا کہ یہ کوئی آباد خطۂ زمین تھا۔ ویزمان کی نظروں میں تو یہ محض ایک غیر آباد علاقہ ہے جو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ ایک ایسی قوم کی آمد کا منتظر تھا جو اس کی مناسب انداز سے دیکھ بھال کر سکے۔ (مصنف)

۲ے شائم ویزمان: "Trial and Error" صفحہ نمبر ۱۲۵۔

قیمت میں اضافہ کر دیا ۔" اور اگرچہ سیاسی اعتبار سے زمین عربوں کے پاؤں تلے سے کھسکائی جا رہی تھی ، (وقتی طور پر) وہ خوب منافع کما سکتے تھے ۔

ویزمان یہودیوں کو تلقین کرتا ہے کہ عربوں کی بے توجہی ، درماندگی ، پیرانہ سالی اور خستہ حالی کے مقابلے میں یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ہمت اور قوتِ ارادی کو بروئے کار لائیں ، اپنے آپ کو منظم کریں تاکہ زمین کی بحالی کی جا سکے اور اسے (غاصبوں کے قبضے سے) "چھڑایا" جا سکے۔ اس کا اندازِ بیان خطیبانہ تھا اور اس میں سارا زور اس بات پر صرف کیا جاتا تھا کہ یہودی ہر کام رضاکارانہ طور پر کریں ۔ وہ قوتِ ارادی اور نئے خون کی جو آئیڈیالوجی پیش کر رہا تھا ، اس کے پرچار کے لیے اس نے صیہونیت کے لیے وہی زبان (اور بعد ازاں حکمتِ عملیاں) ہتھیالی تھی جو یورپی نو آباد کار مقامی پسماندگی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے استعمال کرتے تھے۔" اس ملک میں نیا خون لانا پڑا تھا ۔ مہم جوئی کا نیا جذبہ متعارف کرانا پڑا تھا۔" یہودیوں نے نو آبادیوں کے تصورات درآمد کرنے اور آباد کاروں کے فرائض سرانجام دینا تھے ان آباد کاروں کا کام محض یہ نہیں تھا کہ وہ ایک علاقے کو اپنی تحویل میں لے لیں بلکہ انہیں یہودیوں کے اپنے قومی احیا کی درسگاہیں بھی بننا تھا ۔ چنانچہ اگر فلسطین ایک ایسا خطہ تھا جو "عظیم امکانات سے بھرپور تھا" تو پھر سوال پیدا ہوا کہ اس حقیقت کا کیا کیا جائے کہ (یہودیوں میں) "قوتِ ارادی کا فقدان تھا" مسئلہ یہ تھا کہ " اس قوتِ ارادی کو بیدار کیسے کیا جائے ؟ ایک ایسے عمل کو جس میں سبھی شریک ہوں ، کیسے شروع کیا جائے ؟" قریب تھا کہ صیہونی ہمت ہار بیٹھتے لیکن انہیں جس چیز نے قطعی حوصلہ شکنی سے بچایا ، وہ ویزمان کے بقول محض " ہمارا یہ احساس تھا کہ قوت و توانائی کا ایک عظیم سرچشمہ موجود ہے

جو اس بات کا منتظر ہے کہ کوئی آئے اور اسے صحیح مصرف میں لائے ـــــ
یہ سرچشمہ ایک قوم کی یہ اضطراری آرزو تھی کہ وہ واقعی ایک قوم کی حیثیت اختیار
کرے لیکن تاریخی طریقہ کار کی گم کردہ راہ تعبیر و تشریح نے اس آرزو کو عارضی طور پر
پابہ زنجیر کر رکھا تھا۔"[1] جس طریقہ کار کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، وہ
صہیونیوں کا یہ میلان تھا کہ وہ روتھ چائلڈ جیسے عظیم غیر ملکی محسنوں پر زیادہ انحصار
کرتے تھے (کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر یورپی طاقتوں کو اس بات
پر آمادہ کریں گے کہ فلسطین یہودیوں کا وطن قرار دے دیا جائے اور یوں ان
کے حوالے کر دیا جائے) اور خود سرزمین (فلسطین) پر خود کفیل نوآبادیاتی
اداروں کی تعمیر اور نشوونما سے "اغماض" برتتے تھے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے تو ایک سکیم وضع کی
جائے اور پھر اس سکیم پر صحیح معنوں میں عمل کی صورت نکالی جائے تاکہ فلسطین کو
"اغماض" کی موجودہ کیفیت سے نکال کر ایک یہودی مملکت میں تبدیل کیا جائے۔
اس سکیم کے تحت ارض فلسطین پر نئے حقائق کا ایک جال ـــــ ایک
زبان، نئی بستیوں کا ایک پُر پیچ سلسلہ، نئی تنظیموں کا ایک سلسلہ ـــــ
بچھایا جانا تھا۔ نئے حقائق کے اس جال نے موجودہ "حقائق" کو اتنا اپنی یلغار
میں نہیں لیا تھا جتنا کہ انہیں نظرانداز کرنا تھا، ان کے دوش بدوش پھلنا پھولنا تھا
اور یوں جب اس کے پنجے پھیل جاتے) پھر ایک دن انہیں صفحۂ ہستی سے ناپید
کر دینا تھا، بالکل ایسے ہی جیسے عظیم الجثہ درختوں کا ایک جنگل گھاس بات کے
ایک چھوٹے سے قطعے کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ اس قسم کے پروگرام (کو

---

[1] شائم ویزمان TRIAL AND ERROR
صفحات نمبر ۲۹-۱۲۸، ۲۵۳ -

پایۂ تکمیل تک پہنچاتے) کے لیے ایک بڑی نظریاتی ضرورت یہ تھی کہ اس کا کوئی (قانونی) جواز تلاش کیا جائے۔ (چنانچہ اس کے لیے سوچا یہ گیا کہ) لے اثریات[1] اور غائیت[2] کے علاقوں میں لپیٹ دیا جائے تاکہ مقامی ثقافت کو جو ابھی تک فلسطین میں مضبوطی سے پاؤں جمائے ہوئے تھی، مکمل طور پر نرغے میں لے لیا جائے اور ایک لحاظ سے اسے فرسودہ اور دقیانوسی قرار دے دیا جائے۔ اعلان بالفور جس تصور کے پیش نظر منظر عام پر لایا گیا تھا، اس کی غایت یہ تھی کہ یہودیوں کا ایک قومی وطن تشکیل دیا جائے۔ ویزمان نے اس تصور میں یہ ترمیم کی کہ "تشکیل" کی جگہ "قیام نو" اس کا مقصد ٹھہرایا۔ اس نے یہ جن وجوہ کی بنا پر کیا، ان میں سے ایک بلاکم وکاست یہ تھی کہ اس علاقے کو ایسی امکانی حقیقتوں میں محصور کر دیا جائے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے قدیم ترین اور انتہائی دور تک پہنچنے والی ہوں۔ فلسطین کو جس انداز سے نوآبادی بنایا جا رہا تھا، اس کے پیچھے یہ نکتہ کام کر رہا تھا کہ "ہم" تو محض ایک "حقیقت کی تکرار" کر رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیں کہ یہودی (ان کے اپنے موقف کے مطابق) ایک دیسی معاشرے کی اکھاڑ پچھاڑ کرنے، اسے نیست ونابود کرنے یا اسے تتر بتر کرنے اور یوں اس کی جگہ خود قابض ہونے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ (ان کی نظروں میں تو) یہ معاشرہ بذات خود ایک عجوبہ تھا کہ اس نے فلسطین پر ساٹھ سال

---

[1] اثریات (Archaeology): عہد عتیق کے آثار، از قسم قبور، عمارات، آلات، ظروف وغیرہ کی تلاش اور ان کا مطالعہ، تاکہ اس زمانے کی تہذیب، ثقافت، رسم ورواج کے متعلق حتمی رائے قائم کی جا سکے۔ [2] غائیت (Teleology): علم کی وہ شاخ جو مطالعہ کرتی ہے کہ کائنات کے تمام تغیرات کس غایت یا مقصد سے واقع ہوتے ہیں۔ اس غایت کی مدد سے خود مظاہر فطرت کی بھی تشریح کی جاتی ہے۔

یہودی اقتدار اعلیٰ کے سانچے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور یوں دو ہزار سال تک یہ اقتدار اعلیٰ معطل رہا تھا۔ تاہم یہودیوں کے دل و دماغ میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ اسرائیل ہمیشہ وہیں (یعنی فلسطین میں) قائم چلا آرہا ہے۔ اور یہ ایک ایسی واقعیت تھی جس کا ادراک مقامی باشندوں کے لیے دشوار تھا۔ چنانچہ یہودیوں نے ارضِ فلسطین کی اصلی شکل و صورت بحال کی، اسے (غیروں اور غاصبوں کے) پنجے سے چھڑایا، اپنے عہدرفتہ کی تکرار کی، اسے دوبارہ سرسبز و شاداب کیا، اس کے پوشیدہ امکانات کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے اور اس میں یہودی سیادت قائم کی۔ اسرائیل کے قیام کی غایت یہ تھی کہ یہاں ان حالات کو بحال کر دیا جائے جو کسی زمانے میں یہاں موجود تھے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں جو نئے حالات پیدا کیے گئے وہ یہودیوں کے ان پُراسرار آباؤ اجداد کی نسبت جو پہلی صدی میں بقید حیات تھے، اپنے طریقوں اور کامرانیوں میں انیسویں صدی کے یورپی سامراجیوں سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔

یہاں یہ ضروری ہے کہ ایک بات کی بالخصوص وضاحت کر دی جائے۔ فلسطین پر یہودی اقتدارِ اعلیٰ کی "بحالی" کے لیے جتنے بھی منصوبے بنائے گئے، وہ ہمیشہ دو بنیادی عناصر پر مشتمل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ پُر احتیاط عزم تھا کہ یہودیوں نے اپنی حالت بہتر بنانا ہے۔ اس کے متعلق لامحالہ دنیا بہت کچھ سن چکی ہے۔ یہودیوں کو اپنی شناخت کا نیا احساس دلانے، ان کا دماغ کرنے، شہریوں کی حیثیت سے انہیں حقوق دلانے (علی زر بن یہودہ[1]

---

[1] قدیم یہودیوں کی زبان عبرانی تھی۔ انجیل مقدس کی زبان بھی یہی تھی۔ تاہم امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس زبان کا استعمال متروک ہو گیا اور یہ دنیا کی مردہ زبانوں میں شمار (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی کوششوں کے ذریعے) ایک قومی "وطنی" زبان کا احیاء کرنے، تمام دنیائے یہود کو اپنی نمو اور اپنے تاریخی مقدر کا اہم احساس دلانے کے لیے زبردست اقدامات کئے گئے۔ چنانچہ "صیہونیت ان کے لیے ایک ایسا وسیلہ تھی جس کی طرف وہ رجوع کر سکتے تھے، وہ ایک ایسا وسیلہ تھی جو انہیں ایک نئی زندگی (کے تصور) میں منہمک کر سکتا تھا"۔ صیہونیت یہودیوں کے لیے ایک درس گاہ تھی ——— اور اس کا معلمانہ فلسفہ مدام بالکل واضح، ڈرامائی اور ذہانت سے بھرپور دکھائی دیتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود صیہونیت کا ایک عنصر اور بھی ہے اور جدلیاتی طور پر یہ پہلے عنصر کا حریف ہے۔ یہ عنصر صیہونیت کے عین قلب میں موجود ہے لیکن (اس امر کے باوجود کہ فلسطینیوں کو اس کا بلاواسطہ تجربہ ہوا ہے) اس کے وجود سے ہمیشہ آنکھیں چرائی گئی ہیں۔ یہ وہ عنصر ہے جس نے یہودیوں اور فلسطین کے

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۴۷: ہونے لگی۔ انیسویں صدی کے دوران میں جب صیہونیوں کو اپنی قومیت کا احساس ہوا تو ضروری سمجھا گیا کہ اس زبان کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ اس کے احیاء کے لیے جن لوگوں نے کوششیں کیں، ان میں سرفہرست نام ایلیزر بن یہودہ کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص اپنے نظریات و عقائد میں اتنا متشدد تھا کہ اس نے اپنے بیوی بچوں کو بھی یہ حکم دے دیا کہ وہ ان سے عبرانی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں کلام نہیں کرے گا۔ یوں اس زبان کے احیاء کی تحریک شروع ہو گئی اور آہستہ آہستہ بے شمار یہودیوں کو اپنے دائرے میں شامل کرتی گئی۔ آج کل عبرانی نہ صرف اسرائیل کی سرکاری زبان ہے بلکہ ادنیٰ اور اعلیٰ تمام تعلیمی درسگاہوں میں ذریعہ تعلیم بھی ہے۔

غیر یہودیوں کے مابین ایک دیوار کھڑی کردی ہے۔ یہ دیوار مضبوط بھی ہے اور اس کی تعمیر میں بڑی ذہانت اور دانائی کا بھی مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس دیوار کے ایک طرف جو یہودی ہیں وہ تمام فوائد سے مستفید ہو رہے ہیں اور دوسری طرف جو غیر یہودی ہیں، ان کے حصے میں فائدہ تو ایک بھی نہیں آیا (البتہ بعد میں عقوبت و سزا کے چکر میں انہیں ضرور ڈال دیا گیا)۔

صیہونی پروگرام کی (اس) دوشاخی تقسیم کے نتائج و عواقب فلسطین اور بالخصوص ان عربوں کے حق میں، جنہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اسرائیل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے انتہائی بھیانک انداز سے مترتب ہوئے ہیں۔ فلسطین کے متعلق صیہونیوں کے خیالات یہودیوں کے حق میں ——— ان معنوں میں کہ ان کی غرض و غایت یہودیوں کی خبر گیری کرنا اور غیر یہودیوں کو نظر انداز کرنا تھی ——— اتنے موثر ثابت ہوئے ہیں کہ عربوں کے نزدیک ان خیالات کا جو مفہوم بنتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے عربوں کو محض مسترد کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ (انہیں) اسرائیل بذات خود ایک منفی وجود نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی تعمیر اس لیے کی گئی ہے تاکہ عربوں کو یا تو بالکل بے دخل کر دیا جائے اور یا پھر انہیں مطیع و محکوم بنا لیا جائے۔ چنانچہ ایک قوم اور ایک معاشرے کی حیثیت اسرائیلی اور اسرائیلیوں کی داخلی معصومیت، استواری اور پیوستگی ایسی چیزیں ہیں جو عام طور پر عربوں کے پلے نہیں پڑتیں۔ چنانچہ صیہونیت نے جو دیواریں چنی تھیں، ان میں مزید اضافہ یہ ہوا ہے کہ خود عربوں نے بھی اپنے اور یہودیوں

ے شائم وزیہ مان "Trial and Error" صفحہ نمبر ۱۳۴۔

کے مابین ایسی دیواریں تعمیر کر لی ہیں جن کی اساس عربیت کے تصور پر رکھی گئی ہے اور اس تصور پر وہ مذہبی عقیدے کی سی پختگی کے ساتھ یقین رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر اسرائیل لفاظی کا وہ آلہ ہے جو مغرب نے عربوں کو عاجز کرنے کے لیے فراہم کیا ہے۔ (عربوں کے) اس ادراک کا عرب ممالک میں یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ وہاں جبر کی پالیسیاں اپنائی گئی ہیں اور ایک طرح سے لوگوں کے خیالات پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں۔ سالوں ادیبوں، صحافیوں اور مصنفین پر یہ پابندی رہی کہ وہ اپنی نگارشات میں اسرائیل کا نام بھی نہیں لے سکتے۔ قدرتی طور پر اس قسم کے سنسر شپ کا انجام یہ ہوا کہ پولیس ریاستیں^۵ مستحکم ہو گئیں، آزادیٔ اظہار کا فقدان رہا، حقوق انسانی کی مٹی پلید ہوئی اور انہیں پاؤں تلے کچل ڈالا گیا۔ مفروضہ طور پر ان تمام خرابیوں اور برائیوں کا جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ "ہم اسرائیلی جارحیت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں"۔ سیدھے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اندرونِ ملک ہر قسم کا ظلم و جور قابلِ قبول ہے کیونکہ اس سے "قومی سلامتی" کے "مقدس فریضہ" کو ادا کرنے میں مدد ملتی تھی۔

صیہونیت جس نسلی علیحدگی کی پالیسی پر گامزن ہے، اس کے نتائج و عواقب (خود) اسرائیل اور اسرائیلیوں کے لیے بھی ہر جگہ مساوی طور پر تباہ کن ثابت ہوئے

---

۵ پولیس ریاست یا پولیس سٹیٹ، اس قسم کی استبدادی مملکت کو کہتے ہیں جہاں ایسی پولیس کو کنٹرول حاصل ہو جو سیاست میں ملوث ہو۔ صدر فلیلنسیو باتستا کے تحت کیوبا میں ایسا ہی نظام حکومت قائم تھا۔ ۱۹۵۹ء میں فیدل کاسترو نے ختم کیا۔

ہیں۔ ہر وہ شے جو رذیل ہے ڈراؤنی ہے، خلافِ عقل ہے، اجڈ یا گنوار ہے عربوں کو اس کا مترادف قرار دیا گیا۔ قومی ادارے ـــــــ اجتماعی زرعی فارم (کبتز)، قانونِ واپسی، تارکینِ وطن کے لیے اپنے آپ کو نئے ماحول اور نئی ثقافت میں ڈھالنے کی سہولتیں ـــــــ جن کی انسانیت پسندانہ اور معاشرتی (بلکہ سوشلسٹ بھی) خوبیاں یہودیوں پر آشکار تھیں اور جو انہیں فلسطین (یا بعد میں اسرائیل) آنے کی تحریک دیتے تھے، عربوں کے معاملے میں صحیح معنوں میں اور بڑی استقامت کے ساتھ سنگدلی اور شقاوت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اپنے جسم اور روح وجود میں، ان جذبات اور نفسیات میں، جو مبینہ طور پر ان سے منسوب کیے جاتے تھے، عرب ہر اس چیز کی نمائندگی کرتے تھے، جس کا صیہونیت سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا، جو اس سے بعید تھی، اور جو اس کی رسائی سے دور تھی۔

میرا خیال ہے کہ عربوں نے اسرائیل کو تسلیم کرنے سے جو انکار کیا، اس میں وہ سوفسطائیت اور پیچیدگی نہیں تھی جتنی کہ اس انکار میں، جو بعد میں اس کوشش میں تبدیل ہو گیا کہ عربوں کی موجودگی کو زیادہ سے زیادہ گھٹا کر پیش کیا جائے، پائی جاتی ہے جو اسرائیل نے عربوں کے وجود کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں کیا۔ نہ صرف یہ کہ صیہونیت انیسویں صدی کے یورپی استعمار کی صورت تو تھی کیونکہ اپنے تمام افکار کے معاملے میں ان دونوں میں زبردست مماثلت تھی، بلکہ اس کی غرض و غایت ایک ایسے معاشرے کی تخلیق بھی تھا جو "مقامی" تو ہو سکتا ہے[1] اور کچھ نہیں

[1] کسی ملک کی ثقافت کے اصل مراکز اس کے بڑے بڑے شہر (metropolitan cities) تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ملک کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ یہ اس بات پر تُلی ہوئی تھی کہ جن مقامیوں کی یہ اکھاڑ پچھاڑ کر رہی تھی اور ان کی جگہ نئے "مقامیوں" (جو بنیادی طور پر یورپی تھے) کو آباد کر رہی تھی، ان (یعنی اصلی مقامی) کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ اس (صہیونیت) نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ اصلی مقامیوں کی جگہ بیرونی "مقامیوں" کی آبادکاری کا کام کفایت شعارانہ انداز سے کیا جائے گا اور عربوں کو یہ قطعاً موقعہ نہیں دیا جائے گا کہ وہ اسرائیلی معاشروں میں کسی طرح بھی نفوذ کر سکیں۔ اور اگر عربوں نے راہ فرار اختیار نہ کی اور فلسطین میں ہی مقیم رہے تو انہیں فرمانبردار، اطاعت شعار محکوموں کی طرح رہنا ہوگا۔ اور وہ چیز یا شخص جو وہاں اس لیے مقیم رہا کہ وہ اسرائیل کو للکار سکے، تو اس کے متعلق یہ رائے قائم نہیں کی گئی کہ وہ وہاں موجود ہے، بلکہ اسے ایک ایسی چیز کی علامت تصور کیا گیا جس کا اسرائیل سے کوئی تعلق نہیں بنتا، جو اسرائیل سے باہر ہے اور صہیونیت اسے باہر سے نیست و نابود کرنے پر تلی رہی۔ یہاں پر صہیونیت نے لغوی طور پر اس علم انواع [1] کو اختیار کر لیا جو یورپی ثقافت نے استعمال کی تھی کہ منوب

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۵۰: باقی علاقوں کی ثقافت کو قصباتی یا دیہاتی قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ صہیونیت نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس کے مطابق ہر جگہ کے، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، باشندوں کو اپنی تعمیر و ترقی اور اپنی ثقافت کی ترویج کے لیے "مقامی" طور پر مواقع فراہم کرنا تھا۔ ان "مقامی" جگہوں کا بڑے شہروں سے تعلق واسطہ کم سے کم ہوتا تھا۔ یہاں مصنف صہیونیت کے یہی خدوخال بیان کر رہا ہے۔

[1] علم انواع (Typology) انواع، بالخصوص ان انواع کا مطالعہ، جنکا ذکر انجیل میں کیا گیا ہے

کو ایک بھیانک اور ڈراؤنے مشرق کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس میں صرف ایک استثناء تھا اور وہ یہ کہ صہیونیت ایک پیش قدم[1] نجات بخش مغربی تحریک کی حیثیت سے مشرق کا مشرق میں سامنا کر رہی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ "تکمیل شدہ" صہیونیت عربوں کے متعلق بالعموم اور فلسطینیوں کے متعلق بالخصوص کیا کہتی تھی، اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل تحریر میں نظر آجاتی ہے جو "معارف"[2] کے ۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں مطبوعہ مضمون سے اخذ کی گئی ہے۔ اس مضمون کے مصنف کا نام ڈاکٹر اے۔ کارل باخ ہے۔ یہ شخص کوئی دریدہ دہن اور ناکندہ تراش شعلہ بیان اور فتنہ انگیز مقرر نہیں تھا، بلکہ (اسرائیل کا) ایک ممتاز شہری تھا۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ اسلام صہیونیت کا مخالف ہے۔ اپنے اس استدلال میں وہ فلسطینیوں کی گنجائش نکال لیتا ہے:

"یہ سوب اسلامی ممالک نہ تو غربت کے نخچیر ہیں، نہ بیماری کے، نہ ناخواندگی کے اور نہ استحصال کے۔ وہ تو صرف بدترین عذاب الٰہی[3] ــــــ اسلام ــــــ میں مبتلا ہیں۔ جہاں کہیں اسلامی نفسیات کا سکہ چلتا ہے، وہاں ناگزیر طور پر استبداد اور مجرمانہ جارحیت کا چلن ہے۔ خطرہ اسلامی نفسیات میں مضمر ہے کہ یہ اپنے آپ کو اعلیٰ کارکردگی اور ترقی کی دنیا کے ساتھ مربوط نہیں کر سکتی تاکہ یہ التباس اور فریب نظر کی دنیا میں رہتی ہے کہ اس پر

---

[1] پیش قدم (Avant Garde) ادیبوں، فنکاروں، فنون لطیفہ یا کسی بھی دوسرے علم سے وابستہ اشخاص کا وہ گروہ، جو اپنے زمانے میں جدت آمیز اور نئے نئے خیالات پیش کرنے میں مہارت اور شہرت رکھتا ہو۔

[2] اسرائیل کا ایک اخبار

[3] نقلِ کفر، کفر نہ باشد (مترجم)

احساس کمتری اور خبطِ عظمت[1] کے دورے پڑتے رہتے ہیں اور یہ دورے اس کا ذہنی سکون برباد کیے رکھتے ہیں، کہ یہ مقدس شمشیر کے خوابوں میں گم رہتی ہے۔ وہ چیزیں، جو خطرے کی گھنٹیاں بجاتی رہتی ہیں، یہ ہیں: دنیا کے متعلق مسلمانوں کا تصور یہ ہے کہ یہاں ہمہ گیر آمرانہ[2] طرزِ حکومت رائج کیا جائے۔ قتل و غارتگری کا جذبہ ان کے خون میں رچا بسا ہے۔ ان میں منطق کا فقدان ہے۔ عرب نہایت آسانی سے آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اور رمعاً ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ شیخی خور ہیں اور بہت ڈینگ لیتے ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر یہ کہ ان تمام چیزوں کو، جو مہذب دنیا کے نزدیک مقدس ہیں، نہایت بے حرمتی کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔۔

۔۔۔۔۔۔ کوئی چینز کوئی بات لے لیں، ان کا ردِ عمل ہمیشہ عقل اور شعور سے تہی دامن ہوگا۔ سبھی کے سبھی مسلمان جذباتی، ذہنی اعتبار سے غیر متوازن، فوری ردِ عمل کا اظہار کرنے والے، کور عقل اور کند ذہن ہیں۔ وہ اپنے حلق سے جو باتیں نکالتے ہیں، ایسی باتیں صرف پاگل اور جنونی ہی ہمیشہ کر سکتے ہیں۔ آپ ہر شخص، یہاں تک کہ شیطان سے بھی کام کی بات کر سکتے ہیں، لیکن اللہ (تعالیٰ) سے نہیں[3]۔۔۔۔۔۔ اس

---

[1] خبطِ عظمت (megalomania) ایک نفسیاتی کیفیت جس میں انسان دولت، اختیارات اور عظمت کے خواب دیکھتا ہے۔

[2] ہمہ گیر آمرانہ طرزِ حکومت (Totalitarian rule) ایک ایسی حکومت جو آمرانہ طرز پر کام کرے اور اسے آئینی، قانونی، سیاسی، اقتصادی، ذہنی، اخلاقی اور ہر قسم کی دیگر سرگرمیوں کے متعلق لامحدود اختیارات حاصل ہوں۔ [3] نقلِ کفر، کفر نہ باشد (مترجم)

علاقے کا ایک ایک ذرہ پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے ۔ یہاں بڑی ثقافتیں ظہور پذیر ہوئیں اور ہر قسم کے حملہ آور یہاں وارد ہوئے ان سب نے، یہاں تک کہ صلیبیوں نے بھی یہاں اپنی ثقافت کی نشانیاں چھوڑیں اور ان کی یہ ثقافتیں یہاں پروان بھی چڑھیں لیکن جہاں جہاں اسلام نے قدم دھرے، وہاں درخت بھی سوکھ گئے۔[1]

جب ہم تصویر بگاڑ دیتے ہیں اور موضوع زیر بحث کو محض اسرائیل اور اس کے ہمسایوں کے مابین سرحدی جھڑپوں تک محدود کر دیتے ہیں، تو ہم جرم کے ساتھ گناہ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سچائی ہے ہی نہیں۔ آویزش کا مرکزی نقطہ سرحدوں کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ مسلم نفسیات کا مسئلہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مزید برآں مسئلے کو اس طرح پیش کرنا گویا کہ یہ دو مماثل اجزاء کے مابین آویزش کا مسئلہ ہے، عربوں کو دعویٰ کا ایک ایسا ہتھیار فراہم کرتا ہے، جو ان کا ہے ہی نہیں۔ اگر ان کے ساتھ بحث حقیقتاً سیاسی نوعیت کی ہو تو دونوں فریقین کو اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر ہم یوں دکھائی دیں گے گویا ہم ایک ایسے ملک میں چلے آئے ہیں جو کہ سراسر عرب تھا۔ گویا کہ ہم نے اسے فتح کیا اور ایک غیر ملکی قوم کی حیثیت سے ان کے مابین اپنے پنجے گاڑ لیے، ہم نے ان پر پناہ گزینوں کا بوجھ لاد دیا اور عسکری اعتبار سے ان کے لیے

---

[1] فلسطین کے متعلق "اغماض" کا جو مشاہدہ ویزمان نے کیا تھا، کارل باخ کا قارورہ اسی سے جا ملتا ہے۔ برائے بحث ہم یہ مفروضہ قائم کر سکتے ہیں کہ اگر ویزمان کبھی بعد میں اپنے خیالات قلم بند کر رہا ہوتا، وہ بھی تقریباً اسی قسم کی باتیں کہتا جو کارل باخ نے کہی ہیں۔ (مصنف)

خطرہ بن گئے وغیرہ وغیرہ ...... اس یا اس فریق کو حق بجانب ٹھہرایا جا سکتا ہے ــــ اور مسئلے کو اگر اس سوفسطائی اور سیاسی انداز سے پیش کیا جائے، تو یورپی اذہان کے لیے قابل فہم بن جاتا ہے ــــ لیکن اس کی قیمت ہمیں چکانا پڑتی ہے۔ عرب اپنے دعاوی کو ایک قانونی تنازعہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور یوں ان کا نقطۂ نظر آسانی سے اہل مغرب کے پلے پڑ جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت ہم سے بہتر کون اس بات سے آگاہ ہے کہ انہوں (عربوں) نے جو مخاصمانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس کا ماخذ یہ نہیں؛ وہ جو سیاسی اور معاشرتی تصورات پیش کرتے رہتے ہیں، ان کے کبھی بھی اپنے نہیں تھے اور نہ ہیں۔ وہ قبضہ، جو ہتھیاروں کے بل بوتے پر کیا جائے، اسے نہ ان کی اپنی نظروں میں اور نہ اسلام کی نظروں میں کبھی ناانصافی کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس یہ تو اس بات کا عملی مظاہرہ ہے اور اس بات کی سند ہے کہ قبضہ مستند اور قابل اعتبار ہے۔ ان کے ہاں اس امر کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ پناہ گزینوں کے ساتھ، اپنے ان بھائیوں کے ساتھ جنہیں بے دخلیوں سے دوچار ہونا پڑا، افسوس کا اظہار ہی کر دیا جائے، ہمدردی کے دو بول ہی کہہ دیئے جائیں۔ یہ تو اللہ کی مرضی تھی، اسی نے انہیں نکالا اور وہی ان کی نگہداشت کرے گا۔ اس قسم کی چیزوں سے کوئی مسلمان سیاست دان کبھی ٹس سے مس نہیں ہوا اور نہ کبھی اس کا دل پسیجا ہے (ہاں اس قسم کی مصیبت غلطی اس کے اپنے ذاتی مقام و مرتبہ کو خطرے میں ڈال دے تو

دوسری بات ہے)۔ اگر کوئی پناہ گزیں نہ بھی ہوتے اور ہم نے کوئی فتوحات حاصل نہ بھی کی ہوتیں تب بھی وہ اسی طرح ہماری مخالفت پر کمر بستہ ہوتے۔ ایسے سفاک اور تند خو لوگوں کیساتھ مغربی تصورات کی اساس پر بات چیت کرکے ہم انہیں انصاف کا یورپی لبادہ پہنا دیں گے۔

"عرب رویوں" کے متعلق جو اسرائیلی مطالعات ——— ایک مثال جنرل ہرکابی کی ہے، جس نے سرکاری طور پر منظور شدہ ایک "مستند مطالعہ پیش کیا تھا[1] ——— شائع ہوتے رہتے ہیں، ان میں اس

---

[1] ہرکابی (Yohoshafat Harkabi) "اسرائیل کیمتعلق عرب رویے"، (مطبوعہ: کی ٹر پریس، یروشلم ۱۹۷۲ء) ہرکابی فوجی جاسوس ادارے کا سربراہ تھا۔ وہ ۱۹۵۹ء تک اس عہدے پر فائز رہا کر وزیراعظم بن گوریان نے اسے برطرف کردیا۔ بعدازاں وہ عرب امور کے ماہر کی حیثیت سے عبرانی یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوگیا اور اسرائیل میں عربوں اور خاص طور پر فلسطینیوں کے خلاف جو پراپیگنڈہ کیا جاتا تھا، وہ اس کا سب سے بڑا پرچارک تھا۔ اس نے اس ضمن میں "فلسطینی اور اسرائیل" (کی ٹر پریس، یروشلم ۱۹۷۴ء) کے عنوان سے ایک زہر آلود کتاب لکھی اور مدتوں اسرائیلی سفارت خانہ اسے امریکہ میں مفت تقسیم کرتا رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہرکابی نے حال ہی میں ایک زبردست قلابازی کھائی ہے اور وہ ان لوگوں میں شامل ہوگیا ہے جنہیں "امن کی فاختائیں" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس حیثیت سے وہ اب اس تحریک کا حمایتی بن گیا ہے جو اسرائیل میں PEACE NOW کے نام سے بعض لوگوں نے چلا رکھی ہے۔ (مصنف)

قسم کے تجزیوں (جس قسم کا تجزیہ کارل باخ نے سپرد قلم کیا ہے) پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ کارل باخ جیسے لوگوں کے تجزیے اتنے طلسمی اور نسلی پرستانہ ہیں کہ فلسطینیوں کا شاذونادر ہی ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ تاہم عربوں کو تمام انسانی خصائص سے محروم کرنے کی روش، جس کا آغاز اس نقطہ نظر سے ہوا کہ اوّل تو فلسطینی (فلسطین میں) سرے سے موجود ہی نہیں اور اگر موجود بھی ہیں، تو پھر وہ بالکل تندخو اور سفاک ہیں یا پھر یہ دونوں ہی باتیں صحیح ہیں، اسرائیلی معاشرے کے رگ و پے میں پوری قوت کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ کے دوران میں فوجی دستوں میں ایک کتابچے (جسے مرکزی کمان کے ربّی ابراہام الویدان نے تحریر کیا تھا اور جس کا دیباچہ اسی کمان کے جنرل یونا الفراتی نے رقم کیا تھا) کی تقسیم کو کوئی غیر معمولی بات تصور نہیں کیا گیا۔ منجملہ دیگر باتوں کے، اس کتابچے میں مندرجہ ذیل کلیدی عبارت بھی شامل ہے

> جنگ، تعاقب یا حملے کے دوران میں جب بھی ہمارے فوجی دستوں کا سامنا شہری باشندوں سے ہو اور اس بات کے متعلق یقین سے کچھ نہ کہا جا سکتا ہو کہ وہ ہمارے خلاف جوابی کارروائی کے معاملے میں معذور ہیں، تو انہیں ہلاک کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہلاخا[1] معیاروں کے مطابق تو انہیں لازماً ہلاک کر دینا چاہیے۔ کسی صورت میں بھی کسی عرب باشندے پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے خواہ وہ اپنے متعلق یہ تاثر ہی کیوں نہ دے کہ وہ بہت مہذب اور شائستہ انسان ہے[2]

---

[1] ہلاخا (HALAKAH) یہودی قوانین و روایات کا مکمل مجموعہ اس میں توریت اور زبانی روایات بھی شامل ہیں۔

[2] یہ عبارت اسرائیل کے جریدے Haolam Hazeth نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بچوں کا ادب جری اور دلیر یہودیوں کے (کارناموں) پر مشتمل ہوتا ہے جو انجام کار فرو تر، دغاباز اور ناقابلِ اعتبار عربوں کو، جن کے نام مجنون (مخبوط الحواس)، بندورہ (ٹماٹر) یا مکرہ (فردام) جیسے ہوتے ہیں، "جہنم واصل" کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ روزنامہ "ہارٹیز" (مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۴ء) کے ایک مصنف نے تحریر کیا تھا، بچوں کی کتابیں "ہمارے اپنے موضوعات کے متعلق ہوتی ہیں، یعنی ان میں ان عربوں کا ذکر ہوتا ہے جو یہودیوں کو اپنی تفریح کے لیے قتل کرتے ہیں اور ان میں خالص یہودی لڑکوں کے کارناموں کی تفصیل دی جاتی ہے جو بزدل خنزیر کو شکست دیتے ہیں۔" اس قسم کے جوشیلے خیالات صرف انفرادی مصنفین تک محدود نہیں جو کثیر الاشاعت کتابیں تحریر کرتے ہیں بلکہ، جیسا کہ میں بعد ازاں یہ ثابت کروں گا کہ اس قسم کے خیالات منطقی طور پر کم و بیش ان اداروں (کی سوچ) کے مرہونِ منت ہیں جنہیں خود مملکت نے قائم کر رکھا ہے۔ ان اداروں کا دوسرا کام یہ ہے کہ (اور یہ کام یہودیوں کے لیے بہت فیض رساں ہے) کہ وہ یہودیوں کی زندگیوں میں انسان دوستی کے تقاضوں کے مطابق باقاعدگی پیدا کریں۔

اس ثنویت[1] کی کامل مثالیں خود وزمان کی تحریروں میں بکثرت موجود ہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۵۳: اپنی ۱۵ مئی ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں نقل کی تھی۔ اس جریدے کے مدیر یوری ایونیری Avnery نے ایک کتاب بعنوان "Israel Without Zionism: Aplea for Peace in the Middle East" (میکملن پبلشنگ کمپنی نیویارک، ۱۹۶۸ء) تحریر کی ہے۔ یہ کتاب دلچسپ بھی ہے اور قدرے فتنہ انگیز بھی لیکن اس قابل ضرور ہے کہ اسکا مطالعہ کیا جائے۔ اس کتاب میں موشے دیان جیسے لوگوں پر بڑی زہریلی تنقید کی گئی ہے۔ موشے دیان کے متعلق ایونیری کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر "عرب جنگجو" ہے۔ سبحان اللہ

[1]: ثنویت (duality) دورنگی۔

جس نے اس قسم کے معاملات کو فوری طور پر اپنی پالیسی، عمل اور تفصیلی نتائج میں اہم مقام دیا۔ وہ سیموئیل پیفس نر[1] (Pevsner) کی تحسین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پیفس نر "عظیم صلاحیتوں سے مالا مال، پُرجوش توانا، باعمل، باتدبیر اور اپنی اہلیہ کی مانند ایک انتہائی تعلیم یافتہ انسان تھا" اس تعریف و توصیف سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اور نہ ہمیں اس پر کوئی اعتراض ہے۔ لیکن ویزمان دم لیے بغیر[2] اس کے فوراً بعد اچانک یہ جملے تحریر کرتا ہے: "اس قسم کے لوگوں کا فلسطین کی طرف کوچ کرنا درحقیقت ایک معاشرتی ویرانے کی طرف رُخ کرنا تھا اور یہ وہ بات ہے جسے ان لوگوں کو ذہن نشین کر لینا چاہیے جو آج فلسطین کا رُخ کر رہے ہیں اور جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے تعقلی، ثقافتی اور معاشرتی وسائل یورپی دنیا کے وسائل سے کسی لحاظ سے بھی کم تر نہیں ہے[3]۔ پیش منظر میں صرف صہیونیت تھی اور باقی ہر چیز پس منظر میں۔ چنانچہ لازم یہ تھا کہ (صرف صہیونیت کی تعریف و تحسین کی جائے اور) جو چیزیں پس منظر میں تھیں، انہیں مطیع و محکوم کیا جائے۔ انہیں سات پردوں میں چھپا کر رکھا جائے اور کسی صورت بھی منظر عام پر نہ آنے دیا جائے، ان کی تحقیر کی جائے تاکہ ثقافتی تحصیل کا پیش منظر (یعنی صہیونیت) یوں نظر آئے کہ "تہذیب سے روشناس کرنے والی اولین کوشش صرف یہی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مقامی عربوں کو ناقابل علاج حریف بنا کر پیش کیا جائے، وہ ایک ایسی چیز ہیں جو سفاکی و

۱۔ پیفس نر: ایک روسی نژاد یہودی رہنما۔

۲۔ ویزمان: "Trial and Error": صفحہ نمبر ۱۳۰

۳۔ ایضاً صفحہ نمبر ۱۸۸

خونخواری اور مافوق الفطرت انسانیت کا ملغوبہ ہے، اور کچھ نہیں تو بہرحال وہ ایک ایسی ہستی ضرور ہیں جس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ناممکن (چنانچہ لاحاصل) ہے۔

عرب مناظرے کے ماہر اور مجادلے کے بادشاہ ہیں اور اس حد تک کہ اس معاملے میں ایک عام تعلیم یافتہ یورپی ان سے قطعاً کوئی لگا نہیں کھا سکتا۔ اور جب تک فریق مخالف اس تکنیک پر پوری طرح دسترس حاصل نہیں کر لیتا، وہ بڑے خسارے میں رہتا ہے۔ عربوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انہیں آپ کے اپنے خیالات کے قطعاً برعکس خیالات کو گھما پھرا کر نہایت نفاست اور شائستگی سے ادا کرنے کا اتنا زبردست ملکہ حاصل ہے کہ آپ کو یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ پوری طرح متفق ہیں اور فوری طور پر آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے آمادہ۔ عربوں کے ساتھ بات چیت اور مذاکرات کا ڈول ڈالنا صحرا میں سراب کے پیچھے بھاگنے سے کسی طور مختلف نہیں۔ سراب جو دیکھنے میں جاذب نظر اور دلفریب، امیدوں اور امنگوں سے بھرپور نظر آتا ہے، لیکن امکان یہی ہے کہ وہ انجام کار آپ کو پیاسا ہلاک کر دے گا۔

براہ راست سوال پوچھنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس سے عرب کو نہایت مہارت کے ساتھ پیچھے ہٹنے اور موضوع کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کی ترغیب ملے گی۔ پھر آپ لاکھ سر پٹکیں، موضوع کے قلب تک رسائی آپ کے لیے ناممکن ہو جائے گی اور اگر آپ یہ رسائی حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو آپ

کو اس کیلئے لامتناہی عرصہ درکار ہوگا۔[5]

ایک دوسرے موقع پر وہ اپنے ایک تجربے کا ذکر کرتا ہے اور حقیقتاً یہی وہ تجربہ ہے جو تل ابیب کی تولید کا موجب بنا۔ ایک یہودی مرکز کی حیثیت سے اس نے زیادہ تر حیثیت اس بنا پر حاصل کی ہے کہ اس سے متصل (لیکن کہیں قدیم) عرب قصبے جافہ کو بالکل بے اثر اور بے وقعت بنا دیا گیا ہے۔ تاہم ویزمان اپنے قاری کو جو کچھ بتاتا ہے، اس میں اس حقیقت کی طرف ایک بالکل خفیف سا اشارہ ملتا ہے کہ عرب اس مقام پر، جس کے متصل مستقبل میں تل ابیب کو بسایا جاتا تھا، پہلے ہی موجود تھے۔ (اس کے نقطۂ نظر کے مطابق) اہم بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہودیوں کی موجودگی وجود میں لائی جائے۔ اس موجودگی کا جو فائدہ ہے، اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، وہ خود ہی اظہر من الشمس ہے:

> میں جافہ میں قیام پذیر تھا کہ ایک روز رُوپاں مجھ سے ملنے چلا آیا۔ وہ مجھے گھمانے پھرانے قصبے کے شمال میں ریت کے ٹیلوں کی طرف لے گیا۔ جب ہم پوری طرح اس علاقے میں داخل ہو گئے جہاں ہر طرف ریت ہی ریت تھی ______ مجھے یاد ہے کہ ہمارے پاؤں پنڈلیوں تک ریت میں دھنسے جا رہے تھے ______ تو وہ رک گیا اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا کہ ہم یہاں ایک یہودی شہر بسائیں گے۔ اس کی بات سُن کر میرا دل بیٹھنے لگا اور میں اس کے منہ کی طرف تکنے لگا۔ اس

---

[5] ویزمان Trial and Error صفحہ نمبر ۲۱۶-۲۱۵

ویرانے میں جہاں گھاس کی ایک پتی بھی نہیں اگتی ، لوگ رہائش کرنے کیوں آئیں گے ؟ میں نے اس پر تیکنیکی نوعیت کے سوالات کی بھرمار کر دی ، وہ نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ میرے ان سوالات کے صحیح صحیح جوابات دینے لگا اس نے مجھے بتایا کہ تیکنیکی اعتبار سے ہر چیز ممکن ہے ، اگرچہ چند ابتدائی سالوں کے دوران میں نئی بستی کے ساتھ مواصلات کا سلسلہ قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں چند در چند دشواریاں پیش آئیں گی لیکن بہت جلد وہاں کے مکین مالی اور اقتصادی طور پر خود کفالت حاصل کریں گے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں گے ۔ جافہ کے یہودی ایک نئے اور جدید شہر میں منتقل ہو جائیں گے اور قرب و جوار کی یہودی بستیوں کو اپنی زرعی پیداوار اور صنعتی مصنوعات کے لیے ایک مرکزی مارکیٹ میسر آ جائے گی ۔ شہر کے عین مرکز میں ایک جمنازیم[1] تعمیر کیا جائے گا اور فلسطین کے دوسرے علاقوں سے طالب علم یہاں کشاں کشاں چلے آئیں گے ، بلکہ وہ یہودی ماں باپ بھی ، جو غیر ممالک میں رہائش پذیر ہیں لیکن اپنے بچوں کو ایک یہودی شہر کے ایک یہودی سکول میں تعلیم دلانے کے خواہش مند ہیں ، انہیں یہاں بھیجنے میں کوئی عار محسوس نہیں کریں گے ۔

چنانچہ یہ رویا تھا جس نے سب سے پہلا تل ابیب کا

---

[1] ہمارے ملک میں جمنازیم اس عمارت یا کمرے کو کہتے ہیں جہاں جمناسٹک اور بعض دوسری کھیلیں منعقد کی جاتی ہیں ۔ تاہم بعض یورپی ممالک بالخصوص جرمنی میں ، جمنازیم اس ہائی سکول کو بھی کہتے ہیں جو یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے خواہش مند طلبا تیار کرتا ہے ۔

خواب دیکھا۔ ہاں وہی تل ابیب جس کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا تھا کہ وہ اتنی وسعت اختیار کرے گا اور اقتصادی اعتبار سے اتنی ترقی کرے گا کہ جافہ کا قدیم قصبہ اس سے کوسوں پیچھے رہ جائے گا اور یہی وہ شہر تھا جس نے بحیرہ روم کے مشرقی ساحل پر واقع خطے میں ایک اہم مرکزی شہر بننا تھا۔ [۲]

البتہ امتدادِ زمانے کے ساتھ ساتھ تل ابیب کی اہمیت اس لیے بھی دو چند ہو جاتا تھی کہ جافہ کو فوجی تسخیر کا نشانہ بننا تھا۔ یہ خیالی منصوبہ بعد ازاں پورے ملک کی عسکری تسخیر کے لیے پہلی سیڑھی ثابت ہوا۔ نوآبادی کے تصورنے بعد ازاں جب عملی صورت اختیار کی اور اس میں حقیقت کے رنگ بھرے گئے تو حقیقتاً ایک نوآبادی وجود میں آگئی۔ پھر آباد کار بھی آدھمکے، اور جن لوگوں کو نوآبادیات کے شکنجے میں جکڑے جانا تھا، وہ بھی وہاں پہنچ گئے۔

بجا کہ وینمان اور روپاں اپنے گفتار و کردار میں پہل قدم قائدین کی پرجوش عینیت سے سرشار تھے۔ تاہم ان کی گفتار اور ان کے کردار میں ان اہلِ مغرب کا تحکم بھی پایا جاتا تھا جو ایک ایسے خطے اور اس کے مقامی باشندوں کا سروے کرنے پر مامور تھے جو ان کے خیال کے مطابق ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے

---

[۱] تل ابیب کی تعمیر ۱۹۰۶ء میں عمل میں آئی۔ یہ اسرائیل کا نہ صرف سب سے بڑا شہر ہے بلکہ کافی عرصہ ملک کا صدر مقام بھی رہا۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد اسرائیلی حکومت تو بیت المقدس منتقل ہو گئی لیکن عربوں کے احتجاج کے پیشِ نظر اکثر ممالک کے سفارتخانے اب بھی اسی شہر میں کام کر رہے ہیں۔ یہ شہر اسرائیل کا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے۔ آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔

[۲] وینمان "Trial and Error" صفحہ نمبر ۱۳۰

تھے اور اب یہ ان (اہل مغرب) کا کام تھا کہ ان (مقامی باشندوں اور ان کے وطن) کے مستقبل کے خاکے بھی مرتب کریں۔ وائزمان محض یہ نہیں سوچتا تھا کہ یہ فیصلے کرنے کے لیے کہ مقامی باشندوں کے بہترین مفادات[1] کیا ہیں؟، وہ (ان کی نسبت) بہتر صلاحیتوں اور بہتر علم سے بہرہ ور ہے بلکہ اسے اس بات کا بھی پختہ یقین تھا کہ وہ یہ بھی خوب اچھی طرح "سمجھتا" ہے کہ عرب اصل میں ہیں کیا؟ جب وہ یہ کہتا تھا کہ "درحقیقت" عربوں کی "بے پایاں صلاحیت" بس اتنی ہے کہ وہ کبھی سچی بات نہیں بتائیں گے، تو دراصل ان خیالات کی جگالی کر رہا تھا جو دنیا کے بعض دوسرے ممالک کے مقامی باشندوں کے متعلق دوسرے اہل یورپ ظاہر کرتے رہتے تھے کہ صیہونیوں کی طرح ان اہل یورپ کا بھی مسئلہ یہی تھا کہ نسبتاً مٹھی بھر نڈر، پہل قدمی پسند وسیع اکثریت کی حامل مقامی آبادی کو کس طرح اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔

یہاں آپ یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ احمقانہ حد تک ناکافی فوجوں کی مدد سے ہم آخر کس طرح ان نسلوں کو، جو اتنی توانا اور قابل ہیں، جو اس قدر ذہنی اور جسمانی خوبیوں سے لیس ہیں، کس طرح اپنے قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ ایک عام افریقی کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں میں دو خامیاں پائی جاتی ہیں۔ میں یہ دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی پہلی بڑی خامی یہ ہے کہ ان میں دیانت کا خلقی فقدان ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مقابلتاً شاید ہی کبھی کسی افریقی کو کسی دوسرے

---

[1] مثلاً وہ یہ سمجھتا تھا کہ جافہ پر ایک جدید یہودی شہر کو سبقت حاصل ہونا چاہیئے۔ (مصنف)

افریقی پر اتنا اعتبار ہو گا کہ وہ اپنا وعدہ الفا کرے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔
چند بہت ہی نایاب مثالوں سے قطع نظر، یہ ایک حقیقت ہے
اگرچہ قابلِ افسوس ہے، کہ یورپی تہذیب کے ساتھ روابط قائم
ہونے کے بعد اس خامی میں اضافہ ہی ہوا ہے، تخفیف نہیں
آئی۔ ان کی دوسری خامی یہ ہے کہ ذہنی طور پر اس قابل ہی نہیں کہ
کسی بھی معاملے میں پہل کر سکیں، بس یوں سمجھیں کہ لکیر کے فقیر ہیں
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک انہیں باہر سے مجبور نہ کیا جائے،
مقامی باشندے اپنے جانے پہچانے اور گھسے پٹے طور
طریقوں سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔ یہ ذہنی کام چوری اور
کاہلی ان کے اذہان کی خصوصیت ہے[1]۔

مندرجہ بالا اقتباس ایک کتاب "مقامی نسلیں اور ان کے حکمران
(۱۹۱۸ء) سے لیا گیا ہے۔ اس کا مصنف سی۔ ایل۔ ٹمپل نائیجیریا پر حکومت
کرنے میں فریڈرک لوگارڈ کا ایک معاون تھا۔ ویزمان کی طرح وہ بھی اپنے
نقطۂ نظر کی رو سے لبرل فیبین[2] زیادہ تھا اور نسل پرست نازیوں کا نمونہ کم۔

---

[1] سی۔ ایل۔ ٹمپل "The Native Races and their Rulers" طبع ثانی۔
فرینک کیس (Cass) اینڈ کمپنی، لندن، ۱۹۶۸ء

[2] جارج برنارڈ شا، اینی بیسنٹ، سڈنی ویب اور چند دوسرے مفکرین نے ایک جماعت
فیبین (Fabian) سوسائٹی کے نام سے قائم کی تھی۔ یہ لوگ ایک قسم کا سوشلسٹ نظام
نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن انقلابی نہیں تھے۔ انہیں یہ تو پسند نہیں تھا کہ دولت اور صنعتوں کا
ارتکاز چند ہاتھوں میں ہو لیکن وہ سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت نہیں کرتے تھے اور نہ اسے
استحصال کے مترادف خیال کرتے تھے۔

ویزمان کی طرح ٹمپل کے نزدیک بھی اصل حقائق یہ تھے کہ جس ثقافت سے مقامی باشندوں کا تعلق تھا، وہ ساکت تھی، جامد تھی۔ جس دھرتی پر وہ رہتے تھے، چونکہ وہ اس کی قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر تھے چنانچہ ایک ترقی یافتہ یورپی ثقافت کو پہل قدمی کرنا پڑتی تھی اور ان مقامی باشندوں کو مہمیز کرنا پڑتی تھی بلکہ شاید ان کی اکھاڑ پچھاڑ بھی کرنا پڑتی تھی۔ ادھر ویزمان کو یقیناً اضافی فائدہ حاصل تھا۔ اسے ایک یہودی مملکت کی تشکیلِ نو کرنا تھی یہودیوں کو یہود دشمنی سے بچانا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے اس کی پشت پر عقلی توجیہات کا ایک انبار تھا۔ لیکن جہاں تک مقامی باشندوں کا تعلق ہے، ان کے لیے ابتداً یہ بات اتنی اہم نہیں تھی کہ نوآبادی میں ان کا واسطہ جن یورپینوں سے پڑا تھا، وہ انگریز تھے یا یورپی یہودی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ جہاں تک فلسطین میں صہیونیوں کا یا افریقہ میں انگریزوں کا تعلق ہے، دونوں ہی حقیقت پسند تھے۔ وہ حقائق کو دیکھتے تھے اور ان سے نپٹتے تھے، وہ سچائی کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے۔ اس "حقیقت" کے باوصف کہ غیر یورپی مدت مدید سے اپنے آبائی اوطان میں مقیم تھے، وہ سچائی سے ہمیشہ آنکھیں چراتے رہے۔ یورپی بصیرت کا مفہوم یہ بنتا تھا کہ اسے یہ کمال حاصل تھا کہ وہ نہ صرف جو کچھ وہاں موجود تھا، اسے دیکھ لیتی تھی، بلکہ جو کچھ وہاں "موجود ہو سکتا تھا"، اسے بھی بھانپ سکتی تھی۔ اسی بنا پر تو ویزمان اور رموپاں کے مابین جافہ اور تل ابیب کے متعلق مکالمہ ہوا۔ فلسطین میں صہیونیوں کو جو خصوصی ترغیب ملتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اس امکان پر یقین کرنے لگے تھے ـــــ اور اس امکان کو بروئے کار لانے کے لیے انہوں نے منصوبہ بندی کا آغاز بھی کر دیا تھا ـــــ کہ

مقامی باشندے وہاں حقیقتاً موجود نہیں ہوں گے اور لاریب اس امکان کا روبہ عمل اس وقت ثابت ہو گیا (۱) جب مقامی باشندوں نے فلسطین پر یہودیوں کی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور (۲) ۱۹۴۸ء کے بعد وہ اپنے ہی وطن میں خارجی (Outsider) قرار پائے۔

تاہم صیہونیوں کو جو کامیابی ہوئی، وہ محض اس بنا پر نہیں ہوئی کہ انہوں نے ایک مستقبل کی مملکت کے بارے میں ایک دلیرانہ خاکہ تشکیل دے لیا تھا یا ان میں یہ اہلیت تھی کہ وہ یہ بھانپ گئے تھے کہ مقامی باشندے اتنے قلیل التعداد ہیں یا قلیل التعداد بنائے جا سکتے ہیں کہ انہیں آسانی سے نظرانداز کر دیا جائے۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ عرب فلسطینیوں کی مزاحمت کے خلاف صیہونیوں کو جو اتنی مؤثر کامیابیاں حاصل ہوئیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے استعماری طاقتوں کی طرح محض ایک عمومی خواب (وژن) پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی پالیسی کو جزئیات سمیت بغور و فکر طے کیا۔ چنانچہ فلسطین صرف موعودہ سرزمین ہی نہیں تھا۔ (اگر موعودہ سرزمین صرف ایک تصور ہی ہوتی تو ہر دوسرے تصور کی طرح یہ تصور بھی محض ایک مجرد شے ہوتا اور یوں آسانی سے ذہنی گرفت میں نہ آسکتا)۔ بلکہ فلسطین (ان کی نظروں میں) ایک مخصوص علاقہ تھا اور بطور علاقہ اس کی اپنی مخصوص خصوصیات تھیں۔ چنانچہ اس کے ایک ایک انچ رقبے کی پیمائش کی گئی۔ پورا جائزہ لیا گیا اس پر بستیاں بسائی گئیں، اس کے لیے منصوبے وضع کیے گئے۔ اس پر تعمیرات کھڑی کی گئیں، وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ ہر کام جزئیات کی گہرائیوں تک کیا گیا۔ صیہونی نوآبادکاری کا عمل جب شروع ہوا، تو آغاز ہی سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ عربوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں اور نہ ان کے پاس

کوئی ایسی جوابی تجاویز تھیں جن کی تمام تفصیلات اور جزئیات طے کر لی گئی ہوں وہ یہ فرض کیے بیٹھے تھے (اور اپنے اس رویے میں وہ غالباً صحیح تھے) کہ چونکہ وہ اس سرزمین پر سکونت پذیر ہیں اور قانوناً اس کے مالک بھی ہیں، اس لیے یہ انہی کی ہے۔ تاہم جو بات وہ سمجھنے سے قاصر رہے، وہ یہ تھی کہ ان کی مڈبھیڑ ایک ایسے شعبۂ نظم سے تھی جو کسی چیز کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے اس کی تمام تفصیلات اور جزئیات کو پوری طرح کھنگالتا ہے اور یہ وہ شعبہ نظم تھا جس کی مدد سے ارض فلسطین پر ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں لایا جا سکتا تھا جو ابھی تک محض اذہان میں قائم تھی اور جس کی حیثیت محض خیالی تھی۔ کیسے؟ جزئیات طے کر کے اور ان پر صحیح معنوں میں عمل کر کے انچ انچ چلتے ہوئے، قدم قدم بڑھتے ہوئے، اور جیسا کہ ویزمان نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "ایک اور ایکڑ، ایک اور بکری"۔ (یعنی صیہونیوں نے چھوٹی سی چھوٹی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا، جو شے بھی ان کے ہاتھ آئی، خواہ وہ کتنی ہی حقیر اور معمولی تھی، انہوں نے اس پر قبضہ کیا اور پوری تندہی سے اپنے مقصد کے حصول میں لگے رہے)۔ (اس کے برعکس) فلسطینی عرب ایک عمومی پالیسی کی عمومی اصولوں سے مخالفت کرتے رہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ صیہونیت ایک غیر ملکی استعمار ہے (اور صحیح پوچھیں تو یہ واقعی ایک غیر ملکی استعمار تھا، خود اولین صیہونی اس کا اقرار کرتے تھے)، مقامی باشندوں کے متعلق اس کا رویہ غیر منصفانہ ہے (احد ہاعم جیسے اولین صیہونیوں نے اس کا بھی اقرار کیا ہے) اور وہ (فلسطینی عرب) یہ سمجھتے رہے کہ اپنی مختلف نظری کمزوریوں کے پیش نظر اس (صیہونیت) کا انجام فنا ہے۔ آج تک فلسطینیوں کا سیاسی مؤقف عام طور پر صرف انہی منفی رویوں کے گرد مجتمع رہا

ہے ۔ اور ابھی تک انہوں نے صہیونی مہم جوئی کی جزئیات کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے سلسلے میں کوئی خاص کوشش نہیں کی ۔ مثلاً اب تک مغربی کنارے پر صہیونیوں کی ستر (۷۰) غیر قانونی بستیاں تعمیر ہو چکی ہیں اور اسرائیل مغربی کنارے پر عربوں کی ملکیتی اراضی کا ستائیس فیصد ضبط کر چکا ہے ۔ تاہم اسرائیلی بستیوں کا یہ سلسلہ جو زلفِ یار کی طرح دراز تر ہوتا جا رہا ہے ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں میں عملی طور پر اتنی جسمانی سکت بھی نہیں رہی کہ وہ اسے روک سکیں ۔

فلسطینی یہ بات سمجھ نہیں پائے کہ صہیونیت محض ایک غیر منصف مزاج نوآبادیاتی آقا ہی نہیں (اس آقا کے خلاف تو آپ ہر نوع کی اعلیٰ عدالتوں میں اپیل کر سکتے تھے خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی برآمد نہ ہوتا) ، بلکہ اس سے کہیں کچھ زیادہ ہے ۔ صہیونیت نے جو چیلنج پیش کیا ہے ، وہ بھی ان (عربوں) کی سمجھ میں نہیں آپایا ۔ اس صہیونی چیلنج کی مختلف صورتیں ہیں ۔ وہ جزئیات کی پالیسی اختیار کرتے ہیں ، ادارے قائم کرتے ہیں ، تنظیمیں کھڑی کرتے ہیں ان کی معاونت سے (آج تک) لوگ غیر قانونی طور پر اس سرزمین پر وارد ہو رہے ہیں ، وہاں مکانات تعمیر کر رہے ہیں ، وہاں آباد ہو رہے ہیں اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ سرزمین ہماری ہے ـــــــ کُل عالم ان کی مذمت کر رہا ہے (لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے اور اپنا کام کیے جا رہے ہیں) ۔ ایک یہودی سرزمین پر آباد ہونے ، بلکہ ایک لحاظ سے اسے تخلیق کرنے کے جذبے کے پیچھے جو محرک قوت کام کر رہی ہے ، اس کی ایک جھلک اس دستاویز میں دکھائی دیتی ہے ، جس کے متعلق ویزمان کہتا ہے اور ٹھیک ہی کہتا ہے کہ " معلوم ہوتا تھا کہ اس میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کی

پیش بینی کی گئی ہے۔ اور سچ پوچھیں تو ہوا بھی یہی کچھ۔ اس دستاویز کا جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ عنوان تھا: "صہیونی تحریک کی امنگوں کے مطابق فلسطین میں یہودی نوآبادکاری کے پروگرام کا اجمالی خاکہ۔" یہ دستاویز، ۱۹۱۷ء کے اوائل میں منظر عام پر آئی اور اس قابل ہے کہ اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جائے:-

"سیادتی حکومت[1] (یعنی کوئی بھی حکومت، خواہ وہ اتحادیوں کی ہو یا دوسروں کی لیکن جس کا حکم یہاں چلتا ہو) فلسطین میں یہودیوں کی نوآبادکاری کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک یہودی کمپنی کی تشکیل کی اجازت دے گی۔ مذکورہ کمپنی براہِ راست سیادتی حکومت کے زیر تحفظ ہوگی (یعنی فلسطین میں جو کچھ بھی ہوگا، اس کے جائز ہونے کی سند مقامی باشندے نہیں بلکہ کوئی بیرونی طاقت عطا کرے گی)۔

اس کمپنی کے مقاصد مندرجہ ذیل ہوں گے:

۱۔ ہر ممکن طریقے سے فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ بستیوں کی دستگیری کرنا، انہیں تقویت پہنچانا اور انہیں پروان چڑھنے میں مدد فراہم کرنا۔

۲۔ دوسرے ممالک کے ان یہودیوں کی، جو فلسطین میں آباد ہونے کے آرزومند ہوں اور اس کام کے لیے موزوں بھی ہوں، امداد حمایت اور حوصلہ افزائی کرنا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ترکِ وطن

---

[1] سیادتی (Suzerain) حکومت، ایک غیر ملکی حکومت، جو مقامی امور کے متعلق اختیارات تو مقامی حکومت کے سپرد کر دیتی ہے لیکن دفاعی اور خارجی امور اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔

کے کام کو منظم کیا جائے گا، (ضروری) معلومات فراہم کی جائیں گی اور ہر قسم کی مادی اور اخلاقی امداد مہیا کی جائے گی۔

کمپنی کو ایسے تمام اختیارات حاصل ہوں گے جن کے ذریعے ملک کو زرعی، تجارتی، ثقافتی، صنعتی، غرضیکہ ہر لحاظ سے ترقی دیجا سکے ان اختیارات میں اراضی کی خرید، بالخصوص سرکاری اراضی کے حصول اور اس کی ترقی و نمو کا اختیار، شاہراہوں، ریلوے لائنوں، اور بندرگاہوں کی تعمیر کے حقوق، فلسطین میں مسافروں اور تجارتی سامان کو لانے اور انہیں باہر بھیجنے کے لیے جہاز راں کمپنیوں کے قیام کا اختیار، بلکہ ہر وہ اختیار شامل ہوگا، جو اس ملک کے دروازے یہودیوں کیلئے کھولنے کے سلسلے میں ضروری ہوگا [1]

اس غیر معمولی عبارت سے جن بین السطور عزائم کی نشاندہی ہوتی ہے، وہ ایسی تنظیموں کا قیام ہے جن کے فرائض بالکل وہی ہیں جو کسی ملک کی مسلح افواج کے ہو سکتے ہیں، کیونکہ صرف مسلح افواج ہی وہ تنظیم ہوتی ہیں جو آبادکاری کے لیے کسی ملک کا "دروازہ کھولتی ہے"، جو غیر ملکی علاقے میں بستیوں کے قیام کو منظم کرتی ہے، جو ترک سکونت، جہاز رانی، رسد (کی فراہمی) جیسے امور میں امداد پہنچاتی ہے اور ان کی ترقی و نمو میں ہاتھ بٹاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محض شہریوں کی کچھ اس طرح ماہیت قلب کرتی ہے کہ وہ نظم و ضبط کے خوگر "موزوں" ایجنٹوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں جن کا کام عین سرزمین پر عین موقع پر موجود ہونا اور وہاں اپنے

---

[1] ویزمان "Trial and Error": صفحہ نمبر ۱۵۲، ۵۷

مطلب کے ڈھانچے، تنظیمیں، اور ادارے قائم کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح افواج عام شہریوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں ______ وہ انہیں یونیفارم میں ملبوس کر دیتی ہیں، چالوں گھاتوں اور حربوں کی مشق کراتی ہیں اور اپنے ہر رکن کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے تربیت دیتی ہیں اور اس میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں ______ صیہونیت نے بھی یہی کچھ کیا۔ اس نے یہودی نو آبادکاروں کو یہودی مزدوروں اور یہودی کسانوں کی تنظیموں میں پرو دیا، انہیں جو یونیفارم پہنائی گئی (یعنی انہیں جس رنگ میں رنگا گیا) اس کا یہ تقاضا تھا کہ ان تنظیموں میں صرف یہودی ہی قابل قبول ہو سکتے ہیں اور وہی ان میں بار پا سکتے ہیں۔ صیہونی فوج کی قوت نہ اس کے رہنماؤں کی رہینِ منت تھی اور نہ ان ہتھیاروں کی جو یہ اپنی فتوحات اور اپنے دفاع کے لیے جمع کرتی تھی، بلکہ یہ اس سارے نظام کے روبہ عمل ہونے، مختلف مقامات کو اپنے قبضے میں لینے اور اس قبضے کو برقرار رکھنے اور وینمان کے الفاظ میں زراعت، ثقافت، تجارت اور صنعت کے میدانوں میں تھی۔ قصہ مختصر، صیہونیت نے جو یہ "جماعت" تشکیل کی' اس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف ذرائع کی امداد سے ایک نظریے اور ایک خواب کو عملی شکل دی جائے۔ یہ نظریہ، یہ خواب کیا تھا؟ یہی کہ عربوں کے اس علاقے کے عین قلب میں، جس کی پیمائش اور تعمیر و ترقی کا کام نیم دلی سے کیا گیا تھا، ایک یہودی نو آبادی قائم کی جائے، اس کی ترقی و نمو کی جائے اور اسے اپنے قبضے میں رکھا جائے۔

صیہونیت نے اپنی ترویج کے لیے جو آلۂ کار "جماعت" تشکیل کی، اگرچہ اس کی تاریخ بہت مسحور کن ہے لیکن یہاں ہم اس پر زیادہ خامہ فرسائی

نہیں کر سکتے تاہم اس کے طریقۂ کار کے متعلق کم ازکم چند باتیں ضرور توجہ کی مستحق ہیں۔ دوسری صیہونی کانگرس نے، جس کا اجلاس اگست ۱۸۹۸ء میں سوئٹزر لینڈ کے شہر بیزل میں منعقد ہوا تھا، ایک ادارہ "جیوش کولونیئل ٹرسٹ لمیٹڈ" کے نام سے قائم کیا۔ اس ادارے نے ۱۹۰۳ء میں فلسطین کے شہر جافہ میں اپنا ایک ذیلی ادارہ قائم کیا اور اس ذیلی ادارے کا نام "اینگلو پیلسٹائن کمپنی" تجویز ہوا۔ چنانچہ اس طرح ایک ایسی ایجنسی نے اپنے کام کا آغاز کیا، فلسطین کی کایا پلٹ کرنے میں جس کا کردار غیر معمولی طور پر اہم ثابت ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں "جیوش کولونیئل فنڈ لمیٹڈ" کے بطن سے ایک اور ادارے، "جیوش نیشنل فنڈ" نے جنم لیا تھا۔ اس فنڈ کو اراضی خریدنے اور اسے "یہودی قوم" کی امانت کے طور پر اپنی تحویل میں رکھنے کا اختیار تھا۔ ابتدائی تجویز کے الفاظ یہ تھے۔ جیوش نیشنل فنڈ یہودی قوم کی امانت ہوگا۔ اس کا سرمایہ صرف فلسطین اور شام میں اراضی خریدنے پر صرف ہوگا۔ "جیوش نیشنل فنڈ" ہمیشہ عالمی صیہونی تنظیم[۵] کی تحویل میں رہا اور اس کے ذریعے ۱۹۰۵ء میں اراضی خریدنے کے اوّلین سودے طے پائے۔

ایک کارگر ادارے کی حیثیت سے جیوش نیشنل فنڈ اپنے قیام کے روز اوّل ہی سے اراضی خریدنے، اسے پٹے پر لینے اور اسے ترقی دینے ـــــــ صرف یہودیوں کے لیے ـــــــ کے لیے موجود رہا ہے۔ جیسا کہ والٹر لہن[۶] نے بڑے باوثوق انداز سے یہ ثابت کیا ہے

---

[۵] عالمی صیہونی تنظیم: World Zionist Organization

[۶] میں نے والٹر لہن (Lehn) کے حوالے سے اوپر جو تفصیلات دی ہیں، وہ اس کے ایک مضمون "دی جیوش نیشنل فنڈ" سے اخذ کی گئی ہیں۔ یہ مضمون ایک جریدے "جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز" کی جلد سوم شمارہ نمبر ۴ (بقیہ اگلے صفحہ پہ ہے)

کہ صہیونیوں کی منزل یہ تھی کہ اراضی حاصل کی جائے تاکہ اس پر آبادکاروں کو بسایا جا سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے پہلے تو "جیوش نیشنل فنڈ" کی ایک ایجنسی کی حیثیت سے "پیلسٹائن لینڈ ڈیولپمنٹ کمپنی" کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں ایک اور ادارے "پیلسٹائن فونڈیشن فنڈ" کی تاسیس رکھی گئی۔ اس فنڈ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے ممالک کے یہودیوں کو ترک وطن کی ترغیب دی جائے اور انہیں فلسطین میں بسایا جائے۔ اور یہ دونوں کام بڑے منظم انداز سے کیے جانے تھے۔ اس کے ساتھ ہی زور اس بات پر دیا گیا کہ اراضی افراد کے نام پر نہیں خریدی جائے گی اور نہ وہ افراد کی ملکیت ہوگی۔ بلکہ اراضی کی خرید ایک ادارے کی

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۷۳: (گرما ۱۹۷۴ء) میں صفحات نمبر ۹۲-۴۷ پر شائع ہوا تھا۔ لمن کی تحقیقات نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اسی لیے میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ ۱۹۸۰-۱۹۷۷ء میں لسانیات کا پروفیسر والرلمن مقبوضہ مغربی کنارے پر اعلیٰ تعلیم کے واحد عرب ادارے بیرزیت یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ اس سال کے دوران میں لمن نے جیوش نیشنل فنڈ کے متعلق اپنی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے اس نے ۲ جنوری کو ایک کھلے خط پر دستخط بھی کیے۔ اسرائیلی فوجیوں نے دو فلسطینی طالب علموں کی بڑے ظالمانہ انداز سے زبردست پٹائی کی تھی اور بعد میں ایک طالب علم کو، جو اس پٹائی کے دوران میں بے ہوش ہو گیا تھا، ہسپتال میں داخل کرانا پڑا تھا۔ اس خط میں اسی پٹائی کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ مئی ۱۹۸۰ء میں دوسرے چھ پروفیسروں کے ساتھ مغربی کنارے کے فوجی حکام نے لمن کو بھی ورک پرمٹ دینے سے انکار کر دیا۔ کسی امریکی اخبار نے یہ خبر شائع نہ کی بہرحال جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز کی جلد ہفتم شمارہ نمبر ۴ (گرما ۱۹۷۸ء) میں نوری ڈیوس اور والرلمن کا مضمون پڑھا جا سکتا ہے (مصنف)

حیثیت سے پوری "یہودی قوم" کے نام پر ہو گی اور ایک ادارے کی حیثیت سے پوری "یہودی قوم" اس کی مالک ہو گی۔ اس صراحت سے یہ بات بھی یقینی ہو گئی کہ صیہونی مملکت ان معنوں میں دوسری تمام مملکتوں سے مختلف ہو گی کہ یہ اپنے ہی شہریوں کی مملکت نہیں ہو گی بلکہ یہ ایک پوری قوم کی مملکت ہو گی جس کے بیشتر افراد دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے پڑے تھے۔ اس رویے نے نہ صرف یہ کہ مملکت کے غیر یہودی باشندوں کو دوسرے درجے کے شہری قرار دے دیا بلکہ اس نے یہودی تنظیموں اور بعد ازاں مملکت کو اس قابل بنا دیا کہ انہیں اہم علاقائی مقبوضات کے علاوہ جن پر کسی مملکت کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، ان علاقوں کے (یہودی) باشندوں پر بھی، جو ان کی دسترس سے باہر تھے، اختیار حاصل ہو گیا جیسا کہ جان ہوپ سمپسن[ل] نے ۱۹۳۰ء میں کہا تھا کہ "وہ زمینیں بھی، جو "جیوش نیشنل فنڈ" نے حاصل کی تھیں، ملکی قانون کی دسترس سے باہر (extraterritorialized) قرار دے دی گئیں۔ اب ان زمینوں سے عرب نہ تو اب اور نہ آئندہ کبھی مستقبل میں کوئی فائدہ اٹھا سکتے تھے"۔ جہاں تک عربوں کا تعلق ہے، انہوں نے یہودیوں کی طرح ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ وہ بھی زمین کو افراد کی ملکیت سے نکال کر قوم کی ملکیت میں دے دیتے اور یوں ثابت کر دیتے کہ زمین پر حق صرف ادارے کا ہے افراد کا نہیں۔ انہوں نے یہ تک نہ سوچا کہ شاید ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت پیش آ جائے جو اراضی کو "عرب قوم" کے استعمال کے لئے "دائمی طور پر" اپنے قبضے میں رکھ سکے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مختلف

ل SAMPSON

طبقوں، فریقوں اور قوموں کی) حمایت حاصل کرنے کے لیے نہ تو معلومات اکٹھی کی گئیں اور نہ سرمایہ جمع کرنے کا کوئی بندوبست کیا گیا جس طرح کہ صیہونی امریکہ اور یورپ میں کر رہے تھے تاکہ وہ "یہودی" علاقے کو وسعت دے سکیں اور متناقض طور پر اسے ایک یہودی موجودگی اور ایک بین الاقوامی، قریب قریب مابعد الطبیعاتی، درجہ بخش سکیں۔ عربوں کا خیال تھا کہ زمین کا مالک ہونا اور اس پر موجود رہنا ہی کافی ہے اور یہ کتنا غلط خیال تھا۔

اس باریک بین اور دور اندیشانہ کوشش کے باوجود ایک مملکت کے طور پر اسرائیل کے قیام تک "جیوش نیشنل فنڈ" تقریباً پچاس سالوں کے دوران میں صرف نو لاکھ چھتیس ہزار دونم[1] اراضی حاصل کر سکا۔ یہ زیر انتداب فلسطین کا مجموعی رقبہ دو کروڑ تریسٹھ لاکھ تئیس ہزار دونم تھا۔ کچھ قلیل رقبہ یہودی مالکوں کے نجی قبضے میں بھی تھا۔ چنانچہ مل ملا کر فلسطین میں صیہونیوں کی زیر ملکیت اراضی کا کل رقبہ ۱۹۴۷ء کے اواخر تک سترہ لاکھ چونتیس ہزار دونم یعنی ملک کے کل رقبے کا محض ۶٫۵۹ فیصد تھا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد جب انتدابی حکام نے فلسطین میں یہودیوں کی ملکیت اراضی کو چند مخصوص خطوں تک محدود کر دیا، تب بھی ملک کے پینسٹھ فیصد علاقے میں، جو عربوں کے لیے محدود کر دیا گیا تھا، اراضی کی غیر قانونی خرید (وفروخت) جاری رہی۔ چنانچہ جب ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا گیا، تو وہ اراضی بھی، جو غیر قانونی طور پر یہودیوں کے قبضے میں تھی، اسے امر واقع شدہ (fait accompli) کے طور پر یہودی مملکت کی حدود میں شامل کر دیا گیا اور جب اسرائیل نے یہ اعلان کیا کہ اس نے ایک مملکت کی حیثیت اختیار کر لی ہے، تو ذخیرہ کن قوانین کے نفاذ

---

[1] ایک دونم کوئی چوتھائی ایکڑ کے برابر ہوتا ہے۔

کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان قوانین کے تحت عرب زمینوں کے وسیع و عریض قطعات (جن کے مالک پناہ گزیں بن چکے تھے اور جنہیں "غیر حاضر زمیندار" قرار دے دیا گیا تھا تاکہ ان کی زمینوں کو ہتھیایا جا سکے اور ان کی واپسی کے تمام امکانات کو ختم کیا جا سکے) کو ہڑپ کر لیا گیا اور انہیں "نیشنل جیوش فنڈ" کی تحویل میں دے دیا گیا۔ (عربوں کے نقطۂ نظر سے) انتقالِ اراضی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

"جماعت" کو جو "علاقائی کامیابیاں" حاصل ہوئی تھیں، ان کے نظریاتی اور انتہائی سیاسی معانی اس نزاعی بحث پر روشنی ڈالتے ہیں جو ۱۹۶۷ء (کی جنگ) کے بعد اس بارے میں شروع ہوئی تھی کہ اسرائیل کے زیرِ قبضہ عربوں کی اراضی کیسے ٹھکانے لگائی جائے۔ اسرائیلی آبادی کا ایک خاصا بڑا حصہ یہ یقین کرتا نظر آتا ہے کہ عربوں کی اراضی کو یہودی اراضی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کیونکہ آج سے دو ہزار سال قبل یہ اراضی (ارتیز اسرائیل کے جزو کے طور پر) یہودی اراضی تھی۔

(۲) کیونکہ جن زمینوں کے متعلق "لاپروائی" برتی گئی ہو یا انہیں "نظرانداز" کر دیا گیا ہو، ان کی ماہیت تبدیل کر کے انہیں یہودی قوم کی ملکیت بنانے کے لیے "جیوش نیشنل فنڈ" میں طریق کار موجود ہے[۱]

---

[۱] مثلاً ایک خاصے بڑے عرب گاؤں "ام الفحم" میں جو کچھ پیش آیا، اس پر غور فرمائیں۔ یہ گاؤں روڈز معاہدے کے تحت اردن کے شاہ عبداللہ نے ۱۹۴۹ء میں اسرائیل کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۹۴۸ء سے قبل اس گاؤں کا کل ملکیتی رقبہ ایک لاکھ چالیس ہزار دونم تھا اور آبادی پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ۱۹۷۰ء میں ام الفحم کے عرب باشندوں کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی لیکن ان کے زیرِ ملکیت (بقیہ آگے ہے)

جس زمین پر ایک مرتبہ یہودی بستیاں تعمیر ہو جائیں اور ان بستیوں میں لوگ آباد ہو جائیں، اور ایک مرتبہ یہ بستیاں ملکتی نظام میں پرو دی جائیں، تو وہ اپنی مناسب حیثیت کے اعتبار سے علاقائی قوانین کی دسترس سے باہر ہو جاتی ہیں، وہ جز و طریقے سے یہودی بن جاتی ہیں اور یوں اس زمین کی حیثیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ اب عرب زمین نہیں رہتی۔ اس نئی اراضی پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے چند اور عقلی توجیہات کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ان توجیہات کا تعلق حربی تقاضوں سے ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ اراضی اسرائیل کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ تاہم اگر یہ باتیں محض داخلی اسرائیلی تشویش کا مسئلہ ہوتیں اور ان باریک بین دلائل کا مقصد محض اسرائیل کے رائے دہندگان کو متاثر کرنا ہوتا، تو جذبات سے بالاتر ہو کر ان کا تجزیہ کیا جا سکتا تھا اور انہیں محض عجیب اور نرالے کہہ کر ان سے صرفِ نظر کی جا سکتی تھی

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۷۷: رقبہ صرف پندرہ ہزار دونم رہ گیا اور یہ رقبہ بھی زیادہ تر چٹانی اور اوریوں کاشتکاری کے اعتبار سے بے کار تھا۔ گاؤں کی بہترین اراضی مختلف "قانونی فرامین" بشمول "قانون اراضی، بیمہ و معاوضہ" کے تحت ضبط کر لی گئی۔ عظیم ترین ستم ظریفی غالباً یہ ہے کہ یہاں "مغید و" اور "جیوات اوز" کے نام سے دو "سوشلسٹ" "کبتز" (اجتماعی زرعی فارم) عربوں کی ضبط شدہ اراضی پر قائم کیے گئے اور جو اراضی ان کی دستبرد سے بچ گئی وہ "موشاف" یا "امداد باہمی کی زرعی انجمن" کے حوالے کر دی گئی۔

(مصنف)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں ان علاقوں کے عرب باشندوں کے مفادات سے ٹکراتی ہیں ——— جیسا کہ وہ ہمیشہ ٹکراتی رہی ہیں — اور تب انہیں ان (عرب باشندوں کے مفادات) پر واضح تفوق حاصل ہوجاتا ہے۔ تاہم نظری اور عملی اعتبار سے ان کی مؤثریت اس نکتے میں ہے کہ وہ اس علاقے کو کس طرح یہودی اور اس کے ساتھ ساتھ غیر عرب صفات سے متصف کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کی ایک ناقابلِ تردید شہادت اس تحریر میں موجود ہے جو جوزف ویٹز (Weitz) نے اس ضمن میں سپردِ قلم کی تھی۔ ویٹز ۱۹۳۲ء سے "جیوش نیشنل لینڈ فنڈ" کا ڈائریکٹر چلا آ رہا تھا ۱۹۶۵ء میں اس کے روزنامچے اور دوسری تحریریں "میری ڈائری اور بچوں کے نام خطوط" کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ اس کتاب کے مطابق اس نے ۱۹ دسمبر ۱۹۴۰ء کو لکھا:

جنگ (جنگ عظیم دوم) کے بعد ارض اسرائیل کا مسئلہ اور یہودیوں کا مسئلہ بھی اٹھایا جائے گا۔ اب تک یہ دونوں مسائل "ترقی و نمو" کے بنیادی سانچے کے اندر اٹھائے جاتے رہے ہیں لیکن جنگ کے بعد ان کی نوعیت تبدیل ہوجائے گی اور ہمیں "ترقی و نمو" سے کچھ آگے بڑھ کر سوچنا ہوگا۔ یہ بات بالکل واضح ہوجانا چاہیے کہ اس ملک میں دونوں قوموں کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ ہمیں اس چھوٹے سے ملک میں ایک آزاد قوم کی حیثیت اختیار کرنا ہے اور کوئی "ترقی و نمو" ہمیں اپنے اس مقصد کے قریب نہیں لاسکے گی۔ اگر عرب اس ملک سے

کوچ کر جائیں تو پھر یہی ملک ہمارے لیے وسیع وعریض بن جائے گا اور اس کی آغوش ہمارے لیے وا ہو جائے گی۔ لیکن اگر عرب یہیں ڈٹے رہے تو پھر یہی ملک تنگ اور فلاکت زدہ بن جائے گا۔ جب جنگ ختم ہو جائے گی اور انگریز فتح کے پھریرے لہراتے پھریں گے۔ اور جب منصفین قانون و انصاف کی کرسیوں پر براجمان ہو جائیں گے تو ہماری قوم کو ان کے سامنے اپنی درخواستیں، التجائیں اور دعاوی پیش کرنا چاہئیں۔ مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ ارض اسرائیل یا کم از کم مغربی ارض اسرائیل کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس اسرائیل میں ایک بھی عرب باشندہ نہیں ہوگا۔ اس نکتے پر کسی قسم کے سمجھوتے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ ارض اسرائیل پر یہودی مملکت کی تخلیق کے لیے زمین ہموار کرنے اور فضا ساز گار بنانے کے ضمن میں صہیونیوں نے جو جان توڑ مہم شروع کر رکھی ہے، وقت کے لحاظ سے اس کے نتائج نہایت شاندار اور عمدہ رہے ہیں۔ اس مہم کا ایک جزو "اراضی کی خرید" بھی تھا اور اس ضمن میں ہمیں جو کامیابی ہوئی ہے، اس پر ہم بغلیں بھی بجا سکتے ہیں

تاہم محض "اراضی کی خرید" سے اسرائیل کا قیام عمل میں نہیں لایا جا سکے گا۔ جس طرح (گناہوں سے) نجات فوری طور پر ملتی ہے (تصور مسیحا[1]

---

[1] مسیحا (مسیح): "عہد نامہ عتیق" میں اس مفہوم کی متعدد پیشین گوئیاں مندرج ہیں کہ خداوند ایک بادشاہ کو بھیجے گا جو یہودیوں کو نہ صرف ان کے گناہوں سے بلکہ ان لوگوں سے بھی جو ان پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں، نجات دلائے گا۔ اس بادشاہ کو "مسیح" (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کارازیہی ہے)، اس طرح یہ کام (تخلیقِ اسرائیل) بھی فوراً ہونا چاہیے۔ لیکن اس کام کو اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکتا جب تک عربوں کو یہاں سے ہمسایہ ممالک میں منتقل نہیں کر دیا جاتا اور یہ منتقلی بھی ان سب کی ہونا چاہیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ بیت اللحم، الناصرہ اور قدیم بیت المقدس کو چھوڑ کر ہمیں ایک بھی (عرب) گاؤں اور ایک بھی (عرب) قبیلہ یہاں رہنے نہیں دینا چاہیے۔ اس منتقلی کا رخ عراق شام بلکہ (مشرقِ اردن کی طرف ہونا چاہیے اس مقصد کے حصول کے لیے ہم روپیہ بے حساب روپیہ، اکٹھا کریں گے۔ ہم صرف اسی صورت میں کہ یہ منتقلی عمل میں آ جائے، اپنے لاکھوں کروڑوں بھائیوں کو یہاں کھپا سکیں گے اور یہودی مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اس مسئلے کے حل کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ (زور کے لیے الفاظ مصنف نے خط کشیدہ کئے ہیں۔)[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۸۰: "مسیحا" یا بحقوق "ظلِ الٰہی" کہتے ہیں ۔۔۔۔۔ وہ بادشاہ داؤد (علیہ السلام) کی آل میں سے ہوگا۔ وہ اپنی قوم کی خاطر مصائب جھیلے گا، لیکن اسے قوت و دولت سے بھی سرفراز کرے گا۔ یہودی اب بھی اس کا انتظار کرتے ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مسیح مانتے ہیں۔ وہ انہیں "کرائسٹ" کہتے ہیں جو دراصل "مسیح" کا یونانی ترجمہ ہے۔ (السٹریٹڈ ورلڈ انسائیکلوپیڈیا)

[1] جوزف وٹیز: مائی ڈائریز اینڈ لیٹرز تو چلڈرن "۔ (مساوات تل ابیب) جلد دوم صفحات نمبر ۲۸۰-۱۸۱

بعد میں جو کچھ پیش آنا تھا، یہ عبارت اس کے متعلق محض الہامی طور پر ہی پیشین گوئی نہیں کرتی بلکہ یہ ایک پالیسی بیان بھی ہے جو اگرچہ پیش تو وئیٹز کر رہا ہے لیکن در حقیقت تمام یہودیوں کا اجماع بھی اسی پر ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ صہیونیوں کے اس قسم کے بیانات اور تحریریں، جن کا آغاز ہرزل سے ہوتا ہے، سینکڑوں کی تعداد میں دستیاب ہیں اور جب "نجات" کی گھڑی آ پہنچی، تو یہی وہ خیالات تھے، جن کو پیش نظر رکھ کر صہیونیوں نے فلسطین اور عربوں کے اخراج کے منصوبوں پر عمل کیا۔
جنگ عظیم دوم کے اختتام اور اواخر ۱۹۴۸ء کے ما بین فلسطین میں جو شورشیں برپا ہوئیں اور جو ہنگامے ہوئے، ان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کیا پیش آ سکتا تھا اور کیا نہیں پیش آ سکتا تھا، اس کی پیچیدگیوں کے بغیر ہی وئیٹز کے خیالات روشنی کی ایک کرن فراہم کرتے ہیں اور ہمیں ان واقعات کو سمجھنے میں آسانی فراہم کرتے ہیں جو اس بات کی طرف کھلا کھلا اشارہ کر رہے تھے کہ ایک ایسی یہودی مملکت کا قیام عمل میں آنے والا ہے جس کے اصل عرب باشندوں کی بیشتر تعداد کو پناہ گزیں بنا دیا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کے عظیم واقعات کو، جس میں ایک نئی مملکت کی تولید شامل ہے، اور مملکت بھی وہ جو ناقابل یقین حد تک پیچیدہ اور کثیر الجہتی جد و جہد اور ایک بڑے پیمانے کی جنگ کے طفیل وجود میں آئی ہو، سیدھے سادے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کے متعلق کوئی عام فہم کلیے یا اصول گھڑے جا سکتے ہیں۔ میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں کہ میں یہ کام کرنے کا بیڑا اٹھاؤں، تاہم اس جد و جہد کا جو نتیجہ برآمد ہوا، میں اس سے بھی آنکھیں چرا نہیں سکتا اور نہ میں ان فیصلہ کن عناصر سے پہلو تہی کر سکتا ہوں

جو اس جدوجہد میں شریک تھے اور یا جو قیام اسرائیل کے روز اوّل ہی سے وہاں پالیسیاں بنانے پر مامور ہیں ۔ وہ حقیقت جو فلسطینیوں ——— اور صہیونیوں کے لیے ——— اہم ہے ، یہ ہے کہ وہ خطۂ زمین جہاں کسی زمانے میں عربوں کی بھرمار تھی ، جنگ (۱۹۴۸ء) کے بعد اس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ

(۱) وہ اپنے اصلی باشندوں سے خالی ہو گیا ۔

(۲) فلسطینیوں کا وہاں دوبارہ آنا ناممکن بنا دیا گیا ۔

صہیونیوں نے فلسطین کے حصول کے لیے جو نظریاتی اور تنظیمی تیاریاں کیں اور اس ضمن میں جو فوجی حکمت عملی اور حربے اختیار کیے ، ان میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ انہوں نے ایک خطے کو اپنی تحویل میں لینا اور اس میں نئے باشندوں کو بسانا ہے ۔ جیسا کہ صہیونی مورخین ، جون اور ڈیوڈ کمچے نے بیان کیا ہے ۔ "دلیت منصوبے" کا مقصد یہ تھا کہ فوجی اہمیت کی حامل ان چوٹیوں پر ، جو حملہ آور عرب فوجوں کی پیش قدمی کے امکانی راستوں پر واقع تھیں ، قبضہ کر لیا جائے اور برطانوی فوجوں کی واپسی کے بعد جو خلا پیدا ہوگا ، اسے اس طرح پورا کیا جائے کہ شمالاً جنوباً ایک ایسا علاقہ وجود میں لایا جائے جہاں یہودی بستیاں ایک دوسرے کے قریب قریب واقع ہوں مثلاً جیسے مقامات ، حافہ سے عکہ تک کا ساحلی علاقہ ، بیت

ے جون اینڈ ڈیوڈ کمشے (Kimche) "A Clash of Destinies: The Arab-Jewish War and the Founding of the State of Israel" (Praeger) ناشر پریگر

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

المقدس کے بعض حصے ، حیفہ کے عرب محلوں کا تو ذکر ایک طرف رہا ،
اور رام اللہ کے شہروں تک ، سبھی مقامات اور علاقے
صہیونیوں کی زد میں تھے - جہاں پہلے انگریزوں کی چوکیاں تھیں ، وہاں اپنی
چوکیاں قائم کر رہے تھے بلکہ وہ تو ان مقامات پر بھی پہنچ رہے تھے
جہاں خالصتاً عرب باشندے رہائش پذیر تھے - ولیمز کے الفاظ میں ان عرب
باشندوں کی "منتقلی" کی جا رہی تھی -

یہ جو اس قسم کے دعاوی بار بار لڑھکائے جاتے ہیں کہ فلسطین کے
باشندوں نے اس لیے ترک سکونت اختیار کی کیونکہ ان کے قائدین نے انہیں
ایسا کرنے کا حکم دیا تھا یا یہ کہ اسرائیل نے مئی ۱۹۴۸ء میں اپنی آزادی کا جو اعلان
کیا تھا ، حملہ آور عرب افواج نے اس میں دخل در معقولات کیا تھا تو ان کے
متعلق میں یہ نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ایک شخص بھی اس
قسم کے احکام کے بارے میں ذرہ برابر شہادت پیش نہیں کر سکا جن کے
نتیجے میں اتنا وسیع اور قطعی خروج عمل میں آیا۔[1] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۸۳ پبلشرز ، نیویارک ، سالِ اشاعت ، ۱۹۶۰ء)
صفحہ نمبر ۹۲ - یہاں ولید خالدی کے دو اہم مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں - ان
میں سے "سقوطِ حیفہ" ("The Fall of Haifa") "مڈل ایسٹ فورم" جلد نمبر ۳۵ ،
شمارہ نمبر ۱۰ (دسمبر ۱۹۵۹ء) کے صفحات نمبر ۳۲-۲۲ پر اور "Plan Dalet:
The Zionist Blue print for the Conquest of Palestine"
اسی جریدے کی جلد نمبر ۳۷ شمارہ نمبر ۹ (نومبر ۱۹۶۱ء) کے صفحات نمبر ۲۲-۲ پر شائع ہوا تھا -

[1] فلسطینی خروج کے متعلق اس زمانے کے ایک ایک عربی اخبار اور ایک ایک ریڈیو نشریہ
کے عمیق مطالعہ کے بعد جس بات کا انکشاف ہوتا ہے - وہ یہ ہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ نکلا کہ اگر ہم واقعی یہ سمجھنا چاہتے ہوں کہ ۱۹۴۸ء میں سات لاکھ اسی ہزار فلسطینیوں نے ترک وطن کیوں کیا تو پھر ہمیں اپنی توجہ کا مرکز کسی دوسری چیز کو بنانا ہوگا تاکہ ہم ان واقعات کی نہیں جو ۱۹۴۸ء میں معناً پیش آئے۔ بلکہ ان سے آگے جو امور آتے ہیں، ان کی بھی تہہ تک پہنچ سکیں۔ بلکہ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ خروج اس لیے ممکن ہوا کیونکہ صہیونیوں کی مؤثر کارروائیوں کے جواب میں فلسطینیوں نے اپنے جس ردِ عمل کا اظہار کیا، اس میں سیاسی اور تنظیمی سطحوں پر خاصی کمزوری پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان پر ناکامی دہشت اور خوف و ہراس کی نفسیاتی کیفیت بھی طاری تھی۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں مناحم بیگن اور اس کی دہشت پسند تنظیم "ارگن" کے ارکان نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا اور بالخصوص دیر یاسین گاؤں کے اڑھائی سو معصوم عرب باشندوں کے قتل عام جیسی جو بہیمانہ کارروائیاں سرانجام دیں، انہوں نے یقیناً

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۸۴: ۔ فلسطینیوں کو کسی شخص نے بھی یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ اپنا ملک چھوڑ دیں۔ زور جس بات پر دیا گیا، وہ یہ تھی کہ وہ اپنے وطن میں مقیم رہیں اور ترک سکونت بالکل نہ کریں۔ بدقسمتی سے انہیں میں خوف و ہراس کا نشانہ بنایا گیا وہ اتنا شدید تھا کہ غیر مسلح آبادی اس کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکی۔ ابراہیم لغود کی مرتبہ کتاب "The Transformation of Palestine" میں ارسکن چائلڈرز کا مضمون "The Worldless Wish, From Citizens to Refugees" کا مطالعہ بھی فرمائیں۔

چائلڈرز (Childers) کا تعلق آئرلینڈ سے ہے۔ جس زمانے میں اس نے تحقیقات کا کام کیا، وہ ایک آزاد و خود مختار (فری لانس) صحافی تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا اور پایا، وہ صیہونیت کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ ہے (مصنف)

اپنا اثر دکھایا لیکن اپنی تمام تر بہیمیت اور سفاکی کے باوجود دیر یاسین کا سانحہ اس قسم کے قتل عام کے بے شمار سانحات میں صرف ایک سانحہ تھا جو جنگ عظیم اوّل کے فوراً بعد وقوع پذیر ہونا شروع ہو گئے تھے اور جنہوں نے شعوری طور پر ایسے صہیونیوں کو جنم دیا جو اپنے آپ کو ان امریکیوں کے ہم پلہ قرار دیتے تھے جو مقامی ریڈ انڈین باشندوں کا قتل عام کیا کرتے تھے اور اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا کرتے تھے[۱] لیکن اغلباً اہم تر وہ تراکیب اور تنظیمیں تھیں، جو ان غیر مسلح عرب باشندوں کو دور باش رکھنے کے لیے وضع کی اور تشکیل دی گئیں، جو (اکثر و بیشتر صورت میں) ایک مرتبہ جنگ کی تباہ کاریوں اور سفاکیوں سے بچنے کے لیے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ گئے تھے[۲] ان کی روانگی سے قبل بھی اور ان کی روانگی کے بعد بھی صہیونیوں کے پاس عملی طور پر ان کی موجودگی کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرنے کے ذرائع تھے۔ ۱۹۴۰ء میں ویٹز کیا سوچتا تھا، اس کی ایک جھلک میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ یہاں اس کی کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ اس اقتباس میں وہ اس گفتگو کو پیش کر رہا ہے جو ۱۸ مئی ۱۹۴۸ء کو اس کے اور اسرائیلی وزارتِ خارجہ کے ایک اہل کار موشے شرتوک (بعد ازاں اس نے اپنا نام موشے شیرت رکھ لیا تھا) کے مابین ہوئی:

کیا ہمیں کوئی ایسی کارروائی کرنا چاہیے تاکہ ملک سے عربوں کا خروج ایک حقیقت میں تبدیل ہو جائے اور وہ کبھی بھی یہاں دوبارہ

۱۔ ملاحظہ فرمائیں الیونیری کی تصنیف: "Israel Without Zionism"

۲۔ یہاں مصنف اس جنگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو قیام اسرائیل کے بعد ۱۹۴۸ء میں یہودیوں اور عربوں کے مابین ہوئی تھی۔

واپس نہ آسکیں؟

شرتوک :۔ اس ضمن میں جو بھی پہل ہوگی، اسے میری اشیرباد حاصل ہوگی۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ ہمیں اس طریقے سے کارروائی کرنا چاہیے کہ عربوں کا خروج ایک مسلمہ حقیقت میں تبدیل ہو جائے۔[1]

بعد ازاں اسی سال وٹیز نے ایک عرب گاؤں کا، جو خالی ہو چکا تھا، دورہ کیا۔ اس نے جو کچھ وہاں دیکھا، اس کے متعلق وہ اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے:

میں "معار" گاؤں گیا۔ ٹریکٹر اس کو نیست و نابود کرنے کی کارروائی مکمل کر رہے تھے۔ اس تباہی و بربادی کو دیکھ کر مجھے نہ تو حیرت ہوئی اور نہ میں اس سے ذرہ برابر متاثر ہوا۔ میرے دل میں نہ تو کوئی تاسف تھا اور نہ نفرت۔ بلکہ میں نے سوچا کہ دنیا کا دستور بس یہی ہے۔ ہم اسی دنیا کے مزے لوٹنا چاہتے ہیں، نہ کہ کسی آنیوالی دنیا کے۔ ہم تو یہاں محض رہائش اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اس بستی کے پکے مکانوں کے مکین قطعاً یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم یہاں زندہ رہیں۔ وہ نہ صرف ہم پر تسلط و تغلب حاصل کرنے کے آرزومند ہیں بلکہ وہ ہمیں صفحہ ہستی سے بھی مٹا دینا چاہتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جائیں، ہر جگہ ہمارے بچے بچے کی زبان پر یہی الفاظ ہونگے۔[2]

---

[1] وٹیز: "مائی ڈائری" جلد سوم، صفحہ نمبر ۲۹۳

[2] وٹیز، "مائی ڈائری" جلد سوم صفحہ نمبر ۲۹۳

وہ ان واقعات کا ذکر تو کرتا ہے۔ جو فلسطین کے چپے چپے پر رونما ہوئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہا کہ اُس بدنصیب گاؤں میں ذی روح انسان ———— مانا کہ وہ بہت مسکین، عاجز اور غریب تھے ———— فی الواقع رہائش پذیر تھے اور یہ بدنصیب گاؤں ان کے لیے کچھ معانی رکھتا تھا۔ ویٹز دیہاتیوں کی حقیقت تسلیم کرنے سے تو انکار نہیں کرتا، اس کی کوشش بس یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ ان (دیہاتیوں) کی تباہ و بربادی کے معانی صرف اتنے سے ہیں کہ یہاں اب "ہم" رہائش پذیر ہو سکتے ہیں۔ اسے اس خیال سے ذرا سی بھی وحشت نہیں ہوتی کہ مقامی فلسطینیوں کے نزدیک وہ محض ایک اجنبی پردیسی ہے جو انہیں اکھاڑنے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ اگر کوئی شخص مقامی باشندوں کو اکھاڑنے کی کوشش کرے گا، تو ان کا اس کی اس کوشش کی مخالفت کرنا ایک بالکل فطری بات ہے۔ اس کی بجائے وہ اور اس کے "بچے" "نہایت ڈھٹائی" سے یہ مؤقف اختیار کر لیتے ہیں کہ "فلسطینی" ہمیں نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے" ———— اور اس مؤقف نے گویا انہیں یہ کھلی چھٹی دے دی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں، مکانوں اور دیہاتوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتے پھریں، (اور ان سے کوئی نہیں پوچھے گا کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ اور واقعتاً پوچھا بھی کس نے ہے؟) کئی دیہاتیوں تک عربوں کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کرنے کے بعد گویا کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھے، صیہونیت نے اپنا اصلی چہرہ دکھانا شروع کر دیا اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ جس قدر ممکن ہوا، عربوں کے آثار مٹانے کے کام کا آغاز کر دیا۔ فلسطینی عرب پہلے نظری طور پر لاشے (non-entity) تھے، اب انہیں قانونی

طور پر بھی لاشئے قرار دے دیا گیا۔ پہلے بھی ان کی حالت قابلِ رحم تھی اور تبدیلی کے بعد بھی ان کی حالت قابلِ رحم ہی رہی۔ فلسطین میں وہ اپنے اعلام کا تماشا اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ اس کا مؤثر انداز سے ابلاغ نہیں کر پا رہے تھے۔

پہلے تو ایک فلسطینی باشندے کو ایک بے حیثیت اور بے وقعت شخص قرار دیا گیا، پھر وہ ایک غیر حاضر شخص بن گیا۔ پھر ۱۹۴۸ء کے بعد اندرون اسرائیل اسے ایک ایسے شخص کے مقابلے میں، جس کا تعلق "یہودی قوم" سے تھا، اس بات سے قطع نظر کہ یہ شخص اسرائیل میں موجود تھا یا نہیں، قانونی اعتبار سے ایک کم حقیقی فرد کا درجہ دیا گیا۔ وہ فلسطینی، جو خوف و ہراس کے عالم میں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، "پناہ گزیں" کہلائے۔ لفظ "پناہ گزیں" محض ایک تجرید ہے۔ اقوام متحدہ ہر سال اس پر توجہ بھی دیتی ہے اور ایک قرارداد بھی منظور کر دیتی ہے جس میں اسرائیل سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ——— جیسا کہ اسرائیل نے وعدہ کیا تھا[۱] ——— وہ ان پناہ گزینوں کو یا تو واپس لے لے یا پھر ان کے نقصانات کی تلافی کرے۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہتا ہے۔ بچے کھچے فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل نے جو اہانت آمیز برتاؤ کیا ہے، انہیں جن جن ذلتوں سے گزارا ہے اور کسی بھی غیر جانبدارانہ معیار کے مطابق اس نے انہیں محکوم و مطیع رکھنے کے لیے جو غیر اخلاقی حرکات کی ہیں، ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ چنگے بھلے آدمی کا خون کھول اٹھتا ہے۔ لیکن اس وقت تو آدمی کا پارہ اور بھی چڑھ جاتا ہے جب ایک طرف تو وہ اسرائیل کا یہ شرمناک ریکارڈ دیکھتا

---

[۱] ایسا ہی ایک وعدہ بھارت نے کشمیر میں رائے شماری کرانے کے متعلق بھی کیا تھا۔

ہے اور اس کے مقابلے میں وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اسرائیلی جمہوریت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں اور ایک آدھ شخص نہیں بلکہ تقریباً سارا مغرب ہی اس معاملے میں اسرائیل کی مداحی میں سر دھن رہا ہے۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۸ء تک اپنے انتداب کے دور کے دوران میں یہودیوں اور عربوں سے نپٹنے کے لیے برطانیہ نے جن ہنگامی دفاعی قوانین (ایمرجنسی ڈیفنس ریگولیشنز) کا سہارا لیا تھا، اسرائیل نے انہیں من و عن اختیار کر لیا گویا کہ اپنے اس اقدام سے وہ ایک لاکھ بیس ہزار (اور اب ساڑھے چھ لاکھ) بدقسمت عرب باشندوں کو ان کی اس گستاخی کا مزا چکھانا چاہتا ہو کہ انہوں نے وہاں (فلسطین میں) ہی رہنے کی جرأت کیسے کی۔ انگریزوں کے زمانے میں صیہونی جب سیاسی ہنگامہ آرائی کرتے تھے، تو بجا طور پر وہ ان دفاعی قوانین کو اپنی تند و تیز تنقید کا نشانہ بناتے تھے لیکن ۱۹۴۸ء کے بعد خود اسرائیل ان قوانین کو مسلسل عربوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے اور اس نے ان میں ایک نکتے کی ترمیم بھی نہیں کی۔

مثلاً اسرائیل کے ان علاقوں کو، جہاں ابھی تک عرب اکثریت میں ہیں، "یہودی رنگ میں رنگنے" کے لیے ایک ایسی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے جو بظاہر تو گئے زمانے کی چیز[1] معلوم ہوتی ہے لیکن کسی طرح بھی کم تفصیلی اور کم مؤثر نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، اصیہونیت کے ابتدائی ایام میں

---

[1] یہاں مصنف نے انگریزی زبان کا لفظ "anachronistic" استعمال کیا ہے جو "anachronism" سے مشتق ہے۔ مؤخر الذکر لفظ ایک ایسی چیز کی نمائندگی کرتا ہے جو تاریخی اعتبار سے اپنے صحیح یا مناسب وقت پر وجود میں آنے یا پیش آنے کی بجائے کسی دوسرے وقت پر وجود میں آ جائے یا پیش آ جائے۔

روپاں اور ویزمان نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن وہ آئے گا جب تل ابیب عرب جافہ پر سبقت لے جائے گا اور اس سے بہت آگے نکل جائے گا"۔ بعینہٖ آج کی اسرائیلی حکومت ایک نئے الناصرہ کی تخلیق و تعمیر میں مصروف ہے جو قدیم عرب قصبے پر "سبقت لے جائے گا اور اس سے کہیں آگے نکل جائے گا"۔ یہ منصوبہ کیا ہے؟ اس پر ایک اسرائیلی نے ۱۹۷۵ء میں بدیں الفاظ روشنی ڈالی تھی:

"بالائی الناصرہ جو تقریباً پندرہ سال قبل" اس لیے تخلیق کیا گیا تھا تاکہ وہ عرب الناصرہ کی کاٹ کر سکے"۔ الجلیل کے خطے کو "یہودی رنگ میں رنگنے" کی پالیسی کا بنیادی ستون ہے۔ بالائی الناصرہ اس لیے ان پہاڑیوں پر تعمیر کیا گیا ہے جنہوں نے قدیم الناصرہ کو تقریباً چاروں طرف سے محصور کر رکھا ہے، تاکہ وہ اس کے اردگرد سلامتی کا ایک حصار بن سکے۔ اس کی تعمیر ہزاروں ایکڑ پر مشتمل اس اراضی پر ہوئی جو عرب بستیوں، بالخصوص قدیم الناصرہ اور رینا کے قصبوں کے مکینوں سے بزور شمشیر ہتھیائی گئی تھی۔ "بالائی" الناصرہ کے نام کا محض انتخاب ہی (یہاں زور لفظ "بالائی" پر ہے۔ اس رویے کی نشاندہی کرتا ہے جو حکام نے اختیار کر رکھا ہے۔ وہ جدید شہر کو ہر قسم کی سہولیات اور مراعات سے نوازتے ہیں اور انہوں نے پرانے شہر کو قطعاً نظرانداز کر رکھا ہے۔ انہوں نے (یہودیوں اور عربوں کے مابین) امتیازات برتنے کی جو پالیسی اپنا کر رکھی ہے۔ اس سے وہ یہاں سر مو انحراف نہیں کرتے۔ قدیم الناصرہ کے متعلق وہ جو بے اعتنائی برتتے ہیں،

اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اسے ایک اسفل ترین چیز سمجھتے ہیں ۔ قدیم الناصرہ کی ترقی کے سلسلے میں جس لاپرواہی اور غفلت کا مظاہرہ کیا گیا ہے ہر سیاح اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور وہ یہ تسلیم کرے گا کہ واقعی یہاں کوئی توجہ نہیں دی گئی ۔ لیکن یہی سیاح جب بالائی الناصرہ جائے گا تو وہاں اسے نئی تعمیرات ، وسیع و عریض شاہراہیں ، سڑکوں اور گلیوں میں روشنیاں ، سیڑھیاں ، کثیر المنازل عمارتیں ، صنعتی کارخانے ، کاریگروں کی ورکشاپیں ، غرضیکہ سبھی کچھ نظر آئے گا اور یوں ان دونوں شہروں کے مابین جو تضاد پایا جاتا ہے ، وہ واضح طور پر اسے دکھائی دے گا ۔ "اوپر" ترقی اور "نیچے" اعتنا اور ذمہ داری کا فقدان ۔ "اوپر" سرکاری طور پر ہر قسم کی تعمیرات کا کام ہو رہا ہے اور "نیچے" تعمیرات نام کی کوئی چیز بھی نہیں پائی جاتی ۔ ۱۹۶۶ء سے (اسرائیلی) وزارت تعمیرات (ہاؤسنگ) نے قدیم الناصرہ میں ایک بھی رہائشی مکان تعمیر نہیں کیا ۔ (جوزف الغازی ، روزنامہ ہوحدارث ، مورخہ ۳۰ جون ۱۹۷۵ء)

حکمران اقلیت کا ڈرامہ نہایت واضح انداز سے الناصرہ میں جاری ہے ۔ بالائی ــــــــ یعنی کہ یہودی ــــــــ الناصرہ کے سولہ ہزار مکینوں کو زندگی کی تمام سہولیات اور فوائد میسر ہیں ۔ زیریں الناصرہ کے پینتالیس ہزار عرب باشندے فلاکت و زبوں حالی کی منہ بولتی تصویر ہیں ۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ یہودی شہر یہودیوں کے لیے مخصوص وسائل سے پوری طرح مستفید ہو رہے ہیں ۔ غیر یہودیوں کو چن چن کر ان فوائد سے محروم رکھا جا رہا ہے ۔ ان کے اور یہودیوں کے مابین جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے ، صیہونی اس بات پر

تلے ہوئے ہیں کہ اسے دونوں فرقوں کے مابین ایک مکمل اختلاف بنا کر پیش کیا جائے نہ کہ محض درجے کا اختلاف۔ اسرائیل کا ہر یہودی "پوری یہودی قوم" کی نمائندگی کرتا ہے ——— یہ "یہودی قوم" کیا ہے، اس میں نہ صرف وہ یہودی شامل ہیں جو اس وقت اسرائیل میں موجود ہیں بلکہ اس میں یہودیوں کی وہ نسلیں بھی شامل ہیں جو کبھی روئے زمین پر موجود تھیں (جن کے موجودہ یہودی بچے کھچے آثار ہیں) اور وہ بھی جو آئندہ موجود ہوں گی۔ پھر وہ یہودی بھی جو دنیا کے دوسرے خطوں اور ممالک میں آباد ہیں، ایسی قوم کا ایک جزو ہیں ——— اس کے برعکس اسرائیل میں ایک غیر یہودی شخص ایک ایسی چیز کی نمائندگی کرتا ہے جسے نہ صرف اسرائیل میں اپنے بلکہ ماضی، حال اور مستقبل کے ان دیگر فوائد سے بھی جو اسے فلسطین میں (بشرطیکہ وہ قائم رہتا) حاصل ہو سکتے تھے، مستقلاً محروم کر دیا گیا ہے کیونکہ اس فلسطین سے اسے ہمیشہ کے لیے دیس نکالا دے دیا گیا ہے۔ اسرائیل کے غیر یہودی، جو دیہاتوں میں رہائش پذیر ہیں، ایک قسم کی تشنہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عرب دیہاتوں میں نہ کتب خانے ہیں اور نہ یوتھ سنٹر، نہ تھیٹر ہیں اور نہ ثقافتی مراکز۔ الناصرہ کے عرب میئر کے بقول، جسے اسرائیل میں ایسا فقید المثال اختیار حاصل ہے، جس سے عام طور پر فلسطین میں غیر یہودی محروم ہیں، عرب دیہاتوں میں بجلی، ٹیلی فون، صحت کے مراکز، سبھی کچھ عنقا ہے۔ الناصرہ کے علاوہ کہیں بھی نکاسئ آب کی سہولتیں موجود نہیں ہیں اور الناصرہ میں بھی یہ سہولتیں صرف جزوی طور پر میسر ہیں۔ ایک بھی گاؤں میں نہ پختہ سڑکیں ہیں اور نہ پختہ گلیاں، وغیرہ؟ یہودیوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتوں سے، جو ایک مملکت اپنے شہریوں کو فراہم کر سکتی ہے، متمتع ہونے کا حق حاصل ہے جب کہ غیر یہودیوں کو

کم سے کم بڑھا دیا جاتا ہے ۔ اسرائیل میں عرب کارکنوں کی کل تعداد اسی ہزار ہے ۔ ان میں سے ساٹھ ہزار ان منصوبوں پر کام کرتے ہیں جن کا انتظام و انصرام یہودیوں کے قبضے میں ہے ۔" ان کارکنوں کے نزدیک خود اپنے قصبوں اور دیہات کی کوئی اہمیت نہیں سوائے اس کے کہ وہاں وہ رہائش پذیر ہیں ۔ ان کی واحد صنعت جو خوب فروغ پا رہی ہے ، وہ افرادی قوت کی تولید اور فراہمی ہے ۔"[۵] پھر یہ افرادی قوت بھی کچھ اس قسم کی ہے کہ نہ تو اس کی کوئی سیاسی اہمیت ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ایسا علاقہ ہے جسے وہ اپنا کہہ سکے اور جس میں وہ اپنی جڑیں استوار کر سکے ۔ یہ افرادی قوت تو اپنے ثقافتی تسلسل سے بھی محروم ہو چکی ہے ۔ ۱۹۴۸ء کے بعد اگر کسی غیر یہودی نے اتنی جرأت دکھا دی ، کہ وہ نئی یہودی مملکت میں ٹکا رہا تو اس کا اسے یہ خمیازہ بھگتنا پڑا کہ اب وہ صرف اتنی ہی روزی کما سکتا ہے جس سے وہ بمشکل جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکتا ہے ۔ وہ قطعی طور پر اتنا بے دست و پا ہو چکا ہے کہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا ۔ البتہ وہ کچھ کرنے پر قادر ہے ، وہ صرف یہ ہے کہ اپنے جیسے انسانوں کو جنم دیتا رہے اور اپنی نامختتم غربت و نکبت ان تک منتقل کرتا رہے ۔

۱۹۶۶ء تک اسرائیل کے عرب شہریوں پر فوجی حکومت کا حکم چلتا رہا یہ فوجی حکومت محض اس لیے موجود تھی تاکہ مقدور حد تک عملاً عربوں کی زندگی کے ہر پہلو پر تسلط قائم کیا جا سکے ، ان کا سر خم کیا جا سکے ، ان کو اپنے مقاصد

---

۵ توفیق زیاد : "Fate of the Arabs in Israel" یہ مضمون "جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز" کی جلد ششم ، شمارہ نمبر ا (خزاں ۱۹۷۶ء) کے صفحات ۹۹-۹۸ پر شائع ہوا ۔

کے لیے استعمال کیا جا سکے، انہیں ہراساں کیا جا سکے، غرضیکہ وہ کسی اعتبار سے بھی پنجۂ یہود سے نکل نہ سکیں۔ جیسا کہ عوام کے ہنگاموں اور مظاہروں سے، جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے، عیاں ہے کہ ۱۹۶۶ء کے بعد بھی حالات میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ عربوں کی ہزار ایکڑ زمین کو ہتھیانے کے لیے ہنگامی دفاعی قوانین کا سہارا لیا گیا۔ اس مقصد کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے گئے۔ کبھی کہا گیا کہ یہ اراضی سلامتی کے منطقے (سیکورٹی زون) میں واقع ہے (اس لیے دفاعی نقطۂ نظر سے اس پر سرکاری قبضہ کرنا ضروری ہے)۔ کبھی کہا گیا کہ ان کے مالک غیر حاضر ہیں (اس لیے حکومت ان کی اراضی کو اپنی تحویل میں لے سکتی تھی۔ کئی معاملات میں تو بہت مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی اراضی کے اصل مالک موجود تھے لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور قانونی موشگافیوں کے ذریعے انہیں خواہ مخواہ غیر حاضر قرار دے دیا گیا۔) کسی فلسطینی سے پوچھ لیں۔ وہ آپ کو بتائے گا کہ غیر حاضر مالکوں کی جائداد کا قانون مجریہ ۱۹۵۰ء، قانونِ حصولِ جائداد بوقتِ ہنگامی صورتِ حال مجریہ ۱۹۴۹ء قبضہ و تصرف کے ذریعے حق کا قانون مجریہ ۱۹۵۸ء، قانون حصول اراضی مجریہ ۱۹۵۳ء کے معانی کیا ہیں۔ مزید برآں عربوں پر پابندیاں لگا دی گئیں اور ابھی تک وہ ان پابندیوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں کہ وہ اندرون اور بیرون ملک آزادانہ سفر نہیں کر سکتے، یہودیوں سے اراضی پٹے پر حاصل نہیں کر سکتے، آزادانہ تقریر نہیں کر سکتے، ایجی ٹیشن نہیں کر سکتے اور اپنی مرضی کی تعلیم نہیں پا سکتے۔ آپ کو ایسی مثالیں آسانی سے مل جائیں گی کہ اچانک دیہات پر کرفیو نافذ کر دیا گیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ جب کھیت مزدوروں کے لیے یہ معلوم کرنا کہ ان کے گاؤں یا گاؤں پر کرفیو لگا دیا گیا ہے، بظاہر ناممکن تھا، مجرم کسانوں کو موقع پر ہی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس ضمن میں ایک انتہائی گھناؤنا اور سفاک واقعہ، جس میں جان بوجھ کر درندہ صفتی سے کام لیا گیا، اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ایک گاؤں

"کفر قاسم" میں پیش آیا۔ اس واقعہ کے دوران میں سرحدی دستوں نے، جو اسرائیلی فوج کے خصوصی استعداد کے حامل سیکشن پر مشتمل تھے، غیر مسلح اشخاص کو نہایت شقاوت اور بے رحمی کے ساتھ گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ جب اسرائیلی حکومت کو احساس ہوا کہ اس واقعے سے اس کی رسوائی کا خطرہ ہے، تو جس افسر کے ذمے یہ کارروائی لگائی گئی تھی، خانہ پری کے طور پر اس پر مقدمہ چلایا گیا، اسے مجرم بھی قرار دے دیا گیا لیکن سزا؟ اسے ایک پیاسٹر[لے] جرمانہ کیا گیا۔

جب ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران میں اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر قبضہ کیا، تو تقریباً دس لاکھ مزید عرب باشندے اس کی رعایا بن گئے یہاں بھی اس کا ریکارڈ کوئی بہتر نہیں۔ لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات بھی نہیں[لے]

لے پیاسٹر ایک اسرائیلی سکہ ہے۔ اس کی مالیت ایک امریکی سینٹ (تقریباً اٹھارہ پیسے) سے بھی کم ہے۔

لے اس کے باوجود "نیویارک ٹائمز" نے ۱۹ مئی ۱۹۷۶ء کو اپنے ایک اداریے میں تحریر کیا کہ مغربی کنارے اور غزہ پر اسرائیلی قبضے کو دونوں قوموں کے مابین "آئندہ تعاون کے لیے ایک نمونہ" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسرائیلی جس طرح عربوں کے مکانات کو مسمار کرتے ہیں، انہیں اذیتیں دیتے ہیں، ملک سے باہر نکال دیتے ہیں، انہیں قتل اور ہلاک کرتے ہیں، مقدمہ چلائے بغیر انتظامی حکم کے تحت نظر بند کرتے ہیں، ان سب باتوں کی ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ریڈ کراس نے ہی مذمت نہیں کی بلکہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق خود امریکہ کے محکمہ خارجہ نے ۱۹۷۸ء میں جو رپورٹ شائع کی تھی، اس میں بھی ان پر تنقید کی گئی تھی۔ اس کے باوجود جبر و تشدد ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بھونڈے اور غیر شائستہ طریقوں سے

باقی اگلے صفحہ پر

مقبوضہ عرب علاقوں میں جو کچھ پیش آرہا ہے، اس سے اگر آپ متعارف ہونا چاہتے ہوں تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان اسرائیلی عربوں کی شہادتوں کا مطالعہ فرمائیں جنہیں ۱۹۶۷ء سے قبل اسرائیل کی قانونی سفاکیوں سے واسطہ پڑا اور یوں مصائب جھیلنے پڑے۔ مثال کے طور پر آپ مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

(۱) "اسرائیل کے عرب"[1] از صابری جریس

(۲) "اسرائیل میں بحیثیت عرب رہنا"[2] از فوزی الاشمار

(۳) "اسرائیل کے فلسطینی: داخلی نوآبادیات کا مطالعہ"[3] از ایلیا۔ ٹی۔ زریک

اسرائیل کا سیاسی ہدف یہ ہے کہ اس کی سرزمین پر جو عرب آباد ہیں، وہ پُرامن رہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اسے ان پر تواتر سے جو تسلط و تغلب حاصل

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۹۶: جن میں کچھ کا میں نے ذکر کیا ہے اور کچھ کا نہیں، سفاکانہ کارروائیاں مسلسل جاری ہیں۔ اجتماعی سزائیں اور جرمانے روزمرہ کا معمول ہیں ۱۹۶۹ء میں رام اللہ کے فوجی گورنر نے شہریوں کو یہ سزا دی کہ گوشت کی فروخت ہی بند کر دی ۱۹۷۰ء میں جب انگوروں کا موسم آیا تو ان کے چننے اور فروخت کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اور یہ پابندی اس وقت تک جاری رہی جب تک رہنماؤں نے تنظیم آزادی فلسطین کی علانیہ مذمت نہیں کی۔ ۱۹۷۰ء میں نبلوس پر اس لیے سات دن تک کرفیو نافذ رہا کیونکہ، شہریوں نے پولیس کے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا۔ (المصنف)

[1] "The Arabs in Israel"

[2] "To Be An Arab in Israel"

[3] "The Palestinians in Israel: A study in Internal Colonialism"

ہے، وہ کبھی اس سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جائیں۔ جب کوئی (فلسطینی) قوم پرست اپنا قد وقامت قدرے بڑھا لیتا ہے تو اسے یا تو جلاوطن کر دیا جاتا ہے، یا پھر (مقدمہ چلائے بغیر) اسے حوالۂ زنداں کر دیا جاتا ہے، یا پھر وہ نظروں سے ہی اوجھل ہو جاتا ہے قوم پرست مجرموں کو سبق سکھانے کے لیے اسرائیلی فوج ان کے گھروں کو بم برسا کر منہدم کر دیتی ہے (اس طرح جن مکانوں کو مسمار کیا گیا، ۱۹۸۰ء تک ان کی تعداد سترہ ہزار تک پہنچ چکی تھی)۔ خواہ عرب خود کچھ لکھیں یا کوئی دوسرا ان کے متعلق کچھ تحریر کرے، دونوں سنسر شپ کی زد میں آجاتے ہیں۔ ہر عرب براہ راست فوجی ضوابط کے تابع ہے۔ جبر و تشدد کی پردہ پوشی کرنے اور اسے اسرائیلی شعور کے سکون میں خلل ڈالنے سے روکنے کی غرض سے ایسے اسرائیلی یہودیوں کی ایک پوری جماعت وجود میں آگئی ہے جو اپنے آپ کو عرب امور کے ماہر گردانتے ہیں اور جو یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ "ہم عرب ذہنیت" کو خوب سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ماہر کا "اسم گرامی" ایمنون لین ہے۔ اس نے ۱۹۶۸ء میں تحریر کیا کہ "لوگ ہم پر اعتبار کرتے تھے اور انہوں نے ہمیں عمل کی وہ آزادی دی جو ملک کے کسی بھی دوسرے گروپ کو کسی میدان میں حاصل نہیں ہو سکی"۔ چنانچہ

> امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمیں مملکت میں ماہرین کی حیثیت سے ایک فقید المثال مقام حاصل ہو گیا ہے۔ اور کسی شخص میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ ہماری آراء یا ہمارے افعال کو جھٹلا سکے

۱؎ نبلوس اور بعض دوسرے شہروں کے میئروں کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔

حکومت کے تمام اداروں، ہستادروت[۱] اور سیاسی جماعتوں میں ہمیں نمائندگی حاصل ہے۔ حکومت کے ہر محکمے، ہر شعبے اور ہر دفتر میں عرب امور کے ماہرین موجود ہیں اور یہی وہ ماہرین ہیں جو عربوں کے مابین اپنے وزیر کی طرف سے کوئی کارروائی کرنے کے مجاز ہیں[۲]۔

یہ نیم حکومت "خصوصی مہارت" کے پردے میں عربوں کے رویوں کی تشریح کرتی ہے، ان پر حکم چلاتی ہے اور جیسا کہ میں باب اوّل میں تحریر کر چکا ہوں، ان لبرل امریکیوں کو، جو اسرائیل کی سیاحت پر آئے ہوتے ہیں اور بھولے طور پر عربوں کے متعلق بھی کچھ جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں، انہیں یہی نام نہاد ماہر مناسب آرائشی تصویر تھما دیتے ہیں[۳]۔ دریں اثنا مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیلی بستیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے (۱۹۶۷ء اور ۱۹۸۰ء کے دوران میں ایسی نوے بستیاں تعمیر ہو چکی تھیں)۔ ۱۹۶۷ء کے بعد بھی نوآبادیاں تعمیر کرنے کے لیے اسی منطق کا سہارا لیا جا رہا ہے، جس کا

۱۔ ہستادروت: اسرائیل کے مزدوروں کی فیڈریشن۔ اس کا قیام ۱۹۲۰ء میں عمل میں آیا۔ اسرائیل کے نوے فیصد کسان، مزدور اور دکاندار کسی نہ کسی اعتبار سے اس فیڈریشن سے منسلک ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی لیبر پارٹی اسی جماعت کے بل بوتے پر برسر اقتدار آئی تھی۔

۲۔ جرلیس نے اپنی کتاب "The Arabs in Israel" کے صفحہ نمبر ۷۰ پر اس کا حوالہ دیا ہے۔

۳۔ ملاحظہ فرمائیں سال بیلو کی کتاب "To Jerusalem and Back" مطبوعہ وائی کنگ پریس، نیویارک، سال اشاعت ۱۹۷۶ء صفحات نمبر ۶۱-۱۵۲

۱۹۴۸ء سے قبل لیا جاتا تھا۔ نتیجہ ۂ عرب اب بھی اسی طرح اپنی جائدادوں اور گھروں سے بے دخل ہو رہے ہیں جیسے پہلے ہوتے تھے۔[1]

صہیونیت اور اسرائیل یہودیوں کے لیے بھی ہے اور صہیونیت اور اسرائیل غیر یہودیوں کے لیے بھی۔ صہیونیت نے یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین ایک واضح لکیر کھینچ رکھی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھنے کے لیے اسرائیل نے ایک مکمل نظام وضع کیا۔ اس نظام میں اجتماعی کاشت کا نظام Kibbutz (کبز) بھی شامل ہے جس کی تحسین و تعریف

---

[1] جان کولی (COOLEY) نے امریکہ کے روزنامہ "کرسچین سائنس مانیٹر" کے ۲۵ جولائی ۱۹۷۰ء کے شمارے میں اپنے مضمون "Settlement Drive Lies Behind Latest Israeli "No"" میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ اسرائیل کا سرکاری منصوبہ یہ ہے کہ مغربی کنارے پر اتنے یہودی آباد کر دیئے جائیں کہ ... ۱۹۸۵ء تک وہاں انہیں اکثریت (ساڑھے بارہ لاکھ) حاصل ہو جائے اور مقبوضہ سینائی کے قصبے "یامیط" کو ترقی دے کر اسرائیل کا ایک بڑا شہر بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہاں تعمیرات کا کام زور شور سے جاری ہے۔ "جیوش ایجنسی" کے چیئرمین ارائی ڈوزین کے بقول صہیونی یہ چاہتے ہیں کہ یامیط پر ہمیشہ یہودی حاکمیت قائم رہنا چاہیے کیونکہ "صہیونی ہیرو ہرزل نے ۱۹۰۳ء میں یہی پیش گوئی کی تھی۔ اسرائیل مغربی کنارے اور یامیط میں جن یہودیوں کو بسانا چاہتا ہے ان میں بیشتر جنوبی افریقہ، امریکہ اور روس سے آئیں گے (اسرائیل کی حکومت فوجی اور ایٹمی شعبوں میں جنوبی افریقہ کی حکومت کے ساتھ جو تعاون کر رہی ہے اور اس نے وہاں کے سزا یافتہ نازی وزیراعظم جان فارسٹر کے ساتھ جو دوستانہ مراسم قائم کر رکھے ہیں، ان کے پیچھے یہی اغراض کام کر رہی ہیں)۔ (مصنف)

میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں (لیکن حقیقتاً جس کی اساس خالص نسل پرستی کے جذبات پر استوار ہے)۔ آج تک ایک بھی عرب باشندہ اس کا رکن نہیں بن سکا۔ عملی طور پر عربوں پر ایک بالکل علیحدہ حکومت کا حکم چلتا ہے۔ اس حکومت کی اساس اس مقدمے پر قائم کی گئی ہے کہ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے لیے ایک ایسی حکومت کا قیام، جو دونوں کو مساوی معاشی اور سیاسی حقوق (ECONOMIC RULE) کی ضمانت دے، ناممکنات میں سے ہے۔ اس انتہا پسندانہ تصور کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عرب اپنے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں مقید ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے یہ بات بالکل فطری ہے کہ اپنے محدود اور باقی دنیا سے کٹے ہوئے علاقوں میں وہ اپنے ہی انداز کی زندگی بسر کریں۔ اپنی صوابدید کے مطابق اس کی نمو کریں، اس کی تفصیلات طے کریں اور خود ہی یہ فیصلہ کریں کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ یوری الوزری نے اسرائیلی پارلیمنٹ[1] کے سامنے اس صورتِ حال کو یوں پیش کیا:

> عرب خطے میں ایک نئی حکومت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک خفیہ حکومت جس کے قیام کی قانونی طور پر کوئی منظوری نہیں دی گئی تھی، وجود میں لائی گئی۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس (حکومت) کے ارکان کون ہیں اور اس کے (کام کرنے کے) طریقے کیا ہیں۔
>
> ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے ایجنٹ شعبہ انتظامی امور برائے اراضیات سے لے کر وزارتِ تعلیم اور وزارتِ مذاہب تک اسرائیل

---

[1] اسرائیلی پارلیمنٹ کو انگریزی میں Knesset کہتے ہیں جو بذاتِ خود عبرانی لفظ "کنیسست" (اجتماع مجلس) سے مشتق ہے۔

کے تمام سرکاری اداروں اور وزارتوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ یہ حکومت ان عربوں کے متعلق، جو غیر معروف بستیوں میں رہتے ہیں، نہایت دوررس اور اہم فیصلے کرتی ہے۔ یہ فیصلے ان عربوں کی زندگیوں پر بڑی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن ان فیصلوں کو نہ ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے اور نہ ان کا کوئی ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ بلکہ ان فیصلوں کو خفیہ گفتگوؤں یا ٹیلیفون کے ذریعے (متعلقہ اشخاص تک) پہنچایا جاتا ہے۔ یہی ہے وہ طریقہ جو اس قسم کے فیصلے کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے کہ اساتذہ کے سیمینار میں کون شریک ہوگا۔ ٹریکٹر کسے ملے گا، کس سرکاری عہدہ پر کس کا تقرر ہوگا، امدادی رقم (سب سڈی) کسے فراہم کی جائے گی، اسرائیلی پارلیمنٹ یا مقامی بلدیاتی ادارے کا، اگر اس قسم کا کوئی ادارہ موجود ہے، رکن کسے منتخب کیا جائے گا۔" اس قسم کی ایک ہزار ایک وجوہ گنوائی جا سکتی ہیں۔[1]

اسرائیل نے اپنے عرب باشندوں کے لیے جس قسم کی حکومت قائم کر رکھی ہے اور وہ جس طریقے سے کام کر رہی ہے، اس کے متعلق بعض اوقات چوکس اور ہوشیار مبصروں کو غیر ارادی طور پر ایسی باتیں بھی بتا دی جاتی ہیں جو ان دونوں کی قلعی کھول دیتی ہیں۔ اس قسم کی بے احتیاطی اور غفلت کی ایک انتہائی مثال وہ رپورٹ پیش کرتی ہے جو ضلع شمالی الجلیل کے کمشنر نے اس زمانے کے وزیراعظم تیز حاک رابن کے لیے اس بارے میں تحریر کی تھی کہ "اسرائیل میں عربوں کے ساتھ کیسے نپٹا جا سکتا ہے (بعد میں

---

[1] جریس : "اسرائیل کے عرب" : صفحہ نمبر ۷۰

یہ رپورٹ ایک جریدے "الہمیش مار" کو چوری چھپے فراہم کر دی گئی اور اس نے ۷ ستمبر ۱۹۷۶ء کو اسے شائع بھی کر دیا۔) اس رپورٹ میں جو مواد پیش کیا گیا ہے، اس کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تاہم یہ مواد ان مفروضات کی، جو صیہونیوں نے اپنے غیر یہودی نخچیروں کے متعلق قائم کر رکھے تھے تکمیل کرتا ہے۔ کمشنر کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر یہ اعتراف کرتا ہے کہ عربوں نے پیدائش آبادی کا مسئلہ کھڑا کر رکھا ہے کیونکہ یہودیوں کے برعکس، جن کی فطری افزائش ڈیڑھ فیصد سالانہ ہے، عربوں کی تعداد میں سالانہ ۹ء۵ فیصد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ مفروضہ بھی قائم کرتا ہے کہ اگرچہ عرب فطری طور پر قومی بے چینی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ان کے متعلق قومی پالیسی یہی ہونا چاہیے کہ انہیں سماجی اور معاشی اعتبار سے کمتر حیثیت پر رکھا جائے اور "ہم" اسی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ تاہم بڑا مسئلہ یہ ہے کہ الجلیل جیسے علاقوں میں عربوں کی آبادی کو، جو بے حد گھنی ہے اور نتیجتاً شورش برپا کرنے کے امکانات کی حامل ہے، کس طرح کم کیا جائے، حدود کے اندر رکھا جائے، کم زور بنایا جائے۔ چنانچہ وہ تجویز کرتا ہے کہ ضروری امر یہ ہے کہ

ان علاقوں میں جہاں عرب آبادیاں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے سے متصل ہیں، یہودی بستیاں کثیر تعداد میں اور دُور دور تک قائم کی جائیں۔ اس امکان کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے کہ جہاں جہاں عرب آبادیوں کا ارتکاز موجود ہے، وہاں اسے کیسے کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں اور الناصرہ کے خطے کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کی جانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اتنک

جو معمول کی کارروائیاں کی گئی ہیں، صورت حال کا تقاضا یہ ہے
کہ مزید کارروائی اس معمول سے ہٹ کر کی جائے۔ اس کے
ساتھ ساتھ سرکاری طور پر ایک قانون نافذ کیا جانا چاہیئے جس کے
تحت ملک کے مختلف علاقوں میں عربوں کی نئی آبادیاں اور بستیاں
بسانے کی تحدید کر دی جائے۔"

ان تجاویز کے پیچھے جو نیم فوجی حکمت عملی کارفرما ہے، وہ کوئی زیادہ
ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ہمیں جس بات پر دھیان دینے کی ضرورت ہے، وہ
کمشنر کا صیہونی تقاضوں کے متعلق نقطہ نظر ہے جنہیں وہ بلا چون و چرا تسلیم
کرتا ہے اور جن پر وہ عملدرآمد کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ اس کی تجاویز واضح
طور پر جن نسلی مقاصد کی آبیاری کر رہی ہیں، اپنی رپورٹ میں وہ کہیں بھی یہ عندیہ
نہیں دیتا کہ وہ ان پر شرمسار ہے یا اسے ضمیر کی کوئی کسک محسوس ہوئی ہے۔
اسے اس بارے میں قطعی کوئی شبہ نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ صیہونی پالیسی
کی تاریخ کے عین مطابق ہے، جو غیر یہودیوں کے متعلق، جن کی تعداد اگرچہ
پریشان کن حد تک بہت زیادہ ہے، لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ یہودیوں
کے زیر تسلط علاقے میں موجود ہیں، وضع کی گئی تھی۔ چنانچہ وہ ــــ منطقی طور پر
ــــــ دلائل کے انبار لگاتا جاتا ہے کہ جو عرب رہنما کوئی مصیبت کھڑی
کرتے نظر آئیں تو ان کی جگہ نئے عرب رہنما "تخلیق"[1] کئے جائیں" جو اعلیٰ
ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہوں، جو اپنے رویے کے اعتبار سے منصف مزاج
ہوں، جن کے اذہان کھلے ہوں، جن کی شخصیتیں کرشمہ ساز ہوں اور وہ لوگوں کو

---

[1] یہ لفظ تقریباً مذہبی لب ولہجہ کا حامل ہے اور عربوں کے متعلق یہودی پالیسی سے
عین مطابقت رکھتا ہے۔ (مصنف)

اپنے ساتھ بہا لے جانے کا گُر جانتے ہوں ۔" اور اسرائیلی حکمرانوں کے لیے سراسر قابل قبول ہوں ۔ مزید برآں ، ان بے چین قوم پرست رہنماؤں کو، جن کا واحد گناہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مقامی باشندوں کو اپنی کمتری پر جو ان پر زبردستی مسلط کی گئی ہے ، پیچ و تاب کھانے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ۔ " تحلیل " کرنے کے بعد حکومت کو " ایک خاص ٹیم تشکیل دینا چاہیے ... جو (عرب) رہنماؤں اور دوسرے مقامی باشندوں کے عادات و خصائل کا مطالعہ و معائنہ کرے اور یہ اطلاعات رائے دہندگان تک پہنچائی جانا چاہیئے ۔"

کمشنر اسرائیل کے عرب باشندوں کی " تقلیل " کرنے اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ایسے طریقے بھی تجویز کرتا ہے جن کی مدد سے انہیں معاشی اعتبار سے " اپاہج اور بے اثر " بنایا جا سکتا ہے اور " ان کے راستے میں روڑے اٹکائے " جا سکتے ہیں ۔ تاہم ان تجاویز پر اس وقت تک صحیح معنوں میں عمل نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ایسا طریقہ وضع نہ کر لیا جائے جس کی مدد سے " ان بے شمار مایوس اور دل شکستہ دانشوروں کو، جن کی ذہنی ضرورت انہیں تسکین ڈھونڈنے پر مجبور کرتی ہے ، کسی نہ کسی طرح شہہ مات نہیں دی جاتی ۔" کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو تسکین کی خاطر ملک کے اسرائیلی ڈھانچے کے خلاف لب کشائی کرتے رہتے ہیں ۔" معلوم ہوتا ہے کہ کمشنر کی سوچ یہ ہے کہ عربوں کو " مایوس اور دل شکستہ " رکھنا ایک بالکل فطری امر ہے کیونکہ اس کی تجاویز کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو یہ قطعاً یاد نہیں رہتا کہ عرب بھی ایک قوم ہیں اور نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی رپورٹ جنگ عظیم دوم کے دوران میں کسی نازی نے یہودیوں کے متعلق تحریر نہیں کی بلکہ ۱۹۷۶ء میں ایک یہودی نے اپنے عرب ہم وطنوں کے متعلق سپرد قلم کی

ہے۔ کمشنر کے منصوبے کی عقب کی چال (MASTER STROKE) اس وقت سامنے آتی ہے جب وہ اس امر کو زیر بحث لاتا ہے کہ عربوں کے پسماندہ "لیوانتی کردار"[1] کو خود ان کے خلاف استعمال کرنے کے لیے معاشرتی طور پر کیا زیروزبر کرنا چاہیے۔ چونکہ اسرائیل کے عرب مراعات سے سراسر محروم طبقہ ہیں، کمشنر یہ چاہتا ہے کہ صورت حال کی سنگینی میں مزید اضافہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ مندرجہ ذیل اقدامات تجویز کرتا ہے:

الف: یونیورسٹیوں میں داخلے کے خواہشمند طلبا کے لیے وہی معیار مقرر کیا جائے جو یہودی طلبا کے لیے معین ہے۔ تقسیم وظائف میں بھی اسی اصول کو مدنظر رکھا جائے۔

ان ضوابط کو من وعن اختیار کرنے اور ان پر سختی سے عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ (طلبا کا) انتخاب فطری انداز سے ہوگا۔ یوں عرب

---

[1] وہ ممالک جو بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر واقع ہیں، انہیں "لیوانت" کہا جاتا ہے۔ یہاں غالباً نکتہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ چونکہ یہودی نہیں تھے، اس لیے وہ ان کو غیر مہذب، اجڈ اور گنوار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ "لیوانت" نام کا جو چمڑا ہوتا ہے، وہ بہت کھردرا ہوتا ہے اور کتابوں کی جلدیں باندھنے کے کام آتا ہے۔

[2] یہاں ڈارون کی اصطلاحات اپنے منہ سے آپ بول رہی ہیں (مصنف)۔ ڈارون کے نقطۂ نظر کے مطابق صرف وہی حیوانات اور نباتات زندہ بچ سکتی ہیں جو جہد للبقا میں بہت مضبوط اور توانا ثابت ہوں۔ کمزور اور ناہل ہمیشہ فنا ہو جاتے ہیں۔ یہاں کمشنر یہ کہہ رہا ہے کہ یہودیوں کے مقابلے میں عرب ذہنی اعتبار سے بہت کمتر ہیں اس لیے ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو تعلیمی میدان میں یہودیوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ چنانچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عربوں کی تعداد بھی بہت کم رہ جائے گی۔ چنانچہ حکومت انہیں

بقیہ اگلے صفحہ پر

طلباء کی تعداد کافی کم ہو جائے گی۔ چنانچہ گھٹیا معیار کے حامل گریجوایٹوں کی تعداد بھی بہت تھوڑی رہ جائے گی۔ اس طرح حصول علم کے بعد انہیں مختلف اسامیوں پر کھپانا بھی آسان ہو جائے گا۔

(ب) طلباء کی یہ حوصلہ افزائی ہونا چاہیے کہ ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد ٹیکنیکل فنون اور طبعی اور فطری علوم کی تعلیم حاصل کرے۔ اس قسم کی تعلیم کے دوران میں قوم پرستانہ تحریکوں میں جھک مارنے کے لیے وقت نہیں بچتا اور ایسے طلبا کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، جو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے جاتے ہیں[1]۔

(ج) تحصیل علم کی خاطر غیر ممالک کا سفر آسان تر بنا دیا جائے لیکن واپسی کے عمل کو مشکل کر دیا جائے اور روزگار کے مواقع محدود

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۳۰۶ : فراہم کر سکے گی اور یوں شاید ان کے خیالات پر پہرے بھی بٹھا سکے گی۔ لیکن جہاں تک عربوں کی بہت بڑی اکثریت کا تعلق ہے وہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جانے کے باعث ہمیشہ گھٹیا اور ادنیٰ نوعیت کے کام کرنے پر مجبور ہوں گے اور یوں انہیں ذہنی اعتبار سے خصی بنانے کا عمل یقینی ہو سکے گا۔

[1] سائنس اور انسانی اقدار کے مابین عدم موافقت کے متعلق یہودی کمشنر اپنے خیالات میں سی۔پی۔ سنو (ایک انگریز ناول نگار، جس کا بنیادی فلسفہ ہی یہ ہے کہ سائنس اور انسانی اقدار آپس میں نباہ نہیں کر سکتیں۔ چارلس پرسی سنو کا انتقال ۱۹۸۰ء میں ہوا) سے دو قدم آگے نکل گیا ہے۔ یہ کہ سائنس اور سائنسی علوم کو سیاسی تخریب کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، یہ اس کی نہایت بھیانک اور پراز خباثت مثال ہے۔ استعمار نے اسے کاہے کو سوچا ہوگا، یہ اس کے لیے بھی بالکل نئی چیز ہوگی۔

(مصنف)

کر دیئے جائیں ——— اس پالیسی کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ خود ہی ترکِ وطن پر آمادہ ہو جائیں گے۔

(۷) کالجوں اور یونیورسٹیوں کے مختلف مدارج کے طلباء میں جو شوریدہ سر عناصر (ایجی ٹیٹر) موجود ہیں، ان کے خلاف سخت اقدامات کئے جائیں۔

(۸) گریجویٹوں کی بیشتر تعداد کو ان کی قابلیت کے مطابق مختلف اسامیوں پر کھپانے کے لیے پیشگی منصوبے بنائے جائیں چونکہ حکام کے پاس اس قسم کے منصوبے بنانے اور اقدامات کرنے کے لیے کافی وقت (کئی سال) ہے، اس لیے اس پالیسی کو عملی جامہ پہنایا جا سکے گا۔

اگر اس قسم کے خیالات کا اظہار سٹالن[1] کے پیروکار، آرویل[2] مدرسۂ فکر کے سوشلسٹ یا عرب قوم پرست ہی کرتے تو (مغرب کے) لبرل طبقے وہ شور و غوغا مچاتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ تاہم (انہیں) ایک اسرائیلی کمشنر کی تجاویز عام طور پر صحیح اور جائز دکھائی دیتی ہیں کیونکہ یہاں جو منطق کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ واقعات و حالات نے مغربی یہودیوں کی ایک مختصر لیکن دلیر و شجیع آبادی کو عربوں کی کثیر اور بے ہنگم آبادی کے، جو ہر دم اپنا رویّہ تبدیل کرتی رہتی ہے اور تباہ کن حد تک عقل و دانش سے عاری ہے، بالمقابل لا کھڑا

---

[1] جوزف سٹالن۔ روس کا مردِ آہن۔ (۱۸۷۹-۱۹۵۳ء) کیمونسٹ نظام میں جو جبر اور سختی پائی جاتی ہے۔ اس کی ذمہ داری زیادہ تر اسی پر ڈالی جاتی ہے۔

[2] آرویل (GEORGE ORWELL) (۱۹۰۳-۱۹۵۰) اینگلو انڈین انگریز مصنف و ناول نگار۔ اس نے اپنے ناولوں ANIMAL FARM اور ۱۹۸۴ء میں کمیونزم پر طنز کیا ہے۔

کیا ہے۔ کمشنر کی رپورٹ میں جن باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان میں سے ایک بات بھی اس بنیادی ثنویت[1] سے متصادم نہیں جو صہیونیت کا خاصہ ہے کہ یہ (صہیونیت) یہودیوں کے لیے تو سراسر خیر و برکت ہے تاہم عربوں کے معاملے میں اس کا طرز عمل لازماً لیکن پدرانہ[2] طور پر مخاصمانہ ہے۔ مزید برآں، یہودی کمشنر اپنے خیالات نہ صرف ایک عینیت پسند اور نظریہ ساز شخصیت کی حیثیت سے بلکہ ایک ایسے شخص کے نقطۂ نظر سے بھی جسے اسرائیلی معاشرے میں ایک مقتدر اور با اختیار مقام حاصل ہے، قلم بند کر رہا ہے۔ اسرائیلی عربوں کے ایک حاکم کی حیثیت سے کمشنر صہیونیت کے دونوں پہلوؤں کا اظہار کرتا ہے کہ سرکاری طور پر یہودیوں کی فلاح و بہبود پر ہر ممکن توجہ دی جاتی ہے (وہ خود بھی یہودیوں کے مفادات کو برقرار رکھتا ہے اور ان کا تحفظ کرتا ہے) لیکن فروتر مقامیوں کے بارے میں پدرانہ اور انتظامی تسلط و تغلب سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے جو موقف اختیار کیا ہے، یہودی مملکت کے اداروں نے اسے ایک تقدیس بخش دی ہے۔ چونکہ

---

[1] ثنویت: اصل میں یہاں مصنف نے انگریزی لفظ DICHOTOMY استعمال کیا ہے DICHOTOMY وہ تقسیم ہوتی ہے جو دو اجزا پر مشتمل ہوتی ہے لیکن عام طور پر یہ دونوں اجزا آپس میں اس کے دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں اور باہم برسر پیکار۔ بعض اوقات یہ تقسیم خیالات میں بھی در آتی ہے۔

[2] پدرانہ PATERNALISTIC (پدرانہ حکومت یا سرپرستی) بعض اوقات حکومت ایسے امور میں بھی دخل دینا شروع کر دیتی ہے جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ نجی دلچسپی کے حامل ہیں یا وہ اس نظریے پر معاشی اور معاشرتی خدمات بہم پہنچانے لگتی ہے کہ وہ نجی تحریک پر بالکل مہیا نہیں کی جاسکتیں۔ ایسی حکومت کو پدرانہ حکومت کہتے ہیں۔ چونکہ اسرائیل کی حکومت عربوں کے ہر معاملے میں دخیل ہوتی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا انداز فکر "پدرانہ" ہے۔

اس نے انہی اداروں سے اذن اور پروانہ حاصل کیا ہے، چنانچہ وہ ہمیشہ ان اصطلاحات میں سوچتا ہے کہ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ مستقبل میں یہودیوں کو تو زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہو سکیں اور عربوں کو کم سے کم۔ اس کی رپورٹ کے مندرجہ ذیل پیراگراف میں ان تمام تصورات کی بھرپور نقشہ کشی کی گئی ہے،

ایک ایسی مملکت میں جہاں اسرائیلیوں جیسا معاشرہ موجود ہو، نفاذِ قانون کا مسئلہ ایسا ہے جسے لچک، احتیاط اور بہت دانائی کے ساتھ حل کرنا چاہیے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ عاملہ اور انتظامیہ کے ان حکام کو، جو عربوں کے خطے میں تعینات ہیں، قانون کی موجودگی اور اس کے نفاذ کے متعلق آگاہ ہونا چاہیے تاکہ قانون کا منشاء پورا ہو اور غیر ارادی طور پر بھی کسی سے رُو رعایت نہ کی جا سکے۔ ؎

ویزمان اور اس کمشنر کے مابین کئی عشروں کا عرصہ حائل ہے۔ اوّل الذکر جن باتوں کا محض خواب دیکھا کرتا تھا کہ ایسا ہوگا یا ایسا ہونا چاہیے، وہی باتیں مؤخر الذکر کے لیے قانونی سیاق کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ ویزمان کے عہد سے لے کر اس یہودی کمشنر کے عہد تک فلسطین کے مقامی عربوں کے لیے صیہونیت میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ پہلے یہ ان کی زندگیوں میں اس طرح دراندازی ہو رہی تھی جیسے کوئی شخص آپ کی جائداد پر تجاوزات تعمیر کر رہا ہو

؎ کمشنر کی اس رپورٹ کا مکمل انگریزی متن جریدے SWASIA نے اپنی جلد سوم شمارہ نمبر ۴۱ میں پندرہ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو شائع کیا تھا۔

لیکن اب اس نے ایک طے شدہ حقیقت ـــــــ ایک قومی مملکت ـــــ کا روپ دھار لیا تھا اور یہ چاروں طرف سے ان کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتی جا رہی تھی۔ ۱۹۴۸ء کے بعد اسرائیل نے نہ صرف یہودیوں کی سیاسی اور روحانی امیدوں کی تکمیل کر دی تھی بلکہ یہ ان لوگوں کے لیے مواقع کا مینارۂ نور بھی بنا رہا اور انہیں رہنمائی فراہم کرتا رہا جو ابھی تک دوسرے ممالک میں بکھرے پڑے ہیں۔ پھر جو لوگ سابقہ فلسطین میں رہائش پذیر تھے، اس نے انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنی ترقی و نمو یہودی فکر کے مطابق کر سکیں اور یوں اپنی تحصیلِ ذات کر سکیں۔ جہاں تک عرب فلسطینیوں کا تعلق ہے، ان کے لیے اسرائیل لازماً ایک معاندانہ حقیقت ہے جس کے بے شمار ناگوار ضمنی شاخسانے ہیں۔ ۱۹۴۸ء کے بعد ہر فلسطینی قومی اور قانونی طور پر معدوم ہو گیا۔ البتہ بعض فلسطینی عدالتی فیصلوں کے تحت "غیر یہودیوں" کے روپ میں دوبارہ نمودار ہو گئے۔ جو وہاں سے نکل آئے، وہ "پناہ گزین" بن گئے بعد ازاں ان میں سے بعض نے عرب، یورپی یا امریکی شناخت حاصل کر لی تاہم آپ کو کوئی فلسطینی ایسا نہیں ملے گا جس نے اپنی "پرانی" فلسطینی شناخت گنوا دی ہو۔ اس قسم کی بے معنی قانونی افسانہ طرازیوں سے کہ اسرائیل اور دوسرے ممالک میں فلسطینی عدم موجود ہیں، بالآخر فلسطینیوں نے چھٹکارا پا لیا ہے ـــــ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کے آثار بھی نظر آنے لگے ہیں کہ اب بین الاقوامی سطح پر صیہونی نظریے اور عمل کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے کافی آمادگی پائی جاتی ہے۔

۱۹۷۵ء کے بعد اقوام متحدہ نے جب ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "صیہونیت نسل پرستی ہے"۔ تو اس پر مغرب میں جو شور و غوغا

اور واویلا ہوا، وہ لاریب تصنع سے پاک تھا۔ اسرائیل کے یہودیوں نے
جو کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کی ہیں ــــــــ یہ کامرانیاں مغربی یہودیوں
کے کھاتے میں زیادہ ڈالی جاتی ہیں اور مشرقی یہودیوں کے حصے میں بہت کم
آتی ہیں ــــــــ وہ مغربی دنیا کے سامنے اہل۔ اکثر معیاروں کے
مطابق یہ خاصی زبردست کامرانیاں ہیں۔ جن چیزوں پر "نسل پرستی" کا ٹھپا
لگ جاتا ہے، ان کی مذمت میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے
جاتے ہیں اور یوں انہیں مسترد کر دیا جاتا ہے۔ تاہم جہاں تک اسرائیلی یہودیوں
کی کامرانیوں کا تعلق ہے، سچی بات یہ ہے کہ ان پر بھونڈے انداز سے "نسل
پرستی" کا کلنک نہیں لگایا جا سکتا۔ اور یوں ان کی عمومی انداز سے مذمت نہیں
کی جا سکتی۔ جہاں تک عرب فلسطینیوں کا تعلق ہے جنہوں نے صہیونیت
کی معیت میں زندگی بسر کی ہے اور جنہوں نے اس کے ان طریقہ ہائے کار
کا مطالعہ کیا ہے، جو وہ ان کے اور ان کی زمین کے متعلق اختیار کرتی ہے،
ان کے لیے یہ تکلیف دہ صورتِ حال پیچیدہ ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ
وہ بالکل غیر واضح نظر آنے لگے۔ وہ جانتے ہیں کہ "قانون واپسی" یہودیوں
کو اسرائیل میں فوری داخلے کی اجازت دیتا ہے لیکن بعینہٖ یہی قانون انہیں
اپنے گھروں کو واپس آنے سے روکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اسرائیلی
حملوں میں ہزاروں شہری باشندوں کو محض اس لیے اپنی جانوں سے ہاتھ
دھونے پڑے ہیں کیونکہ ان کے پاس یہ قابل قبول گھڑا گھڑایا بہانہ موجود
ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف کارروائی کر رہے ہیں جب کہ اصل
حقیقت یہ ہے کہ فلسطینیوں کو من حیث القوم ایسے دہشت گردوں کے
مترادف ٹھہرایا جا رہا ہے جو اپنی دہشت گردی پر نہ تو نادم ہوتے ہیں

اور نہ شرمسار اور جس قسم کی دہشت گردی کے وہ مرتکب ہوتے ہیں، اس کے لیے انہیں کوئی مشتعل بھی نہیں کرتا۔ بس بلا جواز دہشت گردی کیے جا رہے ہیں ۔ فلسطینی اس پُر فریب اور پُر پیچ عقلی عمل کو سمجھتا تو ہے لیکن

لہ فلسطینی تشدد کی جو انتہائی مکروہ مثال پیش کی جاتی ہے، وہ ان کا مئی ۱۹۷۴ء میں "معلوت" کے قصبے پر حملہ ہے۔ یہ واقعہ فلسطینی دہشت گردی کے مترادف بن چکا ہے لیکن کسی بھی امریکی اخبار نے اس واقعے سے قبل ان واقعات کا مطلق ذکر نہیں کیا، جب اسرائیل کے طیارے اور توپ خانہ مسلسل دو ہفتے تک جنوبی لبنان پر وحشیانہ بمباری کرتے رہے۔ اسرائیلیوں نے نپام بم بھی گرانے سے اجتناب نہیں کیا۔ نپام بموں کے ان حملوں کے دوران میں دو سو عام شہری باشندے ہلاک ہوئے اور کم از کم دس ہزار افراد بے گھر ہو گئے۔ پھر بھی ابھی تک "معلوت" کی رٹ جاری ہے۔ (مصنف)

اسرائیل کی دہشت گردی صرف جنوبی لبنان تک محدود نہیں رہی۔ ۱۹۸۲ء میں اس نے نہایت دھڑلے کے ساتھ اپنی فوجیں لبنان میں داخل کر دیں اور وہ مار دھاڑ کرتی بیروت پہنچ گئیں۔ یہاں انہوں نے اور ان کے حواریوں، عیسائی ملیشیا، نے فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں کا محاصرہ کر لیا اور انہیں بے پناہ گولہ باری کا نشانہ بنایا، خوراک، ادویات اور دوسری اشیائے رسد کی ترسیل ناممکن بنا دی۔ بلا مبالغہ ہزاروں ہی لوگ جن میں بچے، بوڑھے، جوان، خواتین، سبھی شامل ہیں، ہلاک ہوئے۔ زخمیوں کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں۔ اسرائیلی فوجیں تو کچھ عرصے کے بعد بیروت سے واپس آ گئیں۔ لیکن اس کے حواریوں نے ابھی تک لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور خود اسرائیلی طیارے بیروت، طرابلس اور دوسرے شہروں میں فلسطینی کیمپوں پر اکثر بمباری کرتے رہتے ہیں ساحلی شہروں پر بحریہ کے جہاز گولہ باری کرتے ہیں۔ جنوبی لبنان ابھی تک اسرائیلی فوجوں اور عیسائی ملیشیا کے قبضے میں ہے اور لبنان کی حکومت کو اس پر کوئی کنٹرول نہیں (مترجم)

وہ خود شاید اس پر عبور حاصل نہیں کر سکتا، جس کے ذریعے اس کی انسانیت کو، جسے پہلے ہی مسخ کیا جا چکا ہے، ناپاک بنایا جا چکا ہے، اسے دیکھے بغیر، اس کا نقطۂ نظر سمجھے بغیر، ایک ایسی آئیڈیالوجی کی تعریف و تحسین میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جس نے اسے قریب قریب تباہ کر دیا ہے۔ "نسل پرستی" ایک بہت ہی مبہم سی اصطلاح ہے۔ صیہونیت صیہونیت ہے۔ الفاظ کی یہ تکرار[1] ایک فلسطینی کے لیے جو مفہوم رکھتی ہے، وہ اس مفہوم کے بالکل متجانس تو ہے لیکن اصلاً اس کے بالکل الٹ ہے جو یہ ایک یہودی کیلئے رکھتی ہے۔

آج جبکہ اسرائیل ایک بھاری فوجی بجٹ کے بوجھ تلے کراہ رہا ہے جو اس کی مجموعی پیداوار کا پینتیس فیصد کھا جاتا ہے، اپنے چند دوستوں کے علاوہ، جو بحر اوقیانوس کے قرب و جوار میں واقع ہیں اور جن میں سے بھی بعض کی اس پر نکتہ چینی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، یہ باقی دنیا سے کٹ چکا ہے اب یہ ایسے سماجی، سیاسی اور نظریاتی مسائل میں گھر چکا ہے، جنہیں وہ صرف اسی صورت میں حل کر سکتا ہے کہ وہ ان سے کامل مراجعت اختیار کر لے۔ ان حالات میں اس کا مستقبل خاصا بھیانک اور وحشت ناک ہو گیا ہے۔ صدر سادات امن کے جس مشن پر روانہ ہوئے تھے، اس سے کم از کم اتنا ضرور ہوا ہے کہ بیگن جس جامد اور بے لچک مذہبی جنون میں مبتلا تھا، اس کی

---

[1] یہاں مصنف نے انگریزی کا لفظ (Tautology) استعمال کیا ہے، اس کے ایک معنی تو الفاظ کی تکرار یا ایک ہی مفہوم کو مختلف الفاظ کے ذریعے بلا ضرورت بیان کرنا ہے۔ دوسرا مفہوم "منطق" میں استعمال ہوتا ہے، جب ایک بیان کو جو سادہ بیانات پر مشتمل ہوتا ہے، اس طریقے سے ادا کیا جائے کہ سادہ بیانات بیشک صحیح ہوں یا غلط، یہ بیان اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً "شاید کل بارش ہو، شاید نہ ہو۔"

دبی دبی سہی لیکن بہر حال مخالفت کا آغاز ہو گیا ہے۔ لیکن جہاں ادارے تو ایک طرف رہے، فلسطینی حقائق سے انسان دوستی کے جذبے کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی تصور، کوئی خیال تک موجود نہ ہو، وہاں یہ توقع کرنا کہ اسرائیلیوں کے فکر و عمل میں کوئی فیصلہ کن تبدیلی آسکے گی، محض خام خیالی ہے۔ امریکہ کا انتہائی طاقتور اور بارسوخ یہودی طبقہ ابھی تک اپنا روپیہ اور اپنا تقلیلی نقطۂ نظر اسرائیلی ارادے پر ٹھونستے ہوئے ہے۔ پھر ہمیں امریکی یہودیوں سے بھی کہیں زیادہ ہیبت ناک اور وحشت اثر امریکہ کی دفاعی انتظامیہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو اس تاجر طبقے کے بھی مقابلے میں، جو تیل کی دولت سے مالا مال ہوب منڈیوں پر حریصانہ نظریں جمائے ہوئے ہے، کہیں آگے ہے کیونکہ یہ اسرائیل اور اب مصر میں جدید ترین ہتھیاروں کی مسلسل بھرمار اس لیے کئے جا رہی ہے کہ یہ ممالک "انتہا پسندوں[1] "سوویت یونین یا ہر اس طاقت کے خلاف، جو امریکہ کے لیے جغرافیائی یا سیاسی یا دونوں اعتبار سے "بھیانک بھوت" بن چکی ہے، سینہ سپر ہو جائیں گے۔ اسرائیل کی بے لگام عسکریت[2]

---

[1] انتہا پسند (Radicals) ان لوگوں کو کہتے ہیں جو حکومت اور قوانین، خاص طور پر معاشی اور معاشرتی قوانین میں فوری اور بنیادی تبدیلیاں لانے کے دعویدار ہوں۔

[2] عسکریت یا حربیت (Militarism) لاتعداد اسلحہ جات رکھنا، شہریوں پر فوجی افسروں کو تعینات کرنا، شہری اداروں کی بجائے فوجی اداروں کو نصب العین بنانا۔ وہ اقوام جو جوع الارضی میں یقین رکھتی ہیں، وہ عسکریت کو اپنی حکمت عملی میں درجۂ اولیت دیتی ہیں، ہٹلر اور مسولینی نے جنگِ عظیم دوم سے قبل اپنے اپنے ملکوں میں جو نظام قائم کئے تھے، وہ اس کی بدترین مثالیں ہیں۔ آج کل دنیا کا تقریباً ہر ملک اس لت میں گرفتار ہے وہ اور کچھ نہیں تو اسلحہ کے انبار لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہے۔

کا جو بدیہی نتیجہ برآمد ہوا ہے، اس کا بالکل صحیح احوال اسرائیلی اخبار "ہارتیز" نے ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو اپنے ایک مضمون میں بیان کیا تھا۔ لبنان میں جو کارروائی ہوئی، اس پر خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے اس اخبار نے تحریر کیا:

جو کچھ گزشتہ ہفتے پیش آیا، وہ ہر اس شخص کو، جو آنکھیں رکھتا ہے، یہ دکھانے کے لیے کافی ہے کہ آج اسرائیل کی دفاعی افواج اپنے سازو سامان کی کمیت اور تعداد کے اعتبار سے بالکل امریکی افواج ہیں۔ ہماری رائفلیں، فوج بردار گاڑیاں طیارے اور بحری جہاز، الیف ۱۵ اڑاکا طیارے، بلکہ کفیر[1] ہوائی جہاز بھی، جن میں امریکی موٹریں نصب ہیں، ہر شخص کو اس کا یقین دلا دیگی۔

اسرائیل کے "زبردست فوجی سازو سامان" کی اوپر جو نغمہ سرائی کی گئی ہے، اس کا لگا اگر کوئی چیز کھا سکتی ہے، تو وہ مغربی اور اسرائیلی دانشوروں کا، جو گذشتہ تیس سال سے پلکیں جھپکائے بغیر اسرائیل اور صیہونیت کا کلمہ پڑھے جا رہے ہیں، مہلک اور زیاں رساں اثرو رسوخ ہے۔ گرام شی نے جن لوگوں کے متعلق کہا تھا کہ یہ "ناجائز کو جائز بنانے کے بڑے ماہر" ہیں، یہ (مغربی اور اسرائیلی) دانشور ایسے ہی "ماہرین"[2] کا کردار بحسن و خوبی ادا کر رہے ہیں۔ دانائی اور انسانیت کی دہائی دینے کے باوجود یہ لوگ بڑے بے ایمان، دھاندلی باز، غیر عقلی اور غیر منطقی ہیں۔ شرمناک اور ذلیل ریکارڈ کا ذرا ناقدانہ جائزہ لیں تو آپ کو صرف چند ہی اصحاب، جن کی تعداد ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، ایسے ملیں گے، جنہوں نے یہ دیکھنے کی

---

[1] اسرائیل کے ساختہ فوجی طیارے۔ [2] ان لوگوں میں نوئیم چومسکی، اسرائیل شحاک، آئی۔ الیف سٹون (امریکی صحافی) اور ایلمر برگر (Berger) شامل ہیں۔

سعی کی ہے کہ صہیونیوں نے فلسطینیوں کے ساتھ ، صرف ایک مرتبہ ۱۹۴۸ء
میں ہی نہیں ، بلکہ سلسلہ تو کئی برسوں پر محیط ہے ، کیا سلوک کیا ہے ؟ مقامی
فلسطینیوں کے متعلق صہیونیوں نے جو اصول اور نظریے وضع کیے ہیں اور ان کے
ساتھ جو برتاؤ روا رکھا ہے ، اس کے متعلق یہ کامل سکوت اس صدی کے انتہائی
لرزہ خیز اور ہولناک ثقافتی واقعات میں سے ایک واقعہ ہے ۔ آج ارجنٹائن ،
چلی یا جنوبی افریقہ میں انسانی حقوق کی جو تذلیل ہو رہی ہے اور انہیں جس طرح
پاؤں تلے روندا جا رہا ہے ، اس کے متعلق ہر وہ دانش ور ، جس میں خودداری
اور غیرت کی ذرا سی رمق بھی موجود ہے ، کچھ نہ کچھ کہنے پر آمادہ ہے لیکن
اسرائیل میں عربوں کی امتناعی نظر بندی ، اذیت رسانی ، آبادیوں کی تبدیلی اور
ملک بدری کے متعلق جب ناقابل تردید شواہد پیش کئے جاتے ہیں تو لغوی طور پر
منہ میں گھنگھنیاں ڈال لی جاتی ہیں ، مجال ہے کہ کسی کی زبان سے مذمت کا ایک
لفظ بھی نکل جائے ۔ مثلاً کسی ڈینیل موئی ہان یا کسی بیلو کو مطمئن کرانے کیلئے
اتنا ہی کافی ہے کہ انہیں یہ یقین دہانی ، خواہ یہ کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو ، کرا دی
جائے کہ اسرائیل میں جمہوریت کا احترام کیا جاتا ہے تو پھر اخلاقی محاذ پر
راوی چین ہی چین لکھتا ہے اور ان کا ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے ۔ یہ مملکت پرستی
کس حد تک پہنچ چکی ہے ، اس کا صحیح اندازہ غالباً اس ملاقات کا احوال پڑھنے
کے بعد ہی ہو سکتا ہے ، جو مارٹن بوبر[1] اور ایوراہام ادیرت[2] کے مابین ہوئی
اور جسے اسرائیل کے ایک سہ ماہی مذہبی جریدے پیتاچیم نے اپنے دسمبر ۱۹۷۲ء
کے شمارے میں شائع کیا تھا ۔ ادیرت اسرائیلی افواج کی تعریفوں کے پل باندھ

---

[1] مارٹن بوبر (Buber) (۱۸۷۸-۱۹۶۵ء) آسٹریا نژاد یہودی عالم اور فلسفی ۔

[2] ایوراہام ادیرت (Aderet) ایک اسرائیلی صحافی ۔

رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ان میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد نوجوانوں کو کردار سازی کا موقع ملتا ہے۔ وہ اس ضمن میں ایک واقعے کو بطورِ مثال پیش کرتا ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۶ء میں مصر کے خلاف جنگ میں پیش آیا تھا۔ ہوا یوں کہ ایک فوجی افسر نے اپنے (زیرِ کمان) فوجیوں کے ایک گروپ کو یہ حکم دیا کہ "جتنے بھی مصری جنگی قیدی .... کہ ہمارے ہاتھ آئے ہیں آپ نے بس انہیں ہلاک کرنا ہے"۔ چنانچہ چند رضاکار آگے بڑھتے ہیں اور مناسب انداز سے قیدیوں کو گولیوں سے بھون دیتے ہیں۔ اگرچہ ایک رضاکار ایک ایسا بھی تھا جس نے بعد میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ "جب میں نے گولی چلائی، میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں"۔ اس موقع پر اڈیٹر یہ "ارشاد" کرتا ہے کہ "لاریب اس قسم کی آزمائش ہر اس شخص کو، جو صاحبِ ضمیر ہے اور جسے زندگی کا تجربہ بھی حاصل ہو چکا ہو، (ذہنی) انتشار میں مبتلا کر سکتی ہے۔ یہ بات ان نوجوانوں پر خاص طور پر صادق آتی ہے جو ابھی اپنی اپنی زندگی کی دہلیز پر کھڑے ہوں۔ میرے خیال میں اس سارے معاملے میں تکلیف دہ اور ناگوار بات وہ ذہنی انتشار نہیں جس میں وہ نوجوان بوقتِ ضرورت مبتلا ہوئے، بلکہ وہ داخلی توڑ پھوڑ ہے، جو بعد میں ان کے اندر ہوئی"۔ "روح کی بالیدگی کرنے والی" اس تعبیر و تشریح کا "معلم اخلاق" کریم النفس مفکر اور سابق دوہرے قوم پرست "بوبر" سے صرف یہ جواب بن پڑا۔

"یہ ایک سچی اور زبردست کہانی ہے۔ آپ کو اسے ضرور حیطۂ تحریر میں لانا چاہیے"۔

اس کہانی میں جو ہولناکی ہے، اس کے متعلق اور نہ اس صورتِ حال

کے متعلق، جس نے اسے ممکن بنایا، اس نے پھوٹے منہ بھی ایک لفظ تک نہ کہا۔

لیکن جس طرح گزشتہ سو سالوں کے دوران میں آپ کو ایک بھی یہودی ایسا نہیں ملے گا جس پر صیہونیت اثر انداز نہ ہوئی ہو، اسی طرح آپ کو کوئی فلسطینی ڈھونڈے سے نہیں ملے گا جو اس کا نخچیر نہ بنا ہو۔ تاہم یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ فلسطینی صیہونیت کا محض ایک وظیفہ نہیں اس کی زندگی، ثقافت اور سیاست کا اپنا ایک محرک ہے اور ان چیزوں کی بالآخر اپنی ایک صداقت ہے۔ چنانچہ اب ہمیں انہی کی طرف توجہ دینا ہوگی۔

تیسرا باب

فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کی طرف

۱
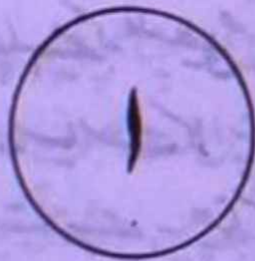
بچے کھچے فلسطینی — کچھ جلاوطن، کچھ زیردست

اس وقت پینتیس سے چالیس لاکھ فلسطینی عرب دنیا بھر کے مختلف ممالک میں بکھرے پڑے ہیں، ان میں سے ساڑھے چھ لاکھ تو وہ فلسطینی ہیں جنہیں اسرائیلی عرب کہا جاتا ہے۔ دس لاکھ اسرائیلی مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ (کی پٹی) میں سکونت پذیر ہیں، تقریباً دس لاکھ ہی اردن میں اور کوئی ساڑھے چار لاکھ لبنان میں مقیم ہیں۔ اور جو باقی بچتے ہیں، ان کی بیشتر تعداد عرب خلیجی ریاستوں، شام، مصر، لیبیا اور عراق میں رہتی ہے۔ تھوڑے سے فلسطینی ایسے بھی ہیں جو یورپ، شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے مختلف ممالک میں جا بسے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مجھے یقین ہے کہ یہی کہے گا کہ "میں تو جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہوں" اگرچہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جلاوطنی کے حالات اور انواع میں بہت بین فرق ہے، تاہم ہر فلسطینی کی

لپٹ پر ایک عظیم عمومی حقیقت موجود ہے کہ وہ کسی زمانے میں ـــــــ اور اس زمانے کو بیتے اتنا زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا ـــــــ اپنے وطن میں، جسے فلسطین کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، سکونت پذیر تھا، لیکن یہ وطن اب اس کا اپنا وطن نہیں رہا۔ اس قسم کی بات کہنے کے لیے کسی فلسطینی کو کبھی بال کی کھال ادھیڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس کے ساتھ بہت کم شرائط، تعویلات یا اگر مگر وابستہ نظر آتے ہیں۔ تاہم جس طرح کہ ٹالسٹائی[1] نے خاندانوں کے متعلق کہا تھا کہ مسرور و مطمئن خاندان بالکل ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن ایک ناشاد و نامطمئن خاندان اپنے غم و اندوہ اور نااطمینانی میں اپنی قسم کے ہر دوسرے خاندان سے مختلف ہوتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت فلسطینیوں کی ہے۔ انہیں فرداً فرداً جو دکھ جھیلنے اور زخم اٹھانا پڑے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی دکھ کی چھتیس لاکھ اقسام ہیں۔ ان دکھوں کی ایک قسم کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ یہ ان واقعات کی کہانی ہے، جو مغربی الجلیل کے ایک چھوٹے سے عرب گاؤں میں پیش آئے جو ۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں صیہونی فوجوں کے قبضے میں آگیا تھا۔ (اس کہانی کی) راوی ایک بزرگ کسان خاتون ہے، جو اس وقت لبنان میں پناہ گزینوں کے ایک کیمپ میں رہتی ہے۔ اس کی کہانی ۱۹۷۳ء میں ریکارڈ کی گئی تھی:

"اس رات ہم گاؤں کے (پھلوں کے) باغات میں سوئے۔ اگلی صبح میں اور اُم حسین گاؤں گئیں۔ گلیوں میں مرغیاں پھر رہی تھیں۔

---

[1] لیو ٹالسٹائی (Leo Tolstoy) (۱۸۲۸ - ۱۹۱۰) مشہور روسی مصنف اور فلسفی غالباً دنیا کا عظیم ترین ناول نگار۔ "جنگ و امن" اور "اینا کیرے نینا" اس کے شاہکار ناول ہیں۔

اُمِّ حسین نے مجھ سے کہا، "جاؤ اور کچھ پانی لے آؤ۔" میں چوپال کی طرف جا رہی تھی کہ راستے میں میری ملاقات اُمِّ طٰحٰہ سے ہوئی وہ پھٹ پڑی اور چلّانے لگی کہ "جاؤ اور اپنے مرحوم خاوند کو دیکھو۔" وہ مجھے مل گیا۔ کسی نے اس کے سر کی پشت پر گولی ماری تھی۔ میں نے اس کی لاش گھسیٹ کر سائے میں کر دی اور خود اُمِّ حسین کو بلانے چل دی تاکہ وہ اسے دفنانے میں میری مدد کر سکے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں قبر نہیں کھود سکتی تھی۔ چنانچہ ہم نے اسے ایک چوبی تختے پر لٹایا، اور اسے قبرستان لے گئیں۔ وہاں ہم نے اس کی والدہ کی قبر میں اسے اس کے پہلو ہی میں دفن کر دیا .... آج بھی میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہتی ہوں کہ میں نے اسے صحیح سمت میں لٹا کر دفنایا ہو۔ میں کچھ کھائے بغیر چھ دن کبریٰ (اس کے گاؤں کا نام) میں مقیم رہی۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی بہن کے پاس چلی جاؤں گی جو کچھ عرصہ قبل اپنے گھر والوں کے ساتھ شام بھاگ گئی تھی۔ میں نے ایک بزرگ شخص، ابو اسماعیل ارکع سے درخواست کی کہ "آپ میرے ساتھ ترشیحہ تک چلیں"۔ وہ میری بات مان گئے اور میرے ساتھ چل پڑے۔ ابو اسماعیل تو اپنے بیٹے کے پاس ترشیحہ ہی میں ٹک گئے اور میں نے شام کا رُخ کر لیا۔"[1]

---

[1] اس کہانی کا حوالہ نافذ نزال نے اپنے مضمون "The Zionist Occupation of Western Galilee 1948" میں دیا ہے۔ یہ مضمون "جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز" کی جلد سوم شمارہ نمبر ۳ (موسم بہار ۱۹۷۴) میں شائع ہوا تھا۔

۱۹۷۰ء سے قبل آپ اس قسم کی کہانی انگریزی زبان میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ قیام اسرائیل کے بیس برس بعد تک دنیا کو مبہم طور پر اور عمومی انداز سے اتنا تو معلوم تھا کہ "فلسطینی پناہ گزین" نام کی ایک مخلوق موجود ہے یا یوں کہیں کہ کبھی کبھار فلسطینی پناہ گزینوں کے متعلق بھنک ان کے کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں امریکہ میں معاشرتی علوم کی ایک معیاری نصابی کتاب، "مشرق وسطیٰ کی معاشرتی قوتیں"[1] شائع ہوئی۔ اس کتاب میں فلسطینیوں کے متعلق ایک علیحدہ باب باندھا گیا ہے۔ تاہم پوری کتاب کھنگال ڈالیں، آپ کو کہیں بھی اس بات کا عندیہ تک نہیں ملے گا کہ یہ لوگ بھی کہیں موجود ہیں۔ اگر کہیں ان کی موجودگی کا سوال اٹھایا بھی گیا ہے تو اس طرح کہ یہ لوگ علاقے کی "ترقی" میں معمولی انداز سے رخنہ انداز ہیں یا پھر ان کا شمار ان عام پناہ گزینوں کی صف میں کیا گیا ہے، جن کے متعلق اعداد و شمار اقوام متحدہ کے ایجنڈے میں شامل ہوتے ہیں۔ (ایران میں جو فریق شاہ کی مخالفت کرتے تھے، ان کی موجودگی کے متعلق بھی امریکہ کی اعلیٰ درسگاہوں اور خفیہ اداروں سے وابستہ اشخاص نے اسی قسم کی لاعلمی اور ناکامی کا مظاہرہ کیا تھا اور جب ۱۹۷۹ء میں شاہ کے خلاف مخالفت کا طوفان پھوٹ پڑا اور سارے بند ٹوٹ گئے تو سبھی لوگ ششدر رہ گئے۔ ان لوگوں کی حیرانی اور سراسیمگی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کی دانست میں شاہ کی مخالفت موجود نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ مخالفت اتنی شدت اختیار کر جائے

---

[1] "Social Forces in the Middle East", edited by Sydney N.Fisher [Ithaca, N.Y: Cornell University Press]

گی اور شاہ کے استحکام کے لیے کسی خطرے کا باعث بن جائے گی۔)

ایک اور مسئلہ جس امر نے ایک فلسطینی کا اپنے آپ سے اور باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع کر رکھا تھا، وہ بیس سالہ قومی تفرقہ اور آپس کی پھوٹ تھا۔ ایک طرف تو وہ فلسطینی تھے جو واضح طور پر جلاوطن تھے۔ دوسری طرف وہ فلسطینی تھے جو رہتے تو اسرائیل میں تھے لیکن دوسروں سے الگ تھلگ اپنی داخلی جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے ان کا رجحان اپنے آپ کو عرب سیاست کی اصطلاحوں میں دیکھنے کی جانب تھا یا پھر ان کی کوشش یہ تھی کہ جن نئے مقامات پر انہوں نے رہائش اختیار کی ہے، وہاں کے ماحول میں رچ بس جائیں اور وہیں کے ہو کر رہ جائیں۔ مؤخر الذکر کے روابط عالم عرب سے کٹ چکے تھے کیونکہ وہ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ اسرائیلی تسلط کے زیر سایہ انہیں جو تھوڑی بہت رہنے کو جگہ میسر ہے، وہیں وہ اپنی زندگیوں کو متشکل کر سکیں دونوں صورتوں میں کافی عرصے تک جس (ترکیبی) عنصر کی کمی محسوس ہوتی رہی وہ متحد و مربوط بنا دینے والی ایک ایسی سیاسی قوت تھی جس میں انضمام ختم ہو کر فلسطینیوں کو تاریخ کے ایک ایسے عہد میں، جسے دوبارہ آواز دیکر بلایا نہیں جا سکتا تھا، جس مجہول ڈراؤنے خواب کا تجربہ ہوا تھا، اسے بھلانے میں وہ ان کی مدد کر سکے اور کوئی اس سے بہتر چیز انہیں پیش کر سکے۔

البتہ جس چیز کا فقدان تھا، وہ ایک ملک تھا۔ جب تک اکھاڑ پچھاڑ کے بعد فلسطین کی جگہ اسرائیل قائم نہیں ہو گیا۔ یہ (فلسطین) ایک ایسا ملک تھا جو اپنے کردار کے اعتبار سے غالب طور پر ایک عرب ریاست

(جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں آباد تھے) تھا۔ یہی وہ حقیقت ثابتہ ہے جس کے متعلق صہیونی اور مغربی رویّے کی میں نے باب اوّل اور باب دوم میں وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن جہاں تک ایک عام فلسطینی کا تعلق ہے، اس کے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس کے ملک کی ایک اپنی خصوصیت اور ایک اپنی شناخت تھی۔ یہ درست ہے کہ جنگ عظیم اوّل کے اختتام تک فلسطین سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ رہا اور یہ بھی درست ہے کہ کسی بھی مسلمہ معیار کے مطابق یہ کوئی آزاد ملک نہیں تھا۔ تاہم اس کے باشندے اپنے آپ کو فلسطینی کہتے تھے اور وہ اپنے اور شامیوں، لبنانیوں اور اردنیوں کے مابین اہم امتیازات و اختلافات کی نشاندہی کرتے تھے۔ فلسطینیوں میں اس چیز کا احساس، جسے ہم ان کا تشخص یا ادعائے ذات[۵] کہہ سکتے ہیں، زیادہ تر اس وقت بیدار ہونا شروع ہوا جب انھوں نے فلسطین میں یہودی تارکین وطن کی آمد جس کا سلسلہ ۱۸۸۰ء کے عشرے کے دوران میں شروع ہوا تھا، اور فلسطین کے متعلق مختلف صہیونی تنظیموں کے نظریاتی دعاوی کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر کرنے کی ابتدا کی تھی۔ ایک طبقے کی حیثیت سے فلسطینی دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی عرصے کے دوران میں ابھرے جب ان پر ہر آن غیر ملکی یلغار کا احساس طاری رہنے لگا ــــــ وہ چیزیں ــــــ معاشرے کی ساخت، گاؤں اور گھرانے کی شناخت، رسوم و رواج، طرز طباخی، لوک روایات اور فنون، امتیازی عادات و خصائل اور تاریخ ــــــ جن

---

[۵] ادعائے ذات (self assertion) اپنی شخصیت، امنگوں اور خیالات کو پُرزور طریقے سے پیش کرنا اور منوانے کی سعی کرنا۔

کی صداقت کے متعلق کبھی کسی شبے کا اظہار نہیں کیا گیا اور جنہیں ہمیشہ حرزِ جاں بنا کر رکھا گیا، فلسطینیوں نے فلسطینیوں کے سامنے بطور ثبوت پیش کیں کہ جب یہ علاقہ ایک نوآبادی بھی تھا، اس وقت بھی یہ فلسطینیوں کا وطن تھا اور یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی قوم کو قوم بناتی ہیں، چنانچہ فلسطینی بھی ایک (علیحدہ) قوم ہیں۔ ملک کی ساٹھ فیصد آبادی کھیتی باڑی کا کام کرتی تھی۔ جہاں تک باقی باشندوں کا تعلق ہے، ان کی بیشتر تعداد شہروں اور قصبوں میں رہتی تھی اور نسبتاً ایک معمولی سی تعداد خانہ بدوشوں پر مشتمل تھی۔ یہ تمام لوگ، اپنے ان احساسات کے باوجود، کہ وہ ایک عظیم تر عرب قوم کے بھی افراد ہیں، اپنے متعلق یہ یقین رکھتے تھے کہ ان کا تعلق ایک ایسی سرزمین سے ہے جسے عرفِ عام میں فلسطین کہا جاتا تھا، اور بیسویں صدی کے پورے عرصے کے دوران میں وہ اپنے ملک کو "فلسطینونہ" (ہمارا فلسطین) کہتے رہے۔

بدیہی حقیقت یہی ہے کہ فلسطینی "مشرقِ وسطیٰ کے بحران" کے قلب میں جاگزیں ہیں اور اگر اس بحران کا حل ڈھونڈنا مقصود ہے، تو انہیں اس (حل) میں شریک کرنا ہی پڑے گا۔ اس کتاب میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے، وہ بظاہر اس بدیہی حقیقت کی تائید و حمایت کرتا ہے لیکن اصل مقصد اس نقطۂ نظر کو محض اس طور پیش کرنا نہیں کہ دوسروں کو قائل کیا جائے بلکہ اس سے کچھ زیادہ کرنے کی سعی کرتا ہے۔ میرا نقطۂ نظر، جس پر میں سختی سے قائم ہوں، یہ ہے کہ چونکہ فلسطینیوں کے سیاسی تشخص کو اتنے وسیع پیمانے پر عمومی (اور حال ہی میں) قبولیت اور تائید حاصل ہوئی تھی، اس لیے بلا کم و کاست یہ کہا جا سکتا ہے کہ بالکل اسی بات (قبولیت عام)

میں چند خطرات بھی مضمر ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ایک عمومی نوعیت کا حل فلسطینیوں کی مخصوص، مفصل حقیقت کو پوری طرح سمجھنے میں ناکام رہے بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ انہیں تباہی کے کنارے پر ہی پہنچا دے۔ چنانچہ اس مقالے میں، میں نے جس بات کو بالاصرار کہنے کی کوشش کی ہے، وہ یہ ہے کہ "مسئلہ فلسطین"، متعدد اور گوناگوں کیفیات کا حامل ہے۔ کیفیات کے اس تنوع کو اکثر مبہم و معلق بنا دیا جاتا ہے، نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر دیدہ و دانستہ اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسانی فریق ——— خاص طور پر وہ لوگ جو فلسطینیوں اور صہیونیوں کی کشمکش میں براہ راست ملوث ہیں ——— بڑے جوشیلے یقین، یا کم از کم ایسے یقین کے ساتھ، جس سے یہ مترشح ہوتا ہو کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس کا پابند بنا رکھا ہے، کام کرتے ہیں۔ یہ بات جس طرح فلسطینیوں کے بارے میں درست ہے کہ وہ صہیونیت اور اسرائیل کے متعلق کیا محسوس کرتے ہیں، بالکل اسی طرح یہودیوں پر بھی صادق آتی ہے کہ ان کے ان دونوں چیزوں (صہیونیت اور اسرائیل) کے بارے میں کیا احساسات ہیں۔ (دونوں ہی جوش و ولولہ سے تو کام کرتے ہیں لیکن عقل و خرد کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے) تاہم توازن کے فقدان نے، جو صہیونیوں اور فلسطینیوں کی مشترکہ تفہیم کے مابین پایا جاتا ہے، عمومی طور پر ان اقدار اور مشکلات و مصائب سے بھرپور اس تاریخ کی، جس نے اس صدی کے دوران میں فلسطینیوں کو کچھ نہ کچھ کرنے پر ابھارا ہے، پردہ پوشی کر رکھی ہے کیونکہ اکثر امریکی اس بات سے آگاہ ہی نظر نہیں آتے کہ اسرائیل کے وجود میں آنے سے قبل فلسطینی واقعتاً فلسطین میں رہائش پذیر تھے۔ تاہم اگر ہم

صرف اپنی اقدار اور اپنی تاریخ کو ملحوظ خاطر رکھیں تو ہمیں سمجھوتے، تصفیے اور بالآخر امن کے بنیادی نقوش نظر آنا شروع ہو جائیں گے۔

میرا کام فلسطینیوں کی داستان پیش کرنا ہے، جہاں تک صیہونیوں کی کہانی کا تعلق ہے، (مغرب میں) وہ کہیں بہتر انداز سے جانی اور سمجھی جاتی ہے۔

میرے خیال میں یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں کہ اس اچانک توجہ کے باوجود، جو فلسطینیوں کی جانب مبذول ہونا شروع ہوئی ہے، انہیں اب بھی بنیادی طور پر چند منفی اوصاف کا مجموعہ تصور کیا جاتا ہے — بلکہ بعض اوقات تو وہ خود بھی اپنے آپ کو انہی منفی اوصاف سے متصف سمجھنے لگتے ہیں — جب حالت یہ ہو تو پھر فلسطینیوں کو مکمل حق خود ارادیت دینے کا عمل غیر معمولی طور پر دشوار ہو جاتا ہے کیونکہ حق خود ارادیت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ارادے کا اظہار کرنے کے لیے کوئی واضح طور پر نظر آنے والا "خود" موجود ہو۔ جلاوطنی اور انتشار[1] مسئلے کی نوعیت کو فوری طور پر واضح کر دیتے ہیں۔ اس صدی کے بیشتر حصے کے دوران میں وہ دنیا بھر میں اور تاریخی اعتبار سے جس انداز سے متعارف ہوئے ہیں وہ زیادہ تر انکارات اور استردادات[2] کی شکل میں ہے۔ ان پر صیہونیت کی

---

[1] انتشار (dispersion) مختلف ممالک یا مقامات پر بکھرے ہونا۔

[2] انکارات اور استردادات: بعض چیزوں کے وجود سے انکار کرنا یا انہیں مسترد کر دینا۔ صیہونی فلسطینیوں کے وجود سے انکاری ہیں اور فلسطین پر ان کے تمام دعاوی مسترد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح فلسطینی اسرائیل کے وجود کو ماننے سے انکاری ہیں اور ارضِ فلسطین پر ان کے تمام دعاوی مسترد کر رہے ہیں۔ فلسطینی ان دونوں ہی اعتبارات سے دنیا کے سامنے نمودار ہوئے ہیں۔

مخالفت کا الزام عاید کیا جاتا رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مسئلے کا مرکزی نقطہ وہی ہیں، پھر ان پر یہ تہمت بھی دھری جاتی ہے کہ وہ دہشت گرد ہیں۔ انہیں انتہا پسند اور "میں نہ مانوں" کی گردان کرنے کا طعنہ دیا جاتا رہا ہے ——— یہ فہرست کافی طویل بھی ہے اور اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں جس پر فخر سے گردن بلند کی جا سکے۔ ان کی غیر معمولی بدقسمتی یہ ہے کہ اس بات کے باوجود کہ ان کا مقدمہ بہت مضبوط ہے کہ وہ اپنے وطن پر استعماری یلغار کی مزاحمت کرتے چلے آرہے ہیں، ان کا واسطہ یہودیوں سے پڑا ہے جو بین الاقوامی اور اخلاقی دنیا کی اصطلاحات میں تمام حریفوں کے مقابلے میں اخلاقی طور پر پیچیدہ ترین حریف ہیں۔ یہ پیچیدگی اس لیے پیدا ہوتی ہے کیونکہ یہودیوں کو خود طرح طرح سے ستایا گیا اور انہیں دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کی اس مظلومیت کی تاریخ خاصی طویل ہے۔ یہودیوں نے اپنا مقدر بنانے اور سنوارنے کے لیے آباد کار استعمار[1] استعمال کیا ہے لیکن یہ استعمار اپنے جلو میں جو کامل زیادتیاں اور ناانصافیاں لے کر آتا ہے، اہل مغرب کی نگاہوں میں ان کی شدت یا تو بہت کم ہو جاتی ہے اور یا غالباً بالکل معدوم ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک مسئلہ یہودیوں کی بقا کا ہے اور یہودیوں کی بقا انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ اس

---

[1] آباد کار استعمار (Settler colonialism) عام طور پر استعماری طاقتیں کسی ملک پر سیاسی یا اقتصادی قبضے پر ہی اکتفا کرتی ہیں، ان کے شہری وہاں آباد ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن جنوبی افریقہ اور فلسطین نہ صرف استعمار کا نشانہ بنے بلکہ یورپ کے آباد کار وہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ انھوں نے نہ صرف تمام وسائل پر قبضہ کر لیا بلکہ مقامی باشندوں کو مملکت کے اندر سے بھی بے دخل کر دیا۔ اسے آباد کار استعمار کہا جا سکتا ہے۔

پر نہایت سختی سے یقین رکھتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں مطلق شبہ نہیں کہ ہر سوچنے سمجھنے والا فلسطینی، خواہ وہ عسرت و افلاس کی چکی میں پس رہا ہو، یا وہ مجھ جیسا ہو جس کی آزمائشوں کو خوش قسمتی اور مراعات نے نسبتاً آسان بنا دیا ہے، کسی نہ کسی انداز سے یہ بات ضرور جانتا ہے کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے مابین جتنی بھی حقیقی مماثلتیں پائی جاتی ہیں، وہ اس وقت اس کے شعور میں بری طرح گڈمڈ ہونے لگتی ہیں جب وہ نہایت سنجیدگی کے عالم میں ان اختلافات پر غور کرتا ہے جو افریقہ کے سفید فام آبادکاروں اور یورپی یہود دشمنی سے بھاگ کر آنے والے یہودیوں کے مابین پائے جاتے ہیں تاہم اگرچہ افریقہ اور اسرائیل کے ایذا دہندگان مختلف ہیں، دونوں صورتوں میں ان کے ستم زدگان کو ایک ہی قسم کے زخم اور چوٹیں سہلانا پڑتی ہیں۔ تاہم غیر یورپی ستم رسیدہ قوموں کے مابین جو روابط قائم ہو چکے ہیں، اس نے ان کے اور یہودیوں کے مابین، جو غیر مشروط طور پر مغرب کا دم بھرتے ہیں اور اس کے ہتھکنڈے اختیار کر چکے ہیں، ایک خلیج حائل کر دی ہے۔

اب تک تو مشکلات کا انبار بہت گھمبیر ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہی مشکلات جزوی طور پر فلسطینیوں کی پائیداری اور ان کی بقا کا موجب بنی ہیں ——— اور یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہوا ہے کہ یہ مشکلات ان قوتوں کی پیدا کردہ ہیں جو ان کا وجود مٹانے کے درپے ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ وہ یہودی اور دوسرے لوگ (جن میں بعض عرب بھی شامل ہیں)، جن کا فلسطینیوں سے واسطہ پڑا ہے، بنیادی انسانی نفسیات کے بارے میں مکمل بے خبری اور عدم واقفیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، یہاں سیاست کی شیرہ چشمی اور جابر و سفاک طاقت

کی کرختگی اور اکھڑپن بالکل ایسی انداز میں نظر آتا ہے جیسا کسی نصابی کتاب میں درج ہوتا ہے۔ فلسطین کے صیہونی / یہودی نوآبادکار نظری اور عملی دونوں سطحوں پر شاید یہ توقع رکھتے تھے کہ اگر فلسطینیوں کو نظرانداز کر دیا جائے، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے یا ان سے پہلوتہی کی جائے تو وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے، منظر سے غائب ہو جائیں گے یا انہیں پریشان نہیں کریں گے۔ بعد ازاں انہیں خیال آیا کہ اگر فلسطینیوں کو جسمانی ایذائیں پہنچائی جائیں اور انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو وہ صیہونیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں گے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد مملکت اسرائیل نے مقامی عرب آبادی کو خود اپنے انسانی آثار اور نشانات مٹانے کے لیے استعمال کیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ (مار مار کر) انہیں انسانوں کے ایک ایسے طبقے میں تبدیل کر دیا جائے جن کے پاس سوچنے کے لیے اپنا دماغ نہ ہو، جو بمشکل حرکت کر سکیں اور مکمل طور پر مطیع و فرمانبردار رعایا بن جائیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد مغربی کنارے، جولان کی پہاڑیوں، غزہ کی پٹی اور سینائی کے مقبوضہ عرب علاقوں میں سفاکی، شقاوت اور درندگی نے ننگا ناچ ناچا۔ ایذا رسانی کا کون سا طریقہ تھا جو عربوں کے خلاف آزمایا نہیں گیا۔ انہیں عقوبت گاہوں[1] میں پابند سلاسل رکھا گیا،

---

[1] عقوبت گاہیں (Concentation Camps) یا حراست گاہیں۔ ایسی جگہوں کو کہتے ہیں جہاں ان افراد کو محبوس کیا جاتا ہے جو کسی حکومت کی مخالفت کرتے ہوں یا وہ سیاسی لحاظ سے مشکوک ہوں۔ ایسی عقوبت گاہوں کا آغاز برطانیہ نے انیسویں صدی میں جنوبی افریقہ میں جنگ بور کے دوران میں کیا تھا۔ ہٹلر نے انہیں پروان چڑھایا۔ بعض اشخاص کا دعویٰ ہے کہ نازی جرمنی میں ایسی دو ہزار عقوبت گاہیں قائم کی گئی

باقی اگلے صفحہ پر

ملک بدر کیا گیا، پورے پورے دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر۳۴۱:۔ عقوبت گاہیں قائم کی گئی تھیں۔ جہاں یہودیوں اور حکومت مخالف افراد کو زیر حراست رکھا جاتا تھا۔ ان افراد پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاتا تھا بلکہ اکثر کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ان عقوبت گاہوں میں سے بعض میں گیس چیمبر تعمیر کئے گئے اور ان گیس چیمبروں کو لوگوں کو اجتماعی طور پر ہلاک کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ صیہونیوں کا دعویٰ ہے کہ ان عقوبت گاہوں میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو لقمۂ اجل بنایا گیا۔

سوویت یونین نے اس قسم کی حراست گاہیں سائبیریا کے انتہائی ویران اور سرد علاقوں میں قائم کر رکھی ہیں۔ ویسے ان کا سلسلہ زاروں کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ یہاں بھی حکومت کے مخالفین کو رکھا جاتا ہے۔ عام معنوں میں یہ لوگ محبوس نہیں کہلا سکتے لیکن یہ بھاگ کر بھی کہیں نہیں جا سکتے کیونکہ سینکڑوں میل تک آبادی اور ہریالی کے کہیں نشان تک نہیں ملتے۔ جو بھاگے گا، وہ سردی اور بھوک سے مر جائے گا۔ تاہم ان حراست گاہوں میں قیدیوں سے زبردست مشقت لی جاتی ہے۔

[1] حال ہی میں کمیل نصر، ڈیبا لارنس اور روزمیری رتھ نے، جو امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پروفیسر کے عہدوں پر فائز ہیں، اسرائیل اور مقبوضہ عرب علاقوں کا دورہ کیا اور بیس صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ میں نہایت لرزہ خیز انکشافات کئے گئے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مغربی کنارے اور غزہ کے شہریوں کو ناکردہ جرائم کا اعتراف کرانے کے لیے "نہایت منظم طریقے سے ایذائیں پہنچائی جاتی ہیں"۔ بچوں سے ایسے افعال کے ارتکاب کا اعتراف کرایا جاتا ہے جو ان سے سرزد ہی نہیں ہوئے ہوتے۔ اور ان اعترافات کو عبرانی زبان میں قلم بند کیا جاتا ہے جو وہ پڑھ ہی نہیں سکتے۔

رپورٹ کے مطابق بچوں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے، انہیں ذلیل کیا جاتا ہے، ان پر جسمانی تشدد کیا جاتا ہے۔ انہیں گالیاں دی جاتی ہیں، انہیں تھپڑ مارے جاتے ہیں، گھونسے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کیمیاوی ادویات چھڑک کر فصلوں اور درختوں کی ہریالی ختم کر دی گئی۔[۵] مکانات کو زمین بوس کر دیا گیا، زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ ہزاروں افراد پر مشتمل آبادیوں کی "منتقلی" عمل میں لائی گئی۔ تاہم (ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود فلسطینیوں کا وجود پھر بھی مٹایا نہ جا سکا اور نہ انہیں منظر سے اوجھل کیا جا سکا ہے۔ وہ موجود ہیں، خواہ دنیا کی نگاہوں میں وہ لفظوں کی ایک ترکیب ——— "فلسطینی مسئلہ" ——— کی حیثیت ہی سے مصروف کار ہیں اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کے متعلق ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہ اسرائیل اور عرب ممالک کے مابین آخری ناقابلِ عبور کھائی کی علامت بنا ہوا ہے۔

میرا مسئلہ فلسطینی بقا ہے۔ پہلے بڑی بڑی مشکلات پر غور فرمائیں۔ فلسطینیوں کا طبقہ وہ طبقہ ہے جو انتشار و افتراق کا شکار ہے یہ مختلف ممالک اور خطوں میں بکھرا ہوا ہے، اس کے پاس کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں اسے اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو، اسے مسلسل و متواتر صیہونی ظلم و ستم اور عالمی بے اعتنائی سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ اسے (اس سے مشورہ کیے بغیر)

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۳۲۲: جانے نہیں دیا جاتا۔ گھنٹوں ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی رہتی ہیں۔ انہیں مکّوں، رسّوں اور لاٹھیوں سے پیٹا جاتا ہے۔ انہیں کئی کئی دن کھانے کو بھی کچھ نہیں دیا جاتا۔ گھنٹوں انہیں چھتوں سے لٹکایا جاتا ہے۔ ان پر جنسی تشدد سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔"

روزنامہ "نیشن" مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۸۸ء، لاہور

[۵] مثلاً فرانسیسی اخبار "Le Nouvel Observateur" کے تین جولائی ۱۹۷۲ء کے شمارے کے مطابق مغربی کنارے کے گاؤں "اکرابہ" میں ۲۸ اپریل ۱۹۷۲ء کو ہوائی جہاز کے ذریعے کیمیاوی مادے کا چھڑکاؤ کر کے گندم کی فصل بالکل برباد کر دی گئی۔

غیر حاضر یا بالکل ہی منفی "انٹرلوکوٹر"[۱] کا کردار سونپ دیا گیا ہے اور اس کا دل چاہے یا نہ چاہے، اس کا کام یہ ہے کہ وہ بین العرب حرکی قوتوں[۲] کے جوڑ توڑ، عظیم طاقتوں کی مسابقت اور محاذ آرائی اور مختلف علاقائی نظریاتی طاقتوں کی کشمکشوں میں کسی نہ کسی طور ضرور شریک ہو۔ اسے ہر طرف سے محکومی اور بیخ کنی کا اندیشہ دامن گیر رہتا ہے۔ تاہم موجود ناگوار اور غیر موافق حالات میں اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ ایک مکمل طور پر متحد فلسطینی خود ادعائی SELF ASSERTION کا اظہار کر سکیں گے۔ —— اس خود ادعائی کا اظہار صرف انہی صورتوں میں ممکن ہے کہ لفاظی سے کام لیا جائے انفرادی سطح پر لوگ تنگ آمد بجنگ آمد کوئی کارنامہ سر انجام دیں لیکن ان کاموں میں بھی ان کا ارادہ دوسرے لوگوں کے ارادے سے قطعی مختلف ہو سکتا ہے۔ جن ممالک میں وہ بطور مہمان مقیم ہیں، ان کے ساتھ ارادتاً لیکن انجام کار خطرناک محاذ آرائی شروع کر دیں —— آپ فلسطینیوں کے ایک اجتماعی مؤقف کا ذکر تو کر سکتے ہیں لیکن اس اجتماعی تاریخی آفت کے علاوہ، جس کا میں نے ذرا ہی پہلے ذکر کیا ہے۔ کوئی ایسی صورتِ حال نہیں

۱؎ انٹرلوکوٹر (interlocutor) ناچ اور گانے کے ایک پروگرام منسٹرل Ministrel ہیں، جبکہ کردار وحشیوں کی طرح اپنے منہ کالے کر لیتے ہیں، ایک کردار ہوتا ہے۔ خود یہ درمیان میں ہوتا ہے اور اس کے دونوں اطراف دو اور کردار ہوتے ہیں۔ اس کا کام ان دونوں کرداروں کے ساتھ جگت بازی، ٹھٹھہ مخول اور دل لگی کرنا ہوتا ہے۔

۲؎ حرکی قوتیں (Dynamics) وہ طبعی، ذہنی یا اخلاقی قوتیں جو ایک مؤثرہ دائرے کے اندر حرکت، عمل اور تغیر کا باعث بنتی ہے۔

جسے جامع فلسطینی صورتِ حال کہا جا سکے۔ مثلاً لبنان ہی کو لیں۔ وہاں مسلح
فلسطینی خاصے وسیع پیمانے پر موجود ہیں اور ان کی اس موجودگی کی علامت
وہ اختیار ہے جو (لبنان کے اندرونی معاملات میں) تنظیم آزادیٔ فلسطین
کو حاصل ہے۔ لیکن اصلاً لبنان کی نکیل شام کے ہاتھ میں ہے، اس لیے
شاہ مات دینے کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔ چنانچہ لبنان میں تنظیم
آزادیٔ فلسطین جس صورتِ حال سے دوچار ہے، شام کو اس میں دخیل
ہونے کا موقعہ میسر آتا رہتا ہے۔ ادھر اردن میں جو فلسطینی مقیم ہیں، انہیں
اردن کی شہریت اختیار کرنے کا حق تو حاصل ہے لیکن وہاں کی حکومت جسطرح
انکے امور میں دخیل ہوتی رہتی ہے (خود مختار مملکتوں کو یہ خصوصی حق حاصل ہے، کہ وہ ان باشندوں
کو، جو اسکی حدود کے اندر سکونت پذیر ہیں، اپنے احکام کے تابع بنا سکیں، اسلیے اردن بھی اس حق
کو استعمال کرتا ہے) وہ فلسطینیوں کیلئے خاصی تکلیف دہ بات ہے، کیونکہ وہ اس جنگ کو کبھی
فراموش نہیں کر سکتے جو ۱۹۷۰۔۷۱ء میں اردن نے انکے خلاف برپا کی تھی (اردن نے اسرائیل
کی انتقامی کارروائیوں سے بچنے کیلئے فلسطینیوں کا کچومر نکال دیا تھا کیونکہ فلسطینیوں
نے اسرائیل کے خلاف اپنی کارروائیوں کے لیے اردن کو اڈہ بنا رکھا تھا)۔ جہاں
تک عراق اور عرب خلیجی ریاستوں میں مقیم فلسطینیوں کا تعلق ہے، اگرچہ ان
میں سے بعض بہت نمایاں اور مقتدر حیثیت کے مالک ہیں، لیکن انہیں
بھی انہی قوانین کی اطاعت کرنا پڑتی ہے جو خود مقامی باشندوں کے لیے
شہری آزادیوں کے استعمال کو ناممکن بنا دیتے ہیں۔ مغربی کنارے اور
غزہ کے فلسطینی عربوں اور نام نہاد اسرائیلی عربوں کے گرد قوانین اور تسلط و
تغلب کا ایک ایسا جال بُن دیا گیا ہے کہ ان کے لیے اپنی اجتماعی صورتِ حال
کو اپنے اردن اور لبنان میں مقیم بہن بھائیوں کی صورتِ حال کے موافق

بنانا قریب قریب ایک ناممکن امر بن گیا ہے۔
اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے ہر فلسطینی طبقے کو کم از کم دو سطحوں پر لازماً جدوجہد کرنا ہوگی۔
اوّل:۔ ایسے فلسطینیوں کی حیثیت سے جن کی صیہونیت کیساتھ تاریخی مڈبھیڑ ہوئی اور اس مڈبھیڑ کے نتیجے کے طور پر انہیں اچانک اور بہ عجلت اپنے وطن سے محروم ہونا پڑا۔
دوم:۔ ایسے فلسطینیوں کی حیثیت سے، جو دنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہیں اور جنہیں اپنی روزمرہ کی زندگی کے وجودی ماحول میں اس دباؤ کے خلاف اپنا ردِّعمل ظاہر کرنا پڑتا ہے، جو ان پر اس ملک میں پڑتا ہے، جسے انہوں نے اپنا مستقر بنا لیا ہے۔
کسی بھی فلسطینی کا ایک فلسطینی کی حیثیت سے کوئی ملک نہیں ہے۔ یہ البتہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جس ملک میں وہ مقیم ہے، اس کا وہ ایک باشندہ تو ہے لیکن اس کے ساتھ اس کا دلی لگاؤ کوئی نہیں۔ جس طرح اردنی، شامی اور مغربی کنارے کے فلسطینی ہیں، اسی طرح لبنانی فلسطینی اور امریکی فلسطینی بھی ہیں۔ اسرائیلی یہودیوں یا دیگر عربوں کے مقابلے میں ان کی تعداد میں "نسبتاً" زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا پیچیدگیوں میں جو اضافہ ہو رہا ہے، اس کا دائرہ کار اجسام کی تعداد میں اضافے تک پھیلتا جا رہا ہے۔ آج نیویارک یا عمان جیسے مقامات پر بھی جن فلسطینی بچوں کی پیدائش ہو رہی ہے، وہ بھی اپنی شناخت اس حوالے سے کراتے ہیں کہ ان کا تعلق "شفا العمرو یا بیت المقدس یا طبریہ سے ہے۔ یہ دعاوی قریب قریب بے معنی ہیں سوائے اس کے کہ وہ متناقض طور پر فلسطینی موجودگی کے سلسلۂ نسب

میں، جس نے تاریخ اور جغرافیہ کی منطق کے علی الرغم اپنے آپ کو قائم کر رکھا ہے، اضافہ کیے جا رہے ہیں[۵۷]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کو زمان و مکان کے اجتماع ضدین کے نہایت ٹھوس سانچوں کے استعمال کے ذریعے جزئیات اور حقائق کا ادراک حاصل ہے۔ اس سانچے کا آغاز فلسطین میں ہوتا ہے جہاں زمین کا ایک ٹکڑا تھا، ایک گھر تھا، ایک علاقہ تھا، ایک گاؤں تھا، وہاں شاید صرف ایک ہی آجر تھا۔ جزوی طور پر یہ چیزیں حقیقی تھیں اور جزوی طور پر ان پر دیومالائی رنگ چڑھ گیا ہے۔ پھر منظر بدلتا ہے۔ اب یہ سانچہ فلسطین سے باہر نکلتا ہے۔ اب اس میں یہ احساس شامل ہونے لگتا ہے کہ ایک اجتماعی قومی شناخت کا فقدان پیدا ہو گیا ہے (اس فقدان کا احساس ان لوگوں کو بھی ہو جاتا ہے جو قدیم فلسطین میں ہی مقیم رہتے ہیں)۔ ٹھوس جلاوطنی کا آغاز ہوتا ہے۔ اب اس کا ہر دم، ہر آن ایسے قوانین سے براہ راست تصادم ہوتا رہتا ہے جو صرف فلسطینیوں کے لیے بنائے جاتے ہیں (بعد میں اس تصادم نے مختلف صورت اختیار کر لی۔ اب براہِ راست تصادم

---

۵۷ فلسطین میں جب اسرائیل قائم ہو گیا تو اکثر فلسطینیوں کو اپنے وطن سے دیس نکالا مل گیا، اور وہ دنیا کے مختلف ممالک میں بکھر گئے۔ چنانچہ جغرافیہ کی منطق کے مطابق دنیا میں فلسطین کے نام کا کوئی ملک موجود نہیں اور تاریخ کی منطق یہ کہے گی کہ جب فلسطین ہی نہیں رہا تو فلسطینیوں کی قوم کا وجود بھی مٹ گیا۔ لیکن فلسطینی ہیں کہ وہ کہیں بھی کیوں نہ ہوں اپنے آپ کو فلسطینی ہی کہلانے پر اصرار کرتے ہیں اور متناقض بات یہ ہے کہ ان کے دھڑا دھڑ جو بچے پیدا ہو رہے ہیں، وہ بھی فلسطینی شناخت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ یوں تاریخ اور جغرافیہ کی منطق کے علی الرغم فلسطینی تعداد کے اعتبار سے بڑھتے جا رہے ہیں، چہ جائیکہ وہ مٹ جائیں۔

کم ہی ہوتا ہے، البتہ ان سے پہلو بچانے کے لیے ذہانت اور مہارت استعمال کی جاتی ہے)۔ انجام کار اس سانچے کی صورت میں کچھ تبدیلی آتی ہے۔ اب اس میں نئے سرے سے امید کے رنگ بھرنا شروع ہو گئے ہیں، فلسطینیوں نے کچھ کارنامے بھی سرانجام دیئے ہیں، ان پر فخر و مباہات کا اظہار کیا جاتا ہے، یہ اظہار بھی اس سانچے کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ لیکن مخالفت و مخاصمت ہر جگہ موجود ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء کے بعد جس بچے نے بھی اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے، اس نے گم شدہ فلسطین کے ساتھ اپنے اصل تعلق کا اظہار بہ شدت کیا ہے۔ یہ اس بات کی علامتی شہادت ہے کہ اتنا کچھ بیت جانے کے باوجود فلسطینی اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ چنانچہ اگر ۱۹۴۸ء کا سال وجود میں نہ آتا، تو یہ بچہ یا بچی فلسطین ہی میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو جذباتی پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر وہ بچہ جو ۱۹۴۸ء کے بعد پیدا ہوا، اپنے سینے میں اپنے والدین کی دربدر کی ٹھوکروں اور آزمائشوں کو اپنے سینے میں سموئے ہوئے ہے۔ اس کے باوجود وہ ایک ایسا فرد بھی ہے جو اس قابل ہے کہ مستقبل کے بارے میں ہماری جو جدوجہد جاری ہے، اس کا وہ اظہار کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے انداز سے یہ بتا سکتا ہے کہ یہ مستقبل وہ خود ہی ہے۔

تاریخ میں جو دوسرے لوگ بے گھر اور بے در ہوئے، چند ظاہری صورتوں کے سوا ان کا بیسویں صدی کے فلسطینیوں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کس نے زیادہ مصائب جھیلے یا کس نے زیادہ نقصانات برداشت کئے۔ ایسے موازنے بنیادی طور پر نازیبا اور ناروا ہیں جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ روئے زمین پر کوئی دوسری

قوم ایسی نہیں جس پر ——— عرائم خواہ نیک ہوں یا بد ——— اتنے کثیر التعداد، لیکن جو دسترس سے باہر اور سمجھ سے بالا ہیں، مفاہیم کا بار لاد دیا گیا ہو جتنا کہ فلسطینیوں پر لادا گیا ہے۔ یہودیوں کے انٹرلوکوٹروں (interlocutors) کی حیثیت سے صیہونیت اور انجام کار سیاسی اور بلکہ روحانی یہودیت کے ساتھ بھی ان کے تعلق نے ان پر ایک مہیب بار گراں لاد دیا ہے۔ پھر ان کے اسلام، عرب قوم پرستی، تیسری دنیا کی سامراج اور نوآبادیات کے خلاف جدوجہد، عالم عیسائیت (اس کی ارض فلسطین کے ساتھ اپنی فقید المثال تاریخی اور وابستگی کے ہمراہ) مارکسٹوں اور دنیائے سوشلزم کے ساتھ، کچھ نہ کچھ تعلقات، کچھ نہ کچھ روابط ہیں ——— یہ تمام چیزیں مل ملا کر تشریحات و تعبیرات کے اتنے دروازے کھول دیتی ہیں اور فلسطینیوں کے تشخص کو وہ اتنے خانوں میں تقسیم کر دیتی ہیں کہ جن کی جدید سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں عملاً کوئی مثال نہیں ملتی ——— یہ ہے وہ حقیقت جو اس لیے مرعوب کن حد تک اور بھی گراں بار ہو جاتی ہے کیونکہ یہ منفی رویوں اور راگر مگر کی پیچیدگیوں میں سے چھن کر آتی ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ہم فلسطینی اپنے حق خود ارادیت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن ہیچ یہ آن پڑا ہے کہ ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں، ہماری دسترس میں کوئی متفقہ خطہ زمین نہیں جس پر ہم اپنی جدوجہد کو پروان چڑھا سکیں۔ جس قسم کی جدوجہد میں ہم مصروف ہیں، اس نے واضح طور پر ہمیں استعمار دشمن اور نسل پرستی کے مخالف بنا دیا ہے لیکن ہماری بھی مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ جو لوگ ہمارے مخالف ہیں، تاریخی طور پر وہ نسل پرستی کے سب سے بڑے نخچیر ہیں اور شاید ہمیں

اپنی جدوجہد جدید تاریخ کے ایک ایسے دور میں کرنا پڑ رہی ہے جو بیت
گڈھب اور بعد از استعمار دور ہے۔ صاف عیاں ہے کہ ہماری جدوجہد
ایک بہتر مستقبل کے لیے ہے لیکن یہاں بھی پیچ یہ آن پڑا ہے کہ وہ
مملکت، جو ہمیں ہمارا اپنا مستقبل بنانے سے روک رہی ہے، پہلے ہی
اپنی حرماں نصیب قوم کے لیے ایک مستقبل فراہم کر چکی ہے۔ ہم اب ضرور
ہیں لیکن محض عرب نہیں ہیں۔ ہم جلاوطن ضرور ہیں لیکن جن ممالک میں ہم
اپنی جلاوطنی کے دن کاٹ رہے ہیں، وہ ہمیں مہمان کا درجہ دے کر ہمیں
برداشت کر رہے ہیں۔ ہم اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں اپنے دکھڑے
ضرور سنا سکتے ہیں لیکن صرف مبصرین کی حیثیت سے۔ کسی بھی ایسی قوم
کے متعلق، جس کی بے گھری اور بے دری کے متعلق قطعاً کوئی ابہام نہیں پایا
جاتا، کوئی امریکی صدر (اس دور میں بھی جب کہ انسانی حقوق اور ولسن[1] کے
وضع کردہ حق خود ارادیت میں اتنی دلچسپی لی جا رہی ہے)، جس نے یقینی طور پر
کبھی جیتے جاگتے، گوشت پوست کے بنے ہوئے اصلی فلسطینی کو نہ تو کبھی
شرفِ ملاقات بخشا ہے اور نہ کبھی اس سے گفتگو کی ہے، محتاط انداز سے
بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں (یعنی فلسطینیوں کو) اپنے مستقبل کو طے کرنے

---

[1] ولسن: طامس وڈرو ولسن (۱۹۲۴-۱۸۵۶ء)، امریکی صدر (۲۱-۱۹۱۳ء)۔ انہوں نے جنگ عظیم اول کے اختتام پر دنیا میں مستقل امن قائم کرنے کے لیے چودہ نکات پیش کیے۔ ان میں سے ایک نکتہ قوموں کے حق خود ارادیت کے متعلق تھا لیکن یورپ کے حریص سیاستدان نہ صرف اپنی نوآبادیات سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ وہ تو جرمنی اور ترکی کی نوآبادیات پر بھی اپنے پنجے گاڑنے کے لیے پر تول رہے تھے، چنانچہ انہوں نے ولسن کی ایک نہ سنی، تاہم وہ ولسن کی تجویز پر لیگ آف نیشنز (جمعیت اقوام) قائم کرنے پر ضرور رضامند ہو گئے۔ لیکن ان کے اپنے ہی ملک کی کانگرس نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور یہی صدمہ ان کی موت کا سبب بنا۔

کے عمل میں شریک ہونا چاہیے (اس لفظ "خود ارادیت" کے گرد بیلے رقص کے انداز میں جو بھدے قدم حرکت کر رہے ہیں، وہ کتنے مضحک، بدصورت اور بے ڈھنگے ہیں)۔ چنانچہ ہر امریکی صدر کی حکومت نے ایسی پالیسیوں پر ہی عمل کیا ہے جن کا سراسر مقصد یہ ہے کہ فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کے متعلق جب اور جہاں مذاکرات ہوں، خود فلسطینیوں کو ان میں شریک ہونے سے روکنا ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا قومی گروہ روئے زمین پر موجود نہیں جس کے سیاسی اور ثقافتی عدم وجود کے متعلق اس پر ستم ڈھانے والوں نے اتنی طویل اور بلند آہنگ غوغا آرائی کی ہو بیشک یہ "ناقوم" اپنے ستم شعاروں کے خلاف احتجاج کرتی رہے، جوشیلی تقریریں کرتی رہے اور ان کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگائے رکھے، جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے۔ "ضرورت سے زیادہ"، "بالکل نہیں" اور "تقریباً اگر ایسا نہ ہوتا" جیسی تراکیب نامحسوس طور پر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں اور اس کی بھاری قیمت بھی انہیں ہی ادا کرنا پڑتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ نفسیاتی مشکلات نہیں ہیں، تاہم ان کے نفسیاتی عواقب ضرور ہیں۔ لیکن میں یہاں جن مشکلات کا ذکر کر رہا ہوں، وہ حقیقی تاریخی اور مادی مشکلات ہیں۔ یہی وہ مشکلات ہیں، جنہوں نے مظلوم فلسطینیوں کے مقدر کو اتنا غیر معمولی بنا دیا ہے۔ ان کی تاریخ اور معاصریت[۱] مکعبی[۲] ہے۔ تمام دخیل کار سطحیں کبھی ایک قلمرو اور کبھی دوسری قلمرو۔

---

۱ معاصر صورتِ حال۔

۲ مکعبی (Cubistic) مکعبیت (Cubism) دراصل ایک قسم کی مصوری ہے جس میں اشیاء کا خاکہ آسان طریقے سے پیش کیا جاتا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ثقافت کی قلم رو، سیاسی امور کی قلم رو، نظریاتی تشکیل کی قلم رو، قومی نظم کی قلم رو ———— میں اچانک گھس جاتی ہیں اور یوں وہ اپنی شناخت ایک مسئلے کے طور پر کراتی ہیں ———— اس طرح جو مسائل وجود میں آتے ہیں، وہ حقیقی مسائل ہیں، یہ سبھی مسائل توجہ مانگتے ہیں، کبھی وہ منت سماجت کرتے ہیں، کبھی پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری قبول کی جائے چنانچہ آج فلسطینی واقعیت کی یہ مجنونانہ حد تک اتنی سطحیں اور ان سطحوں کے

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۳۴۱: اس میں ایک شے بلاک، آئس کریم کون (CONE) یا گول گیند کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً ایک مصور کو بوتل جیسی ایک بالکل فطری شے نظر آتی ہے۔ لیکن جب کینوس پر وہ اس کی تصویر بناتا ہے، تو اس بوتل کو وہ مخروطی کے بجائے تکونی شکل دے دیتا ہے۔ مکعبیت کا مقصد یہ ہے کہ اشیا کی تصویر وہ بنائی جائے، جو مصور کے نقطہ نظر کے مطابق اس کی بہترین تصویر ہو سکتی ہے، نہ کہ وہ جو کہ وہ حقیقت میں نظر آتی ہے۔ اس سے ہمیں اس شے کا تاثر ملتا ہے کہ یہ چیز ہے کیا لیکن ساری چیز کو دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ مکعبیت میں چیزوں کی صورتیں اور شکلیں چپٹی ہوتی ہیں اور زاویوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں حقیقی سہ جہتی کیفیت شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔

مکعبیت کا آغاز پابلو پکاسو اور کچھ دوسرے مصوروں نے کیا تھا۔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیانی سالوں میں اس نے بہت فروغ پایا۔ فلسطینیوں کی صورتِ حال اس لیے مکعبی ہے کہ انہیں جو گوناگوں مسائل درپیش ہیں، وہ کوئی واضح شکل اختیار نہیں کر سکتے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا بھی نظر آتے ہیں۔

پیدا کردہ مسائل ہیں، وہ اس بھرپور ایجنڈے کا حصہ ہیں، جس کی شقوں پر اگر انفرادی طور پر غور کیا جائے تو ان کے سمجھ میں آنے کا امکان موجود ہے لیکن اگر اس ایجنڈے کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو پولیٹیکل سائنس کے بڑے بڑے ماہرین کی گھگھی بندھ جائے۔ غزہ اور مغربی کنارے اور خود اسرائیل میں سکونت پذیر فلسطینیوں کے مسائل کو جنہوں نے ابھی ابھی سر اٹھانا شروع کیا ہے لیکن جن کی نوعیت بہرحال جداگانہ ہے، تو فی الحال ایک طرف رکھیں، تنظیم آزادیٔ فلسطین کو روزانہ سعودی عرب، چین اور روس کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں فیصلے کرنا پڑتے ہیں، پھر ہر عرب ملک کے ساتھ، جن میں شام اور مصر بھی شامل ہیں اور جہاں فلسطینیوں کے اچھے خاصے سیاسی مفادات داؤں پر لگے ہوئے ہیں، روابط کے متعلق فیصلے الگ منتظر رہتے ہیں۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اقوام متحدہ اور اس کی ذیلی تنظیموں میں تنظیم آزادیٔ فلسطین کے امور کا مسئلہ اپنی جگہ پر ہے۔ مثلاً لبنان کا معاملہ لے لیں۔ وہاں ہزاروں ہی فلسطینی موجود ہیں۔ انہیں روزانہ خوراک پہنچانا، ان کے بچوں کے لیے تعلیم کا بندوبست کرنا، انہیں مسلح کرنا، ان کی تربیت کرنا اور انہیں معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام امور کو احسن طریقے سے سرانجام دینا آسان کام نہیں ہے۔ ہر آن شامی فوج، لبنان کے دائیں بازو اور ان کے مقامی اتحادیوں کے ساتھ مڈبھیڑ کا اندیشہ رہتا ہے۔ پھر خود فلسطینی مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر طبقے کی اپنی معینہ ترجیحات ہیں۔ چنانچہ ان مختلف طبقات کے مابین تعلقات کو فروغ دینا، ان کے مابین کشیدگی کو کم کرنا یا ختم کرنا اور ان کے مابین اتحاد قائم کرنا، یہ مسائل اپنی جگہ پر ہیں۔ اور سب سے

بڑھ کر یہ کہ اسرائیل پر، جس کی سرحدیں فلسطینی جلاوطنوں کے لیے بہت دور ہیں اور جن تک پہنچنا بہت دشوار نظر آتا ہے، مسلسل دباؤ کیسے برقرار رکھا جائے۔ چنانچہ فلسطینی نفس میں ہم جس قسم کے بھی نفسیاتی مسائل دریافت کرنے کے آرزومند ہوں ——— وہ لوگ جو اپنے آپ کو فلسطینی امور کے "ماہرین" تصور کرتے ہیں اور ان کے قومی کردار کا تجزیہ کرتے رہتے ہیں، ان کے ہاتھ یہ نیا مشغلہ آگیا ہے ——— میرے خیال میں ان کی نوعیت ان کی اہم سرمادی ضروریات کی اس زنجیر کے مقابلے میں بالکل عارضی ہے، اس لیے ان پر اتنی توجہ دینے کا کوئی جواز نہیں۔

۱۹۴۸ء سے فلسطینی لغوی طور پر جس الجھن میں گرفتار ہیں، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بہرحال فلسطینی ہے تو وہ کسی نہ کسی قسم کے یوٹوپیا[ا] ———

[ا] یوٹوپیا (Utopia) یہ لفظ ایک ایسے خیالی ملک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جہاں ہر چیز کامل ہو — جہاں کے باشندے مکمل اتحاد و یگانگت کی فضا میں رہتے ہوں انہیں جس چیز کی بھی ضرورت پیش آئے، وہ انہیں بآسانی دستیاب ہو جائے اور جہاں مسرت اور شادمانی کے نقارے بجتے ہوں۔ اصل میں یہ ایک کتاب کا نام ہے جو ایک انگریز مصنف سر ٹامس مور ۱۴۷۸ء–۱۵۳۵ء نے آج سے تقریباً چار سو سال قبل تحریر کی تھی۔ اس کتاب میں اس نے ایک ایسے ملک کا ذکر تفصیل سے بیان کیا ہے، جہاں کی ہر شے کامل تھی متعدد مصنفین نے مختلف ناموں کے تحت ایسے مقامات اور ممالک کا ذکر کیا ہے انہیں باغ ارم یا باغ عدن بھی کہا جا سکتا ہے۔ افلاطون نے "جمہوریت" میں ایک مثالی حکومت کا نقشہ کھینچا ہے۔ جیمز ہلٹن نے اپنی کتاب "گمشدہ افق" میں ایک مقام "شنگریلا" کا ذکر کیا ہے جہاں مدتوں کوئی شخص بوڑھا نہیں ہوتا۔ ہماری "الف لیلہ" اور "داستانیں" ایسی حکایات سے بھری پڑی ہیں جن میں ہر لحاظ سے مکمل مقامات کی تصویر کشی کی گئی ہے

حقیقتاً ایسا مقام جس کا کوئی وجود نہیں ــــــــ میں ضرور رہا ہے۔
چنانچہ بالکل اتنا ہی لغوی طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آج فلسطینی جس جدوجہد
میں مصروف ہیں، وہ فی زمانہ ایک ایسا رخ اختیار کر چکی ہے کہ دنیا کا تقریباً
ہر شخص اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہے۔ اور یہ صورتِ حال اس امر کی
وضاحت کرتی ہے جس کا ذکر میں بعد ازاں کروں گا کہ فلسطینی سیاست میں
تبدیلی کیسے رُونما ہوئی اور وہ کس طرح خیالوں کی دنیا سے نکل کر ایک ایسے
موڑ پر پہنچ گئی کہ اب اس نے ایک نہایت مؤثر صورت اختیار کر لی ہے۔
فلسطینی زندگی کی مکعبی صورت کا ایک پہلو، جو متعدد غلطیوں کی تلافی کر دیتا
ہے، یہ ہے کہ فلسطینیوں نے اپنی منزل ایک ایسے علاقے یا خطے کا
حصول قرار دے دیا ہے جہاں وہ ایک قوم کی حیثیت سے آباد ہو سکیں۔
محض یہ حقیقت کہ ماضی میں وہ اس قسم کے ایک خطے میں سکونت پذیر تھے
یا موجودہ زمانے کی یہ حقیقت کہ اب وہ "نا اشخاص" بن چکے ہیں، فی زمانہ
ان میں اپنے برحق ہونے کا نہ تو اتنا احساس پیدا کرتی ہے اور نہ ان
میں وہ غیض و غضب کی کیفیت ابھارتی ہے، جو انہیں مسلسل جدوجہد
پر اکسانے کے لیے کافی ہو۔ ۱۹۶۷ کی جنگ نے، اور ستم ظریفی کی بات
یہ ہے کہ صہیونیوں کی طرف سے مزید فلسطینی علاقوں کے حصول نے،
جلاوطن اور مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے فلسطینیوں کا اپنے علاقے
سے رابطہ قائم کر دیا ہے۔ صہیونیوں نے فلسطینیوں کے قومی وجود کو مٹانے
کے لیے پیچ در پیچ قواعد و ضوابط کی بھول بھلیاں تشکیل کی تھیں۔ ان کا
خیال تھا کہ قواعد و ضوابط کی ان بھول بھلیوں کے ذریعے وہ فلسطینیوں کو
اپنے وطن میں ٹکنے نہیں دیں گے۔ انہیں دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر

ہونے پر مجبور کر دیں گے اور یوں ان کی وحشیانہ موجودگی سے چھٹکارا حاصل کریں گے۔ وہ ان سے سلوک بھی اس طور کرتے تھے گویا کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں۔ اب تک یہ پالیسی خفیہ تھی اور اس پر عمل بھی رازداری سے ہوتا تھا۔ لیکن ۱۹۶۷ء کے بعد ان کی قلعی کھل گئی اور اپنی اس پالیسی پر وہ کھلے بندوں عمل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب اسرائیل کی نئی حدود کے اندر لاکھوں فلسطینی تھے اور صریحی طور پر ان کے سروں پر اسرائیل سوار تھا جس نے پوری دنیا کی نظروں کے سامنے، جو فوجی قبضے کے معنی و مفہوم کو سمجھتی تھی، ان پر حکومت کرنے کے لیے فوجی حکومت قائم کر دی۔ فلسطینیوں کو امن کی جو تلاش تھی، اس نے اب ٹھوس معانی اختیار کر لیے جو یہ تھے کہ (مقبوضہ علاقوں سے) اسرائیلی قبضے کو ختم کیا جائے۔ ساری علاقائی گتھی کو سلجھانے کے تمام امکانی حلوں کے فریم ورک میں فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کا انحصار زیادہ تر اس ضرورت پر ہے کہ فلسطین کے اصل قدیم علاقے کے ایک حصے کو آزاد کرا کر وہاں ایک خود مختار اور آزاد مملکت قائم کی جائے۔

تاہم اگر فلسطینی مسئلہ محض اتنا سا ہوتا، تو اس سے بہت زیادہ آسانی سے نپٹا جا سکتا تھا۔ ایک نعرے کی حیثیت سے، جو سب کو ایک مقام پر اکٹھا کر دے، فلسطین کی ایک کہیں بڑی بین العرب اور بین الاقوامی (بین الفلسطینی جہت کا ذکر فی الحال چھوڑیں) جہت ہے۔ کسی بھی شخص کے ذہن میں، جس نے ایک حمایتی کی حیثیت سے اپنی توانائیاں صرف کی ہیں، اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں پایا جاتا کہ "فلسطین" نے بے شمار دوسرے مسائل کی لگامیں ڈھیلی کر دی ہیں۔ یہ لفظ معاشرتی ناانصافی کے خلاف جدوجہد

کی علامت بن چکا ہے ۔۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں کے دوران میں مصری طلبا کے جو مظاہرے ہوتے تھے، ان میں ایک نعرہ اکثر لگایا جاتا تھا اور وہ یہ تھا کہ "ہم سب فلسطینی ہیں"۔ ۱۹۷۸ء میں شاہ کے خلاف ایرانی مظاہرین اپنا رشتہ فلسطینیوں کے ساتھ جوڑا کرتے تھے۔ غیر سفید فام دنیا میں یہ شعور عام ہو گیا ہے کہ سیاست جدید میں عوام کے جم غفیر پر اس طور حکومت کرنے کا جو رجحان در آیا ہے کہ انھیں (آسانی سے) ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے، وہ صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے، چوں تک نہیں کرتے اور خاموش رہتے ہیں، اور سیاسی طور پر غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی واضح مثال کی ضرورت ہو تو جو کچھ فلسطینیوں پر بیتی، اس میں بآسانی مل سکے گی۔۔۔

اور اگر مزید مثالوں کی تلاش ہو تو ان نوآزاد ممالک کو لے لیں جو پہلے استعماری طاقتوں کے زیر نگیں تھے اور اب جن پر جمہوریت مخالف فوجی حکومتیں مسلط ہیں۔ اب دیکھ لیں انکے عوام کیساتھ مختلف طریقوں سے کیا سلوک ہو رہا ہے[۵]۔ وہ اگر وہ جو کسی نہ کسی قسم کی مزاحمتی تحریکوں میں حصہ لے رہے ہیں، اپنا مواد اور قوت دونوں فلسطینی تحریک مزاحمت سے حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی مفید تر بات یہ ہے کہ وہ اپنی تحریکوں کی جزئیات بھی فلسطینیوں ہی سے اخذ کرتے ہیں اور ان پر جو ظلم و ستم ہوتا ہے اسکی چھوٹی سی چھوٹی تفصیل کے متعلق ان کا مثبت رویہ کیا ہونا چاہیے، وہ بھی انہیں فلسطینیوں ہی سے ملتا ہے اگر ہم

---

۵ اس موضوع کے متعلق یورپ کے قدرے غیر متعصبانہ اور غیر ریاکارانہ رویے کا اندازہ لگانے کے لیے Gerard Chaliand کی کتاب "Restoration in the Third World: Myths and Prospects" مطبوعہ وائی کنگ پریس، نیویارک، ۱۹۷۷ء کا مطالعہ کیجیے۔

فلسطین کے متعلق اس انداز سے سوچیں کہ یہ دو طرح کے فرائض سرانجام دے رہا ہے، ایک تو اس حیثیت سے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں لوٹ کر جانا ہے اور دوسرے اس حیثیت سے کہ یہ ایک بالکل نئی جگہ ہوگی۔ یعنی یہ جزوی طور پر ایک بحال شدہ ماضی اور جزوی طور پر ایک نئے اور انوکھے مستقبل کا تصور پیش کر رہا ہے، یا یوں سمجھیں کہ یہ غالباً ایک تاریخی سانحہ بھی ہے جو اپنی شکل وصورت تبدیل کر کے ایک بہتر مستقبل کی امید بن گیا ہے، تو شاید ہم اس لفظ کے معانی بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے، ان کی سیاسی جدوجہد دو نقاط کے مابین جاری ہے۔ ایک نقطے پر وہ فلسطینی ہیں جو اپنے وطن واپس لوٹنا چاہتے ہیں اور اپنی تاریخ، ثقافت، ورثے اور سیاسی حقیقت کے ساتھ کوئی نہ کوئی رابطہ استوار کرنے کے متمنی ہیں۔ دوسرے نقطے پر وہ فلسطینی ہیں جو ایک نئے اور انوکھے تجربے سے دوچار ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ ان کے وطن میں ایک نیا معاشرہ قائم ہو۔ یہ نیا معاشرہ مشتمل تو مختلف الخیال اور مختلف العقائد گروہوں پر ہوگا لیکن اصلاً جمہوری ہوگا۔ اس معاشرے میں جو حکومت قائم ہوگی، اس کی اساس ہر قسم کے مذہبی اور نسلی امتیاز کے خاتمے پر ہوگی۔ لوگوں کو نہ صرف سچی شہری آزادیاں حاصل ہوں گی بلکہ خود حکومت بھی نمائندہ اور ذمہ دار ہوگی۔ ان دونوں گروہوں کی یہ سوچ اگرچہ مختلف ہے لیکن اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ سوچ ہر فریق کے جغرافیائی ماحول کی مرہونِ منت ہے، جس میں وہ رہ رہا ہے۔ وہ فلسطینی، جو واضح طور پر جلاوطنی کی کیفیت میں ہیں، واپس لوٹنے کے متمنی ہیں۔ لیکن وہ فلسطینی جو اندرونی طور پر جلاوطن ہیں (یعنی یا تو خود اسرائیل کے اندر مقیم ہیں اور یا پھر فوجی قبضے کے تحت

اپنی زندگی کے ایام گزار رہے ہیں)، وہاں جہاں وہ رہائش پذیر ہیں، آزادی، خودمختاری اور حکومت خوداختیاری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ الجلیل یا جافہ کا ایک سابق باشندہ، جو اس وقت لبنان یا کویت میں پناہ گزین کی حیثیت سے سکونت پذیر ہے، بنیادی طور پر یوں سوچتا ہے کہ جب ۱۹۴۸ء یا اس کے بعد اسے اپنے وطن سے نکلنا پڑا۔ تو اس نے کیا کھویا تھا۔ وہ چاہتا ہے کہ یا تو اسے واپس فلسطین پہنچا دیا جائے اور یا پھر وہ وہاں لوٹنے کے لیے آمادۂ پیکار ہے۔ بہرحال اس کا مطمح نظر واپسی ہے۔ اس کے برعکس وہ فلسطینی ہے، جو اس وقت بھی غزہ، الناصرہ یا نابلوس میں مقیم ہے، اس کا قابض طاقت یا اس طاقت کے اختیارات کی علامات کے ساتھ روزانہ واسطہ پڑتا ہے یا اسے ان کے ہاتھوں تذلیل برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس قابض طاقت اور اس کے کارندوں نے اس پر جو بلا روک ٹوک تسلط و تغلب حاصل کر رکھا ہے، وہ چاہتا ہے، کہ یہ بلا کسی نہ کسی طور اس کے سر سے ٹل جائے اور اسے اس سے نجات حاصل ہو جائے۔ پھر ایک عرب باشندہ وہ بھی ہے جو اندرونِ اسرائیل رہائش پذیر ہے کہ اسے "غیر یہودی" سمجھا جاتا ہے یوں اس کی شناخت بھی منفی انداز سے ہوتی ہے اور اس کے ساتھ برتاؤ بھی منفی طرز کا ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے اس منفی شناخت اور منفی سلوک سے چھٹکارا ابھی حاصل ہو۔ اسرائیل اور مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی دونوں ہی ایک نیا ماحول اور نئی صورت حال کے متمنی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف وہ فلسطینی ہیں جو سفر کا قصد کیے ہوئے ہیں اور دوسری طرف وہ فلسطینی ہیں جو اپنے مستقر ہی میں قیام پذیر رہنا چاہتے ہیں۔ دونوں

ہی اچھی خاصی انقلابی تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔ لیکن کیا یہ خواہشات، جن کی جڑیں فوری توجہ کے مستحق مادی حالات میں پیوستہ ہیں، ایک دوسری کا تکملہ ہیں ؟ کیا فلسطینیوں کی سیاسی امنگوں میں کوئی داخلی ہم آہنگی یا یگانگت موجود ہے ؟

اگر اس کا تعجیل سے یہ جواب دیا جائے کہ "ہاں، موجود ہے" تو یہ یا تو بالکل لفاظی ہوگی اور یا پھر بالکل ہی ایک عمومی نوعیت کا جواب ہوگا۔ بیتی تاریخ کے نشانات نے ______ جن کی فہرست میں مرتب کرنے کی سعی کر رہا ہوں ______ فلسطینی قوم کو نہایت شدت سے مختلف دھڑوں اور گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ گزشتہ نسل کی زندگیوں میں فلسطینی تاریخ نے جو کروٹیں بدلیں، اس کے چند سادہ اور بنیادی حقائق پر ذرا غور فرمائیں تو آپ کو ان لوگوں کے، جو جلاوطن ہوئے اور ان لوگوں کے، جو اپنے گھروں میں مقیم رہے، مابین بہت نمایاں اختلافات نظر آئیں گے۔ اگر ہم اپنی بات کا آغاز اس مفروضے کو صحیح مان کر بھی کریں کہ ۱۹۴۸ء کا سال ہم سب کے لیے ایک ہی معنی رکھتا تھا، تو یہاں یہ چند تفصیلات پیش کی جاتی ہیں جن پر لازماً دھیان دینا ہوگا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد جو فلسطینی اسرائیل میں مقیم رہا، اس کا افق صہیونی قوانین اور صہیونی قانونی موشگافیاں متعین کرتی تھیں۔ وہ حتی الامکان یہ کوشش کرتا تھا کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کے بحث مباحثوں میں، قانونی عدالتوں میں اور اس اراضی کے بارے میں، جس کی ملکیت مسلسل متنازعہ رہی، اپنی شناخت مپائی (Mapai) جیسی سیاسی جماعتوں کے سیاق و سباق میں کرائے (کہ اس کی ہمدردیاں اس یا اس جماعت کے ساتھ ہیں) لیکن وہ اپنی قابل شناخت

موجودگی اور راستواری سے ہمیشہ محروم رہا (کوئی اسرائیلی حکومت یا اس کا کوئی کارندہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ وہاں موجود ہے)۔ یہودیوں کے مقابلے میں اندرونِ اسرائیل اس کے لیے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع قریب قریب ناپید تھے (اور اب تک ناپید چلے آرہے ہیں) جہاں تک عربوں کے ان بچوں کا تعلق ہے، جو مدارس میں داخل ہونے کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں، ان کے سلسلے میں حکومت لازمی تعلیم کا صحیح معانی میں نفاذ نہیں کرتی۔ پھر جو بچے مدارس میں داخل بھی ہو جاتے ہیں، ان میں سے اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اساتذہ کی شدید کمی ہے اور تھوڑے بہت اساتذہ جو تعینات کئے جاتے ہیں، وہ تقریباً سبھی کے سبھی غیر تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ صرف ۱۹۵۶ء میں مملکت نے اساتذہ کی تربیت کے لیے جافہ میں ایک ٹریننگ کالج قائم کیا۔ اس کے باوجود عربوں کے معیارِ تعلیم کو بلند کرنے کیلئے سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس شفیق بے التفاتی کی پالیسی پر جو عمل ہو رہا ہے، شاید اس کا کوئی جواز بھی ہو کیونکہ اسرائیل یہودیوں کی مملکت ہے، غیر یہودیوں کی نہیں۔ تاہم اس سے اسرائیل کے عربوں کو جو صریحی نقصان پہنچ چکا ہے اور پہنچ رہا ہے اس کے سیاسی نتائج، جن کی آسانی کے ساتھ تصدیق کی جاسکتی ہے، یہ برآمد ہوئے ہیں کہ اسرائیل کے عرب شہری اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس کرتے ہیں اور ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔

اندرونِ اسرائیل عربوں کو روائتی طور پر ایسے اشخاص تصور کیا جاتا ہے جنہیں کبھی کوئی قومی شعور حاصل کرنے سے بہر طور روکتا ہو گا نصاب تعلیم

اچانک تبدیل کر دیا جاتا ہے ۔ عربوں کے سکولوں اور ان سکولوں میں دستیاب سہولتوں کا حال واضح طور پر بہت پتلا ہے ۔ انہیں ہر ممکن طریقے سے یہ سکھایا اور سمجھایا جاتا ہے کہ ان کا اور کمتری کا جنم جنم کا ساتھ ہے ، وہ اس سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکیں گے اور انہیں ہمیشہ تذلیل کن طریقے سے مملکت پر انحصار کرنا ہوگا ۔ اندرونِ اسرائیل جو چار لاکھ عرب باشندے موجود ہیں ، ۱۹۷۰ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں تک ان میں سے صرف پانچ سو گریجویٹ تھے ۔ ان اعداد و شمار کا ان اعداد و شمار سے موازنہ کریں جو بیرونِ اسرائیل مقیم پناہ گزین فلسطینیوں کی تعلیمی استعداد سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک ہزار پناہ گزین فلسطینیوں میں گیارہ فلسطینی ایسے ہیں جو یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم پا چکے ہیں یا پا رہے ہیں ۔ (اندرون اسرائیل) پیشہ ور تعلیم کی درسگاہوں میں (عرب) طلبا کی تعداد کافی زیادہ تھی لیکن ان درسگاہوں میں بھی ، جیسا کہ صابری جریس تحریر کرتا ہے ، "ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت یہودی اور غیر یہودی طلبا کے مابین نسبت کا فقدان برقرار رکھا جاتا ہے ۔ "عرب علاقوں میں پیشہ ور تربیت کے صرف انیس سکول ہیں ۔ ان سکولوں میں ۱۴۸۰ طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں ۔ اس کے مقابلے میں یہودی علاقوں میں ایسے سکولوں کی تعداد اڑھائی سو ہے اور ۵۲۰۸۴۳ طلبا زیر تعلیم ہیں ۔ سکولوں اور یونیورسٹیوں کے سارے نظام میں عربی پر عبرانی کو ترجیح دی جاتی ہے ۔ عربوں کی تاریخ پر یہودیوں کی تاریخ کو فوقیت حاصل ہے ۔ ("یونیورسٹی کی چار سالہ تعلیم کے پروگرام میں چار سو سولہ گھنٹے آرٹس کے مضامین کے لیے وقف ہیں ۔ ان چار سو سولہ گھنٹوں میں صرف بتیس گھنٹے عربوں کی تاریخ کی تدریس کے لیے مخصوص ہیں اور ان میں بھی

مسلم ہسپانیہ کی تاریخ کو ہاتھ تک نہیں لگایا جاتا ..... اس کے برعکس یہودی تاریخ ہر درجے کے طالب علموں کو وسیع پیمانے پر پڑھائی جاتی ہے۔) اور جب عربوں سے متعلقہ موضوعات کی تدریس کی بھی جاتی ہے، تو انہیں ایسے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے جہاں زورِ عربوں کے زوال، بدعنوانیوں یا تشدد پر ہو۔ حال ہی میں جو امتحانات منعقد ہوئے، ان میں جس قسم کے سوالات پوچھے گئے، ان کے جائزے پر معلوم ہوا کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہارون الرشید یا (سلطان) صلاح الدین (ایوبی) کے متعلق ایک سوال بھی نہیں دیا گیا۔ جریس نے اس سلسلے میں چند مزید تفصیلات دی ہیں اور بتایا ہے کہ عربوں کے بارے میں حکومت کی تعلیمی پالیسیوں کا ہدف یہ ہے کہ عربوں کو نہ صرف "مملکت کے وفادار شہری" بنایا جائے بلکہ ان کے ذہنوں میں یہ "احساس بھی اجاگر کر دیا جائے کہ اسرائیل میں ان کی حیثیت بس اتنی ہے کہ یہاں وہ الگ تھلگ زندگی گزارتے رہیں" ـــــ تعلیم کے یہ مقاصد ایک سرکاری کمیٹی نے متعین کئے تھے جو عربوں کے نصاب تعلیم میں ترامیم کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ کمیٹی کی یہ رپورٹ روزنامہ "ہارٹز" نے اپنی ۱۹ر مارچ ۱۹۷۱ر کے شمارے میں شائع کی تھی۔ جریس لکھتا ہے:

> سیاسی موضوعات کو (تعلیمی نصاب میں بالعموم اور) عربوں اور یہودیوں کی تاریخ اور لسانی تدریس کی کتابوں میں بالخصوص وسیع پیمانے پر گوندھ دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے کسی بھی پروگرام پر اگر محض طائرانہ نگاہ بھی ڈالی جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اسے یوں آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے کہ یہودیوں کی تاریخ کی تحسین و توصیف کے توپل باندھ دیئے گئے ہیں اور اسے یوں

پیش کیا گیا ہے کہ اس کے بہترین اوصاف نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک عربوں کی تاریخ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں اس قدر کجروی اختیار کی جاتی ہے کہ وہ افترا اور دروغ گوئی کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔ عربوں کی تاریخ کو انقلابات، قتل و غارت گری اور پیہم دیرینہ عداوتوں کا ایک سلسلہ بنا کر کچھ اس طور پیش کیا جاتا ہے کہ ان (عربوں) کے کارنامے اور کامرانیاں دھندلکوں کی اوٹ میں چھپ جاتی ہیں۔ اسی طرح عربوں کی تاریخ کے مطالعے کے لیے جو وقت دیا جاتا ہے، وہ بے حد قلیل ہے، مثلاً پانچویں جماعت کے دس دس سالہ طلبا دس گھنٹے (یا پیریڈ) تو عبرانیوں کے مطالعے پر صرف کرتے ہیں جبکہ "جزیرہ نمائے عرب" کے مطالعے کے لیے صرف پانچ گھنٹے (یا پانچ پیریڈ) مخصوص ہیں۔ اور جب جزیرہ نمائے عرب کو زیرِ مطالعہ لایا بھی جاتا ہے تو پروگرام کی ہدایات کے مطابق وہاں بھی توجہ زیادہ تر وہاں کے یہودی طبقوں پر دی جاتی ہے۔ چھٹی جماعت کے لیے مطالعۂ تاریخ کے چونسٹھ پیریڈ ہیں۔ ان میں سے نام نہاد "اسلامی تاریخ" کے لیے صرف تیس پیریڈ وقف کئے جاتے ہیں۔ اس تاریخ کا عرصہ ابتدائے اسلام سے تیرھویں صدی کے اختتام تک پر محیط ہے، لیکن اس میں بھی (حضرت موسیٰ (علیہ السلام) مائیمونی دیز[1]

---

[1] مائیمونی دیز (Maimonides) :(۱۱۳۵-۱۲۰۴): ایک ہسپانوی نژاد یہودی فلسفی۔

اور ہسپانیہ کے یہودی شاعر ابنِ جبیرل شامل ہیں۔ ساتویں جماعت کے نصاب میں عرب تاریخ کا کوئی ذکر نہیں، تاہم تاریخ کے مطالعہ کے لیے جو پیریڈ مخصوص کئے جاتے ہیں، ان کا چھٹا حصہ اسرائیل اور دیگر ممالک میں منتشر یہودیوں کے مابین تعلقات کے مطالعے کے لیے مخصوص ہے۔ آٹھویں جماعت میں "مملکت اسرائیل" کی تاریخ کے مطالعے کے لیے تیس گھنٹے اور انیسویں صدی سے لے کر موجودہ زمانے تک عربوں کی تاریخ کے مطالعے کے لیے صرف دس گھنٹے دیئے جاتے ہیں۔ یوں عربوں کی تاریخ میں پانچ صدیوں کا خلا باقی رہ جاتا ہے۔ آٹھویں جماعت میں جن موضوعات کو شامل تدریس کیا گیا ہے، ان میں شام اور لبنان کے مذہبی تنازعات اور ۱۸۶۰ء میں دروزیوں اور مارونی عیسائیوں کے مابین دنگا فساد بھی شامل ہے۔[۱]

---

[۱] صابری جریس: "اسرائیل کے عرب" (منتھلی ریویو پریس، نیویارک، ۱۹۷۶ء) صفحات نمبر ۲۱۰-۲۱۲

یہ تو ان عربوں کا حال ہوا جو اندرونِ اسرائیل آباد ہیں۔ رہے وہ عرب، جو ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اسرائیل کے زیر تسلط آئے، اور مغربی کنارے غزہ میں آباد ہیں، تو ان کا حال بھی کچھ اچھا نہیں۔ پاکستان کے مشہور ادیب قدرت اللہ شہاب ایک ایرانی کا بھیس بدل کر اسرائیل گئے اور وہاں کے حالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے آئے۔ وہ فرماتے ہیں "جو عرب ممالک اسرائیل نے فتح کر لیے تھے۔ مغربی کنارہ، یروشلم، غزہ کی پٹی، وہاں یونیسکو کے بہت سے سکول تھے جسے یونیسکو چلاتی تھی، فلسطینی مہاجر بچوں کے لیے، اور وہاں مسلمان اساتذہ تعینات کیے جاتے تھے۔ ان کا انتخاب یونیسکو کرتی تھی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حالیہ دنوں تک اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسرائیل کے عرب شہری دوسرے عربوں اور فلسطینیوں سے الگ تھلگ ہو کر رہ گئے۔ اس نے دوسرے عربوں اور فلسطینیوں کا اسرائیل کے عرب فلسطینیوں کے ساتھ کسی قسم کی تفہیم تک پہنچنا بھی خاصا دشوار بنا دیا ہے۔ اس کا ایک مؤثر سیاسی نتیجہ برآمد

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۳۵۵: ان علاقوں کے نمائندوں کے ذریعے۔ اور نصاب کی کتابیں ہر سکول میں عربوں کی تصنیف کی ہوئی اور یونیسکو سے منظور کی ہوئی وہاں لگائی جاتی تھیں۔ جب ان علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تو انہوں نے مسلمان اساتذہ کو گھر بٹھا دیا۔۔۔۔ اور کتابیں جو یونیسکو کی منظور شدہ تھیں، وہ بھی بدل دیں اور انکی جگہ اپنی لکھائی ہوئی کتابیں لگا دیں۔ ان کتابوں میں اسلام کے خلاف، عرب کلچر کے خلاف، اسلامی تاریخ کے خلاف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے خلاف اتنی غلط اور گمراہ کن باتیں لکھی ہوئی تھیں کہ کئی فلسطینی بچے پڑھنے سے انکار کر دیتے تھے۔ انکو سزائیں دیجاتی تھیں۔ چنانچہ عرب ممالک کے نمائندے جب ایگزیکٹو بورڈ میں آتے تھے تو کتابیں بھی لاتے اور احتجاج بھی کرتے تھے۔ دو دفعہ ایگزیکٹو بورڈ نے انسپکشن ٹیم بھیجی۔ یہ ٹیم اپنے پروگرام کا پہلے اعلان کر دیتی تھی۔۔۔۔ چنانچہ اس ٹیم نے جس روز کسی جگہ جانا ہوتا، اسرائیلی اس روز وہاں مسلمان اساتذہ کو لا کر بٹھا دیتے اور کتابیں بھی بچوں کے ہاتھ میں یونیسکو کی منظور شدہ تھما دیتے۔۔۔۔۔ چنانچہ دونوں دفعہ انسپکشن ٹیم نے یہ رپورٹ دی کہ عرب ممالک کے نمائندے اسرائیلیوں پر غلط الزام لگاتے ہیں مجھے بڑی ندامت ہوئی۔

"چنانچہ میں نے یونیسکو کو اپنی خدمات پیش کیں۔ میں خفیہ طور پر ایک فلسطینی ادارے کے زیر اہتمام گیا اور وہاں سے ایک سو تیرہ ٹیکسٹ بکس، جو اسرائیل نے لگوائی تھی، ان پر اسرائیلی اساتذہ جو وہاں تھے ان کے آٹوگراف لیکر جمع کر کے لایا۔ اسکے ساتھ چھ سات سو تصویریں بھی جو میں نے خفیہ طور پر ایک سگرٹ لائٹر کے ذریعے اتاریں، اپنے ساتھ لایا۔۔۔۔ ان تصویروں میں بعض اسرائیلی ہیڈ ماسٹروں کیساتھ گروپ فوٹو بھی تھے۔۔۔۔ اسکے بعد یہ کتابیں ہٹائی گئیں اور یونیسکو کے نمائندوں کو لغیر نوٹس سکولوں کے معائنے کا اختیار مل گیا"

روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۳۰ جولائی ۱۹۸۲ء

ہوا ہے کہ طرفین کے مابین ایک غیر یقینی کی کیفیت رونما ہو گئی ہے۔ اسرائیل کے عرب شہری اسرائیلی پاسپورٹوں پر سفر کرتے ہیں، چنانچہ ان کے لیے عالم عرب کا دورہ کرنا بے حد مشکل ہے اور جب کبھی جلاوطن فلسطینیوں اور نام نہاد عرب اسرائیلیوں کے مابین ملاقاتیں ہوتی ہیں، تو تبادلہ خیالات کے لیے جس باہمی اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی نوبت آنے سے پہلے بے شمار باہمی شکوک و شبہات کو رفع کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک ناگزیر امر ہے کہ ایک جلاوطن (فلسطینی)، جس کی پرورش و پرداخت اپنے آبائی وطن کی تمنا کی غذا پر ہوئی ہو اور جس میں قوم پرستی کی آئیڈیالوجی کی خاصی بڑی خوراک بھی شامل ہو، اس کرید میں پڑ جائے کہ اس کا جو ہم وطن الناصرہ سے آیا ہے، کہیں وہ اسرائیلی ایجنٹ تو نہیں بن چکا ہے اور وہ یہ سوچنے لگے کہ اس کا یہ ملاقاتی جب اندرونِ اسرائیل تنہائی کا شکار ہوتا ہو گا، تو عبرانی تصانیف یا اسرائیلی قوانین کے مطالعے میں پناہ ڈھونڈتا ہو گا اور یوں اسے اس سچی اور کھری اجنبیت کا احساس ہوتا ہو گا جس نے اسے خالص عرب ثقافت سے الگ تھلگ کر دیا ہے۔

ان حالات میں اسرائیلی فلسطینیوں کو فلاح خویش (اپنی حالت بہتر بنانا) کے جو طریقے میسر تھے، ان میں بھی مملکت بری طرح رخنہ انداز ہوتی تھی اور انہیں اس رخنہ اندازی کے خلاف جو جدوجہد کرنا پڑتی تھی، وہ سب کچھ اسرائیلی قانونی موشگافیوں کی حدود کے اندر رہ کر کرنا پڑتا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یہ قوانین اور ان کی تعبیرات بھی غیر یہودیوں کے خلاف جاتی تھیں اور ان کا پلڑا کر دیتی تھیں۔ چونکہ اسرائیل کا کوئی آئین (مملکت کے اختیارات کی اساس "بنیادی قوانین" کے مجموعے یا "آئین" پر ہوتی ہے) نہیں، اس لیے

فلسطینی اپوزیشن کو اولاً کمیونسٹ پارٹی (جس کی رکنیت یہودیوں اور عربوں دونوں کو حاصل ہے) اور ثانیاً قوم پرست گروہوں کی، جن کے دوائر کار اسرائیلی قانونی موشگافیاں طے کرتی تھیں، جرأت مندانہ ابتکاریوں ؎۱ (initiatives) پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیانی برسوں کے دوران میں اسرائیل کے اندر عوامی محاذ (پاپولر فرنٹ) جیسے گروپ وجود میں آئے۔ ان کا کام فلسطینیوں کی ان جائدادوں کا تحفظ کرنا تھا جنہیں حکومت بلا جواز اپنے قبضے میں لے لیتی تھی۔ لیکن غالباً فلسطینیوں کی جو اہم ترین قوم پرست جماعت ابھر کر سامنے آئی وہ "اسرۃ الارض" ؎۲ تھی۔ اس کی بنیاد ۱۹۵۸ء میں نوجوان فلسطینی قوم پرستوں کے ایک گروپ نے رکھی اور اگرچہ یہ بہت تھوڑا عرصہ قائم رہی لیکن اس نے ایک زبردست معرکہ یہ مارا کہ اس نے اندرون اسرائیل مقامی آبادی کی بے چینی کو زبان دے دی (اس جماعت کا اسرائیل میں جو حشر ہوا اور اس کے رد عمل کے طور پر جلاوطن فلسطینیوں نے جس طرح تنظیم آزادی فلسطین ——— پی۔ ایل۔ او ——— قائم کی، ان باتوں کو ہمیں یہاں ذہن میں رکھنا چاہیے) عربی زبان میں "اسرۃ الارض" کا مطلب "خاندانِ ارضی" یا "زمین کا خاندان" تھا۔ اور یہ ایک ایسا نام تھا جو بچے کھچے (فلسطینی) طبقے کی تشویش کو احسن طریقے سے ادا کرتا تھا۔ اس گروپ کے وجود میں آنے کی علت غائی یہ تھی کہ فلسطینیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ فلسطین ہی میں رہیں۔ ابتدا ہی سے اس گروپ کی کوشش یہ تھی کہ وہ اس طرح کام کرے، جس سے یہ مترشح نہ ہو کہ وہ اپنی آزادی پر

؎۱ جدید فارسی میں (initiatives) کا ترجمہ ابتکاری کیا جاتا ہے۔

؎۲ اس کا لفظی ترجمہ "خاندانِ ارضی" ہے

زور دے رہا ہو بلکہ یہ معلوم ہو کہ وہ اسرائیلی بالادستی کے اندر رہتے ہوئے ایک آزاد فلسطینی عرب سیاسی موجودگی کی نمو کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی عظیم کامیابی منفی نوعیت کی تھی۔ "الارض" نے یہ عملاً ثابت کر دیا کہ اسرائیل کے اندر غیر یہودیوں کے لیے مساوات (کا حصول) ایک ناممکن امر ہے۔ اگرچہ اس نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ یہ اپنا کام قانونی حدود کے اندر رہ کر کرے لیکن ۱۹۶۰ کے عشرے کے بالکل آغاز ہی میں یہ ان قوانین کا شکار ہو گیا جن کے تحت اس کے اخبارات و جرائد پر پابندی لگا دی گئی، اس کے چھاپے خانے (پریس) سربمہر کر دیئے گئے اور اسے ایک قانونی سیاسی پارٹی کی حیثیت سے اپنے آپ کو رجسٹر کرانے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ "الارض" پہلا فلسطینی عرب سیاسی گروپ تھا جس نے ایک علیحدہ فلسطینی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔

اسرائیل کے اندر فلسطینیوں کی نمو کا دوبارہ ذکر میں ذرا بعد میں کروں گا۔ اب میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ ان کے تشخص کی مخصوص ساخت ہے کیونکہ یہ تشخص ہی ہے جو سیاسی طور پر سرگرم عمل ہو کر آزادی اور ظلم و ستم سے رہائی دلاتا ہے۔ ان فلسطینیوں کے لیے ایک ناقابل تخفیف حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک ایسی مملکت کے اندر موجود تھے، جہاں ان کا قیام دوسروں کے رحم و کرم پر تھا اور پھر خالی از خطر بھی نہیں تھی کیونکہ یہ مملکت ان کے وجود کو اپنے لیے وبال جان سمجھتی تھی اور انہیں عارضی طور پر محض اس لیے برداشت کر رہی تھی کیونکہ فی الحال ان سے چھٹکارا پانا مشکل تھا۔ وہ اپنی زندگیوں کے اساسی استحکام کے لیے اراضی کے مرہون منت ہیں یا پھر اس بات کے، اور یہ بات کتنی متناقض ہے اور اپنی تردید آپ کر رہی ہے، کہ اسرائیل کے غیر یہودی باشندوں کی حیثیت سے وہ زمین اور اراضی کے ساتھ کسی قسم کے روابط برقرار رکھنے کے لیے قابل عمل

جواز سے محروم ہیں (کیونکہ اسرائیل نے ایسے قوانین نافذ کئے ہیں، جن کی رُو سے
کسی غیر یہودی کا اسرائیل میں زمین پر قابض رہنا ناممکن ہی نہیں ہو گیا بلکہ غیر قانونی
بھی ہو گیا ہے۔ ان علاقوں کے فلسطینیوں کا بھی، جن پر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی
جنگ کے دوران میں قبضہ کیا تھا، کافی حد تک یہی حال ہو گیا ہے حالانکہ ان
فلسطینیوں کے باہر کی دنیا سے کافی عرصے تک روابط قائم رہے) فلسطینیوں کا
وہ بچا کھچا طبقہ، جو ابھی تک اندرونِ اسرائیل ڈٹا ہوا ہے، اس کا ایک فرد، توفیق
زیاد، بڑے پائے کا شاعر ہے۔ اس کی ایک معرکۃ الآرا نظم کا عنوان "بقول" (ہم یہیں کے
موجود رہیں گے") ہے۔ اس نظم میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ استخوانی استقا
کی حامل ہے اور اس کا مقصد اسرائیلیوں کو یہ یاد دلانا ہے کہ فلسطینی "تمہارے
حلقوم میں شیشے اور ناگ پھنی کی طرح پھانس بن کر اٹک گئے ہیں"۔ ایک سطح پر
فلسطینی شعور کو "بیس ناممکنات" کا سیٹ (مجموعہ) بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ دوسری
سطح پر زیاد ان ہتک آمیز رویوں (ہوٹلوں میں برتن صاف کرنا، آقاؤں کو مشروبات
پیش کرنا، وغیرہ) کو، جن کا نشانہ فلسطینی بنائے جاتے ہیں، اس انداز میں لیتا ہے
کہ وہ ان کی روح کی بالیدگی کر رہے ہیں کیونکہ

یہاں ــــــ ہمارا ایک ماضی ہے
ایک حال
اور ایک مستقبل
ہماری جڑیں پیوست ہیں
زمین کی عمیق گہرائیوں کے ساتھ
بیس ناممکنات کی طرح

ہم موجود رہیں گے[1]

جہاں تک جلاوطن فلسطینیوں کا تعلق ہے، ان کے خیالات و جذبات ان خیالات و جذبات کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کی زندگیاں ان معنوں میں ناقابلِ برداشت بن چکی ہیں کہ فی الحال وہ جہاں ہیں، وہاں ان کی کوئی جڑیں نہیں۔ ان کے آفاقی اقوام متحدہ کی ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی (UNRWA) جیسے بین الاقوامی ادارے، پناہ گزینوں کے کیمپ، جو کسی ایک یا دوسرے عرب ملک میں واقع ہیں اور ان پر فوری طور پر اثر انداز ہونے والے (اور ایک دوسرے سے بے پناہ مختلف) واقعات متعین کرتے ہیں۔ اس جلاوطن طبقے کا، جسے عرف عام میں "غربا" کہا جاتا ہے، نقشہ کھینچنا یا مختصراً اس کی خصوصیات گنوانا عملی طور پر ایک ناممکن امر ہے، کیونکہ بحیثیت مجموعی اس نے جدید عرب دنیا کے معاشرتی اور سیاسی شعور ——— اپنے تمام تر تنوع کے ساتھ ——— کی آئینہ داری بھی کی ہے اور اس کے فروغ میں قابل قدر حصہ بھی لیا ہے۔[2]

۱ـ "Enemy of the Sun: Poetry of Palestinian Resistance", ed. Naseer Arari and Edmund Ghareeb (Washington: Drum and Spear Press, 1970), p.66.

۲ـ See Rosemary Sayigh "Palestinians: From Peasants to Revolutionaries" (London: Zed Press, 1979)

آج اکثر عرب ممالک میں فلسطینی دانشور، انجینئر، مزدور، غیر ممالک کا شتکار اور کیمپوں کے باسی موجود ہیں، ان میں جو طبقاتی تقسیم موجود ہے، وہ مہمان ممالک کے اپنے بڑے ڈھانچوں کے مطابق ہے۔ لیکن ان سب میں ایک بات اور بھی ہے کہ وہ ناگزیر طور پر (خاص طور پر ۱۹۶۷ء کے بعد سے) فلسطینی سیاسی تشخص کے کسی نہ کسی تصور کے، جو باقی تمام امور پر حاوی ہو جاتا ہے، زیر نگیں آ چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم بالکل جائز طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے بعض فلسطینی ایسے ہیں جو اپنے افکار کے اعتبار سے (مرحوم صدر) ناصر کے پیروکار ہیں، بعض فلسطینی بعث پارٹی سے متعلق ہیں، بعض کو فلسطینی مارکسی کہا جا سکتا ہے اور ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے فلسطینی بورژوا کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مخصوص انداز سے، جو بعض اوقات بالکل انوکھا اور عجیب وغریب نظر آتا ہے، (فلسطین) واپسی کے متعلق ایک منصوبہ (جو بے شک ہمیشہ قابلِ عمل نظر نہ آئے) نہیں، تو کم از کم ایک نظریہ ضرور گھڑ رکھا ہے۔ میں سیاسی خیالات اور جماعتوں کے متعلق ذرا بعد میں اظہار خیال کروں گا۔

ظاہر ہے کہ اسرائیلی فلسطینیوں کے برعکس جلاوطن فلسطینیوں کی روزمرہ کی مصروفیات غیر مساوی طور پر ان کے مہمان ملک، پناہ گزینوں کے مسائل سے نپٹنے والے بین الاقوامی اداروں اور خود ان کے اپنے مابین بٹ کر رہ گئی ہیں۔ ۱۹۶۷ء کا سال (پہلی اور بعد کی مصروفیات کے مابین) حد فاصل بن گیا ہے۔ یہ سال اس امر کی علامت ہے کہ عربوں کا روایتی اسلوب اور ڈھانچہ ناکام رہا ہے۔ اور فلسطینیوں نے اپنی مختلف سیاسی تنظیموں کے اتفاق رائے (اجماع) کے ذریعے یہ جو دنیا کو دکھا دیا ہے کہ وہ اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں، اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال سکتے ہیں اور اپنی شناخت خود کرا سکتے ہیں، اس کا آغاز ۱۹۶۷ء سے ہی ہوتا ہے ۱۹۶۷ء

تک عرب مملکتیں جس انداز سے فلسطینیوں کی تائید و حمایت کرتی تھیں، وہ فلسطینی امنگوں کے اتنا موافق نہیں ہوتا تھا جتنا کہ ان کے اپنے رموز سلطنت کیلئے سازگار ہوتا تھا۔ اور یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ مملکتیں فلسطینیوں کی حمایت میں جو اقدامات بھی کرتی تھیں وہ صرف اس لیے کہ اپنے عوام الناس کے جذبات و احساسات کی تسکین کر سکیں جو بے لاگ اور بے ریا طور پر فلسطینی المیہ میں بحیثیت قوم دلچسپی لیتے تھے۔ اقوام متحدہ کی ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی جیسے ادارے اس لیے قائم کئے گئے تھے تاکہ فلسطینی پناہ گزینوں کو اپنی جلاوطنی کے بڑے بڑے مقامات اور مراکز پر جن مخصوص دشواریوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سے نپٹنے کے لیے ان کی مدد کی جا سکے۔ تاہم اس ادارے کا اصل ہدف ہمیشہ فلسطینیوں کی بقا رہا ہے، جب بھی ان کی سیاسی آزادی کا مسئلہ اٹھایا گیا، یہ ادارہ یا تو کنی کاٹ گیا یا طرح دے گیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سال بہ سال اس مفہوم کی جو قرارداد پاس کرتی رہتی ہے کہ اسرائیل پناہ گزینوں کو واپس لے لے، ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کی پالیسی اس (قرارداد) کے عین مطابق ہے۔ تاہم جنرل اسمبلی اسرائیل سے پناہ گزینوں کی واپسی کا جو مطالبہ کرتی ہے، وہ بھی کم و بیش غیر جانبدارانہ انسانی ہمدردی کی اساس پر کیا جاتا ہے اور اس میں کبھی اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا جاتا کہ فلسطینی اور اسرائیلی قومی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر ایک دوسرے کے حریف ہیں۔

ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے متعلق فلسطینیوں نے جو متضاد و جذبی رویہ[1] اختیار کر رکھا ہے، وہ بذاتِ خود ایک پیچیدہ موضوع ہے اور میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں کہ میں یہاں اس کا جائزہ لوں۔ تاہم میں جس چیز کے متعلق اظہار خیال کرنا

---

[1] جب کسی شخص کے دل میں ایک ہی چیز یا واقعہ کے متعلق محبت اور نفرت یا دوسرے متضاد جذبات بیک وقت موجود ہوں، تو وہ دو جذبی رویہ کا اسیر ہوتا ہے۔

چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس ایجنسی کے کردار کے بارے میں ایک عام بے اطمینانی
پائی جاتی ہے، جس کا اگرچہ کھلے بندوں اظہار تو نہیں کیا جاتا لیکن وہ اپنی جگہ موجود
ضرور ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ پناہ گزینوں کو انتہائی
سیاست گزیدہ گروپ بننے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگی (اور اب سیاست چھانٹنا
ان کا مشغلہ بن چکا ہے)۔ اپنے زیرکفالت فلسطینیوں کی علانیہ قومی خود آگاہی کے
مقابلے میں ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی غیر سیاسی الوہیت کی علمبردار تھی اور اس کا
اظہار وہ روٹی کپڑے کی خیرات بانٹ کر اور طبی اور تعلیمی سہولتیں بہم پہنچا کر
کرتی تھی۔ فلسطینیوں کے سیاسی مصائب کے متعلق ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی
جس قسم کی مخیرانہ تشویش کا اظہار کرتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اسے لاحاصل، روکھے
پھیکے اور بے جان اعداد و شمار میں ڈھالا جا سکتا ہے ———— مثلاً یہی
کہ کتنے لوگوں کو خوراک مہیا کرنا ہے، کتنے تن ڈھانپنے ہیں، کتنے اجسام کا علاج
کرنا ہے، وغیرہ۔ میرے خیال میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ فلسطینی، جو اس
سیاسی خول میں مقید تھا، جس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا تھا کہ یہ ریلیف اینڈ
ورکس ایجنسی اس کی ضروریات مہیا کرتی رہے گی، یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ
آیا وہ کبھی یہ زنجیریں توڑ کر صحیح حق خود ارادیت حاصل کر بھی پائے گا یا نہیں؟
ایک طرف ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ پناہ گزین اپنی بے دخلی
کے بعد محض ایک عبوری دور میں سے گزر رہے ہیں اور وہ کسی وقت بھی کسی
دوسرے مقام پر آباد ہو سکتے ہیں؛ دوسری طرف پناہ گزینوں کو یہ اندیشہ کھائے
جا رہا تھا کہ گو کیمپوں میں تو ان کا قیام عارضی نوعیت کا ہے لیکن اس کے متبادل انہیں
جو نیا ٹھکانہ میسر آئے گا وہ کہیں ان (کیمپوں) سے بھی بدتر نہ ہو۔ اس کا ناگزیر نتیجہ
یہ برآمد ہوا کہ اس ایجنسی کے بارے میں وہ غیر مطمئن نظر آنے لگے پھر چونکہ ریلیف

اینڈ ورکس ایجنسی کے تحت چلنے والی درسگاہوں کا عملہ فلسطینیوں پر ہی مشتمل ہوتا تھا، چنانچہ ان درسگاہوں میں صہیونیت اور فلسطین کے متعلق جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، اس نے ایک نئی قسم کی کشیدگی اور کھنچاؤ پیدا کر دیا۔ جوں جوں ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان میں اس ناخوشگوار اور مکروہ تفاوت کا احساس بڑھتا گیا جو ان کی تاریخ اور ان کی حقیقی (قابل رحم) حالت کے مابین پایا جاتا تھا۔ ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کو اپنی محنت و مشقت کا صلہ یہ ملا کہ اسے ایک ناگوار بلکہ مخاصمانہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے عملے کے بعض ارکان بین الاقوامی سول سرونٹ تھے تاہم ان کی ایک خاصی بڑی تعداد خود فلسطینیوں پر مشتمل تھی۔ اگرچہ کسی نے اس تبدیلی کا، جو لبنان اور اردن کے کیمپوں میں، جہاں سب سے زیادہ پناہ گزیں مقیم ہیں، رونما ہوئی، مطالعہ نہیں کیا، لیکن اغلباً یہ بات درست ہے کہ اس تبدیلی میں سب سے زیادہ ہاتھ ان فلسطینیوں کا تھا جو ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے ملازم تھے۔ ان دونوں ممالک میں معاشرتی خدمات بہم پہنچانے کا فریضہ بتدریج خود فلسطینیوں نے سنبھال لیا۔ سیاسی سطح پر اس عبوری دور کی تکمیل (اگرچہ ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی ابھی تک اپنا کام کئے جا رہی ہے) اس وقت ہوئی جب تنظیم آزادیٔ فلسطین کی تشکیل عمل میں آئی۔ پروگرام کے اعتبار سے یہ جماعت ایک قومی تنظیم ہے اور کیمپوں کے اندر اور باہر فلسطینیوں کی نیم سرکاری ذمہ داری اس نے اپنے کندھوں پر لے لی۔ تاہم تنظیم آزادیٔ فلسطین نے جزوی طور پر ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کی جو جگہ سنبھالی ہے، اسے ایک دوسری صورتِ حال سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور وہ صورت حال یہ ہے کہ فلسطینیوں کے اپنے مہمان ممالک، بطور زیادہ تر وہی اردن اور لبنان، کے ساتھ تعلقات خاصے کشیدہ

ہو چکے ہیں اور اس کشیدگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے ۔
میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ ایک نہایت زبردست اہمیت کا حامل واقعہ ہے ۔ اس نے نہ صرف اسرائیل سے نپٹنے کے لیے عربوں کے روایتی طریق کار کو بے وقعت اور بے وقار بنا دیا بلکہ اس نے اکثر فلسطینیوں کو بھی یہ باور کرا دیا کہ صیہونیت کے ساتھ ان کا جو جھگڑا چل رہا ہے اسے نیابتی فوجوں اور مملکتوں کے ذریعے چکایا نہیں جا سکتا ۔ لبنان اور اردن میں مقیم کثیر التعداد فلسطینیوں کے متعلق اہم حقیقت یہ ہے کہ وہ تقریباً بھی کے سبھی ۱۹۶۷ء سے قبل اسرائیل سے ترک وطن کر کے آئے تھے ۔ جونہی اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر قبضہ کیا ، اسرائیلی قبضے کو ختم کرنے کے لیے جن کوششوں کا آغاز ہوا ، جزوی طور پر ان کی توجہ کا مرکز وہ علاقے بن گئے جن پر اردنی اور لبنانی فلسطینیوں کو کوئی خاص دعاوی حاصل نہیں ۔ وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں ان علاقوں میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ درحقیقت آئے نہیں تھے ۔ چنانچہ ان میں جو نام نہاد "مستردین" ہیں ، انہوں نے مغربی کنارے پر فلسطینی ریاست کے قیام کے تصور کی مخالفت کی ۔ مزید براں ، اسرائیل سے بالکل ملحقہ دو ملکوں میں ان کی جو گت بنی ، اس نے نہ صرف یہ بات بالکل واضح کر دی کہ فلسطینی مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں بلکہ اس ضرورت کا بھی انہیں شدت سے احساس دلایا کہ انہیں کسی نہ کسی صورت میں اپنے وطن واپس لوٹنا ہوگا ، یہ الگ بات ہے کہ یہ واپسی پورے فلسطین میں ہو یا صرف مغربی کنارے پر ۔ اردن اور لبنان میں مقیم فلسطینیوں کو دوسرے علاقوں میں قیام پذیر فلسطینیوں کی جو حمایت و تائید حاصل تھی ، جوں جوں اس میں اضافہ ہوتا گیا ، یہ فلسطینی ان ممالک (اردن اور لبنان) کی حکومتوں کے

اختیارات چیلنج کرتے نظر آنے لگے۔ یہ حالات بالخصوص اس وقت پیدا ہوئے جب بھروسے کے قابل اور مسلح فلسطینیوں نے اس خلا کو پُر کر دیا جو شکست خوردہ عرب فوجوں نے چھوڑا تھا۔ ۱۹۶۰ کے عشرے کے اواخر میں فلسطینیوں کو ایک سہ جہتی مسئلے کا، جو ان کے مختلف مقامات پر بکھر جانے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا، سامنا کرنا پڑا:

ان کے حق خود ارادیت (کے حصول) کی امنگ

ایک محفوظ اور امکانی علاقائی اڈے کی عدم موجودگی اور

ایک فلسطینی مقتدرہ قائم کرنے کی ضرورت، جو حتی الامکان مقامی حکام کے ساتھ کسی قسم کی کشمکش میں ملوث نہیں ہوگی۔

۱۹۶۷ سے اب تک فلسطینیوں کو جو مشکلات اور دشواریاں پیش آئی ہیں، ان میں سے ہر ایک کے نشانات انہی تینوں چیلنجوں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

اگر مسئلے کی ان تینوں جہتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے، تو آپ کو تنظیم آزادی فلسطین کے رویوں میں جو بھی کجروی یا خلاف معمول بات نظر آتی ہے، اس کی آسانی سے توضیح ہو سکتی ہے۔ یہ بات یقیناً درست ہے کہ ابتداءً تنظیم آزادی فلسطین عرب لیگ نے ۱۹۶۴ء میں قائم کی تھی اور اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ فلسطینیوں کی توانائیوں کو ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت استعمال کیا جائے (ممکن ہے کہ اس تنظیم کے قیام کے پیچھے یہ خواہش بھی کام کر رہی ہو کہ فلسطینیوں اور ان کی توانائیوں کو حدود کے اندر رکھا جائے) تاہم میرے خیال میں یہ کہنا درست نہیں کہ اس معاملے میں فلسطینیوں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ان کا ہاتھ تھا لیکن ابتداءً یہ تنظیم اتنی سیاسی نہیں تھی جتنا کہ دل کا غبار نکالنے اور خطابت کے جوہر دکھانے کا آلہ تھی چنانچہ اس نے عہدوں کے متلاشیوں کو تو اپنی طرف ضرور راغب کیا پالیسی سازوں کو نہیں تاہم اشتعال انگیز ضرور تھی۔ جیسا کہ میں فوراً بعد میں اس کے عملی ثبوت بھی پیش کروں گا فلسطین کے جانباز طلبوں (MILITANTS) کو بھی تنظیم آزادی فلسطین میں کشش محسوس ہونے لگی۔ ان لوگوں کو یہ خیال آیا کہ (اقوام متحدہ کی ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی کے برعکس) اس

تنظیم میں یہ امکانات موجود ہیں کہ اسے صحیح معنوں میں ایک قومی اور ذمہ دار ادارہ بنایا جا سکتا ہے اور یہ وہ اختیارات بھی استعمال کر سکتی ہے جو صرف ایک حکومت ہی کے پاس ہوتے ہیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ آزادی کی خواہاں دوسری تنظیموں یا عارضی حکومتوں کے برعکس، تنظیم آزادیٔ فلسطین کے پاس اپنا کوئی آبائی علاقہ نہیں تھا جہاں وہ اپنی کارروائیوں میں مصروف ہو سکے۔ غالباً اس کی ساخت کی المناک خامی یہ تھی کہ آغاز ہی سے یہ مقامی باشندوں کی تنظیم نہیں تھی جو اپنے ستم شعاروں کے خلاف مصروف پیکار تھے بلکہ یہ جلا وطنوں کی تنظیم تھی۔ ایک لحاظ سے تنظیم آزادیٔ فلسطین کی ایک بین الاقوامی گروہ بندی تھی۔ اس بات کے باوجود کہ عملی حالات میں اسے مقتدر اور خود مختار حکومتوں سے ٹکر لینا پڑی، اسے شروع ہی سے ایک بین الاقوامی قومی جواز مل گیا۔ یہ آج تک اس مسئلے کا حل تلاش نہیں کر سکی کہ آیا یہ قومی آزادی کے حصول کی سیاسی تحریک ہے یا لڑ کر قومی آزادی حاصل کرنے کی تحریک۔ تاہم یہ اپنے حامیوں کے لیے کافی ترقی یافتہ معاشرتی خدمات بہم پہنچانے میں خاصی کامیاب رہی ہے۔ اس نے جلا وطن فلسطینیوں کو منظم کرنے اور انہیں (حریف کے خلاف) حرکت پذیر بنانے میں مہتم بالشان کامیابی حاصل کی ہے اور پچھلے چند سالوں سے اسے فلسطینیوں کی ایک زبردست اکثریت کی، خواہ وہ جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہوں، مقبوضہ علاقوں کے باسی ہوں یا اندرونِ اسرائیل آباد ہوں، تائید و حمایت حاصل ہے اور وہ اس کے احکام پر مر مٹنے کے لیے آمادہ و تیار ہیں۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین کو مضبوط بنانے کے لیے جن عناصر نے اہم حصہ لیا ہے، ان میں سے ایک قوم پرستی کی وہ مستحکم اور توانا روایت ہے جسے جلا وطنی کے عالم میں بھی زندہ رکھا گیا۔ جب اسرائیلیوں نے ۱۹۵۶ء میں غزہ پر قبضہ کیا تو

فلسطینیوں کے متعدد چھوٹے چھوٹے گروہ تشکیل دیئے گئے جن کا فریضہ اسرائیلیوں
کو اپنے حملوں کا نشانہ بنانا تھا۔ ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء تک جلاوطن فلسطینیوں کی کوئی
چالیس تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ سبھی کی سبھی اسرائیل کی دشمن تھیں اور ان کا مقصد
وطن واپسی کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ بے شمار تصانیف ــــ نظمیں،
سیاسی مقالے اور کتابچے، تاریخ اور صحافت کی کتب ــــ منظرِ عام پر آ چکی
ہیں اور اس کام کا آغاز اسی وقت ہی ہو گیا تھا جب اولین پناہ گزیں نے فلسطین
کو خیر باد کہا تھا۔ ان میں متعدد تصانیف کی عرب ممالک نے حوصلہ افزائی کی اور انہی
کے ایما پر تحریر کی گئی تھیں لیکن ان کی خاصی بڑی تعداد خود فلسطینیوں کی اپنی ابتکاری کا
نتیجہ ہے۔ عرب دنیا اپنے آپ کو منوانے کے دور میں سے گزر رہی تھی اور
اس سلسلے میں فلسطینیوں نے اپنی امتیازی صلاحیتوں اور فقید المثال خوبیوں کا
مظاہرہ کیا۔ اگرچہ پچاس اور ساٹھ کے عشروں میں ناصر کا طوطی بول رہا تھا، پھر بھی
یہ بات لازماً ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ عرب اتحاد، استعمار دشمنی اور انقلابی جدوجہد
کے متعلق صدر ناصر بے پناہ حد تک اپنے فلسطینی تجربات کے مرہونِ منت تھے۔

ابتلا اور جلاوطنی کے ایام میں وہ قومی گروہ جن کی حیثیت ڈیڑھ اینٹ کی مسجد
کی سی ہوتی ہے، حقیقی معنی میں قومی گروہ بن جاتے ہیں۔ چونکہ فلسطینی اتنے مختلف
ممالک میں بکھر چکے ہیں، اس لیے معاشرتی طور پر ایک متجانس قوم کا روپ نہیں دھار
سکے۔ وہ لوگ بھی، جو کیمپوں میں مقیم ہیں، بہت آہستہ آہستہ اپنے گرد و پیش کے
معاشروں میں گھلنا ملنا شروع ہوئے۔ جو زیادہ خوش قسمت تھے، انہوں نے
یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی، کاروباری ادارے قائم کئے یا اعلیٰ پیشوں کے ساتھ
منسلک ہو گئے۔ اس حقیقت نے کہ وہ کچھ کھو چکے ہیں ــــ بلکہ اس سے بڑھ
کر اس حقیقت نے، کہ جو کچھ کھویا جا چکا تھا، اسے عام طور پر چھپانے کی کوشش کی

جاتی تھی ـــــــ فلسطینیوں کی ایک ایسی مستند برادری تخلیق کر دی جو مہمان معاشرے سے قطعاً مختلف نظر آتی ہے۔ خود مجھے جن تجربات میں سے گزرنا پڑا، وہ ان معنوں میں بعض دوسرے جلاوطن فلسطینیوں کے تجربات کے مماثل تھے کہ میری مخصوص تاریخ کو عام عرب چھتری نے ڈھانکے رکھا (یعنی ہمیں فلسطینیوں کی الگ قوم نہیں سمجھا گیا، بلکہ عمومی انداز سے عام عرب قوم کا ایک جزو سمجھا گیا) اور کافی عرصے تک یہی مناسب نظر آتا رہا۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا جب بعض دوسرے فلسطینیوں کی طرح، جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا، میں بھی اپنی زندگیوں اور اپنے حالات کو عالم عرب کی ہر شے سے الگ تھلگ کر کے دیکھنے لگا۔ آج فلسطینی جس چیز کو فلسطینی انقلاب کہہ کر پکارتے ہیں وہ دوسروں سے مختلف ہونے کا کوئی منفی امتیاز نہیں بلکہ یہ ایک پورے فلسطینی تجربے کے متعلق ایک مثبت احساس ہے کہ ہمیں ایک حشر سے دوچار ہونا پڑا اور اب ہمیں اس کا مداوا تلاش کرنا ہے، یہ کہ ہماری ایک فلسطینی شناخت ہے جو محض ان معنوں میں ہی نہیں کہ ہم نے کیا کھویا، قابل تفہیم ہے، بلکہ ہمارے نزدیک وہ ایک ایسی شے ہے جس کے حصول کے لیے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری جدوجہد کا اصل نکتہ یہ ہے کہ ہمیں عدم تشخص، استبداد اور جلاوطنی سے رستگاری (آزادی) حاصل ہو۔

چونکہ تنظیم آزادیٔ فلسطین زیادہ تر جلاوطنوں کی تنظیم ہے، اس لیے تاریخی طور پر اس کا زیادہ تر سروکار واپسی سے رہا ہے اور یہ واپسی وطن کو غیروں کے قبضے سے چھڑانے کا سب سے بڑا ماحصل اور ثمر ہو گا۔ یہاں ان فلسطینیوں کے، جو اسرائیل ہی میں قیام پذیر ہیں، اہداف سے تقابل بہت اہم ہے۔ جو بچے کھچے لوگ ابھی تک وہاں موجود ہیں، وہ مخصوص طور پر اپنے آپ کو اس زبان،

تدابیر وتراکیب، اور چالوں کے حوالے سے دیکھتے ہیں جو اسرۃ الارض نے انہیں سجھائی تھیں۔ چونکہ اس تنظیم کا قیام اسرائیل کے اندر عمل میں آیا تھا، اس لیے اس کی کچھ مجبوریاں تھیں جو اس کی راہِ عمل متعین کرتی تھیں۔ اسے اس کے ارکان اور اس کے متفقین کو اسرائیل کے اندر ہی رہائش پذیر رہنا تھا، وہیں اپنے طبقے کے افراد کے مابین پیوستگی پیدا کرنا اور اس پیوستگی کو مضبوط و مستحکم بنانا تھا، ایک طرف اپنے آپ کو اسرائیل کے منظم معاشرے میں سمونا تھا اور دوسری طرف مساوی حقوق کے حصول کے لیے مصروفِ پیکار ہونا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیں کہ وہاں کے فلسطینی اپنے آپ کو یوں لیتے تھے کہ ان کی اپنی ایک قومی شناخت تو ہے تاہم چونکہ ان کا واسطہ ایک ایسی حقیقت سے تھا جو بظاہر ایک مادی وجود رکھتی تھی، اس لیے انہیں اسرائیل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی اس شناخت کی از سرِ نو تعریف کرنا پڑی۔ تاہم ایک یہودی ریاست میں ایک غیر یہودی ہونے کے فرق (کہ یہ دو متضاد چیزوں کے مابین فرق تھا) کا سامنا جرأت کے ساتھ نہیں کیا گیا اور نہ صہیونیت کے اس مخصوص اسلوب سیاست سے، جس میں غیر یہودیوں کو شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی، نپٹنے کے لیے صحیح راہِ عمل اختیار کی گئی۔ اس کے برعکس جلاوطنوں نے

اس میں غالباً ملک بدر ہونے والوں کی کچھ رومانی عینیت بھی شامل تھی

اپنے اندازِ سیاست کا اظہار نظریہ کلیت کی اصطلاحات میں کیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں فلسطین کے چیدہ چیدہ حصوں سے نہیں، بلکہ پورے فلسطین سے ملک بدر کیا گیا تھا، اس لیے ان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ سارے کے سارے فلسطین کو آزاد کرائیں۔ صہیونیت نے مقامی عرب فلسطینیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اور اب تک ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھ رہی ہے، اس کے پیشِ نظر نہ تو

اسے (صہیونیت کو) ایک تحریک کی حیثیت سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ یہ ایک معاشرے کی حیثیت سے قابل قبول بن سکتی ہے۔ جلاوطنوں نے جس چیز کی نہ تو مناسب طور پر توضیح کی اور نہ اسے پیش نظر رکھا، وہ وہ حمایت تھی جو اسرائیل کو اپنے یہودی شہریوں اور دنیا کی بعض اقوام سے حاصل ہوئی۔ اور اس سے بھی اہم تربات جسے فلسطینیوں نے قطعی طور پر نظرانداز کر دیا تھا، یہ تھی کہ اسرائیل اپنے منتخب شہریوں کی نظروں میں ایک جائز اور مستحکم مملکت کا درجہ اختیار کر چکا تھا (اس کے غیر یہودی شہری اور جلاوطن فلسطینی اسے بے شک ایک فاسق وفاجر مملکت تصور کرتے رہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا)۔

اس مقام پر ہم بخوبی اس اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو فلسطینی جدوجہد میں اس کے تازہ ترین عنصر کو حاصل ہے۔ یہ عنصر آبادی کی تیسری اکائی ہے اور اس نے ۱۹۶۷ء میں اپنے آپ کو اچانک اسرائیل کے قبضے میں پایا۔ ۱۹۶۷ء تک مغربی کنارے کے باشندوں کو اردن اردنی شہری تصور کرتا تھا اور وہ لوگ، جو غزہ کی پٹی میں رہائش پذیر تھے، ان پر مصری انتظامیہ کا حکم چلتا تھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ مغربی کنارے اور غزہ کے باشندے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے (ان دونوں کے بیچ میں اسرائیل کا علاقہ حائل تھا)۔ تاہم، ۱۹۶۷ء کے بعد دونوں کو (غزہ والوں کو زیادہ) اسرائیلی فوجی حکومت کی شکل میں ایک مشترکہ بوجھ اٹھانا پڑا۔ مشرقی (یعنی کہ عرب) بیت المقدس کے باشندوں کے ماسوا، جن کے شہر کا اسرائیل نے انتظامی طور پر اپنے ساتھ انضمام کر لیا تھا، دوسرے فلسطینیوں کو دوبارہ انہی تجربات میں سے گزرنا پڑا جو اسرائیل کے عربوں کو ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں ان مشکلات کا تجربہ بھی ہوا جو جلاوطنوں کو جھیلنا پڑتی

ہیں۔ نبلوس یا رام اللہ کا کوئی فلسطینی باشندہ بھی ملک بدر کیا جا سکتا تھا اور بیشمار کو کیا بھی گیا۔ "مشکوک" قسم کے جرائم (زیادہ تر اس نوعیت کے جن کے متعلق نئی مقبوضہ آبادی یہ سمجھتی ہے کہ قابضین کے خلاف اسے ان کے ارتکاب کا حق حاصل ہے) کے محض شبے میں ہزاروں خاندانوں کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا۔ ہزاروں لوگوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر "منتقل" کر دیا گیا (اور یہ بات غزہ کے بیس ہزار بدوؤں اور متعدد دیگر مقامات کے باشندوں کے متعلق تکلیف دہ حد تک درست ہے)۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی باسیوں کو اپنے ہی وطن میں شہریت کے تمام حقوق و مراعات سے بیک جنبش قلم محروم کر دیا گیا۔ اب وہ نہ تو اردنی تھے اور نہ اسرائیلی۔ ایک لحاظ سے وہ پناہ گزین بن گئے لیکن پہلے (دور کے) سات لاکھ اسی ہزار پناہ گزینوں کے برعکس وہ ارض فلسطین پر ہی مقیم رہے۔ ابتدائی پناہ گزینوں کے برعکس یہ فلسطینی اپنی زندگی دنیا بھر کے عوام کی نظروں کے عین سامنے گزار رہے تھے جو واقعتاً اپنی آنکھوں سے اسرائیلی فوجیوں کو اپنی جیپوں میں سوار غیر مسلح عرب دیہاتوں اور شہروں کا گشت کرتے، بعض اوقات عربوں کو موت کے گھاٹ اتارتے اور اکثر ان کی پٹائی کرتے دیکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ عالمی رائے عامہ نے بیک زبان قبضے اور ان درجنوں غیر قانونی اسرائیلی بستیوں کے قیام کی مذمت کی جسے صحیح ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے۔ انجیل سے فرسودہ دلائل و براہین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کی جاتی ہیں حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ ساری تاویلات جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

فوجی تسخیر کا معاشرے پر بھی نمایاں اثرات پڑے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو فلسطینیوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہی۔ اسرائیل محض ایک یہودی مملکت ہی نہیں رہا بلکہ وہ ایک قابض طاقت بھی بن چکا ہے۔ بعض اسرائیلیوں کو پہلی مرتبہ

اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اسرائیل کو سارے خطّے کے ساتھ بالخصوص اور باقی دنیا کے ساتھ بالعموم جو مصالحت کرنا ہوگی، اس کا مرکزی نقطہ یہی مسئلہ فلسطین ہے۔ اسرائیلی عربوں اور غزہ/مغربی کنارے کے فلسطینیوں کے مابین جب روابط بحال ہوئے تو اس سے سیاسی شعور کو ابھارنے میں اچانک بڑی مدد ملی۔ اسرائیل نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی کہ فلسطینی آبادی کی ان دو اکائیوں کے مابین فاصلے اور رکاوٹیں کھڑی کی جائیں، اس کے باوجود ان دونوں کے مابین تعلقات کا ایک سلسلہ چل نکلا اور دونوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ وہ تنظیمی طور پر (آبادی کی) تیسری اکائی کے ساتھ، جو جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے، منسلک ہیں۔ مزید براں اسرائیل مغربی کنارے اور غزہ میں جس پالیسی پر عمل پیرا تھا، وہ احمقانہ حد تک ناعاقبت اندیشانہ تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے استعماری منتظمین یہ سمجھتے تھے کہ فوجی حکومت کے خلاف "مقامیوں" نے اگر ذرا بھی مزاحمت کی یا ان کی طرف سے گڑبڑ کا معمولی سا اندیشہ بھی ہوا تو اسے بآسانی کچلا جا سکے گا۔ اسرائیلیوں کی سوچ اور رویہ بالکل اسی قسم کا ہے۔ ہر وہ فلسطینی، جس کے متعلق ذرا سا بھی شک ہوتا کہ اس میں فلسطینیوں کا رہنما بننے کے جراثیم پائے جاتے ہیں، اسے یا تو ملک بدر کر دیا جاتا اور یا پھر تو الۂ زنداں۔ "بے چینی" یا اسرائیل کے مفروضہ دشمنوں کے ساتھ "ساز باز" کی سزا یہ دی جاتی کہ فلسطینیوں کو انتظامی احکام کے تحت نقل بند کر دیا جاتا۔ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسرائیل نے اشخاص کا ایک نیا طبقہ پیدا کیا، بلکہ گھڑا، جو آتنا "عرب" (اسے تو اسرائیل نے ایک قانونی جال میں جکڑ لیا تھا، جو اس نے ۱۹۴۸ء کے بعد اپنے "غیر یہودی" شہریوں کے لیے تیار کیا تھا اور جس کے متعلق ان قانونی موشگافیوں سے بالاتر ہو کر کبھی سوچا تک نہیں گیا تھا جس کا نشانہ صرف عرب بنتے تھے) نہیں تھا، جتنا کہ "دہشت گرد"۔

نظر بظاہر یہی آتا تھا کہ اسرائیل کے نزدیک اس "دہشت گرد" کی نہایت ہی محدود اور تخیل سے بالکل محروم (جس کی کوئی ڈھونڈے سے مثال نہیں ملتی) تعریف ہے ـــــ اس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا تھا کہ وہ مملکت کی سلامتی کا دشمن ہے ـــــ لیکن اس کے متعلق حقیقتاً اہم بات یہ ہے کہ وہ قوم پرست محب الوطن کے روپ میں ڈھلتا گیا۔ ان عربوں کے، جن پر ۱۹۶۷ء سے قبل ہی سے اسرائیلی قانون کا اطلاق ہوتا چلا آ رہا تھا اور ان عربوں کے مابین جو ۱۹۶۷ء کے بعد اسرائیلی شکنجے میں گرفتار ہوئے، ایک فرق یہ ہے کہ جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے، صیہونیت نے اسرائیل کے مملکت بننے سے پہلے ہی ان سے عملیاتی طور پر نبٹنے کا اہتمام کر لیا تھا۔ البتہ نئے عربوں پر پرانے طور طریقے نہیں آزمائے جا سکتے تھے۔ چنانچہ انہیں ان ضوابط کی، جن کی نوک پلک سنوارنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا اور جو غیر یہودیوں (نااشخاص) کے لیے وضع کیے گئے تھے، بھول بھلیوں میں آسانی سے گم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نئے علاقوں کا نظم و نسق چلانے کے لیے اسرائیل نے جو بھی "ڈنگ ٹپاؤ" (ایڈہاک) اقدام کیا، وہ بہت بھونڈا اور بے تکا، (جیسے وقت کے وقت گھڑا گیا ہو) ہی نظر نہیں آتا تھا بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مقاصد کی خود ہی نفی کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فلسطینی قوم پرستانہ جذبے کی عوامی لہر نہایت مؤثر طور پر بڑھتی جا رہی تھی، اسرائیل مقبوضہ علاقوں کے اندر "دہشت گرد" کے ساتھ تنظیم آزادی فلسطین کا رشتہ جتنا زیادہ جوڑتا تھا، اتنے ہی زیادہ فلسطینی تنظیم کو اپنی واحد سیاسی امید سمجھنا شروع کر دیتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۸ء سے قبل فلسطین کو نوآبادی بنانا اور اس کے مقامی باشندوں کو زیر کرنا ایک جائز اور برحق مہم تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم ۱۹۶۷ء کے بعد جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس مہم کو اسرائیل کی بین الاقوامی طور پر منظور شدہ سرحدوں

سے اگلے علاقوں تک بڑھایا جا سکتا ہے، تو پھر مسئلہ محض تہذیب سکھانے یا
محض سرزمین کی بازیابی کا نہیں رہا بلکہ سیدھی سادھی توسیع پسندی کا بن گیا۔
کہاں تو اسرائیلیوں کو مقابلے کا کمزور حریف تصور کیا جاتا تھا اور کہاں ان کی یہ کایا
پلٹ ہوئی کہ وہ ایک ہی نسل کی زندگی میں بڑے لاٹ صاحبان بن گئے۔ تاہم معمول
میں ایک فرق یہ آیا کہ فلسطینی ایک فلسطینی کی حیثیت سے منظرِ عام پر نمودار ہوا۔
میں نہیں سمجھتا کہ چند گنے چنے لوگوں کے ماسوا اسرائیلی فلسطینیوں کے متعلق
یہ تصور قبول کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ ایک ایسی سیاسی حقیقت ہیں
جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ تاہم فلسطینیوں کو اتنا مرتبہ ضرور مل گیا ہے کہ بلحاظ آبادی
انہیں ایک حقیقت تسلیم کر لیا گیا ہے اور اب یہودی بھی اس حقیقت سے
نظریں چرا نہیں سکتے۔ اسرائیل کے ان سیاست دانوں نے جو پچھلے چند سالوں
کے دوران میں وزارت عظمیٰ کے عہدے پر متمکن رہے ہیں، فلسطینیوں کا ذکر کرتے
ہوئے جن تراکیب الفاظ کو استعمال کیا ہے، ان سے یہ کافی حد تک واضح ہو جاتا
ہے کہ ان (فلسطینیوں) کے متعلق (اسرائیل کا) سرکاری رویہ کیا ہے۔ ۱۹۶۹ء
میں آنجہانی وزیراعظم گولڈا میئر نے یہ دعوےٰ کیا تھا کہ فلسطینی نام کی کوئی مخلوق صفحۂ
ہستی پر موجود نہیں (جب کہ اس کے اطلاعات کے محکمے اور عرب امور کے علمی
ماہرین نے مسلسل یہ موقف اختیار کئے رکھا کہ فلسطینی اصلاً "جنوبی شام کے
باشندے" ہیں)۔ ایک اور سابق وزیراعظم یتزحاک رابن جب بھی فلسطینیوں کا ذکر
کرتا، تو انہیں "نام نہاد" فلسطینی کہتا۔ (جب کہ اس کے بعض حکام اسے یہ مشورہ
دیتے نہ تھکتے تھے کہ اردن کے ساتھ سرحدیں کھول دی جائیں اور فلسطینیوں کو
حقیقتاً اردنی بنانے کی پالیسی پر عمل کیا جائے) مناحیم بیگن انہیں ارتیز اسرائیل
کے عرب کہتا ہے جیسے کہ وہ اسرائیل کے اپنے "سیاہ فام" باشندے

ہوں [1]۔ (اور انہیں اسرائیلی فوجی نگرانی میں حکومت خود اختیاری کی پیشکش کرتا ہے۔) ان تینوں (سابق وزرائے اعظم) کے سروں پر ایک ہی دُھن سوار رہی کہ سیاسی طور پر فلسطینیوں کو نیست و نابود کرنا ہے۔ تینوں نے بیرون اسرائیل عام باشندوں کے خلاف وسیع پیمانے پر ملکتی دہشت گردی کی اجازت دی اور تینوں نے فلسطین کی مقامی عرب آبادی کو اپنے گھروں اور جائدادوں سے محروم کرنے کی اسرائیلی تاریخ سے کامل بے نیازی برتی ہے۔

ہر جگہ فلسطینیوں کے متعلق اسرائیلی پالیسی کا انتہائی حوصلہ شکن پہلو یہ ہے کہ اسرائیلیوں نے عقل و خرد بلکہ فہم عام (کامن سنس) کو بھی سرکاری طور پر اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا ہے اور آئیڈیالوجی کو ان سب باتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ فلسطینیوں کی موجودگی سے وہ جس طرح انکار کرتے ہیں، علمیاتی طور پر وہ صرف اسی صورت میں بامعنی بن سکتا ہے، اگر اپنے آپ کو اور دوسروں کو یہ باور کرا دیا جائے کہ (صیہونیوں کی آمد سے قبل) فلسطین تو محض ایک بنجر، اُجاڑ، ویران بیابان تھا اور اس بات کا منتظر کہ اس کے متعلق جو اغماض اور لاپروائی برتی گئی ہے، اس کا مداوا کیا جائے۔ لیکن اصل حقیقت جب اس کے بالکل برعکس ہو اور روز روشن کی طرح عیاں ہو، تو اس قسم کی خرافات پر کان دھرنا اور انہیں ماننا اپنی پالیسی سے عقل و خرد کے کردار کو خیرباد کہنا ہے۔ مزید برآں، یہ خیال کہ اسرائیل کو اس (مقبوضہ) علاقے کو اپنی دسترس میں رکھنے کا حق حاصل ہے کیونکہ انجیل مقدس یہ کہتی ہے اور اس (اسرائیل) کی اپنی سلامتی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس پر اس کا قبضہ

---

[1] یہاں اشارہ جنوبی افریقہ کی طرف ہے جہاں کی سفید فام اقلیتی حکومت مقامی سیاہ فام اکثریت کو چھوٹی چھوٹی مقامی ریاستوں کی، جنہیں محدود طور پر حکومت خود اختیاری حاصل ہوگی جیسے ہمارے ہاں بلدیاتی اداروں کو حاصل ہے، پیشکش کر رہا ہے اور ایسی ایک دو ریاستیں اس نے قائم بھی کر دی ہیں۔

برقرار رہے (حالانکہ جنگ کے دوران میں یہی علاقہ خاص طور پر غیر محفوظ اور ضرب پذیر ثابت ہوا)، اسرائیل کے نہایت پُرجوش اتحادیوں کی سمجھ سے بھی بالا ہے۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین کو جو محیر العقول بین الاقوامی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور فلسطینیوں کے تمام طبقوں میں اسے جو مسلسل پذیرائی اور مقبولیت مل رہی ہے، ان کے نشانات اسرائیل پالیسی کے منفی پہلوؤں اور عام فلسطینیوں کے اس عزم میں، کہ اسرائیلی نقطہ ہائے نظر کے جو بھی متبادلات ہوں گے، وہ ان کو اپنانے کے لیے متحد ہو جائیں گے، تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ فلسطینی پہلا عرب طبقہ ہیں جنہوں نے کثیر النسل آبادی کے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ کسی دوسرے گروہ، طبقے یا قومیت نے اتنا جدید نقطہ نظر اختیار نہیں کیا کہ فلسطین میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک سیکولر جمہوری مملکت قائم کی جائے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد کے زمانے میں علاقے میں جو ڈرامائی تبدیلیاں ہوئیں اور وہاں جن نئی حقیقتوں نے جنم لیا، ان سے خاطر خواہ نپٹنے کی جو کوشش تنظیم آزادیٔ فلسطین نے کی کسی دوسرے سیاسی ادارے یا تنظیم نے، خواہ وہ عرب ہو یا یہودی، نہیں کی۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اس نے شعوری طور پر تمام فلسطینیوں ـــــــ خواہ وہ جلاوطن تھے، مقبوضہ علاقوں کے باشندے یا اسرائیل کے باسی ـــــــ کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ ناقابل برداشت حد تک چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم آبادی سے وسیع المشربی، رواداری، کشادہ دلی اور عدم تعصبی کے خوب صورت تناظر میں عمدہ برآ ہونے کی یہ اولین کوشش تھی جو فلسطینی قیادت نے کبھی کی تھی۔ اس سے کم از کم نظری طور پر یہودیوں کی کثیر موجودگی کی گنجائش نکل آئی (معاشرے، انتخابات، سیاسی نظام غرضیکہ ہر جگہ

انہیں عمل دخل حاصل ہو سکتا تھا)۔ تنظیم آزادئ فلسطین کی ایک ٹھوس کارکردگی یہ ہے کہ اس نے، جہاں بھی ممکن ہوا، فلسطینیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے، انہیں مسلح کیا، ان کی سلامتی اور تحفظ کا سامان کیا، انہیں خورد و نوش کی اشیاء مہیا کیں اور انہیں عام ضروریات کی دوسری چیزیں بہم پہنچائیں۔

دوم:۔ تنظیم نے اپنی بین الاقوامی حیثیت اور اثر و رسوخ کو فلسطینی حقیقت کی، جو گزشتہ تقریباً ایک صدی کے دوران میں دنیا کے سامنے دھندلا چکی تھی، تشریح و تعبیر کے لیے استعمال کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے خود فلسطینیوں کو اس حقیقت کا احساس دلایا۔ یوں فلسطین کی ایک آزاد و خود مختار سفارتی شناخت ابھر کر سامنے آئی۔ اس کے ساتھ ہی ایسے ذیلی ادارے وجود میں آگئے جن کا کام معلومات فراہم کرنا اور مختلف امور اور موضوعات کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنا ہے۔ ایسے ذیلی اداروں میں مطالعاتی مراکز، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور طباعتی ادارے شامل ہیں۔ معلومات فراہم کرنے اور مختلف امور و مسائل کی تشریح و تعبیر کرنے والے ان مختلف النوع اداروں نے انجام کار اجتماعی طور پر فلسطینیوں کا رابطہ افریقہ، ایشیا اور امریکہ کی دیگر استعمار گزیدہ اقوام کے ساتھ قائم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صہیونیوں کا یہ جو رعب و دبدبہ تھا کہ باہر کی دنیا جو جی چاہے کہتی اور کرتی رہے، وہ کوئی اثر قبول نہیں کریں گے اور اپنی مرضی کرتے رہیں گے، فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کی نگاہوں میں وہ زائل ہونے لگا اور اب وہ ان سے اتنا مرعوب نہیں رہے جتنا کہ وہ پہلے کبھی تھے بلکہ اب تو صورتِ حال نے مؤثر بہ ماضی ایک نیا پلٹا کھایا۔ اب انہیں صہیونی آبادکار سنگدل خاموش آقا کے بجائے افریقہ کے سفید فام نوآبادکاروں کا مثیل نظر آنے لگا۔ صہیونی آبادکاروں کے متعلق رویے کی یہ تبدیلی ایک ایسی قوت میں ڈھلنے لگی جسے بسرعت حرکت میں لایا اور (حریف کے خلاف) کارروائیاں

کرنے کے لیے مجتمع کیا جا سکتا تھا۔

سوم: ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے تنظیم آزادی فلسطین کے دروازے چاروں اور وا کر دیئے گئے تاکہ قوم کے تمام افراد کو اس کی صفوں میں داخل اور شامل کیا جا سکے۔ اور سچی بات یہ ہے اور اس میں مبالغے کا کوئی پہلو بھی شامل نہیں کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین نے ہر فلسطینی کے لیے (بالخصوص جب یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ یہ قوم تباہ کن انداز سے مختلف چھوٹے چھوٹے اور بے حیثیت گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی) اس بات سے قطع نظر کہ وہ کہاں رہتا ہے یا یہ کہ نظریاتی طور پر اس کی سیاسی وابستگیاں کیا ہیں، نہ صرف ایک فلسطینی ہونا ممکن بنا دیا بلکہ اسے ایک بامعنی اور باوقار چیز بھی بنا دیا۔ یہ تنظیم آزادیٔ فلسطین ہی کا فیضان ہے کہ اس نے عام فلسطینیوں کو مجہول اور انفعالی حیثیتوں سے اٹھایا اور انہیں ایسے انسانوں کے قالب میں ڈھال دیا جو سیاسی محاذ پر پورے تن من دھن سے سرگرم عمل ہو چکے ہیں، تاہم، جیسا کہ میں بعد میں ذکر کروں گا، یہ (تنظیم آزادیٔ فلسطین) خطرناک حد تک عدم التصاق[ا] کا ذریعہ بھی ہے۔

میرے خیال میں فلسطینیوں کے ان مختلف اور منتشر اجزاء کی تاریخ اور نمو کا مسبوط لیکن بہترین جائزہ و تجزیہ پیش کرتا ہے جو حال ہی میں ابراہیم ابوالغود نے جن کا شمار فلسطین کے انتہائی ہوش مند، زیرک اور طباع مفکرین میں ہوتا ہے، پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء کے مابعد فلسطینی جلاوطنوں نے بھی، اور ان فلسطینیوں نے بھی، جنہوں نے اسرائیل ہی میں مقیم رہنے کا فیصلہ کیا تھا، "مصالحت کی سیاست" اختیار کر لی۔ اول الذکر اگرچہ سیاسی اعتبار سے بے حیثیت ہو چکے تھے، پھر بھی وہ فلسطینی نہ سہی، کم از کم عرب سیاست میں ضرور دخیل ہو سکتے

ا۔ incoherence

تھے اور ہوتے رہتے ۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک تو ان کے پاس اور کوئی متبادل نہیں تھا ۔ دوسرے صیہونیت کے برعکس عربیت لاغیریت پسند نہیں تھی ۔ البتہ جو لوگ اسرائیل ہی میں قیام پذیر رہے ، انہوں نے اسرائیلی نظم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور صیہونیت نے ان کے لیے زبردستی جو دائرۂ کار متعین کیا تھا ، انہوں نے اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سیاست کاری کے روایتی فلسطینی طریقے اپنا لیے ۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے کے دوران میں "تارکین وطن اور اسرائیلی عرب ، دونوں ہی ، اس سیاست میں مشغول ہو گئے جسے استرداد کی سیاست کہا جا سکتا ہے ۔" اس سیاست نے اندرونِ اسرائیل اسرۃ الارض کی مہم جوئی کی صورت اختیار کر لی ۔ جہاں تک جلاوطن پناہ گزینوں کا تعلق ہے ، انہوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ سیاست کاری کے حق سے محروم ہو چکے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے "آزادیٔ فلسطین" کے متعلق "برادر عربوں" کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا ۔ ابراہیم لغود رقمطراز ہیں :

یہ جون ، ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دھچکے اور صدمے تھے جو انقلاب اور امید کی سیاست کے نقیب بنے ۔ جلاوطن فلسطینیوں نے اس نئی صورتِ حال کا مفہوم یہ لیا کہ اب انہیں مزاحمت کی کارروائیوں کا آغاز کر دینا چاہیئے ، عرب سیاست سے دامن چھڑا لینا چاہیئے اور اپنے فلسطینی ہونے کا کھلم کھلا اظہار کرنا چاہیے ۔ انجام کار یہ رویہ تنظیم آزادیٔ فلسطین اور اس کے پروگرام کی مخصوص صورت اختیار کر گیا ۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو اسرائیل کے اندر ہی قیام پذیر رہے تھے ، ان کے نزدیک اس نئی صورتِ حال کا مطلب یہ تھا کہ وہ (اسرائیلی) نظام کے اندر رہ کر زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کریں اور کمیونسٹ پارٹی اور فلسطین میں دو

ریاستوں کے قیام کے متعلق اس (کمیونسٹ پارٹی) کی مزید تائید وحمایت
کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اس بات سے قطع نظر
کہ فلسطینی مختلف چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ چکے تھے، انہیں
فلسطینی قوم کی ایکتا کا پُر زور اعلان کرنا چاہیے۔ دونوں فریقوں نے
"عرب" قوم" کے ساتھ اپنے ثقافتی رشتوں کا ادعا تو کیا لیکن عرب قوم کو
وحدت کی ایک لڑی میں پرونے کا جو سیاسی پروگرام ہے، اسے انہوں نے
کم سے کم بنا کر پیش کیا۔ ان دونوں فریقوں کے جو نقطہ ہائے نظر ہیں، معلوم
ہوتا ہے کہ وہ ایک نقطۂ اتصال کی طرف بڑھ رہے ہیں (الولغود نے صرف
دو فریقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ان میں ایک تیسرے
فریق کا اضافہ کرنا چاہیے اور یہ تیسرا فریق ان فلسطینیوں پر مشتمل ہے، جو
مقبوضہ علاقوں میں آباد ہیں) [۵]

لیکن "انقلاب اور امید کی سیاست بھی" کرب اور رکاوٹوں سے خالی نہیں
تاہم اس معاصر دور کی تہہ در تہہ پیچیدگی اور گنجانیت عمیق غور و فکر کی مستحق ہے اور
اب میں اسی کو زیر بحث لانا چاہتا ہوں۔ میری توجہ کا مرکز صحیح معنوں میں سچے اور بے لاگ
متحدہ فلسطینی سیاسی شعور ذات کی نمو ہے۔ اس سیاسی شعور ذات کا معاصر تاریخ
کے ساتھ نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہے اور قوم اپنے حق خود ارادیت کے حصول کی طرف
جو آہستہ آہستہ پیش قدمی کر رہی ہے، یہ (سیاسی شعور ذات) اس کے ساتھ پوری طرح
ہم آہنگ ہے۔

---

۵ الولغود: جریس کی کتاب "اسرائیل کے عرب" پر تبصرہ۔ مطبوعہ MERIP Reports" شمارہ نمبر ۵۸
(جون ۱۹۷۷)، صفحہ نمبر ۲۴

فلسطینی شعور کا ظہور

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایسے موضوع پر بحث کرتے وقت، جو تاریخ کے لیے اتنا ہی حساس ہے جتنا کہ قومی خود آگاہی، اس شخص کا، جو بحث میں حصہ لے رہا ہے، یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ٹھوس صداقت کے مقابلے میں مجرد وضاحت کی قربانی دے دے۔ فی زمانہ فلسطینیوں کی صورت بے حد اُلجھی ہوئی ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں اس چیز کو بالتفصیل بیان کروں جسے وہ اپنے ماضی اور مستقبل، اپنی تاریخی اور سیاسی شناخت کی اپنی تفہیم کہتے ہیں[1]، یہ ضروری ہے کہ پہلے اس شے سے بھی نپٹ لیا جائے جو ایک طرف تو اس تفہیم کی وجہ سے ان کے حالات میں دراڑ ہے اور دوسری طرف اس کا واقعیت کی دنیا میں واسطہ کن چیزوں سے پڑا۔ فلسطینی عوام کی پیچ در پیچ اور تکلیف دہ صورتِ حال کو زیرِ بحث لاتے وقت ایک مزید اُلجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے انتہائی مفسدہ پردازی بلکہ افراتفری کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے

---

[1] یعنی خود فلسطینی ان چیزوں کے متعلق خود کیا سمجھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ۷۶-۱۹۷۵ء کی لبنانی جنگ نے لبنانی/شامی/فلسطینی ڈرامے کی محض سٹیج ہی آراستہ نہیں کی بلکہ حقیقت یہ جنگ بذاتِ خود بین الاقوامی سیاست، عظیم طاقتوں کے مفادات، عرب دنیا میں اقلیتوں کی تاریخ، سماجی/سیاسی انقلاب اور مشرقِ وسطیٰ میں مغربی نوآبادکاری اور استعمار کے پورے المناک ورثے کو ایک چھوٹے پیمانے پر پیش کرنے کی کوشش بھی تھی۔ اب اصل کام جو کرنے کا ہے، وہ یہ ہے کہ ان امور کا ایک سرسری خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ یہ (خاکہ) اس مرکزی موضوع کا، جس کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں اور جو فلسطینی بقا، اور ۱۹۷۶ء کے بعد کے عہد میں فلسطینی قومی شناخت جیسے مسائل کا احاطہ کرتا ہے، افتتاحیہ بن سکے۔

پہلے لبنان ہی کو لیں۔ عرب مشرقِ وسطیٰ کا ایک زیرک اور تیز فہم مورخ معاً اس حقیقت کو بھانپ جائے گا کہ لبنان میں جو کچھ پیش آیا، اگر فلسطینی اور شامی وہاں موجود نہ ہوتے، تو یہ بالکل انہی واقعات کا اعادہ ہوتا جو ۱۸۴۵ء اور ۱۸۶۰ء میں وہاں وقوع پذیر ہوئے تھے۔ (ان سالوں میں) لبنان کے دو بڑے فرقوں ـــــ مارونی عیسائیوں اور دروزیوں[۵] ـــــ کے مابین شدید مخاصمت امنڈ آئی تھی۔ جس طرح اب اس تنازعے میں بڑی طاقتیں ملوث ہیں، اس وقت بھی وہ اس میں اسی طرح ملوث تھیں۔ تاہم ان دونوں فرقوں کے مابین جو معاشرتی اور سیاسی آویزش پائی جاتی ہے، اس کی نہ تو اس وقت خالص مذہبی بنیادوں پر حدود متعین کی جا سکتی تھیں اور نہ اس وقت۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہاں انیسویں اور بیسویں صدی کے مابین سود مند موازنہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس علاقے کا کوئی بھی باشندہ اپنے متعلق کیا سوچتا ہے اور وہ اپنی سیاسی وابستگی کے مفہوم

---

[۵] اسمٰعیلی شیعوں کی ایک شاخ۔

کو کس طور لیتا ہے، جنگ عظیم دوم کے بعد اس میں فیصلہ کن ہی نہیں بلکہ انتہائی اہم تبدیلیاں اور اضافے رونما ہو چکے ہیں۔ اولین تبدیلی یا اضافہ یہ ہے کہ اپنی قومی مملکت کے بارے میں لوگ جن جذبات کا اظہار کرتے ہیں، ان کی شدت میں اب بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ قومی مملکت کے ساتھ وابستگی میں جو شدت پائی جاتی ہے، وہ مختلف مدارج کی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ قومی مملکتوں کی آزادی یا علاقائی تحفظ کو جب کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے، تو اس سے مختلف اقسام اور مختلف مدارج کے جذبات عالم وجود میں آتے ہیں ایک اور نقطۂ نظر کی رو سے جو بات لاریب درست ہے، وہ یہ ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد مملکت اور اس کے کارپردازان نے خیرہ کن اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ پھر جہاں تک ان اختیارات اور ان کے استعمال کا تعلق ہے، مختلف ممالک میں ان کی نوعیت مختلف ہے (کسی کے پاس کچھ کم ہیں اور کسی کے پاس کچھ زیادہ)۔ تاہم موجودہ زمانے کے اختیارات ان اختیارات سے، جو مثال کے طور پر سلطنت عثمانیہ اپنے آپ کو تفویض کرتی تھی، بالکل مختلف قسم کے ہیں۔ اور یہ بات (آج کی) تمام مملکتوں پر صادق آتی ہے۔

بیسویں صدی میں جو دوسری بڑی تبدیلی رونما ہوئی، وہ یہ ہے کہ جہاں تک سیاسی فکر کا تعلق ہے، اس بات کا غالب امکان پایا جاتا ہے کہ خالصتاً مقامی نوعیت کے مسائل کا بھی وسیع تر عالمی تعمیمات کے تناظر میں ہی ادراک کیا جائے گا، (اسی تناظر میں) ان سے نپٹا جائے گا، ان کا تجزیہ کیا جائے گا اور ان کے متعلق محاذ آرائی کی جائے گی۔ صیہونیوں نے (حصولِ) فلسطین کی خاطر جو طور طریقے اور ہتھکنڈے اپنائے، ان پر یقیناً یہی بات صادق آتی ہے مثال کے طور پر بیسویں صدی کے کٹر مارونی عیسائیوں میں یہ بات بہت عام ہے

کہ وہ اپنے متعلق یہ باور کرتے ہیں کہ ہم مغربی تہذیب و تمدن کی اصل خصوصیات اپنے اندر سمو چکے ہیں اور یہ ہم وحشیوں کے ان جتھوں کو، جو ہمارے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں، دور باش کہنے کی سعی کر رہے ہیں۔ بعینہٖ، ۱۹۶۷ء کے بعد فلسطینیوں میں بھی یہ رجحان پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کو اسی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ویت نام، الجزائر، کیوبا اور سیاہ فام جنوبی افریقہ کے عوام اپنی جدوجہد کو دیکھتے تھے یا دیکھتے ہیں۔ جزوی طور پر نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی اس اضافہ پذیر عالمی سیاسی شعور کی مرہونِ منت ہے جس کی تشکیل حریت اور علم کے متعلق خیالات کی وسیع و عریض تشہیر اور نوآبادیات اور استعمار کے خلاف جدوجہد کے نتیجے کے طور پر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ذرائع ابلاغ کے اثر و رسوخ نے دنیا کے دور دراز علاقوں اور اس سے بھی کہیں زیادہ بالکل ہی مختلف (اور بعض اوقات متضاد) خیالات کے گروپوں کو بعض اوقات بلا امتیاز اور بعض اوقات منصفانہ انداز سے ایک دوسرے کے بالکل قریب لا کھڑا کر دیا ہے۔ ایک طرف تو عام رجحان یہ ہے کہ ہر واقعہ کو تعمیمی رنگ دے دیا جاتا ہے، اور دوسری طرف ذرائع ابلاغ اور اوسط دماغ کے مالک انسانوں میں یہ رجحان عام پایا جاتا ہے کہ وہ ہر بات کو آسان سے آسان تر بنا کر اور اسے ڈرامائی انداز دے کر پیش کرتے ہیں۔ اگر ان دونوں رجحانات کو آپس میں اکٹھا کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ بس یہی نکلے گا کہ مسائل اور عمل کے متعلق غلیظ سیاسی لفاظی کا سہارا لیا جائے گا، مبالغہ آرائی میں اضافہ ہو جائے گا غیر اہم موضوعات کو خواہ مخواہ اہم بنا کر پیش کیا جائے گا اور اکثر اوقات ان پر مذہب کا غلاف چڑھا دیا جائے گا۔ یہ ہوگا نہیں، بلکہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی اس سے مامون نہیں کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

غالباً یہ بات ہمیشہ صحیح رہی ہے کہ انسان ایک دوسرے سے اپنے اختلافات

کو تشریح و تعبیر کے امور گردانتے رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ انیسویں صدی کے دوران میں کسی چیز کے متعلق ایک مخصوص قسم کا فرانسیسی یا برطانوی رویہ تھا، یہ کہنے کے مترادف ہے ۔ ـــــــ آپ یہ بات خواہ کتنے ہی مبہم یا گول مول طریقے سے کیوں نہ کریں ـــــــ کہ حقیقت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک مخصوص قسم کا فرانسیسی یا برطانوی انداز تھا۔ اس قسم کے ادعا میں یہ تفہیم یا ادراک بھی شامل ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں، جنہیں صحیح معنوں میں خالصتاً فرانسیسی یا برطانوی مفادات کا نام دیا جا سکتا ہے، حقیقتاً موجود تھیں۔ اور دراصل یہی وہ مفادات تھے جو ان (اقوام کے) رویے متعین کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کی باتیں مشرق وسطیٰ اور اس کی اقوام کے متعلق کہی جاتی ہیں۔ تاہم ان دو تبدیل شدہ حقیقتوں کے پیش نظر، جن کا ذکر میں کر چکا ہوں، اس قسم کی باتوں میں یہ سہولت پیدا ہو گئی ہے کہ آپ ان سے جو چاہیں، مطلب اخذ کریں اور یہ چیز بڑی خطرناک ہے۔ فی زمانہ ہم جب عربوں، لبنانیوں، یہودیوں یا اسرائیلیوں کا ذکر کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ہم گویا محکم تشخصات کا ذکر کر رہے ہیں جب کہ درحقیقت ہم ایسے مفاہیم و تفاسیر کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں جو انتہائی سیماب وش متلون بلکہ انتہائی قیاسی ہوتے ہیں۔ مانا کہ ایسی مملکتیں موجود ہیں، جن کے متعلق ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا چاہتی ہیں لیکن ـــــــ اور یہاں بیسویں صدی کی دوسری بڑی تبدیلی پہلی تبدیلی کے ساتھ متصادم ہو جاتی ہے ـــــــ یہ مملکتیں ایسی سیاسی لفظیات کی گرفت میں ہیں اور ایک سیاسی اقلیم میں مقید ہیں، جس کی زمین مسلسل تبدیلیوں کے عمل میں سے گزرتی رہتی ہے۔ اس صورتِ حال کے سیاسی لین دین اور طریقہ ہائے کار پر جو اثرات مترتب ہوئے ہیں، ان کے بارے میں کسی قسم کے مغالطے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ۱۹۷۶ء میں شام نے لبنان پر جو چڑھائی کی، اس کے بعد

"عرب استحاد" جیسی تراکیب کے کیا معنی رہ جاتے ہیں ؟ "انقلابی یا انتہا پسند عرب ممالک" جیسی تراکیب کا کیا مفہوم ہے ؟ پھر اس قسم کے مطالبات کا صحیح مطلب کیا ہے جن کے تحت اسرائیل اور امریکہ اس قسم کے استفسارات کرتے ہیں۔ کیا عرب اسرائیل کو "تسلیم" کریں گے یا نہیں ؟ یہ سوال اس وقت اور بھی گنجلک ہو جاتا ہے جب اتنا بھی واضح نہ ہو کہ وہ کس اسرائیل کی بات کر رہے ہیں، جس کا وجود وہ "عربوں" سے منوانا چاہتے ہیں ۱۹۴۸ء کا اسرائیل یا ۱۹۶۷ء کا اسرائیل ؟ یا بات اس اسرائیل کی ہو رہی ہے جس کی جنگی کشتیاں جنوبی لبنان کی ناکہ بندی کر چکی ہیں اور اس پر گولہ باری کرتی ہیں (اور بعض اوقات تو اس "نیک کام" میں اسے شام کی تائید و حمایت بھی حاصل ہوتی ہے) ؟

مجھے یہ دلیل پیش کرنے میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ اس قسم کے مسائل مشرق وسطیٰ کی سیاسی زندگی کا ایک باقاعدہ رنگ روپ ہیں اور یہ کہ مشرق وسطیٰ میں جو باتیں اتنی انوکھی، عجیب و غریب اور خلافِ معمول دکھائی دیتی ہیں، وہ حقیقتاً اتنی انوکھی، عجیب و غریب اور خلافِ معمول ہیں نہیں۔ اس قسم کی باتوں کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ چونکہ اس علاقے میں مملکتوں اور مملکتی ڈھانچوں کی ضرورت اور اہمیت پر حالیہ زمانے میں اس قدر بڑھ چڑھ کر زور دیا جانے لگا ہے اور نیز چونکہ مملکتوں کی جو تعریف کی جاتی ہے، وہ تعریف اس قسم کی ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مملکت کوئی عام قسم کی چیز ہے یا کائناتی اہمیت کی حامل کوئی عمومی چیز، چنانچہ بالکل یہی وجہ ہے جو مشرق وسطیٰ کے انوکھے پن، اس کے عجیب و غریب ہونے یا خلافِ معمول نظر آنے کو اتنا نمایاں بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ مشرق وسطیٰ ویسے ہی مسائل کی ایک پوٹ ہے۔ ان مسائل میں فلسطینیوں کو

ایک فقید المثال مقام حاصل ہے۔ چنانچہ مسائل کی اس پوٹ میں اگر فلسطینیوں کے فقید المثال مقام کا اضافہ کر دیا جائے تو صورتِ حال یہ بنے گی کہ مشرق وسطیٰ جو پہلے ہی اتنی بے ضابطگیوں (ANOMALIES) کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، وہ پہلے سے کئی گنا بڑھ جائیں گی۔ فلسطینی مشرق وسطیٰ کا وہ پہلا مقامی گروپ ہیں جنہیں عرب قومیت کے مسئلے سے اس کے وسیع، عمومی اور تشریحی صورت میں عہدہ برآ ہونا پڑا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے سب سے پہلے ایک ٹھوس شکل میں یہ مطالبہ بھی کیا کہ انہیں ایک مملکت کا درجہ دیا جائے۔ صہیونیوں نے جب فلسطین کو ایک نوآبادی بنانے کی تحریک شروع کی، فلسطینیوں نے اس کی مخالفت کی اور یوں ان دونوں کے مابین کشمکش شروع ہو گئی۔ اس کشمکش نے فلسطینیوں پر دوہری ذمہ داریاں ڈال دیں،

(۱) سلطنت عثمانیہ کے سقوط کے بعد عربوں نے سیاسی آزادی اور آزاد ممالک کا درجہ حاصل کرنے کی جو تحریک چلا رکھی تھی، ضرورت اس بات کی تھی کہ فلسطینی اپنی مزاحمت کا ناطہ اس کے ساتھ استوار کریں۔

(۲) صہیونیوں نے ایک مخصوص یہودی مملکت کے قیام کے لیے جو مطالبہ پیش کر رکھا تھا، ضرورت اس بات کی تھی کہ اس مطالبے کی ڈٹ کر مخالفت کی جائے کیونکہ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا ______ اور بعد کے واقعات نے تو اسے صحیح ثابت کر دیا ______ کہ نئی یہودی مملکت میں مجموعی طور پر انہیں کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوگی بلکہ انہیں بیک بینی و دوگوش ملک سے ہی باہر نکال دیا جائے گا۔

ایک خاص حد تک فلسطینیوں کو اور اس خطے کو، جس سے ان کا تعلق ہے، بالکل اسی قسم کی تکلیف دہ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا جس کا سامنا دنیا کے بعض

سابقہ استعمار گزیدہ علاقوں کے عوام کو کرنا پڑا تھا۔ تاہم جیسا کہ میں باب اوّل میں اشارہ کر چکا ہوں، مشرق وسطیٰ کی تاریخ کا ایک غیر معمولی طور پر اہم پہلو یہ ہے کہ یہاں نہ صرف ایسی جماعتیں اور ادارے موجود ہیں جو جھگڑا اور فساد کھڑا کرنے اور حقائق کی من مانی تعبیر کرنے کے ماہر ہیں ـــــ عام طور پر اس قسم کے ادارے اقلیتی حکومتوں کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں ـــــ بلکہ یہاں ایسے اداروں اور جماعتوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو بے حد فعال ہیں اور جنہیں اپنا نقطۂ نظر پُرزور انداز سے پیش کرنے میں بہت مہارت حاصل ہے۔ ان میں سے ہر ادارے یا جماعت نے دنیا کے اس خطے میں، جس کا وہ خود ایک جزو ہے، اپنی مرضی اور اپنا نقطۂ نظر ٹھونسنے کے لیے نہ صرف یہ کہ مہم جوئی کا آغاز کیا بلکہ اس مقصد کے حصول کی خاطر (اسرائیل کی طرح) عملی جدوجہد بھی کی۔ بیسویں صدی کی جن تبدیلیوں کا میں نے ذکر کیا ہے، اگر ان میں محولہ بالا عنصر کو بھی شامل کر دیا جائے اور ساتھ ہی ان میں اقلیتوں کے اس قدرتی میلان کو بھی ملا جائے کہ وہ اپنی کوششوں کو پروان چڑھانے کے لیے خارجی طاقتوں کی امداد و حمایت حاصل کرتی ہیں، تو آج مشرق وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کو ہم بہتر انداز سے سمجھ سکیں گے۔ ان اقلیتوں نے اپنی مخصوص خود آگاہی کو برقرار رکھا ہے۔ اس خود آگاہی کا خاکہ البرٹ حورائی نے بدیں الفاظ پیش کیا ہے،

> مجموعی طور پر ان گروہوں نے بند طبقوں کی تشکیل کی۔ ان میں سے ہر طبقہ اپنی "دنیا" آپ تھا۔ یہ دنیا نہ صرف اس طبقے کے ارکان کی تسکین کے لیے کافی تھی بلکہ ان کی قطعی وفاداری حاصل کرنے کیلئے بھی ممد ثابت ہوتی تھی۔ یہ دنیائیں ایک دوسرے کو مس ضرور کرتی تھیں لیکن ایک دوسری میں مدغم نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں ہر ایک باقیوں کو

نہ صرف شک و شبہ بلکہ نفرت کی نظر سے بھی دیکھتی تھی۔ یہ تقریباً ساری کی ساری ساکن، غیر متبدل اور محدود تھیں لیکن جہاں تک سنی دنیا کا تعلق ہے، اگرچہ ہر قسم کے اندرونی اختلافات کی وجہ سے وہ پارہ پارہ ہو چکی تھی، پھر بھی اس میں ایک نوعیت کی آفاقیت، خود اعتمادی اور احساس ذمہ داری موجود تھا اور یہ وہ چیزیں ہیں، جن سے دوسری دنیائیں محروم تھیں۔ تاہم ان سب (باقی دنیاؤں) کی حیثیت برائے نام تھی اور جہاں تک طاقت اور یا ایسے فیصلے کا تعلق ہے، جو تاریخ پر اثر انداز ہو سکے، وہ اس سے بھی تہی دامن تھیں۔[1]

مشرقِ وسطیٰ کی اقلیتیں، جو پہلے ہی چھوٹی چھوٹی اور (تعداد میں) بیشمار ہیں، اپنے ارکان کو اور بھی چھوٹی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کام کرنے کا رجحان کچھ اس قسم کا ہے، جو انہیں اصل سے بھی چھوٹا بنا دیتا ہے۔ اقلیتیں اپنے آپ کو اپنے انسانی گردوپیش سے علیحدہ کر لیتی ہیں اور داخلی طور پر وہ مزید چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتی ہیں۔ یہ بات اسرائیل پر بھی صادق آتی ہے جہاں (عربوں کا تو ذکر ہی کیا) مشرقی اور یورپی یہودی ملک کو نمایاں انداز میں چھوٹے چھوٹے ذیلی خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے عیسائی جنہیں عام طور پر مشرقی یا اورینٹل عیسائی کہا جاتا ہے، لبنان جیسے ممالک میں بھی، جہاں وہ کسی انداز سے بھی ایک دبکنے والا یا نظروں سے اوجھل ہو جانے والا گروہ نہیں، اپنے امتیازات اور اختلافات کی بہت فکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے

---

[1] البرٹ حورانی (Hourani) "عرب دنیا کی اقلیتیں" (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۴۷ء) صفحہ نمبر ۲۲

کے مقابل ڈٹا ہوا ہے اور اس میں وہ اسی قسم کی شَوونیت [۱] اور عیارت کا مظاہرہ
کرتا ہے، جو وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنے اختلافات اور نزاعات میں دکھاتے
ہیں۔ بظاہر تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ لبنان میں جو دھماکہ خیز صورت حال پیدا ہو چکی ہے
اور جس قسم کی آگ وہاں بھڑک رہی ہے، اس نے "مسلمانوں" کو "عیسائیوں" کے
مدِمقابل لا کھڑا کیا ہے لیکن جس بات کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے
وہ یہ ہے کہ یہ مارونی عیسائی، جو اورینٹل عیسائیوں کی ایک خاص قسم ہیں، ہی تھے،
جنہوں نے جنگ کے آغاز میں سنی مسلمانوں کی مخالفت کی تھی حالانکہ ان سنی مسلمانوں
کا کثیر التعداد شیعہ مسلمانوں کے ساتھ فی نفسہٖ کوئی اتحاد نہیں تھا اور مارونی عیسائیوں
کی اس جنگجویانہ جدوجہد میں یونانی قدامت پسند، پروٹسٹنٹ، آرمینی یا یونانی کیتھولک
فرقوں نے اس اتفاق رائے کے ساتھ شرکت نہیں کی جس کی کہ ہم توقع کر سکتے تھے
پھر مارونی عیسائیوں کو اکسانے اور ان کی دم مروڑنے میں اسرائیلیوں نے بھی ایک
فعال کردار ادا کیا (بلکہ ابھی تک کر رہے ہیں)۔ یہ اسرائیلی ہی تو ہیں جو انہیں ہتھیار،
گولہ بارود اور رسد پہنچاتے ہیں اور ان کی سیاسی حمایت کرتے ہیں۔ اسرائیل لبنان
میں جس پالیسی پر عمل پیرا ہے، اس کی تہہ میں یہ حکمت کارفرما نہیں کہ اسے "عیسائیوں"
کے ساتھ کوئی ہمدردی ہے بلکہ مشرقِ وسطیٰ کی اقلیتوں کا یہ جو مشترکہ مقصد ہے کہ
فلسطینیوں کو کسی نہ کسی طریقے سے تباہ و برباد کر دیا جائے، [۲] اسے وہ دائیں بازو

---

[۱] اس لفظ کی تشریح صفحہ نمبر ۱۰۱ کے حاشیے پر کی جا چکی ہے۔

[۲] پچھلے پندرہ بیس برسوں سے لبنان میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مصنف کے دعوے کی تائید کیلئے کافی ہے
فلسطینیوں کی ایک عظیم اکثریت سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ جب بھی موقع ملتا ہے، اسرائیلی، مارونی
عیسائی، لبنان کے شیعہ مسلمان اور شامی (شام کی حکومت ایک اقلیتی گروہ کے قبضے میں ہے)
فلسطینیوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔

کے عیسائیوں کی امنگوں کا ساتھ دے کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جنگِ عظیم دوم سے قبل بھی صیہونی عالمی کونسل کی کانگرس منعقدہ ۲۹ جولائی تا ۷ اگست ۱۹۳۷ء ڈیوڈ بن گوریان[1] نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "لبنان کی قربت یہودی مملکت کے لیے بے پناہ سیاسی حمایت تشکیل کرتی ہے۔ لبنان یہودی ارتیز اسرائیل کا قدرتی اتحادی ہے۔ لبنان کی عیسائی قوم کا مقدر بعینہٖ وہی ہے، جو یہودی قوم کو درپیش ہے۔"

میرا خیال ہے کہ یہاں مجھے یہ ذکر بھی کر دینا چاہیے کہ مشرقِ قریب کی جنگجو اقلیتوں کا رویہ، اس چیز کے خلاف جسے حورانی سنّی مسلمانوں یعنی اکثریتی طبقے کی آفاقیت، خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری کا نام دیتا ہے، ہمیشہ جارحانہ رہا ہے۔ اس علاقے کے مُسلم، عیسائی تعلقات کی تاریخ پر غور کریں۔ نارمن ڈینیل نے اپنی ایک کتاب[2] میں اس کے متعلق کافی کچھ لکھا ہے۔ ایک معاصر اورینٹل عیسائی یا عرب امور کے ماہر ایک اسرائیلی کی حیثیت سے، جو اسلام یا عرب "ذہنیت" کو اپنا دشمن باور کرتا ہے۔ ڈینیل نے یہ جو کتاب لکھی ہے، وہ اکثر مقامات پر شدید بے چینی اور پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ وہ جو کچھ ثابت کرتا ہے، یہ ہے کہ یہ شامی عیسائی تھے جن میں دمشق کا سینٹ جان (تقریباً ۶۷۵ء تا تقریباً ۷۴۹ء[3]) اور نویں صدی کا فلسفی الکندی

---

[1] ڈیوڈ بن گوریان (۱۸۸۶ء - ۱۹۷۳ء) اسرائیل کا پولینڈ نژاد اوّلین وزیرِ اعظم۔ اسے اسرائیل میں وہی مقام حاصل ہے جو پاکستان میں قائدِ اعظم کو، ترکی میں کمال اتاترک کو اور بھارت میں مہاتما گاندھی کو حاصل ہے۔

[2] Norman Daniel, Islam and the West: The Making of an Image"
ناشر: ایڈنبرا یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۰ء

[3] بعض لوگوں نے اس کا عرصۂ حیات ۷۰۰ء سے ۷۵۴ء تک شمار کیا ہے۔

شامل تھے، جنہوں نے یورپی عیسائیوں کو مسلمانوں اور (حضرت) محمد (مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ اقدس پر حملے کرنے کے لیے مذہبی (اکثر دریدہ دہنی اور دشنام طرازی سے بھرپور) اور اعتقادی مواد فراہم کیا۔ بعد ازاں اس مواد کو مغربی ثقافت میں اہم مقام مل گیا اور بعض لوگ تو آج بھی اس مواد کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔ (حضرت) محمد مصطفےٰ صلعم کے متعلق طرح طرح کی واہیات اور لغو باتیں ، انہی شامی عیسائیوں کی دماغی اختراع تھیں۔ چونکہ یہ شامی عیسائی عربی اور ایک دو کلیسائی زبانیں جانتے تھے، اس لیے وہ اس قسم کی غلیظ اور بدبودار خرافات کو فروغ دینے میں کامیاب رہے۔ (اس کے پس پردہ) ان کے جو محرکات تھے، وہ (آسانی سے) سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اصل قصہ یہ تھا کہ اسلام ایک تبلیغی اور فاتح دین تھا اور چونکہ شامی عیسائیت پر نہایت استقامت اور ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے تھے، اس لیے وہ اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ وہ اسلام پر بڑھ چڑھ کر تند و تیز تنقید کریں تاکہ انہیں طاقتور یورپی اتحادیوں کی حمایت حاصل ہو سکے۔ یہ ہے وہ طویل عرصے سے فراموش شدہ پس منظر، جس سے اس بغض اور کینے کے سوتے پھوٹتے ہیں جو آج کے لبنان میں عیسائی اور مسلمان محسوس کرتے ہیں۔ اور اخلاقی طور پر معیوب اس ورثے میں آج بے شمار صیہونی بھی شریک ہو گئے ہیں۔ اس کے برعکس چونکہ فلسطین میں اور معاصر فلسطینیوں کے مابین کبھی کوئی غالب، غیر متبدل عیسائی فرقہ موجود نہیں رہا اور چونکہ ۱۹۰۰ء سے اولین یورپی صیہونی نوآبادکاروں کی شکل میں انہیں ایک مشترکہ عرب دشمن کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے، اس لیے ایک عیسائی ہونے کے ناطے اس قسم کی خرافات کبھی اس کی تعلیم کا جزو نہیں رہیں۔

اگر کسی فرقے یا گروہ میں اپنے اقلیتی ہونے کا شعور بیدار ہو جائے اور اس کے

ساتھ اسے سیاسی امور کو اس طرح عمومی رنگ دینے کی عادت پڑ جائے جس سے اس کی اپنی جاہ طلبی کے پورے ہونے کا امکان ہو سکتا ہو۔ اور یہ دونوں چیزیں مل کر ایسے حالات پیدا کر دیں کہ اسے کسی سیاسی مملکت کی سیادت فقید المثال انداز سے حاصل ہو جائے تو سمجھیں کہ مصیبت آن کھڑی ہوئی

اور یہ مصیبت عموماً تقسیم کر دینے والی علیحدگی پسندی کی صورت میں آتی ہے۔ آج کل مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک میں، جن میں اسرائیل بھی شامل ہے،[۱] آپ کو یہ کیفیت دیکھنے کو ملے گی کہ ایک طرف تو ان میں عزلت گزینی کا رجحان عام ہے، وہ دوسروں سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتے اور دوسری طرف وہ اپنے انداز سے سیاسی امور کو عمومی رنگ دینے کے بھی بڑے شوقین ہیں۔ چونکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں، اس لیے کشمکش کی ایک صورت نکل آتی ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں بھی کشمکش کی یہ چنگاریاں موجود ہیں جو اندر ہی اندر سلگ رہی ہیں اور بجھنے کا نام تک نہیں لیتیں۔ مصر کی مثال لیں۔ وہاں ایک طرف تو عرب اتحاد کا جذبہ زوروں سے سرگرم عمل ہے۔ دوسری طرف مخصوص قسم کی مصری قومی شناخت کا پیچیدہ نظریاتی رجحان بھی چھپائے نہیں چھپتا۔ چنانچہ یہ دونوں جذبے آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس تصادم کی ڈرامائی شہادت صدر سادات کے "مقدس مشن" کے دوران میں سامنے آئی۔ جو چیز تقسیم کے اس عمل کا موجب بنی ہے، وہ کم و بیش یہ فطری امکان ہے کہ مملکت ایسے لوگوں اور ایسے رجحانات کا ساتھ دے گی جنہیں علم ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں، اس ناطے ان میں خود اعتمادی کا فقدان ہے۔ چنانچہ وہ چاہتے ہیں کہ غیروں کو امور مملکت یا خود مملکت ہی سے نکال دیا جائے اور دوسروں سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ اس کے ساتھ وہ

---

[۱] یہاں اشارہ صدر سادات کے دورۂ اسرائیل کی طرف ہے۔ تفصیلات اگلے باب میں آئیں گی۔

اپنے اعمال پر بلا تمیز سیاسی عمومیت کا غلاف بھی چڑھانا چاہتے ہیں۔ آج شام میں عرب قومیت کا پرچار بھی کیا جاتا ہے (عمومی رنگ دینے کی کوشش) اور دوسری طرف رموز مملکت کی خاطر اس عرب قومیت سے گریز بھی کیا جاتا ہے ——— لبنان میں شام نے جو رویہ اختیار کیا، وہ اس گریز کی واضح مثال ہے ——— چنانچہ ان متحارب امور میں جو رسّہ کشی ہو رہی ہے، اس پر اگر آپ غور فرمائیں تو میرا نکتہ واضح ہو جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ اب یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ ان دونوں امور کے مابین کشمکش کا دارومدار زیادہ تر ان اختلافی توضیحات و تشریحات پر ہے جو اقتدار اعلیٰ، عرب اتحاد، اور اس قسم کے دوسرے تصورات کی کی جاتی ہیں۔ ان متحارب تفاسیر و تشریحات کی دنیا کی ستم ظریفیاں اس وقت اور بھی واضح ہو گئیں جب ۲۱ جولائی ۱۹۷۶ء کو صدر اسد نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں اپنی لبنانی پالیسی اور تنظیم آزادی فلسطین پر اپنی چڑھائی کا جواز اس دعوے کی صورت میں پیش کیا۔ "میں جو کچھ کر رہا تھا، وہ عرب قومیت اور فلسطینی انقلاب کی خاطر کر رہا تھا۔" چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ شامی پالیسی کی اساس عرب مفادات پر نہیں بلکہ صرف اپنے ملک کے مفاد پر رکھی گئی تھی۔

بیسویں صدی کے عرب فلسطینیوں کی ایک عجیب و غریب بدقسمتی یہ رہی ہے کہ علاقے کی تمام دوسری مقامی قوموں کے برعکس ان کی کوئی اپنی مادر وطن نہیں ہے۔ کم از کم جنگ عظیم دوم کے بعد سے ایسا بالکل نہیں ہو سکا۔ ان کی سیاسی محرومی کی ٹھوس حقیقت نے ان کے مقدر کو اور بھی تلخ بنا دیا اور اس تلخی میں رنگ اس حقیقت نے بھی بھرا کہ اس چیز کے خلاف، جسے وہ اپنے وطن پر واضح طور پر غیر ملکی قبضہ قرار دیتے تھے، وہ جس جدوجہد میں مصروف ہیں، اس کے بالکل آغاز پر ہی انہوں نے

صیہونیت کی مخالفت اس بنا پر کی تھی کہ جہاں تک اس خطے کا تعلق ہے، وہ غیر ملکی بھی تھی اور ایک اقلیتی ثقافت بھی۔ اسی طرح یہاں اس بات کا اعادہ کرنا بھی سود مند ہے کہ یہودی زندگی کی ابتدائی صورتوں نے اپنے گرد و پیش کی اکثریت کے سلسلے میں اقلیتی صوبائیت[1] کی راہ اختیار کی۔ مملکت اسرائیل قائم بھی ہو گئی لیکن یہ رجحان اپنی جگہ قائم ہے۔ چونکہ صیہونیت کے علاقے کی سنّی عرب اکثریت کے ساتھ شاید کوئی نامیاتی رشتے نہیں تھے، اس لیے علاقے کے دوسرے اقلیتی فرقوں کی نسبت وہ کہیں زیادہ ایک ملفوف دنیا کی صورت اختیار کر گئی (بہ الفاظ دیگر، وہ اپنی ہی دنیا میں بند ہو گئی) چنانچہ اس طرح ایک طرف تو یہودی / اسرائیلی مملکت نے جو ٹھوس شکل اختیار کر لی اور دوسری طرف فلسطینیوں کو جلاوطنی کے عالم میں ایک فلسطینی مملکت کا جو ٹھوس احساس ہوا جو کہ نظریاتی طور پر مرد می کی اساس پر استوار ہوا تھا، اس سے دونوں کے مابین ایک بالکل صحیح (اور تکلیف دہ) تناسب قائم ہو گیا۔

جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ اب فلسطینی شناخت کے بڑے بڑے اصول وطن کی بازیابی کی ضرورت اور فلسطین کو دوبارہ ایک مملکت کی شکل میں ڈھالنے کے خواب کی تکمیل پر استوار ہیں۔ جہاں تک صیہونیت کا تعلق ہے، وہ نہ صرف ان دونوں ضرورتوں کے جواز بلکہ ان کی حقیقت سے بھی ہمیشہ انکار کرتی رہی ہے جوں جوں فلسطینیوں کا اصرار بڑھتا ہے، صیہونی انکار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسرائیل کے اقلیتی شعور کا بھی، جو بظاہر آویزش کے زمانے میں اور بھی بڑھ جاتا ہے، زبان و قلم سے اتنے ہی زیادہ ٹھوس طریقے سے اظہار کیا جانے

---

[1] انگریزی میں یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا نقطۂ نظر محدود ہوتا ہے اور جو اپنی ہی ذات کے خول میں بند رہتے ہوں۔

لگتا ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ سے ایک سال قبل اسرائیل کے ایک معروف فوجی افسر اور "عرب امور کے ماہر" نے مندرجہ ذیل تحریر سپرد قلم کی تھی:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان (عربوں) کے پاس ہے کیا جس کی تقلید ہمارے لیے مناسب و موزوں ہو؟ اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ کہ عرب شستہ و نفیس اور نستعلیق خصوصیات اور ظاہری خوبیوں سے بالکل ہی تہی دامن ہیں لیکن انہیں تو کسی سیاسی پروگرام کی اساس نہیں بنایا جاسکتا۔ جہاں تک طرز حیات اور تنظیم کا تعلق ہے، عربوں میں اپنے روایتی طور طریقوں کو ترک کرنے اور مغرب کی نقالی کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ اور یہ بات تو بہت عجیب ہوگی کہ جو کچھ وہ خود ترک کر رہے ہیں، اسے ہم اپنا لیں۔ جہاں تک ثقافتی پہلو کا تعلق ہے، تو مجھے اس بات کا قطعاً کوئی یقین نہیں ہے کہ فریقین کے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ یہ ایک مبہم مفروضہ ہے کہ عرب ثقافت، جس کے بڑے اثاثوں پر قرونِ وسطیٰ کی چھاپ لگی ہے (یہ خیال اس یہودی مصنف کا ہے، ہمیں اس سے اتفاق نہیں)۔ بیسویں صدی کے باشندوں کو اپنا گرویدہ بنا سکے گی۔ اور یہ امر تو بہت ہی مشتبہ ہے کہ اس (عرب ثقافت) میں کوئی ایسا عنصر بھی موجود ہے جو ان (بیسویں صدی کے باشندوں) کی رہنمائی کر سکے گا، انہیں کسی کام کے لیے آمادۂ عمل کر سکے گا اور یا ان سوالات کے جوابات فراہم کر سکے گا جنہوں نے فی زمانہ ان کا گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔ ایک ایسی نسل کے لیے، جو چاند پر پہنچ چکی ہے، یہ بہت مشکل ہے کہ وہ "معلقات" کی صحرائی شاعری، "مقامات" کے اندازِ بیان یا (امام) غزالیؒ جیسے عظیم

عرب مفکرین کے فلسفیانہ افکار سے بھی، جن کی روحانی آب و ہوا آج کل کی آب و ہوا سے اتنی مختلف ہے، متاثر ہو سکیں۔ میرا خیال ہے کہ عرب ثقافت کے مقابلے میں ہماری اپنی ثقافت بھی اس معاملے میں کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ (ان دونوں کے برعکس) یورپی ثقافت کے پاس پیش کرنے کے لیے کہیں زیادہ (مواد) موجود ہے۔

اگر منطقی طور پر اس استدلال کا دائرہ وسیع کیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ امریکی چاند پر کمند ہی نہیں ڈال چکے بلکہ اس پر چہل قدمی بھی کر چکے ہیں، اس لیے شیکسپیئر فرسودہ، از کار رفتہ اور بے وقت کی راگنی بن چکا ہے۔ لیکن غالباً جو بات موضوع بحث سے زیادہ متعلق ہے یہ ہے کہ فلسطینیوں کی ایک خاص شکایت دیا اسے رنجش کہہ لیں) کے بارے میں صہیونیوں کا ردعمل اقلیت کی ثقافتی برتری کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ٹھوس حقیقت تو یہ ہے فلسطینیوں کو اپنے گھروں اور جائدادوں سے بے دخل کر دیا گیا اور انہیں اپنے وطن سے باہر نکال دیا گیا، اس کے متعلق تو ایک لفظ بھی نہیں کہا جاتا بصرف وسیع تر عمومی تناظر میں بات کہہ دی جاتی ہے۔ اور یہ وہ تناظر ہے جس میں فلسطینیوں کو صہیونیت کے خلاف جو گلہ ہے، اس پر نہ تو کوئی توجہ دی جاتی ہے، نہ دی جا سکتی ہے اور نہ غالباً دی جائے گی۔

محولہ بالا عبارت میں کچھ اور باتیں بھی ہیں، جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ سوال اٹھانا ہوگا کہ ایک کٹّر حجت اسرائیلی مناظرہ باز نے کس طرح ایک تکلیف دہ حقیقی فلسطینی محرومی کی قلب ماہیت کر کے اسے صہیونیت کے خلاف ایک جامع "عرب" مخاصمت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس ماہر کے نزدیک اسرائیل کی کچھ اس طور کایا پلٹ ہوئی ہے کہ وہ محض ایک مملکت ہی نہیں رہا بلکہ ایک ترقی پسند

یورپی ثقافت کی علامت بھی بن گیا ہے (یہاں عین مین جارج ایلیٹ کے خیالات کے بازگشت سنائی دیتی ہے)۔ اور یہ بالکل اسی طرح ہوا ہے جس طرح کہ فلسطینی نیم فاقہ کش، کنگال اور بے حیثیت کاشتکار دہقانوں سے عربوں کی ثقافتی کمتری کی علامت مطلق بنا دیئے گئے ہیں۔ میں یہاں یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ صیہونیت اور یورپی استعمار کے مشترکہ منابع کا دوبارہ ذکر کروں اور نہ میرے نزدیک اس بات کا حوالہ دینے کی ضرورت ہے کہ جس طرح افریقہ، ایشیا اور امریکہ کے دونوں براعظموں میں سفید فام یورپی یہ باور کرتے تھے کہ ان علاقوں میں مقامی باشندے عدم موجود ہیں اور ان کی زمینیں بے آباد، "غیر توجہی کاشتکار" اور بنجر ہیں، بالکل اسی آسانی سے فلسطین میں وارد ہونے والے ابتدائی یہودی آبادکاروں نے بھی مقامی عربوں کو نظر انداز کر دیا۔
اب میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ فلسطینیوں کی وہ کوشش ہے جو وہ عرب ثقافت کی عمومیت میں اپنے لیے سیاسی اور نظریاتی ملجا و ماویٰ تلاش کرنے کیلیے کر رہے ہیں اور میں اس بات کو بھی واشگاف انداز سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بعد میں اسرائیل اور دوسرے عربوں، دونوں نے ہی کس طرح اس تلاش کا استحصال کیا۔ پہلے تو فلسطینی صہیونیوں کا نقطۂ نظر سنتے اور ان سے مصالحت کرنے کے لیے تیار تھے، پھر یہ کیا ہوا کہ وہ استرداد، انقلاب اور امید کی راہ پر چل پڑے؟ میں اس صورت حال کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔
فلسطینیوں کو جس تکلیف دہ وجودی[1] صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے،

---

[1] وجودیت: فلسفے کی وہ شاخ جو اس بات پر زور دیتی ہے کہ ایک معنی بے نیاز کائنات میں ایک فرد کو جو تجربہ ہوتا ہے، وہ صرف اسی کا تجربہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ تجربہ فقید المثال بھی ہوا اور دوسروں سے الگ بھی۔ فرد اس معنوں میں عزلت گزیں ہے کہ دوسروں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ انسان دنیا میں کیوں آیا، اس کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں۔ تاہم اس فلسفے میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ فرد اپنی مرضی کا مالک ہے اور اس لیے اپنے اعمال کے نتائج و عواقب کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔

اس کا تعلق ان کی سیاسی بقا سے ہے جس کی ضرورت وہ سبھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن مسئلہ صرف سیاسی بقا کا ہی نہیں، اس کے ساتھ وہ نتائج و عواقب بھی شامل ہو گئے ہیں جو علاقے سے محروم ہونے اور سیاسی طور پر اجنبی بن جانے کی وجہ سے ظہور میں آئے ہیں اور ان نتائج و عواقب نے صورتِ حال کو اور بھی گھمبیر بنا دیا ہے۔ فلسطینیوں میں یہ احساس تو ضرور ہے کہ ان کے اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے مقامات پر ان کے جو دوسرے مسلمان اور/ یا عرب بھائی بند موجود ہیں، کے مابین ایک رشتۂ مواخات ہے لیکن اس احساس پر بھی اس تکلیف دہ وجودی صورتِ حال کی، جس کا انہیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے، چھاپ لگی ہوئی ہے۔ فلسطینیوں کے نزدیک دوسرے عرب ایک سطح پر اس کے ساتھ اخوت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں لیکن ایک دوسری سطح پر ان دونوں کے مابین ایک ایسی خلیج حائل ہے جسے پاٹنا ممکن نظر نہیں آتا۔ یوں کہیے کہ تعلقات کی یہ متناقض صورتِ حال زمانۂ حال میں پیدا ہوئی ہے کیونکہ یہ زمانۂ حال کا مسئلہ ہے، معاصر زمانے کا مسئلہ جو فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کو ایک دوسرے کے قریب بھی لاتا ہے اور انہیں ایک دوسرے سے الگ بھی کرتا ہے۔ ایک فلسطینی کے نزدیک عربوں کا ایک ماضی بھی ہے اور مشرقِ وسطیٰ کا اور عربوں کا ایک مشترکہ مستقبل بھی۔ لیکن اب، زمانۂ حال میں، کیفیت یہ ہے کہ (فلسطینی) قوم نہ صرف عدم استحکام کا شکار ہے بلکہ اسے یہ خطرہ بھی درپیش ہے کہ وہ کہیں تحلیل ہی نہ ہو جائے۔

اس مشکل تعلق کی کوئی ٹھوس اور فصیح مثال، جس کا میں حوالہ دے سکتا ہے، فلسطینی ادیب غسان کنفانی[۵] کے ناولٹ "رجال فی الشمس" "دھوپ میں لوگ" کے

---

[۵] غسان کنفانی (۱۹۳۶ء-۱۹۷۲ء)۔ وہ فلسطین کے شہر عکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے بطور معلم اور صحافی پہلے دمشق اور پھر کویت میں کام کیا۔ اس کے بعد انہوں نے بیروت کو اپنا مسکن بنا لیا۔ پہلے وہ مختلف اخباروں کے لیے لکھتے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں نے اپنا رسالہ "الھدف" شروع کیا۔ جولائی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ابتدائی منظر سے بڑھ کر دستیاب نہیں۔ کنفانی ۱۹۶۰ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں تک اسرائیل میں مقیم رہا۔ اس کے بعد اس نے جلاوطنی اختیار کر لی اور جنگجو صحافی اور ادیب بن گیا۔ ۱۹۷۲ء میں اسرائیلیوں نے اسے دھوکے سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے ناولٹ کے ابتدائی منظر کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:-

ابوقیس نے اپنا سینہ مرطوب زمین کے اوپر ٹکا دیا اور دھرتی اس کے نیچے دھڑکنے لگی۔ قلب زمین کی تھکی تھکی دھڑکن، جو ریت کے ذرات میں تھرتھراتی اور اس کے جسم کے خلیوں میں سرایت کر جاتی۔ وہ جتنی مرتبہ بھی نیچے جھک کر دھرتی کے ساتھ ہم آغوش ہوا، اسے اس دھڑکن کا احساس ہوا، جیسے زمین کا دل اس وقت سے، جب وہ پہلی بار سینے کے بل مٹی پر لیٹا تھا، جہنم کی عمیق گہرائیوں سے جو کھم سہتا، زور کرتا، روشنی کی طرف ابھر آ رہا تھا۔ دس برس پہلے کہ اسے اپنا وطن چھوڑے اتنا عرصہ گزر چکا تھا، اس نے یہ بات اپنے ایک پڑوسی سے کہی تھی جو ایک کھیت میں اس کا سانجھے دار تھا۔ بات سن کر پڑوسی نے تمسخر آمیز لہجے میں جواب دیا تھا:

"یہ تمہارے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز ہے۔ جب بھی تم اپنا سینہ زمین کے ساتھ ملا کر لیٹو گے، تمہیں یہ آواز سنائی دے گی۔"

کیا فضول بکواس ہے! پھر وہی خوشبو؟ وہ جب بھی یہ سوندھی سوندھی خوشبو سونگھتا تھا، وہ اس کے دماغ کی طرف امنڈنے اور پھر

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۴۰۱: ۱۹۷۲ء میں اسرائیلیوں نے ان کی کار میں بم نصب کر دیا تھا جس سے وہ لقمۂ اجل ہو گئے۔ ان کے پانچ ناول، پانچ افسانوی مجموعے، دو ڈرامے اور فلسطینی ادب کے دو مطالعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے مترجم نے ان کے ناولٹ "دھوپ میں لوگ" کا ترجمہ کیا تھا جو "محراب" لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

اس کی رگوں میں اترنے لگتی تھی۔ جب بھی زمین پر لیٹ کر وہ اس مہک کو سونگھتا، وہ یہی تصور کرتا جیسے وہ اپنی شریکِ حیات کی زلفوں کو سونگھ رہا ہے جو ابھی ابھی ٹھنڈے پانی سے نہا کر غسل خانے سے باہر آئی تھی، بالکل وہی خوشبو، صنفِ نازک کی خوشبو، جس نے اپنے جسم کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا تھا اور جس نے اس کا چہرہ اپنی گھنیری زلفوں میں، جو ابھی گیلی تھیں، چھپا لیا تھا، وہی تھرتھراہٹ جو آپ اس وقت محسوس کرتے ہیں جب آپ پیار سے کسی نرم و نازک پرندے کو اپنی ہتھیلیوں پر بٹھا لیتے ہیں۔

یہ منظر جاری رہتا ہے تاآنکہ ابوقیس کی آنکھیں آہستہ آہستہ وا ہونے لگتی ہیں اور اسے اپنے صحیح گردوپیش کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ مقام، جہاں وہ لیٹا ہوا ہے، دجلہ اور فرات کے دہانوں کے کہیں قریب واقع ہے۔ وہاں وہ ان انتظامات کا انتظار کر رہا ہے جو اسے غیر قانونی طور پر کویت پہنچانے کے سلسلے میں کئے جائیں گے، جہاں اسے امید ہے کہ اسے کوئی نہ کوئی روزگار مل جائے گا۔ جیسا کہ حوالہ شدہ عبارت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے، وہ زمانۂ حال میں اپنے محلِ وقوع اور منظر کے ماحول کو اپنے ماضی کی یادوں کے حوالے سے "سمجھے گا"۔ یہ یادیں ایک فلسطینی سکول کے متعلق ہیں جہاں اس نے ۱۹۴۸ء سے قبل ایک استاد کو جغرافیے کا سبق ایک خاص لہجے میں پڑھاتے سنا تھا۔ اور یہ سبق دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے انہی دہانوں کے متعلق تھا جہاں وہ اس وقت لیٹا ہوا تھا۔ چنانچہ ابوقیس کا اپنا زمانۂ حال اس کی بے ترتیب اور بے ربط یادوں کا ایک آمیزہ ہے، جس میں اس کی موجودہ مشکل صورتِ حال، جس کی سنگینی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے، شامل ہو گئی ہے۔ وہ ایک پناہ گزیں ہے۔ اس کا ایک خاندان بھی ہے۔ اور وہ

ایک ایسے ملک میں روزگار تلاش کرنے پر مجبور ہے جس کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی دھوپ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے مقدر کے متعلق ایک قسم کی آفاقی بے نیازی موجود ہے۔ (البعد میں) ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ وہ روشنی، جو اس کے چاروں طرف پھیل رہی تھی، دراصل وہ پیش بینی کے انداز سے ناولٹ کے آخری منظر کا حوالہ ہے۔ وہ دوسرے فلسطینی پناہ گزینوں کی معیت میں ابوقیس کو ایک ٹینکر کے خالی پیٹ میں بٹھا کر کویت سمگل کیا جا رہا ہے۔ ٹینکر جب کسٹم کی سرحدی چوکی پر پہنچتا ہے، تو تینوں پناہ گزینوں کو نیچے آتارنے کے بجائے ٹینکر کے پیٹ میں پڑا رہنے دیا جاتا ہے بلکہ اوپر سے ڈھکنا بھی بند کر دیا جاتا ہے تاکہ کسٹم والوں کی نظروں میں دھول جھونکی جا سکے۔ ادھر ڈرائیور پولیس اور کسٹم کے اہل کاروں سے گفت و شنید میں مصروف ہے۔ یہ گفت و شنید بہت طویل ہو جاتی ہے۔ دھوپ کی حدت میں دم گھٹنے سے تینوں آدمیوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہ اتنا بھی نہ کر سکے کہ اپنی موجودگی کا کوئی نشان ہی دکھا سکتے، کسی کو بتا سکتے کہ وہ بھی وہاں موجود تھے۔

محولہ بالا عبارت ان بے شمار مناظر میں سے، جن میں کہانی کی تقسیم کی گئی ہے، ایک منظر کی نقشہ کشی کرتی ہے۔ تقریباً ہر منظر میں، زمانۂ حال، بہ اعتبار زمانی غیر مستحکم نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمانۂ ماضی کی صدا ہائے بازگشت، ہم حسّی

۵؎ ہم حسّی (Synesthesia) ۔ یہ ایک قسم کی قدرتی صورتِ حال ہے جس میں ہیجان کی ایک نوع ایک دوسری قسم کے تحسس (یا احساس) کو جنم دیتی ہے جیسا کہ کسی آواز کے سنائی دینے پر ذہن میں ہل چل پیدا ہو جاتی ہے اور رنگوں وغیرہ کے ذہن میں دیکھے جانے کی حس بیدار ہو جاتی ہے۔

(جیسا کہ قوتِ باصرہ صوت یا قوتِ شامہ کے آگے پسپائی اختیار کر لیتی ہے اور جیسا کہ ایک حس دوسری حس میں خلط ملط ہو جاتی ہے) اسفاک اور بے رحم زمانۂ حال کے خلاف مدافعتوں کے ایک جال اور زمانۂ ماضی کے کسی مخصوص لیکن پسندیدہ جزو کے تحفظ کے امتزاج کے تابع ہے۔ کنفانی کے اسلوبِ بیان (جو میرے ترجمے میں خاصا بھونڈا اور بے سلیقہ نظر آتا ہے لیکن میں نے اسی بات کو اہم جانا کہ پیچیدہ ساخت کے جملے کا جس قدر ممکن ہو، صحیح ترجمہ کروں) میں بھی یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ وقت کے وہ کون سے لمحات ہیں جن کی طرف شعور کا مرکز (تینوں میں سے ایک آدمی) اشارہ کرتا ہے۔ جس عبارت کا میں نے حوالہ دیا ہے اس میں "جتنی مرتبہ بھی" کا "اس وقت سے جب وہ پہلی مرتبہ" میں امتزاج ہو جاتا ہے، اور جو مبہم انداز سے ہی سہی لیکن وہ "اپنا وطن (جسے) چھوڑے اتنا عرصہ (دس سال) گزر چکا تھا" کو اپنے میں شامل کرتا نظر آتا ہے۔ تمثیلی طور پر الفاظ کی ان تینوں تراکیب پر اس تمثال (امیج) کا غلبہ ہے جو ظلمت کو چیر کر روشنی اور نور کی شاہراہ میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ بعد ازاں ناولٹ کے مرکزی حصے میں ہم یہ دیکھیں گے کہ کہانی میں مندرج بیشتر واقعات ایک عراقی قصبے کی گرد آلود شاہراہ پر پیش آتے ہیں جہاں تینوں آدمی اپنے اپنے طور پر "سپیشلسٹوں" کے سامنے گڑگڑاتے، منتیں کرتے اور سودے بازیاں کرتے نظر آئیں گے کہ انہیں سرحد پار پہنچا دیا جائے۔ ناولٹ کی اصل آویزش گھوم پھر کر زمانۂ حال کے اس جدل اور مقابلے کا رخ اختیار کر لیتی ہے کہ جلاوطنی اور بے وری ایک فلسطینی کو اس بات کی تحریک دیتی ہے کہ حیات و کائنات میں وہ اپنا راستہ خود تراشے جو کسی اعتبار سے بھی اس کے لیے ایسا راستہ نہیں جو دوسروں نے اسے فراہم کیا ہو یا جو مستحکم حقیقت کا روپ دھار چکا ہو۔ وہ اپنے عرب بھائیوں کے درمیان ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی اس بات کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سرزمین کی طرح، جس کو وہ خیرباد کہہ آیا ہے۔ فی الحال اسے یوں نظر آتا ہے کہ اپنے ماضی سے بھی، بیشتر اس کے کہ وہ اس کے لیے بار آور ثابت ہو سکتا، اس کے روابط منقطع ہو چکے ہیں۔ لیکن جہاں تک زمانۂ حال کا تعلق ہے، اس فلسطینی کا ایک خاندان ہے، ذمے داریاں ہیں، خود زندگی ہے، جس کے سامنے وہ جواب دہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کا مستقبل غیر یقینی ہے، بلکہ اس کی موجودہ صورتِ حال کی مشکلات میں بھی اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اور وہ گرد آلود شاہراہ کے پُرہجوم ٹریفک میں بمشکل اپنا توازن قائم کر پاتا ہے۔ دن، دھوپ، زمانۂ حال ——— یہ سبھی وہاں فوری طور پر آن موجود ہوتے ہیں، سبھی اس کی جان کے دشمن ہیں۔ وہ اسے مہمیز لگاتے ہیں، اکساتے ہیں کہ وہ یادداشتوں اور بے لگام سوچوں کے فراہم کردہ تحفظ کے حصار سے، جو بعض اوقات دھندلا اور بعض اوقات بہت مضبوط دکھائی دیتا ہے، باہر نکل آئے۔ جب انجام کار یہ اشخاص اپنے رومانی صحرا سے باہر نکل کر زمانۂ حال میں داخل ہوتے ہیں اور مستقبل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو با دلِ ناخواستہ لیکن لازماً ان کا انتخاب یہی ہوگا کہ وہ موت سے ہم آغوش ہو جائیں۔ ان کی یہ موت گمنامی کی موت ہوگی۔ کسی کو یہ نظر بھی نہیں آئے گا کہ ان کا دم واپسیں ہے۔ ان کی ہلاکت دھوپ میں ہوگی اور اسی زمانۂ حال میں، جس نے انہیں اپنے ماضی سے باہر نکلنے کا حکم دیا تھا، اور ان کی بے بسی اور بے عملی پر انہیں طعنے دیئے تھے، ان کی ملامت کی تھی۔

چنانچہ اپنی بے دخلی کے ابتدائی ایام میں فلسطینی کو جس بنیادی قسم کی جدوجہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کنفانی اس پر حاشیہ آرائی کرتا ہے۔ فلسطینی کو اپنا زمانۂ حال بنانا ہوگا کیونکہ حال کوئی تخیلی عیاشی نہیں بلکہ ایک حقیقی، جیتی جاگتی وجودی ضرورت ہے۔ کوئی منظر لے لیں۔ فلسطینی کے لیے اس میں بمشکل گنجائش نکلتی ہے اور

وہ اس کے لیے (وجہ) اشتعال بن جاتا ہے۔ فلسطینی کے لیے معاصریت کا تناقضہ حقیقتاً بہت تلخ اور تکلیف دہ ہے۔ اگر اسے سیدھے سادھے انداز سے (زمانہ) حال نہیں "دیا" جاسکتا (یعنی اگر وقت اسے اپنے ماضی اور اپنے حال کے مابین واضح تفریق کرنے کی اجازت نہیں دیتا یا اسے ان دونوں کے مابین رابطہ قائم کرنے نہیں دیتا کیونکہ ۱۹۴۸ء کا المیہ، جس کا کھلے عام ذکر نہیں کیا جاتا سوائے اس کے کہ وہ بھی ایک واقعہ تھا جو دوسرے واقعات میں پوشیدہ ہو چکا ہے، تسلسل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے)، تو پھر یہ اس کے لیے اسی صورت میں قابلِ فہم بن سکتا ہے اگر وہ اس میں کوئی کارنامہ، کوئی کسب کر کے دکھائے۔ کاش کہ کچھ اور نہیں تو کم از کم کوئی ایسی صورت نکل آتی کہ یہ لوگ اعراف سے نکل سکتے اور کویت میں داخل ہو سکتے، تب کہیں جاکر کسی بھی اعتبار سے ان کی زندگیاں محض ایک حیاتیاتی عرصہ، جس کے دوران میں زمین اور آسمان عام زندگی کی غیر یقینی انداز سے تصدیق کرتے نظر آتے ہیں، نہ رہتیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہو سکتیں۔ چونکہ انہیں لازماً زندہ رہنا ہے ——— تاکہ انجام کار وہ موت سے ہم کنار ہو سکیں ——— حال انہیں کچوکے لگاتا ہے تاکہ وہ عمل پر کمربستہ ہو جائیں جو (عمل) اپنی باری پر مصنف اور قاری کو "فکشن" (کہانی) کا مواد فراہم کرے گا۔

اس ضمن میں مجھے ایک اور فلسطینی کہانی یاد آتی ہے اور میں لازماً اس کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ کہانی بھی خوبیوں کے اعتبار سے اوّل درجے کی کہانی ہے۔ اس کہانی کا عنوان "الواقعۃ الغریبہ فی اختفا سعید ابی نحس المتشائل" (سعید ابی نحس متشائل کی گمشدگی کے متعلق عجیب وغریب حقائق) ہے اور اس کے مصنف کا نام ایمل حبیبی ہے۔ حبیبی حیفہ کا باسی ہے۔ وہ بیس سال سے اوپر اسرائیلی پارلیمنٹ کا رکن رہا اور اندرون اسرائیل فلسطینیوں کا ایک سرکردہ ترجمان ہے۔ اس کا مکتوبی ناول ان معنوں

میں عربی ادب میں فقید المثال ہے کہ اس میں نہایت استقامت اور پامردی کے ساتھ "تشنیع"[1] سے کام لیا گیا ہے۔ یہ تشنیع ایک حیرت انگیز حد تک ایک منضبط لیکن پُرجوش اسلوب نگارش کی پیداوار ہے جس کے ذریعے اندرون اسرائیل فلسطینیوں کی انوکھی صورتِ حال کی نقشہ کشی کی گئی ہے کہ منظر عام پر "نمایاں" بھی ہیں اور "نظر بھی نہیں آتے"۔ کنفانی کی نگارشات کی طرح حبیبی بھی فلسطینی شناخت کی ایک ایسی مکمل تصویر پیش کرتا ہے جو کسی خالص سیاسی نوعیت کے کتابچے کے بس کی بات نہیں معاملہ اسرائیل کا ہو یا عالم عرب کا، دونوں مقامات پر فلسطینی بالکل اسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہیں جس قسم کی کافکا[2] کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ ایک وقت پر وہ

---

[1] تشنیع یا ستم ظریفی (irony) (ا) جب آدمی توقع تو کسی بات کی کرے اور اس کے سامنے جو کچھ آئے، وہ اس (توقع) کے بالکل برعکس ہو

"Hyde noted the irony of Ireland's copying the nation she most hated". Richard Kain

(اا) ایسے الفاظ کا استعمال جن کا مفہوم ان کے لفظی معانی کے بالکل الٹ ہو۔ مثلاً بظاہر آپ کسی شخص کی تعریف کر رہے ہیں لیکن حقیقتاً آپ کا مقصود اس کی تنقیص ہوتا ہے جیسے کسی بدصورت بچے کو دیکھ کر کہا جائے، "کتنا خوب صورت بچہ ہے"۔

(ااا) جب کوئی ادیب اپنے اسلوبِ نگارش کو مؤثر بنانے یا مزاح پیدا کرنے کے لیے اس قسم کے متضاد معانی کے حامل الفاظ اور تراکیب استعمال کرتا ہے، تو وہ بھی irony سے کام لے رہا ہوتا ہے۔

(iv) ڈرامے میں بعض اوقات ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ناظرین کو تو ایک بات کا علم ہوتا ہے لیکن خود کردار اس سے لاعلم ہوتا ہے، اسے ڈرامائی "irony" کہا جاتا ہے۔

(v) مشہور فلسفی سقراط دوسروں کو جاہل ثابت کرنے کے لیے اپنے آپ کو جاہل بنا کر پیش کرتا تھا۔ یہ "سقراطی IRONY" کہلاتی ہے۔

[2] کافکا (Franz Kafka) (۱۸۸۳-۱۹۲۴) کافکا قومیت کے اعتبار سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

وہاں موجود ہوتے ہیں لیکن دوسرے وقت پر موجود نہیں ہوتے اور یہ سلسلہ باری باری چلتا رہتا ہے۔

میں نے یہاں فلسطینی نگارشات کا تفصیلی ذکر اس لیے کیا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ عرب/اسلامی ماحول میں فلسطینی بقا کی صحیح نوعیت کو بالکل درست اور چبھتے ہوئے انداز سے پیش کرتی ہیں۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کی جنگوں میں عربوں کو جو شکستیں اٹھانا پڑیں، فلسطینی ان کی ایک علامت ہے۔ چنانچہ اس علامت کی حیثیت سے وہ سیاسی یادوں کی ایک ایسی صورت کی نمائندگی کرتا ہے جسے لوحِ دماغ سے کھرچنا اتنا آسان نہیں۔ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہو، جس جگہ کا نام لیں وہاں وہ موجود نظر آتا ہو، یا سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شعوری طور پر یہ جانتا ہے کہ وہ خود اور اس کی نگارشات دونوں جدید عرب ثقافت کے موضوعات بنتی ہیں، چنانچہ معاملے کی صورت خواہ کوئی بھی ہو، وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کو دیکھ کر آپ کو تشویش لاحق ہوتی ہے، اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ وہ کہیں آپ ہی کو بے دخل نہ کر دے اور آپ کی جگہ خود سنبھال لے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے متعلق فوری طور پر کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیئے۔ اگر

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۴۰۸: آسٹریا کا باشندہ تھا لیکن وہ پیدا چیکوسلواکیہ کے شہر پراگ میں ہوا اور اس کی زندگی کا بیشتر حصہ بھی وہیں گزرا۔ اس کا ذریعہ اظہار جرمن زبان تھی۔ اس کا شمار اس صدی کے عظیم ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کے مشہور ترین ناول "قلعہ" (Castle) "مقدمہ" (Trial) اور "امریکہ میں"۔

۱؎ معاصر فلسطینی ادب کا ایک وقیع جائزہ حنان میخائل اشروی نے اپنی کتاب "Contemporary Palestinian Literature under Occupation" میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو برزیت یونیورسٹی پبلیکیشنز، برزیت، مغربی کنارہ، نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا تھا۔ (مصنف)

اس کے لیے اس طور کوئی گنجائش نکل آئے کہ عرب آزادی پر کوئی زد نہ پڑے بلکہ اس آزادی کا تحفظ ہوتا ہو تو الحمد للہ خیر سلا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جب حالات میں بگاڑ آنے لگتا ہو تو اس بات کے باوجود کہ اس کا کوئی وطن نہیں، کوئی گھر نہیں، اسے استحکام ——— یہ استحکام مملکتوں کا ہو یا سیاسی جماعتوں کا، حکومتوں کا ہو یا فرقوں کا ——— کے لیے، جو اس کے پہلو بہ پہلو موجود سمجھا جاتا ہے، خطرہ تصور کیا جانے لگتا ہے۔ ۱۹۶۷ء کے بعد ایک نئی صورتِ حال سامنے آئی ہے۔ اب عربوں اور مسلمانوں کی تکثیریت[1] کا ڈھنڈورا بڑے زور شور سے پیٹا جانے لگا ہے اور اس کی تحسین میں بڑی لفاظی سے کام لیا جاتا ہے۔ خود فلسطینی بھی اس تکثیریت میں پوری طرح ملوث ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس کے اس طرح ملوث ہونے سے عربوں کو ہر دم یہ خیال ستانے لگا ہے کہ یہ تکثیریت اس تک بامعنی نہیں ہو سکتی جب تک کہ فلسطینی، جو کہ انتہائی زہریلی بے دخلی کا نخچیر ہے اپنے آبائی وطن واپس نہیں پہنچ جاتا اور اس کے ساتھ اس کا دوبارہ پوری طرح ربط قائم نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ فلسطینی بیک وقت ایک نمائندہ عرب اور ایک راندۂ درگاہ بن گیا ہے۔

۱۹۶۷ء کے بعد فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کے مابین ستم ظریفانہ کشیدگی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا اظہار مندرجہ ذیل خلافِ معمول لیکن حیران کن باتوں سے ہوتا ہے:

---

[1] تکثیریت (pluralism): جب کوئی معاشرہ، قوم، ملت یا ملک جو مختلف نسلوں، مذہبوں یا ثقافتوں سے تعلق رکھنے والوں یا مختلف زبانیں بولنے والوں کی جو ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ طور طریقوں کے مالک ہوں، ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے کی اجازت دیتا ہو تو اس حالت کو تکثیریت کہا جائے گا۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین کے سفارتی وقار میں اضافہ ہوا ہے۔

دنیا نے فلسطینیوں کو "نئے سرے سے دریافت" کیا ہے اور اس کے زبردست نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

عام عرب امور میں اتنی دلچسپی نہیں لی جاتی جتنی کہ پہلے لی جاتی تھی۔

اسی طرح فلسطینی ادارے نہ صرف فلسطینی خود اختیاری (اٹانومی) کے تناقضے کا بار اٹھائے ہوئے ہیں بلکہ وہ ایک لحاظ سے اس کی مثال بھی بن گئے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ وقتے وقفے کے بعد فلسطینیوں کو کبھی ایک عرب ملک سے باہر نکال دیا جاتا ہے اور کبھی دوسرے سے، لیکن اس کے باوجود عرب ممالک جس طرح فلسطینی مقاصد کی تائید و حمایت کرتے چلے آئے ہیں۔ اس میں کسی قسم تخفیف نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر چیز کے باوصف فلسطینی اپنی زندگی کی تعمیر بیرونِ فلسطین نہیں کرتا۔ مکمل جلاوطنی سے اس کی جو ذلت اور رسوائی ہوئی ہے، وہ اس سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس نے جتنے بھی ادارے اور جماعتیں قائم کی ہیں، وہ اس کی جلاوطنی کی حقیقت کا اعادہ کرتے ہیں۔ یہ بات واضح پر ان عربوں پر بھی، جو اسرائیلی تسلط و تغلب کے زیرِ سایہ مغربی کنارے اور غزہ میں مقیم ہیں، اور ان عربوں پر بھی، جو اندرونِ اسرائیل قیام پذیر ہیں، صادق آتی ہے۔ فلسطینی جو کارنامہ بھی سرانجام دیتے ہیں، اس پر پانی پھر جاتا ہے اور وہ باعیب بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ متناقض صداقت ہے کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کی غیر معمولی علامتی کامیابیوں کے باوجود فلسطینیوں کی بیرونِ فلسطین بقا ان معنوں میں پامال ہوتی رہتی ہے کیونکہ اسے ثبات حاصل نہیں، اس کی بنیادیں ٹھوس زمین پر استوار نہیں اور فلسطینیوں کے مستقبل کے بارے میں اس میں اس خود مختارانہ ارادے کا فقدان ہے جسے مخصوص فلسطینی ارادہ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جو

کارنامہ بھی سرانجام دیا جاتا ہے، جو کامیابی بھی حاصل کی جاتی ہے، اس کے پیچھے
ہر وقت یہ خطرہ منڈلاتا رہتا ہے کہ یہ کامیابی یا کارنامہ کہیں اپنی شناخت سے محروم
نہ ہو جائے، کہیں اسے عرب قوم کی عمومیت ہڑپ نہ کر جائے۔ اور واقعہ بھی
یہی ہے کہ عرب مملکتیں مسلسل تنظیم آزادیِ فلسطین کی آزادیِ عمل میں مخل ہوتی
رہتی ہیں۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ فلسطینی جو بھی کامیابی حاصل کرتے ہیں
اور جو بھی کارنامہ سرانجام دیتے ہیں، اسے یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ
عام عرب قوم کے منہ پر ایک طمانچہ ہے کیونکہ اس قوم نے شکست کے نتائج و
عواقب کے ساتھ سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا ہے تاہم شکست کے جو عظیم ترین عواقب
ہیں (موجودہ صورت میں فلسطینی)، ان کے ساتھ وہ بھی سمجھوتہ نہیں کر پائی۔
اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ فلسطینی جو کچھ کرتے ہیں اور جو کچھ وہ سوچتے
ہیں، اس کا بیشتر حصہ فلسطینی شناخت کے متعلق ہوتا ہے۔ میں اسے مشاہدۂ
باطن (introspection) قرار دینے میں تو متامل ہوں کیونکہ یہ محض احتساب ذات یا
محاسبۂ نفس (self examination) کا معاملہ نہیں بلکہ یہ زیادہ تر ایک سیاسی مسئلہ
ہے جو بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔ دوسری طرف، محض اس بنا پر کہ آپ
ایک فلسطینی ہیں، آپ کو جن مخصوص زحمتوں اور ٹھوس صعوبتوں میں سے گزرنا پڑتا
ہے، ان کے متعلق ہمارے تمام ادیبوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور اس حد تک
اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے کہ عربی ادب (جس میں خود نوشت سوانح حیات
یا اعترافی نگارشات قلم بند کرنے کی کوئی خاص سیکولر روایت نہیں پائی جاتی)
اس فلسطینی صنف پر نازاں ہے جسے عام طور پر "مزاحمتی" ادب کہا جاتا ہے اور
جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی نگارشات تخلیق کی جائیں جن میں زور اس بات پر
دیا جائے کہ ہم (فلسطینی) بھی کچھ شے ہیں، ہمارے بھی کچھ عزائم ہیں، کچھ آرزوئیں اور

کچھ امنگیں ہیں۔ پھر نگارشات میں ان لوگوں کے خلاف مزاحمت کا درس دیا جاتا ہے جو فلسطینیوں کو اپنی چیرہ دستیوں اور مظالم کا نشانہ بناتے ہیں اور انہیں گمنامی کے غار میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ اگر کسی بھی فلسطینی کی کسی بھی تحریر کو قومی نظم کہا جا سکتا ہے تو وہ محمود درویش کی مختصر نظم "بطاقۃ الھویہ" (شناختی کارڈ) ہے۔ اس مختصر نظم کی عجیب وغریب قوت یہ ہے کہ جب یہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر میں منظر عام پر آئی تو اس نے ایک عام فلسطینی کی، جس کی سیاسی شناخت دنیا میں اس حد تک گھٹا دی گئی تھی کہ وہ شناختی کارڈ پر بس ایک نام بن کر رہ گئی تھی، اس قدر نمائندگی نہیں کی جتنی کہ اس کی تجسیم کی ہے۔ (یعنی اسے شناختی کارڈ پر صرف ایک نام نہیں رہنے دیا بلکہ اسے گوشت پوست کے بنے جیتے جاگتے انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔) محمود درویش یہ بات پوری طرح بھانپ گیا تھا کہ فلسطینی کو گوشت پوست کا انسان نہیں رہنے دیا گیا بلکہ اسے محض ایک نام بنا دیا گیا تھا جو اسکے شناختی کارڈ پہ درج تھا۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ معانی خود شناختی کارڈ نے اسے سمجھائے۔ اس نے ان معانی کو ایک وسیع تر تناظر دیا اور انہیں ایک زبان دی —— اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کر سکا۔ ساری نظم پر فعل امر "سجل" (اندراج کرلو، لکھ لو) حاوی ہے۔ ٹیپ کے مصرعے کی طرح وقفے وقفے کے بعد اس کی گردان کی جاتی ہے۔ اس کا مخاطب کوئی اسرائیلی پولیس محرر ہے۔ اس پولیس محرر سے صرف اس محدود چوکھٹے کے اندر، جو شناختی کارڈ کا فراہم کردہ ہے، بات کی جا سکتی ہے، لیکن اس شخص (محرر) کو یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ کارڈ کی زبان، اس حقیقت کے ساتھ جس کا وہ مفروضہ طور پر حامل ہے، پوری طرح انصاف نہیں کرتی۔ "تشنیع" درویش کی نظم میں زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

لکھ لو!
میں عرب ہوں۔

اور میرے شناختی کارڈ کا نمبر

پچاس ہزار ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں۔

اور نواں

وہ گرما کے شباب میں تولد ہونے والا ہے:

کیا تم جل بھن تو نہیں گئے؟

دو بندوں کے بعد وہ کہتا ہے:

لکھ لو!

میں عرب ہوں۔

میرا نہ کوئی نام ہے ——— اور نہ خطاب۔

میں ایک ایسے ملک میں صابر و شاکر ہوں

جہاں کے لوگ جل بھن کر کباب ہو جاتے ہیں۔

نظم کے درمیانی بندوں میں راوی کا نجی شجرۂ نسب بیان کیا گیا ہے، یہ شجرۂ نسب کیا ہے، اس کے مصائب و آلام اور نقصانات کی ایک داستان ہے، جسے بار بار دہرایا گیا ہے جیسے کلیسا میں دعائیں کہ انہیں ایک شخص پڑھتا جاتا ہے اور باقی حاضرین اس کے چیدہ چیدہ حصے بار بار دہراتے جاتے ہیں۔ تاہم نظم کا انجام ایک ایسے نکتے پر ہوتا ہے جو اس بیشتر ادب کا، جسے ۱۹۷۰ء کے عشرے کے دوران میں فلسطینیوں نے تخلیق کرنا تھا یا جو فلسطینیوں کے متعلق تخلیق کیا جانا تھا، مرکزی موضوع ۶/۶۵۸۴ بن جائے گا یعنی کہ فلسطینیوں کا ظہور:

چنانچہ!

صفحۂ اوّل کے عین اوپر لکھ لو:

میں انسانوں سے نفرت نہیں کرتا
اور نہ میں اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہوں
تاہم اگر میرا پیٹ خالی ہو
تو غاصب کا گوشت میری غذا بنے گا۔
بچو ــــــ میری بھوک سے بچو
اور میرے غصے سے بھی!

"شناختی کارڈ" میں فلسطینیوں کا ظہور خطرے کی زد میں ہے۔ چند سالوں کے بعد یہی ظہور عرب سیاسی زندگی کی ایک ایسی واقعیت بن جائے گا کہ سب کی زبان پر اسی کا ذکر ہوگا۔ لیکن یہ ذکر اس طور نہیں ہوگا کہ گویا اسے کوئی خطرہ لاحق ہے بلکہ اس طور جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ موجود ہے اور اکثر و بیشتر حالات میں جب اس کا ذکر آئے گا، تو اس سے امید کا پہلو نکلے گا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ دنیائے عرب کے ناول نگاروں کے سرخیل، نجیب محفوظ نے، جس کی نس نس میں مصریت بھری ہوئی ہے اور یہ مصریت اپنی تمام جزئیات سمیت اس کے ناولوں میں جلوہ افروز ہوتی ہے، اپنے ۱۹۷۳ء کے ناول "حب تحت المطر" ("برسات میں محبت") کا، جس میں اس مصر کا ذکر کیا گیا ہے جو نہ امن، نہ جنگ کی کیفیت سے گزر رہا تھا، نقطۂ عروج (کلائمکس) فلسطینیوں کے ظہور ہی کو بنایا ہے۔ ناول کا آخری منظر ہمارا تعارف فلسطینی گوریلے ابوالنصر الکبیر (بابائے فتحِ عظیم) سے کراتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تازہ ترین "امریکی پہل کاری" نے اعصاب زدہ مصری حامیوں کی توجہ ہٹا کر انھیں ذہنی پراگندگی کا شکار بنا دیا ہے۔ بابائے فتح کی رائے یہ ہے کہ آج جو واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں ہمیں ان کے دوررس نتائج پر نظر رکھنا چاہیئے۔ محفوظ ایک ایسا طنز نگار ہے

جیسے اپنے کئے پر کوئی ندامت نہیں۔ یہاں وہ بیک وقت دو چیزوں پر رائے زنی کر رہا تھا کہ:

مسلح فلسطینیوں نے عربوں کے انقلابی ترجمانوں کا فریضہ کس طرح اچانک اپنے ذمے لے لیا اور انقلابی وعدے اور لفاظی کس طرح پہلے ہی خود اپنی پیروڈی[۱] آپ بن چکے تھے۔

بابائے فتح ابھی صرف بالقوۃ بابائے فتح تھا گو نجیب محفوظ نے اس حقیقت کی اہمیت گھٹانے کی کوشش نہیں کی (اور نہ اس کے قاری اس اہمیت کو گھٹا سکتے تھے) کہ اب جو بھی سیاسی حساب کتاب ہوگا اس میں فلسطینیوں کو شریک کرنا پڑے گا۔

---

[۱] پیروڈی (parody) کا اردو میں ترجمہ "تحریف" کیا جاتا ہے۔ اصلاً یہ ایک ادبی اصطلاح ہے۔ کسی سنجیدہ کلام کی مضحک نقالی کو ادبیات کی اصطلاح میں پیروڈی کہا جاتا ہے۔ جس ادب پارے کی پیروڈی کی جاتی ہے، اس کا ادبی دنیا میں معروف ہونا ضروری ہے، ورنہ پیروڈی اپنا لطف کھو دے گی۔ اردو میں پیروڈی کی بہترین مثال پطرس بخاری کا مضمون "لاہور کا جغرافیہ" ہے۔ اس میں نہ صرف جغرافیے کی درسی کتابوں کی بھد اڑائی گئی ہے۔ بلکہ لاہور کی بعض معاشرتی ناہمواریوں کو بھی مضحک بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ خضر تمیمی نے خوشی محمد ناظر کی مشہور نظم "جوگی اور ناظر کی پیروڈی" سارنگی اور طبلہ" کے عنوان سے، اور عاشق محمد غوری نے اختر شیرانی کی نظم "سلمیٰ" کی پیروڈی "کتا" کے عنوان سے کی ہے۔

ویسے یہ لفظ عام زندگی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص یا ادارے کی کارکردگی اتنی خراب ہو کر مذاق بن کر رہ جائے، تو اس صورتِ حال کو "پیروڈی" کہا جاتا ہے۔ مثلاً "مقدمے کی کارروائی انصاف کی پیروڈی کے مترادف تھی"۔

محفوظ کے ناول کی ایک دوسری "تشنیع" (irony) یہ ہے (اور ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل میں عرب دنیا کی جو صورتِ حال تھی، اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے) کہ جہاں تک ہر شخص کا تعلق ہے، معلوم ہوتا تھا کہ فلسطینی شناخت قطعی انداز سے بیرونِ فلسطین ابھر کر سامنے آئی ہے۔ محفوظ کا فلسطینی گوریلا، ابوالنصر، الناصرہ یا نابلوس میں نہیں، بلکہ قاہرہ میں رہتا ہے، اور جہاں تک ہر شخص کا علم کام کرتا تھا، اندرون اسرائیل درویش کی شناختی کارڈ والی زندگی بھی اتنی ہی غیر مطمئن اور ناشاد تھی، جتنی کہ پہلے تھی۔ ۱۹۷۵ء یا ۱۹۷۶ء تک اسرائیلی فلسطینی عرب جلاوطنی کے سحر اور کشش کے سامنے سپر انداز رہے۔ پھر ان کا ظہور ہوا۔ اس ظہور میں جو ناگزیر "تشنیع" (irony) مضمر ہے، یہ اس کے لیے بھی اور ان ٹھوس کامیابیوں کے لیے بھی، جو اس کی مرہونِ منت ہیں، نہایت اہم ہے۔ آئیں، اب ہم ان پر غور کرتے ہیں۔

۳

تحریکِ آزادیٔ فلسطین نمایاں مقام حاصل کرتی ہے

فلسطینی جو محض پناہ گزیں تھے، کس طرح قابل قدر اہمیت کی حامل سیاسی قوت بن گئے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، کسی نے اس کی نہ تو مکمل طور پر تسلی بخش تجزیاتی توضیح کی ہے اور نہ منطقی طور پر اس کا لمحہ بہ لمحہ جائزہ لیا ہے۔ لیکن یہ بات تمام عوامی تحریکوں پر صادق آتی ہے جو اپنے عناصر کی ریاضیاتی جمع تفریق سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فلسطینیوں کی اس کایا پلٹ کی تاریخ وار واقعہ نگاری گمراہ کن حد تک آسان ہے۔ "الفتح"[1] نے اپنی زیست کا آغاز ۱۹۶۵ء میں اندرونِ اسرائیل ایک معمولی یورش کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد جنگجو فلسطینی تنظیموں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اسرائیل کے ساتھ (اور اندرونِ اسرائیل) عسکری اعتبار سے اہم تصادمات کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ تاہم مارچ ۱۹۶۸ء تک فلسطینیوں نے جو کوششیں کیں، ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان دائروں کے اندر محصور تھیں جو عربوں کی قومی نمو (بالخصوص بعث پارٹی[2] اور ناصر

---

[1] "تنظیم آزادیٔ فلسطین" مختلف گروپوں اور جماعتوں پر مشتمل فلسطینیوں کی متحدہ جماعت ہے۔ "الفتح" اس کا سب سے بڑا گروپ ہے۔ یاسر عرفات اس گروپ کے سربراہ ہیں

[2] عربوں کی بائیں بازو کی تنظیم۔ یہ مختلف عرب ممالک میں کام کر رہی ہے۔

اور ان کے حامیوں) انے متعین کئے تھے۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں بالخصوص ۱۹۶۷ء کی جنگ جون کے بعد، فلسطینی تحریک نے ایک نیا جامہ زیب تن کر لیا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سیاسی اور علامتی طور پر یہ عرب گرد و پیش سے الگ ہو گئی اور اس نے ایک اپنی جداگانہ حیثیت منوالی۔ اس تاریخی دن کی اہمیت یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۴۸ء کے بعد اس روز اسرائیل کی باقاعدہ فوجوں (جو اندرون اردن ایک فلسطینی قصبے کرامہ پر چڑھائی کرنے کے لیے دریائے اردن عبور کر آئی تھیں) اور فلسطینیوں کی بے قاعدہ فوجوں کے مابین پہلی جھڑپ ہوئی۔ اس لڑائی میں، جو دن بھر جاری رہی، ما بعد ازاں اردنی فوج کے باقاعدہ دستوں نے فلسطینیوں کی امداد کی، لیکن (فلسطینیوں کے بیان کے مطابق) لڑائی کا بیشتر بوجھ فلسطینیوں نے اٹھایا اور وہی اسرائیلیوں کے خلاف مصروف کارزار رہے۔ کرامہ کا دفاع کرنے والے نہ صرف اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے اور لڑائی کرتے رہے، بلکہ انہوں نے اسرائیل کے بکتر بند دستوں کو بھی کافی نقصان پہنچایا۔ انہوں نے متعدد فوجی گاڑیاں تباہ کر دیں اور اس کے بے شمار فوجیوں کو یا تو ہلاک کر دیا اور یا گھائل۔ یہ وہی بکتر بند دستے تھے جو اس وقت تک اس بات کے عادی تھے کہ ان کا جہاں (مثلاً مغربی کنارے کا گاؤں السموع) جی چاہتا، آرام سے آتے، مار دھاڑ کرتے، جائدادوں کو تباہ و برباد کرتے۔ نہتے عربوں کو ہلاک کرتے اور کوئی ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا بلکہ وہ کوئی خاص نقصان اٹھائے بغیر واپس چلے جاتے۔

کرامہ فلسطینیوں کی تیز ترین نمو کا نقطۂ آغاز تھا۔ تمام عرب ممالک سے رضاکار جوق در جوق آنے لگے اور ایک سال کے اندر اندر فلسطینی فدائین اندرونِ اردن ایک ایسی قوت بن کر ابھر چکے تھے کہ ان سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہی وہ دور تھا جس کے دوران میں وہ چیز صورت اختیار کرنے لگی، جس کی طرف میں پہلے ہی

اشارہ کر چکا ہوں اور جسے تذبذب کہا جا سکتا ہے۔ تذبذب اس بارے میں تھا کہ ایک انقلابی جہت (قوم کو غیروں کے پنجے سے چھڑانے کا عمل[1]) اختیار کی جائے یا وہ جہت اختیار کی جائے جو فلسطینی قوت کے ڈھانچوں کو ایک عرب ریاست کے ڈھانچوں (قومی آزادی) میں تبدیل کر دے۔ یہی وہ تذبذب تھا جس نے فلسطینیوں ——— یا یوں کہیں اور زیادہ مناسب بھی یہی بات ہے کہ اس نے تنظیم آزادئ فلسطین ——— کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا اور یہ فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ کون سی راہِ عمل زیادہ صحیح ہوگی۔ میں اس کتاب میں جس متناقض فلسطینی "صورت حال" کا ذکر کر رہا ہوں، یہ دونوں صورتیں اس کے لازمی عواقب ہیں نظری طور پر ان دونوں امکانات کو ایک دوسرے کا حریف نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر انہیں فلسطینی شناخت کے سارے مسئلے کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے نظر آئیں گے۔ تاہم جب واضح انتخاب کر بھی لیا گیا تو بھی یہ دونوں متبادل صورتیں جو مسائل پیدا کرتی تھیں، وہ ختم نہیں ہوئے۔ فلسطینیوں نے چونکہ کافی ہتھیار اکٹھے کر لیے تھے اور انہوں نے بڑی سرعت کے ساتھ اپنے

---

[1] اصل میں یہاں مصنف نے دو الفاظ liberation اور independence استعمال کیے ہیں۔ اردو زبان میں ان دونوں کا ترجمہ "آزادی" کیا جاتا ہے لیکن ان دونوں الفاظ کے مابین ایک باریک سا فرق ہے۔ لبریشن وہ کارروائی ہے جو کوئی قوم کسی دوسری قوم کا جوا اپنے کندھوں سے اتارنے کے لیے کرتی ہے۔ محکوم قوم کو حاکم قوم سے نجات مل جاتی ہے تو اس حالت کو (independence) (آزادی) کہا جاتا ہے۔ فلسطینیوں کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ سارے فلسطین کو صیہونیوں کے چنگل سے چھڑانے کی کارروائی کریں، اگر وہ یہ کام کرتے ہیں تو وہ برلشن کے لیے جد و جہد کر رہے ہوتے، یا ان کے سامنے یہ صورت تھی کہ وہ فلسطین کے اس علاقے پر، جہاں اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران میں قبضہ کیا تھا، ایک آزاد فلسطینی مملکت قائم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی یہ جد و جہد آزادی (independence) کی خاطر ہوتی۔ انہوں نے دوسری صورت کو ترجیح دی۔

آپ کو سیاسی اور فوجی گروپوں (کی صورت) میں منظم کرنا شروع کر دیا تھا، اور البتہ چونکہ یہ سب کچھ اندرونِ فلسطین نہیں بلکہ کسی نہ کسی برادر عرب ملک کے اندر ہو رہا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ نوجنگجو فلسطینی (اس برادر عرب ملک) کی مرکزی مقتدرہ کے لیے ایک چیلنج بنتے جا رہے ہیں۔ اور جیسا کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ واضح ہو گیا کہ فلسطینی خود ارادیت نے سمجھوتے کی راہ اختیار کر لی تھی۔ پہلے وہ یہ چاہتے تھے کہ انہیں سارے فلسطین کو آزاد کرانا چاہیے لیکن اب وہ فلسطین کے ایک حصے پر اپنی مملکت قائم کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس دوران میں تنظیم آزادی فلسطین نے یہ ہاتھ دکھایا کہ کسی نہ کسی عرب مملکت کے اندر فلسطینیوں کے امور طے کرنے کے لیے اپنی ایک نیم مملکت قائم کر لی۔ اور یہ نیم مملکت پہلے اردن میں اور پھر لبنان میں اپنے سے بڑی مملکت کے ساتھ متصادم ہو گئی۔ دوسری طرف فلسطینی تحریک کی عظیم سیاسی اور نظریاتی قوت کا راز وہ صلاحیت تھی جس کی مدد سے اس نے علاقے کے تقریباً ان تمام عناصر کی توجہ، جو ادب، ثقافت، فنونِ لطیفہ اور اس قسم کے دوسرے محاذوں پر پیشروؤں کا کردار ادا کر رہے تھے، اپنی طرف مبذول کرا لی۔ ایک خاص مفہوم میں "فلسطینی" ہر اس چیز کا مترادف تھا جو ان الفاظ کے بہترین معانی کے اعتبار سے نئی، جدید یا انوکھی تھی۔

پھر یہ "فلسطینیت" سیاست کی ترادف بھی ہے۔ میرے خیال میں یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگا کہ ۱۹۴۸ء کے بعد عرب دنیا میں جو وقیع سیاسی تحریکیں شروع ہوئیں، خیالات کے جو دھارے رواں دواں ہوئے، جن بحث مباحثوں کا آغاز ہوا ان سب پر فلسطین کا مسئلہ حاوی رہا ہے۔ فلسطینیوں کے اپنے بحث مباحثوں، مذاکروں، تنظیموں، وغیرہ پر یہ بات کتنی صادق آتی ہے، اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات خود ہی اظہر من الشمس ہے۔ اس کا جو خالص نتیجہ برآمد ہے، وہ

واقعی زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے فلسطینی سیاست تنظیموں کی اصطلاحوں میں چلائی جا رہی ہے ——— ان تنظیموں میں اہم ترین وہ ہیں جو تنظیم آزادیٔ فلسطین کی صورت میں شیرازہ بند ہو چکی ہیں۔ ان میں "الفتح"، عوامی محاذ برائے آزادیٔ فلسطین (پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف پیلسٹائن یا پی ایف ایل پی)، عوامی جمہوری محاذ برائے آزادیٔ فلسطین[1] (پاپولر ڈیموکریٹک فرنٹ فار دی لبریشن آف پیلسٹائن یا پی ڈی ایف ایل پی)، صاعقہ[2] اور بے حد چھوٹے چھوٹے گروپوں کی ایک خاصی بڑی تعداد شامل ہے۔ ان گروپوں کے ارکان مختلف افکار و نظریات اور رجحانات کے حامل ہیں۔ اور تو اور ان کی وفاداریوں کے منابع بھی مختلف ہیں، جن کا انہیں باقاعدہ معاوضہ بھی ملتا ہے۔ تاہم ان کے تنظیم آزادیٔ فلسطین کی صورت میں شیرازہ بند ہونے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ مخصوص فلسطینی مسائل کا رشتہ عرب سیاست ہی سے نہیں بلکہ تیسری دنیا کی سیاست اور مختلف قسم کے دیگر مفادات سے بھی قائم ہو گیا ہے۔ بعض اوقات فلسطینی سیاست سر چکرا دینے کی حد تک بے ربط ہو جاتی ہے (اس کی وجوہات کیا ہیں، ان پر میں ذرا بعد میں روشنی ڈالوں گا) اور کبھی یہ بالکل خونخوار رویہ اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن بعض مواقع

---

[1] یہ گروپ اصل میں پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف پیلسٹائن (پی ایف ایل پی) کے بطن سے نکلا ہے۔

[2] مثلاً "صاعقہ" گروپ کی وفاداریاں شام کے ساتھ وابستہ ہیں اور شام ہی انہیں امداد فراہم کرتا ہے۔ پچھلے سالوں میں شام بیروت کے فلسطینی کیمپوں پر جو حملے کرتا رہا ہے۔ ان میں اس گروپ کے ارکان شام کی طرف سے لڑتے رہے ہیں۔ کچھ گروپوں کی وفاداریاں لیبیا کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض خود اسرائیل کے ایجنٹ ہوں۔

(مصنف)

ایسے بھی آتے ہیں جب یہ روز روشن کی طرح بالکل واضح صورت اور رُخ اختیار
کرلیتی ہے۔ لیکن ایک بات پر حیران کن حد تک مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور
وہ یہ ہے کہ سبھی گروہ فلسطینیوں کے حق خود ارادیت اور اس کے ساتھ آزادی حاصل
کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر جو بات قابلِ غور اور اہم ہے، وہ یہ ہے
کہ انہوں نے بکاؤ مال بننے، اپنی جدوجہد ترک کرنے اور احتجاج کے بغیر دوسروں
کا دبیل بننے یا اپنے ملک پر غیروں کا قبضہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔
اس معاملے میں ان کا ریکارڈ صاف بھی ہے اور غیر منقطع بھی۔

فلسطینیوں کا سب سے بڑا گروپ "الفتح" ہے۔ اس گروپ پر یاسر عرفات
اور فدائین کا ایک گروہ حاوی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت، اثر و رسوخ اور سیاسی
سوجھ بوجھ جلاوطنوں اور غزہ اور مغربی کنارے کی ایک بہت بڑی اکثریت کو اپنے
دائرے میں سموئے ہوئے ہے۔ الفتح (اور واقعتاً یاسر عرفات) جن نمونوں کی پیروی
کرتا ہے، وہ بنیادی طور پر ناصری ہیں، لیکن (صدر) ناصر (مرحوم) کے علی الرغم الفتح اور
عرفات نے عملاً یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ حتی الامکان کسی بھی عرب ملک کی داخلی سیاست
میں ضرورت سے زیادہ ملوث نہیں ہوں گے۔ (اس معاملے میں لبنان اور اردن دو
مستثنیات تھیں۔ اگرچہ ایک لحاظ سے یہاں دخل اندازی ناگزیر تھی لیکن انجام کار یہ دخل اندازی
بہت مہنگی ثابت ہوئی۔) ناصری سیاست سے میری مراد صرف یہ نہیں کہ اقتدار (القائد)
یعنی "زعیمہ" ہمیشہ ایک مرئی علامت ــــــ اس صورت میں یہ علامت عرفات
ہیں، جو "بڑے میاں" کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں جن کی محض مسلسل موجودگی
ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ فلسطینیوں کا ایک مقصد (کاز) ہے ــــــ
ہوتی ہے بلکہ یہ کہ بنیادی طور پر یہ دو انتہاؤں کے بین بین ایک قوم پرستانہ فلسفہ ہے
جو تحریک کی رہنمائی کرتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ایک خامی ہے کیونکہ اس کا مطلب

یہ ہے کہ سیاسی تنظیم پر کم سے کم زور دیا جاتا ہے، ماسوائے ایک صورت کے جب معاملہ صیہونیت کے خلاف محاذ آرائی کرنے کا ہو۔ چنانچہ عرفات اور الفتح کو مجموعی طور بلا تامل محض عرب اور فلسطینی کی حیثیت سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے لحاظ سے یہ بات اچھی بھی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

(الف) الفتح سیاسی خیالات اور اسلوب میں ڈھنڈورا پیٹے بغیر حقیقی جمہوریت کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

(ب) کوئی بھی یہ کبھی ثابت نہیں کر سکا کہ الفتح ایسے ممالک کے ساتھ جیسے کہ مثال کے طور پر سعودی عرب، لیبیا، سوویت یونین یا جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک (مشرقی جرمنی) ہیں، اپنے تعلقات کے باوجود ان سے آزاد نہیں۔ اور چنانچہ سب سے بڑھ کر یہ فلسطینی تھیں۔

(ج) اور اہم ترین بات یہ ہے کہ الفتح اس اہم اور اساسی حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے کہ یہ مظلوم فلسطینیوں کی ایک جماعت تو ہے لیکن وہ یہ ضروری نہیں سمجھتی کہ عوامی جنگ یا طبقاتی تجزیے کے نظریے میں ہر فلسطینی کو گھسیٹ دے۔

لیکن الفتح صرف انہی باتوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ الفتح کے لاتعداد حمایتی ہیں۔ اس کی جدوجہد کی تاریخ نسبتاً طویل ہے۔ اس کے وسائل (ہزاروں تربیت یافتہ فدائین، حکام، وغیرہ) وافر ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کے متعلق اس کا نقطۂ نظر نسبتاً رجائی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ آخری بات آپ کو عجیب نظر آئے لیکن یہ اس تیقن اور اعتماد، بے جھجک روش اور بے تکلفی اور بنیادی طور پر مثبت رویے کی مظہر ہے، جس کے ذریعے الفتح سیاسی طور پر باقی دنیا کو متاثر کرتی ہے اور خود اس سے متاثر ہوتی ہے۔ اس کی جزوی وجہ یہ ہے کہ اس نے نہ صرف عرب قوم پرستانہ سیاست کے اس بڑے اصول کے ساتھ

پیوند کاری کے ذریعے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے جس کا تعین جمال عبدالناصر نے کیا تھا بلکہ اس نے اپنے (حقیقتاً بہت ترقی پسندانہ) سنی اسلام کے ثقافتی رسومیہ[1] کی پردہ پوشی کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ قصہ مختصر، یہ ایک اکثریتی گروپ ہے اور یہ اپنے آپ کو فلسطینی مسئلے کے متعلق (میرے خیال میں بجا طور پر) بات کرنے کا اہل سمجھتا ہے۔ چنانچہ مجموعی طور پر اسے تنظیم آزادئ فلسطین میں بھی غلبہ حاصل ہے۔ پھر بھی الفتح جو کچھ ہے اور جن چیزوں کی یہ نمائندگی کرتی ہے، ایک لحاظ سے ان کی حدود منفی طور پر متعین کی جاتی ہیں ——— ان منفی حدود کا تعین ان باتوں سے ہوتا ہے جو اس کے سیاسی حریف اس کے متعلق کہتے ہیں اور ان باتوں سے بھی، جن کے متعلق ان حریفوں کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ یہ ہیں وہ چیزیں، جو ہم نے فلسطینی سیاست کی دنیا کو اپنے حصے کے طور پر دی ہیں۔ یہاں چند اہم نکات کا ذکر ضروری ہے۔

اگر یہ بات درست ہے کہ فلسطینی سیاست کی تاریخ کا ایک نمایاں وصف یہ رہا ہے کہ اس نے فلسطین کے متعلق ایسے منصوبوں میں شریک ہونے سے اکثر انکار کیا ہے جو (فلسطین میں نہیں بلکہ) کہیں باہر گھڑے گئے تھے (اعلانِ بالفور سے لے کر، ۱۹۴۷ء کے تقسیم کے منصوبے تک اور وہاں سے کیمپ ڈیوڈ تک)۔ تو پھر الفتح کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جس نے کسی دوسری سیاسی جماعت کی نسبت ان منصوبوں کو ماننے سے سب سے کم انکار کیا ہے۔ (یا مروجہ اصطلاح کے مطابق انہیں سب سے کم مسترد کیا ہے)۔ چونکہ الفتح اس احساس کے ساتھ اور اس احساس میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اپنے دشمنوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے کہ اس کی طاقت کا سرچشمہ جمہور کی حمایت ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ واحد فلسطینی جماعت ہے جو اپنے دشمنوں کے ساتھ کوئی ذمہ دارانہ سیاسی تصفیہ

---

[1] رسومیہ (Ethos) کسی شخص، قوم، فرقے، ثقافت، نظام، ادب پارے یا تحریک وغیرہ کا خصوصی مزاج، کردار، اقدار یا عقائد۔

کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہے۔ الفتح، اور بالخصوص عرفات، عملیت پسند[1] ہیں، جس کا مطلب میرے قیاس کے مطابق یہ ہے کہ چالوں اور گھاتوں پر زیادہ وقت، توجہ اور مہارت صرف کی جانا چاہیئے اور نظریے اور منضبط حکمت عملی پر کم۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ الفتح کی نسبت اس کے حریفوں، بالخصوص پاپولر فرنٹ اور بعد ازاں متاثر کن نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ کو ان مشکلات، سیاق و سباق اور نظریاتی مسائل کا، جنہوں نے مسئلہ فلسطین کو محصور کر رکھا ہے، زیادہ درک تھا، چنانچہ وہ مسئلے کی نوعیت بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ مثلاً پاپولر فرنٹ نے یہ دعوت دی کہ عرب ممالک میں انقلاب برپا کیا جائے کیونکہ فلسطین کا دوبارہ حصول صرف اسی ذریعے سے ممکن ہے۔ یہ فرنٹ اسرائیل، امریکہ یا "عرب رجعت پسندی" کے ساتھ کسی بھی قسم کے سیاسی حل پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں اور اپنے اس انکار پر نہایت سختی سے قائم ہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق مسئلے کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ ہے فوجی حل۔ ڈیموکریٹک فرنٹ (ڈی پی الف) کا جسے خطے کے مارکسی/لینینی گروپوں میں مرکزی مقام حاصل ہے استدلال یہ ہے کہ جو بھی سیاسی رویہ اپنایا جائے، وہ پہلے سے زیادہ زیرکی، معاملہ فہمی اور مہارت کا حامل ہونا چاہیے۔ یہ فرنٹ ۱۹۶۹ء میں وجود میں آیا اور جب سے یہ قائم ہوا ہے، اسی وقت سے یہ بڑھ چڑھ کر اس بات کا پرچار کر رہا ہے کہ اجتماعی فلسطینی مؤقف میں ترقی پسندانہ تبدیلی ہونا چاہیے۔ یہ ڈی پی ایف تھا جس نے سب سے پہلے اس عبوری پروگرام کا، جسے تنظیم آزادیٔ فلسطین نے ۱۹۷۴ء میں منظور کر لیا، زور شور سے پراپیگنڈہ کیا۔ اس پروگرام کے تحت تنظیم آزادیٔ

---

[1] عملیت پسندی (Pragmatism)، مسائل کو حل کرنے کا عملی طریقہ۔ اصل میں یہ فلسفے کا ایک نظریہ یا اصول ہے۔ اس کے مطابق کسی دعوے کی قدر و قیمت صرف اس بنا پر متعین کی جاتی ہے کہ اس کے عملی نتائج کیا برآمد ہوں گے اور انسانی مفادات پر یہ کس طرح اثرانداز ہوگا۔

فلسطین کو جن مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کو کہا گیا وہ فوری نوعیت کے مقاصد تھے اور پورے کے پورے فلسطین کو آزاد کرانے کے مقاصد سے کہیں کمتر تھے ۔ یہ پروگرام ، جس کی ۱۹۷۷ء میں نوک پلک مزید سنواری گئی ، اس تصور کو قبول کرتا ہے کہ فلسطین کے کسی بھی حصے پر ، جسے اسرائیل خالی کر دے ، قومی فلسطینی اقتدار اعلیٰ (اب مملکت) قائم کیا جا سکتا ہے ۔

لیکن وہ گروپ ، جو اس قسم کے منصوبوں کو پائے استحقار سے ٹھکرانے اور مسترد کرنے کے عادی ہیں (ان میں وہ مٹھی بھی تنظیمیں شامل ہیں جنہیں لیبیا اور عراق مالی امداد فراہم کرتے رہتے ہیں) اور ڈی پی الیف (جو مسترد کرنے والوں میں شامل نہیں) ، جو چیلنج پیش کرتے ہیں ، وہ یہ ہے کہ وہ الفتح کی کم و بیش برجستہ ، اور بعض صورتوں میں خاندانی انداز کی بھی ، سیاست کے ناقد ہیں ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا نکتہ چینیاں نظریاتی ، تنظیمی اور حربی تقاضوں کی بنیاد پر کرتے ہیں ۔ (اور اس میں ان کی اپنی کوئی غرض شامل نہیں) تنظیم آزادی فلسطین اور سعودی عرب یا شام کے مابین مفروضہ تعلقات کس نوعیت کے ہونا چاہئیں ؟ اردن کے متعلق ، جو بلحاظ آبادی فلسطینی اکثریت کا علاقہ ہے ، ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے ؟ ۱۹۷۶ء کے موسم خزاں میں تنظیم آزادی فلسطین کے بعض ارکان اور اسرائیل کی بعض عوامی شخصیات کے مابین جو ملاقاتیں ہوئیں ، وہ کیوں ہوئیں اور کن مخصوص مقاصد کے پیش نظر ہوئیں ؟ جب سادات نے بیت المقدس کا دورہ کیا تو اس کی ہر پہلو اور ہر لحاظ سے مذمت کیوں نہ کی گئی ؟ الفتح کے خیال میں مستقبل کا فلسطینی معاشرہ کس قسم کا ہونا چاہیے ؟ استعمار کے مسائل کے متعلق الفتح کے واضح عزائم کیا ہیں ؟ وہ ایسے عزائم کیوں نہیں اپنا تی جن سے امریکہ اور اس کے حواریوں کیساتھ پینگیں بڑھانے کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے ؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب الفتح کا رویہ یہ ہو کہ کچھ یہاں کیا اور کچھ وہاں کیا ، اس کا ایک رہنما الف کہتا ہے اور دوسرا ب ،

اس نے جو نوکر شاہی (بیوروکریسی) قائم کر رکھی ہے، اس کی کوئی کل سیدھی ہی نہیں ہے، وہ انقلابی تنظیم کا کام کرنے اور شعور بلند کرنے کی جگہ محض نعرے لگاتی رہتی ہے، کام کروانے کی بجائے محض سرپرستی کرنا ہی کافی سمجھتی ہے، سنجیدہ جواب طلبی کے بجائے محض اس بات پر عمل کرتی ہو کہ لیڈر کے پیچھے پیچھے چلو، ان تمام امور کے باوصف وہ (الفتح) کب تک مواخذے سے بچی رہے گی؟

بعض اوقات ان مباحث پر اتنا زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے جو صیہونیت کے خلاف نبرد آزما ہونے میں بھی صرف نہیں ہوتا۔ بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب کسی ایسے امر کے متعلق، جو ساری فلسطینی قوم کے لیے بے پناہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے ——— مثلاً ۱۹۷۰ء کے اواخر میں اقوام متحدہ نے جو قرار داد نمبر ۲۴۲ منظور کی تھی اس کی بابت تنظیم آزادیٔ فلسطین کا مؤقف ——— فیصلہ دو عاجلانہ جملوں میں کر دیا جاتا ہے، جب کہ ایک مسئلہ، جو ایک دفتر میں فرنیچر کی ایک استردادی اور اس سے ملحقہ دفتر میں مقیم الفتح کے ایک فدائی کے مابین عارضی جھگڑے سے متعلق ہوگا زبردست دلائل سے معمور (اور عام طور پر مبہم اور آب و تاب سے محروم) نثر کے صفحات کے صفحات کھا جائے گا۔ ٹیڑھی میڑھی ترجیحات اور عدم ارتباط (جس کا ذکر میں نے کچھ ہی دیر پہلے کیا تھا) کا احساس نہ صرف ایک دوسرے سے گتھم گتھا سیاسی فلسفوں بلکہ فلسطینی حیات کی مکینی صورت کا بھی وظیفہ ہے۔ جب آپ کے پاؤں تلے زمین (یعنی اپنا علاقہ) نہ ہو، تو پھر آپ کے لیے یہ امر انتہائی مشکل ہے کہ آپ یقین کے ساتھ یہ معلوم کر سکیں کہ آپ کے لیے بہترین راستہ کون سا ہے کیونکہ آپ ٹھوس حقائق سے عہدہ برآ نہیں ہو رہے تھے بلکہ صرف عالم تجرید میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہوتے ہیں۔ پھر بسا اوقات سیاسی وفاداریوں اور وابستگیوں کا ایک مایوس کن (بلکہ لاعلاج) ملغوبہ وجود میں آجاتا ہے جو نیم ڈھیلی ڈھالی آنول نال[1] کی طرح فلسطینیوں کو ایک دوسرے سے اور ان ممالک

[1] : وہ نال یا آنت جو پیدائش کے وقت بچے کے ناف سے جڑی ہوتی ہے اور جسے کاٹ دیا جاتا ہے۔

کے ساتھ، جہاں وہ مقیم ہیں، منسلک کر دیتا ہے۔ ہر عرب سیاستدان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ فلسطینی جدوجہد کے ساتھ رسم و راہ بڑھائے کیونکہ اس سے اسے اختیار کی سند بھی ملتی ہے اور اسے برسرِ اقتدار رہنے یا آنے کا جواز بھی مہیا ہوتا ہے۔ چنانچہ عربوں کی ہر مملکت یا حکومت یہ ضرورت محسوس کرتی ہے کہ اسے فلسطینی سیاست میں کسی نہ کسی قسم کا اثر و رسوخ حاصل ہو۔ اس اثر و رسوخ کے حصول کے لیے عام طور پر دو ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ کچھ فلسطینی اپنی سیاست میں ان ممالک کی نیابت کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی یہ ممالک فلسطینیوں کی ایک پارٹی بنا دیتے ہیں جو ان ممالک کے اشاروں پر رقص کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ قریب قریب ہر فلسطینی کی یہ کیفیت ہے کہ کبھی شعوری طور پر اور کبھی غیر شعوری طور پر وہ اس قسم کی سیاست کاری کر رہا ہوتا ہے کہ وہ دانشورانہ یا مادی وسائل کے لیے عراق، مصر، سعودی عرب یا کسی بھی دوسرے ملک کے احسانات تلے دبے ہوتا ہے۔ عرفات ایک قسم کی نابغۂ روزگار شخصیت ہیں کیونکہ انہوں نے ان سب کو حدود کے اندر رکھا ہوا ہے بلکہ (ناصر کی طرح) بعض اوقات انہیں اس طریقے سے استعمال کر لیتے ہیں جس سے ان کا اپنا مطلب نکل آتا ہے اور فلسطینی تحریک کو خاصا فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ تاہم بعض مواقع ایسے بھی آجاتے ہیں کہ یہ صورتِ حال ہلاکت آفریں جنگ پر منتج ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال وہ تصادم ہے جو ۱۹۸۰ء کے نصف اوّل کے دوران میں الفتح کے فدائین اور عراق کے پروردہ استردادین کے مابین ہوا تھا۔ لیکن زیادہ تر —— اور یہ غالباً ایک متناقض صورتِ حال ہے —— فلسطینی سیاست کا رجحان آپس کی کھینچا تانی کی طرف نسبتاً کم ہے اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی طرف زیادہ ہے۔ صورتِ حال کی توضیح کا یہ ایک طریقہ ہے کیونکہ ویت نام اور الجزائر کی تحاریک آزادی کے مقابلے میں فلسطینی تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت متشددانہ گروہی سیاست نہیں ہے

جہاں حریف ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ بعض ناقدین یہ باور کرتے ہیں کہ یہ (فلسطینی) تحریک کی ایک زبردست خامی ہے۔ کیونکہ فلسطینیوں (بالخصوص الفتح) کی سوچ یہ ہے کہ طاقتِ بندوق کی نالی سے نہیں بلکہ استدلالی طور پر اپنے حریفوں کو چاروں شانے چت گرانے سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے لوگ اس سچائی کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن وہ ایسا محض اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ تنظیم آزادئ فلسطین کو اپنی نکتہ چینی کا ہدف بنا سکیں کہ یہ سیاسی اور انقلابی عزم سے تو عاری ہے لیکن جنگ جوئی کا پرچار بہت کرتی ہے۔

میرے خیال میں فلسطینیوں کی ایک خاصی بڑی تعداد ان معنوں میں غلط راستے پر چل پڑی ہے کہ وہ یہ باور کرنے لگے ہیں کہ وہ قوت جو تحریک کو مہمیز دیتی اور اسے پروان چڑھاتی ہے، وہ اس کا مسلح جدوجہد کا فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے۔ کہ یہ ایک نیا اور انوکھا تصور ہے جسے اولین بار فلسطینیوں نے متعارف کرایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ عوامی جنگ کے عمومی نظریے کے متعلق بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی انہوں نے ہی تخلیق کیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بات ٹھیک بھی ہے کیونکہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر میں یقیناً یہ صرف فلسطینی ہی تھے جو ابھی تک عرب جدوجہد کو استعمار مخالف اصطلاحات میں سوچنے کی ہمت کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء کے بعد اقوام متحدہ نے جب قرارداد نمبر ۲۴۲[1] منظور کی، تو اس کا عالمی رائے عامہ پر گہرا اثر پڑا۔ اس

---

[1] اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے قرارداد نمبر ۲۴۲، ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو منظور کی تھی۔ اس قرارداد کی رو سے جنگ کے ذریعے دوسروں کے علاقوں کو ہتھیانے کی کارروائی پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا تھا۔ اسرائیل سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا، انہیں وہ خالی کر دے۔ اس کے ساتھ ہی اس قرارداد میں مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک (بشمول اسرائیل) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(عالمی رائے عامہ) سے صدر ناصر اور بعث پارٹی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور سمجھنے لگے کہ اس قسم کی عالمی رائے عامہ کا بننا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اس کی ایک علامت ۱۹۷۰ء میں راجرز منصوبے کی منظوری کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ فلسطینیوں کی مسلح جدوجہد کی اصل معنویت پیچیدہ نوعیت کی حامل تھی لیکن کم از کم ایک سطح پر یہ اس بات کی بھی نمائندگی کرتی تھی کہ اب سارے فلسطین کو آزادی دلانے کی جدوجہد سے منہ موڑ لیا گیا ہے اور ایک قوم پرستانہ مساعی کا آغاز کر دیا گیا ہے جس میں ہتھیار (اور فوجیں) ایک مرکزی قومی مقتدرہ کے تحفظ کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۴۴۰: کی علاقائی سالمیت اور سیاسی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔ چنانچہ علاقے کے تمام ممالک سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ حالتِ جنگ ختم کر دیں۔ ایک دوسرے کی سیاسی آزادی، علاقائی سالمیت اور اقتدار اعلیٰ کا احترام کریں۔ تسلیم شدہ سرحدوں کے اندر امن چین سے رہیں اور ایک دوسرے کو دھمکیاں نہ دیں۔

ے ولیم راجرز (Rogers) صدر نکسن کے زمانے میں امریکہ کے وزیر خارجہ تھے۔ انھوں نے ۹ دسمبر ۱۹۶۹ء کو "مشرق وسطیٰ میں دیرپا امن۔ امریکی نقطۂ نظر" کے عنوان سے ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر میں جو نکات بیان کئے گئے تھے، انہیں "راجرز منصوبہ" کہا جاتا ہے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کی تائید کی تھی۔ انھوں نے بھی اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ وہ مقبوضہ علاقے خالی کر دے، عربوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کریں۔ انھوں نے فلسطینی پناہ گزینوں سے ہمدردی کی اور ان کی خواہشات کا احترام کرنے پر زور دیا۔ تاہم انھوں نے کہا کہ سرحدوں کا نئے سرے سے تعین ہونا چاہیے اور یہ معاملہ اسرائیل اور اردن کی حکومتیں آپس میں صلاح مشورے سے کریں۔ گویا فلسطینیوں کا پتہ نہایت صفائی سے کاٹ دیا گیا۔

اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ نے ناصر ازم اور بعث ازم کے ساتھ یہی کچھ کیا کیونکہ اس نے (نظری طور پر) فوج کا یہ کردار کہ وہ ایک انقلابی سامراج دشمن طاقت ہے، تو ختم کر دیا اور اس کا حلیہ یوں بگاڑا کہ اسے موجودہ حالت (سٹیٹس کو) کا لازمی طور پر قدامت پسند محافظ بنا دیا۔ چنانچہ اس حد تک فلسطینیوں کے متعلق یہ تاثر قائم ہونے لگا کہ ان کے ہتھیاروں کا انقلابی مقاصد کے لیے استعمال ہونے کا امکان کم ہے اور اس مملکت کی خاطر جو ابھی تکمیل کے مراحل میں سے گزر رہی ہے، زیادہ۔

چنانچہ اردنی فوج اور تنظیم آزادئ فلسطین کے مابین جو جھڑپیں ہوئیں، ان میں فلسطینی ہتھیاروں نے ایک آزاد فلسطینی شناخت کا، وہ جیسی کیسی بھی تھی، تحفظ کیا۔ یہ ہتھیار کوئی انقلابی پیش قدمی نہ کر سکے کیونکہ اردنی مملکت کے سیاق و سباق میں توپیں زیادہ سے زیادہ اس تشدد کی اجارہ داری کو، جو مملکت کی تحویل میں تھی، للکار سکتی تھیں، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اور ان کی للکار صرف اس بنا پر تھی کہ وہ ایک مملکت کے اندر اپنے فلسطینی مفادات کا، جو ادارے کی صورت اختیار کر چکے تھے، تحفظ کرنا چاہتے تھے۔ تاہم اگر طرف فلسطینی اردنی دلدل کی کیچڑ میں لتھڑ گئے تاہم دوسری طرف اس عمل نے ان میں آزادی کی زبردست تڑپ بھی پیدا کر دی۔ کیونکہ اگر فلسطینی تحریک محض مسلح جدوجہد اور عوامی جنگ کے فلسفے سے ہی عبارت ہوتی تو تحریک کا وہیں بولورام ہو جاتا اور اس کی قوت وہیں دم توڑ دیتی۔ لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسطینی جو "خواب" دیکھتے ہیں اور جسے میں نے ایک جگہ "فلسطینی تصور" بھی کہا ہے، تو یہ خواب اور اس سے وابستہ اقدار عارضی باہمی عرب مناقشات سے بھی اور خونریز باہمی عرب تشدد سے بھی بہت ماورا رہا ہے۔ فلسطین میں جس سیکولر، جمہوری مملکت (کے قیام) کی سب سے پہلے تنظیم آزادئ فلسطین نے وکالت کی تھی، وہ اس بات کی علامت تھی کہ تحریک صحیح معنوں میں ایک نیا اور انوکھا تصور پیش کر رہی ہے اور وہ انقلابی قوت سے

بھی لیس ہے۔ چنانچہ اس تصور نے ایک ایسے علاقے میں، جو ابھی تک ہر قسم کی رجعت پسندیوں اور ظلم و جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، ان تمام جمہوری اقدار کو، جو اس (تصور) میں مضمر تھیں، آگے بڑھایا۔ اس تصور نے ایک اور کام جو کیا، وہ یہ تھا کہ اس نے محض یہ خواب نہیں دکھایا کہ اپنا مقصد تبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہتھیاروں کی نمائش کی جائے یا تاریخ سے غصیلا انتقام لیا جائے بلکہ اس (تصور) نے اس سے کہیں زیادہ کی امید دلائی۔

چنانچہ کرامہ میں جو کچھ ہوا تھا، اس کے بعد فلسطینی تحریک باری باری دو پلڑوں کے مابین گھومتی رہی۔ کبھی تو وہ انقلاب کے خواب دیکھنے لگتی اور کبھی ایسی چالیں سوچنے لگتی جن سے عملی طور پر قومی مقاصد کے حصول میں مدد مل سکتی تھی۔ مجموعی طور پر فوجی پسپائیوں کے ایک (پورے) سلسلے کے باوجود، جو اپنے نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچیں جب تنظیم آزادی فلسطین کو اردن سے زبردستی نکال دیا گیا، تنظیم اپنے دفاتر، کارکنوں فدائیوں اور حمایتیوں کے کامل حسابی مجموعے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو کر ابھری۔ تحریک کے مغربی تجزیہ نگار باقاعدگی کے ساتھ جن باتوں کی غلط تعبیر کرتے چلے آ رہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تنظیم کو اپنی مقبولیت، یا حمایتی، بلکہ رضا کار بھی، جو اس کی صفوں میں شامل ہوتے چلے آ رہے ہیں، اس لیے حاصل نہیں ہوئے کیونکہ یہ دنیا کو دہشت گردی کے ذریعے مرعوب کرنے کے لیے ایک "اختراع" تھی، اگرچہ اس کے منہ پر غازہ مل دیا گیا تھا[1]۔ اس کے برعکس تنظیم جن چیزوں کی نمائندگی کرتی تھی، وہ فلسطینیوں کے ایک عمومی اتفاق رائے (اجماع) (جہاں تک فلسطینی تاریخ اور امنگوں کا تعلق ہے،

---

[1] یہ بات اخبارات پر صادق آتی ہے لیکن فلسطین کے متعلق امریکہ میں جو معیاری یا نیم سرکاری مطبوعات شائع ہوتی ہیں، ان میں بھی ان انسانی عناصر کا، جو تنظیم کے لیے حمایت اکٹھی کرتے ہیں، خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔ تفصیل کے لیے کوانٹ، جبارا اور اس کے ساتھیوں کی مرتب کتاب "فلسطینی قوم پرستی کی سیاست" مطبوعہ کیلیفورنیا پریس، برکلے کا مطالعہ فرمائیں۔

فلسطینی اتفاق رائے سے ان کے بارے میں بہت حساس ہیں) کار بروئے کار آتا ہے اگر تنظیم آزادیٔ فلسطین اپنی مجموعی کارکردگی کے اعتبار سے بعض اوقات افراتفری اور بدنظمی کا شکار نظر آتی ہے تو اس کی جزوی وجہ بھی یہ ہے کہ اسے مختلف الخیال فلسطینیوں کو جبری طور پر اپنے ساتھ ملا لینے کا غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین کے اندر جو مختلف دھڑے بندیاں ـــــــ پاپولر فرنٹ، ڈیموکریٹک فرنٹ اور دوسرے گروپ ـــــــ موجود ہیں، وہ یقیناً خیالات کے فلسطینی (نیز دوسرے عرب) دھاروں سے متاثر ہوئے اور اپنی باری پر خود انہوں نے دوسروں کو متاثر کیا۔ لیکن جہاں تک خود تنظیم کا تعلق ہے، اس کا عمیق اور دیرپا جواز مستقل طور پر اپنی جگہ قائم رہا اور کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اسے ایک ناجائز جماعت قرار دے سکے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ۱۹۷۴ء کے بعد اس کی حمایت اور بھی مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی۔

اس کی جو بھی وجوہ ہوں، انہیں آسان بنا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اقدار، خیالات، کھلے عام بحث مباحثوں اور انقلابی ابتکاری (INNOVATIVE) کے عناصر جس وافر مقدار میں تنظیم آزادیٔ فلسطین میں موجود ہیں، میں ذاتی طور پر ان سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہ وہ غیر مرئی انسانی اثاثے ہیں جن کا کردار اس کردار سے کہیں زیادہ ہے جو ایک عام جنگجو پارٹی ادا کر پاتی ہے ایک عام جنگجو پارٹی کے ارکان میں اپنے پارٹی کے ساتھ وہ وفاداری نہیں ہوتی جو تنظیم کے ارکان میں تنظیم کے ساتھ ہے اور اس کی وجہ بھی انہی غیر مرئی انسانی اثاثوں کا اتنی وافر مقدار میں موجود ہونا ہے۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین کے اندر جس فلسطینی نوکر شاہی (بیوروکریسی) نے فروغ پایا ہے، وہ بھی ان غیر مرئی انسانی اثاثوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ ذرا غور فرمائیں کہ اس بات کو کوئی زیادہ مدت نہیں گزری بلکہ یوں کہیں کہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر تک فلسطینی اپنی زندگیاں کامل طور پر اس ڈھانچے کے اندر گزار رہے تھے جو عرب ملکوں نے ان کے لیے مرتب کیا تھا۔ دس سال کے اندر اندر فلسطینی تنظیموں کا حیرت انگیز حد تک

فعال جھرمٹ وجود میں آگیا اور ایک لحاظ سے یہ سبھی کی سبھی، تنظیم آزادیٔ فلسطین کے، جو اتفاقِ رائے کے معاملے میں بہت حساس ہے، زیرِ انتظام مصروفِ عمل تھیں۔ بیشمار طلبا تنظیمیں، خواتین کے ادارے، محنت کشوں کی انجمنیں، درسگاہیں، فوجی تنظیموں کے سابق ارکان کی دیکھ بھال کرنے اور انہیں امداد بہم پہنچانے کے پیچیدہ پروگرام، طبی مراکز۔ رسد پہنچانے کا پورا انتظام موجود ہے۔ یہ فہرست مکمل نہیں ہے بلکہ اس میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ جوں جوں فلسطینیوں کی زیادہ سے زیادہ ضروریات پر توجہ دی جانے لگی ہے، ان تنظیموں اور پروگراموں کو بہتر سے بہتر بنایا جا رہا ہے قصہ مختصر یہ کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کا کردار یہ ہے کہ وہ فلسطینیوں کی اس انداز سے نمائندگی کرتی ہے کہ کوئی دوسری تنظیم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ (یہاں بھی تنظیم آناً فاناً ہر فلسطینی کے لیے، خواہ وہ کہیں بھی ہو، اپنی صفوں میں جگہ بنا لیتی ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے) اس کا دوسرا کام یہ ہے کہ اپنی پالیسیوں یا اپنی قیادت کی تمام خامیوں کے باوجود فلسطینی مقاصد کو زندہ رکھا جائے اور یہ مقاصد عبوری تنظیموں یا پالیسیوں سے کہیں عظیم تر ہیں۔

یہاں دو اور عناصر کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اس حد تک زیرِ بحث نہیں لایا گیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ فلسطین کے بڑے بڑے رہنماؤں نے فلسطین کے (انسانی اور دیگر) وسائل کی عام طور پر نہایت کامیابی کے ساتھ نگہداشت بھی کی اور ان کا نہایت احسن لیکن کفایت شعارانہ انداز سے انتظام بھی کیا۔ ان سب رہنماؤں کے شیخ یا سرخیل یاسر عرفات ہیں۔ یاسر عرفات ایک ایسی سیاسی شخصیت ہیں جنہیں اکثر اوقات غلط سمجھا گیا اور ان کی ذات پر خواہ مخواہ کیچڑ اچھالا گیا۔ میرے خیال میں یاسر عرفات کے متعلق یہ کہنا بدتمیزی یا گستاخی نہیں ہو گا کہ وہ پہلے فلسطینی قائد ہیں جنہوں نے دو مکمل طور پر انتہائی ضروری کام سرانجام دیئے:

(۱) انہوں نے ان تمام بڑے بڑے عناصر کا، جو فلسطینی کو کہیں بھی متاثر کرتے ہیں

(مثلاً فلسطینیوں کے باہمی مسائل، عرب اور علاقائی امور، بین الاقوامی حالات و واقعات وغیرہ)، بڑی ذہانت کے ساتھ ادراک کیا ہے۔

(۲) انہوں نے فلسطینی زندگی کی جزئیات پر بھی انتہائی حیرت انگیز عبور حاصل کیا ہے یہی وہ باتیں ہیں جنہوں نے انہیں اتنی مہارت کے ساتھ اتنے طویل عرصے تک مرکزی مقام سنبھالنے میں مدد دی ہے۔ برطانوی انتداب کے زمانے میں ایک قسم کی قیادت موجود تو تھی لیکن یہ عوام الناس کے دلوں میں گھر نہیں کر سکی تھی کیونکہ اس قیادت کی جڑیں عوام میں نہیں تھیں اور یہ بس چند اشخاص کے مابین گھومتی رہتی تھی۔ اور غالباً جس چیز نے اس کے مؤثر ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ کھڑی کی، وہ یہ تھی کہ جو کچھ یہ کرتی تھی، اس کے لیے اسے نہ تو عام حمایت حاصل تھی اور نہ مرکزی طبقوں کی۔ چنانچہ یہ کوئی نیم سرکاری ذمے داری بھی نہیں سنبھال سکتی تھی۔ لیکن جہاں پرانی قیادت ناکام رہی وہاں عرفات اور الفتح نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ انہوں نے یہ کام جزئیات پر توجہ دے کر اور کل کے بارے میں حساس رویے کا مظاہرہ کر کے سر انجام دیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے کبھی اس بات کا عندیہ تک نہیں دیا کہ وہ اپنے رویے میں مستبد یا متلون مزاج ہیں۔ دوسرا عنصر جس سے تجزیاتی طور پر نپٹنا بہت مشکل ہے، سرمایہ ہے، میں اس کا ذرا مختصر سا ذکر کرتا ہوں۔

فلسطینیوں نے ایک مالی ادارہ، فلسطینی قومی فنڈ کے نام سے قائم کر رکھا ہے۔ جلا وطن فلسطینی اس ادارے کو باقاعدہ چندہ بھیجتے ہیں۔ تمام فلسطینی اداروں (بشمول تنظیم آزادی فلسطین) کی طرح یہ فنڈ بھی فلسطینی نیشنل کونسل (جو پارلیمانی یا قانون ساز ادارے کا فریضہ سر انجام دیتی ہے) کے سامنے جواب دہ ہے۔ نیشنل کونسل عمومی پالیسی طے کرتی ہے۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری تنظیم آزادی فلسطین اور اس کے مختلف ذیلی اداروں پر عائد ہوتی ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ فلسطینی بجٹ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ تقریباً

دس لاکھ باشندوں کو خدمات اور رسد بہم پہنچانے، ان کی تربیت کرنے اور انہیں اسلحہ مہیا کرنے پر جو رقوم صرف ہوتی ہیں، وہ اس (بجٹ) کی بدولت نہایت احسن اور مؤثر طریقے سے مہیا ہو جاتی ہیں۔ کچھ سرمایہ تو ان رقوم کی وجہ سے مہیا ہو جاتا ہے جو فلسطینی باشندے رضاکارانہ طور پر دیتے ہیں، تاہم اس سرمائے میں اضافہ اس امداد سے، جو ہر سال گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، ہو جاتا ہے، جو مختلف عرب ممالک بشمول سعودی عرب، کویت اور تیل کی دولت سے مالامال عرب ریاستیں، فراہم کرتی ہیں۔ مزید برآں، شام اور مصر کو اس امداد کی بنا پر جو یہ ممالک فراہم کرتے ہیں، فلسطینیوں کے معاملات میں اچھا خاصا دخل حاصل ہے۔ ویسے یہ دونوں ممالک جو امداد دیتے ہیں، وہ مادی اعتبار سے تو کوئی زیادہ نہیں ہوتی لیکن انہیں عرب ممالک میں جو اہمیت اور وقار حاصل ہے، اس سے یہ ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں اور یوں ان کی حمایت فلسطینیوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ خیر، ان تمام باتوں میں جو اصل نکتہ ہے، وہ یہ ہے کہ فلسطینیوں نے جس طرح تعلیمی میدان میں قابلِ قدر ترقی کی ہے، اسی طرح ان کی مالی پوزیشن اس دعوے کی تکذیب کرتی ہے کہ وہ علاقائی یا سیاسی اعتبار سے کسی خاص گھاٹے میں ہیں۔ تیسری دنیا کی عوامی تحریکوں کا یہ جو کلاسیکی تجربہ کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی مسلسل لاتعلقی[۵] اور غربت کو اپنا اصل اثاثہ بنا لیتی ہیں اور انہیں متواتر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں، یہاں دم توڑ دیتا ہے۔ بے شک فلسطینی آبادی کا ایک خاصا بڑا حصہ ابھی تک مفلوک الحال ہے۔ لیکن ایک بہت بڑی اقلیت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو تعلیم یافتہ ہیں اور انہیں ہر قسم کے وسائل پر دسترس حاصل ہے۔ یہ تناقض مسائل کو شدید ڈرامائی شکل دے دیتا ہے۔ چند مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

اوّل: سماجی آدرشوں اور اداروں کے مابین، جو اپنی فطرت کے اعتبار سے کم و بیش

---

[۵] تیسری دنیا کے عوام، جو غربت کی چکی میں پس رہے ہیں، عام طور پر حکومت اور مملکت کے مسائل و امور میں کم ہی دخل دیتے ہیں۔

قدامت پسند ہیں، کشمکش جاری ہے

دوم: اس بات کا واضح امکان موجود ہے کہ عرب ممالک اپنے سیاسی امور طے کرنے کے لیے جن روایات کی پاسداری کرتے ہیں وہ کھلم کھلا ان ترقی پسند سرد سے گتھم گتھا ہو جائیں گی جو اکثر فلسطینیوں کو تحریک دیتی ہیں۔

سوم: اس بات کے آثار دکھائی دے رہے ہیں کہ فلسطینی بورژوا[1] ذہنیت اختیار کریں اور یہ بات بڑی خطرناک ہوگی۔ تاہم اس بارے میں یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فلسطینیوں کے مابین یہ صحت مند طریقے سے طبقاتی کشمکش کا موجب بن جائے گی اور بتدریج اس کشمکش میں اس حد تک اضافہ ہو جائے گا کہ انجام کار یہ محنت کش طبقے کی فتح پر منتج ہو۔ یوں یہ انقلاب کے لیے بہت اچھی صورت ہوگی۔

تاہم یہ استدلال سارے اہم معاملے کے اس پہلو سے کنی کترا جاتا ہے کہ جلاوطنی کے دوران میں باہمی طور پر ہلاکت آفرین کشمکش کا مطلب کیا ہے۔ جب تک فلسطینی قومی حق خود ارادیت کے حصول کی تلاش میں سرگرداں ہیں، ہر وہ چیز جو اس تلاش کا رخ کسی اور طرف پھیر دے گی منفعت بخش ہونے کے بجائے غالباً نقصان رساں زیادہ ہوگی۔ دوسری طرف فلسطینی تلاش کی یہ جو قدامت پسندانہ تعبیر کی جاتی ہے، کہ ہم سب اسی حالت کی طرف لوٹ سکیں گے، جس کا ۱۹۴۸ء میں چلن تھا، ہمیں ہماری

---

[1] عام معنوں میں ملک کا درمیانہ طبقہ بورژوا طبقہ کہلاتا ہے تاہم مارکس کے نظریات کے مطابق املاک اور سرمائے کے مالک بورژوا طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ طبقہ محنت کشوں (پرولتاری طبقہ) کے طبقے کا مخالف طبقہ ٹھہرا۔ اس طبقے کا قلع قمع کرنے کے بعد ہی کسی ملک میں پرولتاری حکومت قائم ہو سکتی ہے۔

املاک مل جائیں گی، ہمارا ملک پھر سے ایک عرب ملک بن جائے گا اور غالباً ہم پر حکومت بھی مستبد اور جابر عرب حکمرانوں کی قائم ہو جائے گی، تو یہ تعبیر بھی تاریخی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے ناقابل قبول ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ فلسطینی صرف انہی چیزوں کی تلاش میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ان کے منہ پر چپت مار رہے ہیں اور انھوں نے جو خواب دیکھا تھا، اسے آپ جھٹلا رہے ہیں حالانکہ یہ وہی خواب ہے جس نے ملک ملک کے انسانوں کو، جو ناانصافی کے نخچیر ہیں، اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور انہیں امید کی کرن دکھائی ہے۔ تاہم ناخوشگوار صداقت یہی ہے کہ جلاوطنی کے دوران میں جب املاک اور کامرانیوں کے انبار لگ جاتے ہیں، تو انسانوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی واقع ہونے لگتی ہے اور مستقبل کے بارے میں ان کے تصورات پر رجعت قہقری کی چھاپ گہری ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ مسئلہ یہ ہے کہ عرب فقید المثال دولت (اور ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو انہیں یہ دولت ناگزیر طور پر ملنا ہی تھی) کے جس دور میں سے گزر رہے ہیں، ہمیں اس کی افادیت کو تسلیم کر لینا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ یہ دولت اپنے ہمراہ جو ممکنہ بدعنوانیاں لے کر آتی ہے، ہم ان کے دام فریب میں نہ آئیں۔

نقطۂ نظر یا مقصد اگر انتہا پسندانہ ہو، تو وہ جلاوطنوں کا شیرازہ بکھیر سکتا ہے، قوم میں تقطیب[۵۱] پیدا کر سکتا ہے اور یوں اسے مفلوج بنا سکتا ہے۔ تاہم فلسطینیوں نے ان انتہا پسندیوں کا مداوا اپنے داخلی رشتوں میں ڈھونڈ لیا ہے

---

۵۱ تقطیب (polarization) جب دو فریقین کا نقطۂ نظر اور مؤقف ایک دوسرے کے بالکل معکوس ہو اور ان میں سمجھوتے کا کوئی امکان نہ ہو، تو اس صورت حال کو تقطیب کہا جائے گا۔

اور انہی داخلی رشتوں نے انہیں متحد کر رکھا ہے۔ انتہائی طور پر کامیاب جو
بورژوازیوں پر بھی جلاوطنی اثر انداز ہوتی ہے اور ہمیں اس اثر اندازی کی اہمیت
کو کبھی کم سے کم بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ مزید برآں، ۱۹۴۷ء کے بعد کی ٹھوس
تاریخ نے (فلسطینی) قوم کی اتنے ہی مؤثر انداز سے شیرازہ بندی کر رکھی ہے جتنی
کہ اس صدی کے اوائل سے اس میں (کم از کم روحانی طور پر) موجود تھی۔ ۱۹۶۷ء
کی تباہ کن شکست کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو گئی اور اس سے نظریں چرائی نہیں
جاسکتیں کہ عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ اپنے تنازعے کو فوجی طور پر طے نہیں کر سکتے۔
چنانچہ اب سیاسی تصفیے پر خصوصی زور دیا جانے لگا۔ اس خطے میں امریکی اثر و
رسوخ کا جو ڈرامائی احیا ہوا ہے، اس کی جزوی وجہ بھی یہی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں اپنے
انتقال سے قبل خود جمال عبدالناصر نے اپنی سوچ میں نظریاتی تبدیلی پیدا کر لی تھی۔
پہلے انکا زور بیان عرب اتحاد اور حصول آزادی کیلیے استعمار کیخلاف جدوجہد پر صرف ہوتا تھا۔ اب وہ
امریکہ کیساتھ سیاسی مصالحت کی گنجائش نکالنے خطے کی ہر مملکت کی سالمیت کا احترام کرنے اور محدود سیاسی
مقاصد کے حصول کی باتیں کرنے لگے۔ یہ تمام باتیں اس چیز کا عندیہ دیتی تھیں کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کیلیے
(ذہنی طور پر) تیار ہو گئے تھے (حالانکہ ایک زمانے میں وہ اسرائیل کو تسلیم کرنے سے سختی سے انکار کرتے تھے)
پالیسی میں اس تبدیلی کے جو اثرات فلسطینیوں پر مرتب ہوئے، ان میں ۷۱-۱۹۷۰ء کا اردنی اور ۷۶-
۱۹۷۵ء کا لبنانی بحران شامل ہے۔

میرے خیال کیمطابق یہ کہنا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا، کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگا کہ دونوں بحران
جن میں بے شمار انسانی جانوں کا اتلاف ہوا، ناگزیر تھے، لیکن جسطرح یہ بحران خود ناگزیر تھے۔ ان کا یہ ناگزیر
نتیجہ، جو بظاہر متناقض نظر آتا ہے، نکلا کہ تنظیم آزادی فلسطین کے اختیار اور وقار میں بہت اضافہ
۱۹۷۴ء میں مراکش کے شہر رباط میں اسلامی ممالک کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے ایک
فیصلے کی رو سے تنظیم آزادی فلسطین کو فلسطینی عوام کی واحد

جائز نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا گیا۔ حقیقتاً کانفرنس کا یہ فیصلہ اس تصادم کا رہین منت تھا جو ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء میں فلسطینیوں اور اردنیوں کے مابین ہوا تھا۔ پھر لبنان میں جو آتش عظیم بھڑکی، اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فلسطینی قوم کے تمام گروہ (جس میں وہ گروہ بھی شامل ہیں جو اسرائیل اور مقبوضہ علاقوں میں مقیم ہیں) تنظیم آزادی فلسطین کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ چنانچہ جس بات کی توقع تھی وہی ہو کر رہی، اردن اور لبنان دونوں ممالک میں ـــــــ مخصوص حالات خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ تھے ـــــــ فلسطینیوں کو اس لئے حملوں کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ اپنے وطن سے باہر دوسرے ممالک میں قیام پذیر تھے۔ اور یوں دونوں ممالک میں مختلف انداز سے فلسطینیوں کی امنگوں کی، جو محدود ہی سہی، تصدیق ہو گئی۔ ایک مرتبہ پھر ہمیں اس شدید ضرورت کا احساس ہونے لگتا ہے کہ فلسطینی شناخت کی کوئی قابل عمل اور کام چلاؤ تعریف ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہمیں ہی اس شدید ضرورت اور سرعت سے تبدیل ہونے والے سیاسی حقائق کے متعلق فلسطینیوں کے ردِ عمل کا بھی اندازہ ہونے لگتا ہے۔

اردن اور لبنان میں جو دو عظیم بحران رونما ہوئے تھے ان کے مابین ۱۹۷۳ء کی جنگ آ گئی۔ گویا کہ سیاسی مصالحت کے تصور کو شدید بنانے کا یہ اسکا اپنا انداز تھا حالانکہ دو سال قبل راجرز منصوبہ اور جارنگ (JARRING) مشن [۵] دونوں بہت بری طرح ناکام رہے تھے۔ صدر سادات نے واضح اور شامیوں اور اردنیوں نے ذرا کم واضح انداز سے جو کچھ ۱۹۷۱ء میں پیش کیا تھا، وہ وہی کچھ تھا جو صدر سادات نے ۱۹۷۳ء میں پیش کیا تھا۔ پھر ۱۹۷۷ء میں

---

[۵] اقوام متحدہ نے سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سویڈن کے سفیر گنار جارنگ کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا۔ لیکن کئی سالوں کی کوشش کے باوجود ان کا مشن کامیاب نہ ہو سکا اور یوں اسے ختم کرنا پڑا۔

جب صدر سادات نے بیت المقدس کا دورہ کیا تھا تو وہ وہاں بھی یہی کچھ پیش کرتے نظر آتے تھے۔ ان تمام پیش کشوں کا لب لباب یہ تھا کہ عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ صلح کریں گے بشرطیکہ اسرائیل مقبوضہ علاقوں کو کسی اگر مگر کے بغیر مکمل طور پر خالی کر دے اور وہاں ایک فلسطینی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے۔ خاصی بڑی حد تک خود فلسطینیوں کا موقف بھی اس پیشکش کے مطابق ہو چکا تھا۔ فلسطینیوں کی قومی کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۹۷۴ء اور اس سے بھی زیادہ مثبت طور پر اپنے اجلاس منعقدہ ۱۹۷۷ء میں اس عزم کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ ایک فلسطینی ریاست کے قیام کے حق میں ہے (اگرچہ ایک مختصر اقلیت بڑے جذباتی انداز سے یہ استدلال کر رہی تھی کہ فلسطینیوں کو سارے فلسطین کو آزاد کرانے کی جد و جہد جاری رکھنا چاہیے)۔ میرے خیال میں انجام کار تنظیم آزادیٔ فلسطین کو جس چیز نے متاثر کیا، وہ اس کے درمیانہ قوم پرستانہ رویے کی تائید و حمایت کرنیوالوں کا ایک نیا اور مضبوط گڑھ تھا جو غزہ اور مغربی کنارے پر مشتمل تھا۔ یہاں کے باشندوں نے اسرائیل کی جابرانہ حکمرانی کے تقریباً دس سال بعد ۱۹۷۶ء کے میونسپل انتخابات میں بڑی واضح اکثریت سے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو اپنی نمائندہ جماعت قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ اندرونِ اسرائیل فلسطینیوں نے بھی تقریباً اسی انداز سے تنظیم آزادیٔ فلسطین کا خیر مقدم کیا تھا۔ (اپنی کشمکش کی تاریخ کے عین مطابق) انہوں نے اس مقصد کے لیے "یوم الارض" کا انتخاب کیا جو تیس مارچ ۱۹۷۶ء کو منایا گیا۔ چنانچہ اسوقت سے لیکر اب تک وہ فلسطینی تنظیم (آزادیٔ فلسطین) کی حمایت میں درجنوں اعلانات اور مظاہرے کر چکے ہیں۔ کسی فلسطینی سیاسی جماعت کو نہ تو کبھی اتنا مرکزی مقام حاصل ہوا ہے اور نہ وہ کبھی اتنی مضبوط دکھائی دی ہے جتنی کہ تنظیم نظر آتی ہے۔ فلسطینی اور تنظیم ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہیں۔
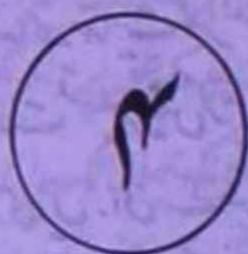
فلسطینی ابھی تک سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں

تاہم فلسطینیوں کی اساسی شکل علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ اور تاریخ نے اس مشکل کے اردگرد اپنی ستم ظریفیوں کا سنگین حصار نہ صرف مستحکم تر بنا دیا ہے بلکہ ان ستم ظریفیوں کا انبار بھی لگا دیا ہے۔ میں بار بار اس بات کی تکرار کرتا چلا آیا ہوں کہ مقدر نے فلسطینی کو عجیب و غریب نوعیت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا ہے اور یہ بات تکلیف دہ حد تک کبھی بھی اتنی درست نہیں تھی جتنی کہ اس وقت ہے۔ جس زمانے میں صہیونیت فلسطین کے استعماری تصفیے میں مصروف تھی، اسے وہاں اپنی موجودگی کی سزا مل رہی تھی اور اب جب کہ اسے وہاں سے نکالا جا چکا ہے، وہ فلسطین سے اپنی عدم موجودگی کی سزا بھگت رہا ہے وہ لوگ جو فلسطین چھوڑ گئے ہیں، آوارہ وطن ہیں، صحیح معنوں میں ان کی نہ کوئی قوم ہے اور نہ ان کا کوئی علاقہ ہے۔ وہ لوگ جو اسرائیل میں موجود ہیں، وہ ستم گزیدہ ہی نہیں، لاشے بھی بن چکے ہیں۔ ان دونوں ہی حیثیتوں سے انہیں مشرق وسطیٰ کا

مرکزی یا بطونی نکتہ تصور کیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ میں ایک سو سے زائد اقوام نے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو فلسطینیوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرلیا۔ تاہم وہ اقوام جن کا فلسطینیوں کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہے، نہ صرف یہ کہ وہ تنظیم کو فلسطینیوں کی نمائندہ جماعت تسلیم نہیں کرتیں، بلکہ وہ تو فلسطینیوں کی شناخت ہی کو ماننے سے انکاری ہیں۔ ان کے خیال میں اس قسم کی کوئی چیز موجود نہیں۔ جب ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ فلسطینیوں کی بنیادی قومی اور جائز شناخت کا اقرار تک نہیں کیا جاتا حالانکہ بین الاقوامی طور پر ہر معاشرے کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اسکی ایک شناخت ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ عالم ہے کہ فلسطینی شہرت و نمود، کامیابی اور ترقی و نمو کی جس سطح پر جو ہر شخص کو نظر آرہی ہے، زندگی گزار رہے ہیں، وہ انہیں تاریخ میں کبھی حاصل نہیں رہی اسکے علاوہ تنظیم آزادی فلسطین کے ذریعے سیاسی طور پر ان کا اپنے ہموطنوں سے جو اتحاد ہوا ہے، وہ اس سے پہلے کبھی اتنا نہیں ہوا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ آبادی کے اعتبار سے بھی اور جغرافیائی طور پر بھی، جس طرح تتر بتر ہوئے ہیں اور اس طرح تتر بتر ہونے کی وجہ سے جو رکاوٹ پیدا ہوئی ہے، اس کو عبور کرنا شدید طور پر کبھی اتنا مشکل نظر نہیں آیا جتنا کہ اب نظر آرہا ہے۔

لیکن جن تناقضات اور ستم ظریفیوں نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے، وہ بھی کم سنگین نہیں۔ غور فرمائیں کہ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی جنگوں کے بعد عرب دنیا اسرائیل کے ساتھ امن چین سے رہنے کے تصور کے قریب آتی جارہی ہے لیکن اسی دوران میں عربوں نے جو ایک دوسرے کا کشت و خون کیا ہے، اتنا اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ فلسطینی مقصد کو ہر عرب حکومت کی ترجیحات میں بلند ترین مقام حاصل ہے لیکن انہی عرب حکومتوں کے ہاتھوں جن فلسطینیوں

کا خون ہوا ہے، ان کی تعداد خوفناک حد تک زیادہ ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اس علاقے میں دونوں عظیم طاقتوں (سپر پاورز) کے مابین مساوات موجود ہے۔ کم از کم یہ مساوات اس حد تک ضرور موجود ہے کہ اس کے بل بوتے پر دنیا میں امن قائم ہے۔ مثال کے طور پر، امریکہ اور سوویت یونین امن کانفرنس کے شریک چیئرمین ہیں حالانکہ جہاں تک اس علاقے میں اسلحہ کی فراہمی کا تعلق ہے، مؤخر الذکر صرف اتنے ہتھیار بہم پہنچاتا ہے جن سے وصول کنندہ کی ضروریات بمشکل پوری ہو سکتی ہیں لیکن جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں پوری طرح چھایا ہوا ہے اور کوئی اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ کل عالم کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ فلسطینیوں کو امن کی کارروائی میں شریک کیا جانا چاہیے، لیکن اگر آپ کسی ایسے فلسطینی کی تلاش میں ہوں، جسے اس قسم کی کارروائیوں میں شریک کیا گیا ہو، آپ لاکھ کوشش کریں، آپ کو ایک شخص (فلسطینی) بھی ایسا نہیں ملے گا۔ اس کے بجائے آپ کیا دیکھیں گے کہ مصری، امریکی، اسرائیلی یا دوسری قوموں کے رہنما فلسطینیوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہی لوگ ان (فلسطینیوں) کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں اور وہی انہیں بتاتے ہیں کہ بین الاقوامی امور میں انہیں کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطری طور پر فلسطینیوں کیلئے تمام در وا ہیں لیکن عملاً ایک بھی نہیں۔ اس تضاد کی ایک ٹھوس مثال دیکھنا ہو تو پھر ہمیں فلسطینیوں اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں امریکہ کے عمومی اور حالیہ ردعمل پر غور کرنا ہوگا۔

۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں صحرائے سینا کے متعلق جو معاہدے[۱] طے ہوئے

---

[۱] یہ معاہدے امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی کوششوں سے اسرائیل اور مصر کے مابین طے پائے تھے۔ ان معاہدوں کی رو سے اسرائیل نے صحرائے سینا کا بیشتر حصہ خالی کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے معاوضے میں مصر نے کئی سیاسی مراعات دینے کا وعدہ کیا ہے۔

ان کے بعد کے مہینوں کے دوران میں امریکہ کے اس وقت کے (یہودی) وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے جو پالیسی وضع کی، اس میں زور اس بات پر دیا جاتا تھا کہ تمام فریقوں کو آپس میں گفتگو کرنا چاہیے اور مختلف امور کو نپٹانے کے لیے تدریجی طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ عرب اتحاد کی عظیم، لیکن اکثر و بیشتر التباسی، تعمیرات کو تو دیمک کی طرح چاٹ گئی لیکن ناعاقبت اندیشانہ انداز سے ان رکاوٹوں کو، جنہوں نے علاقے کی مملکتوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کر رکھا ہے اور جنہیں نہایت اہتمام کے ساتھ برقرار رکھا جاتا ہے، علیٰ حالہٖ قائم رکھنے پر توجہ مرکوز کر دی۔

شاید ہی کوئی تبصرہ نگار ایسا ہوگا جس نے اس بات کی طرف دھیان دیا ہو گا کہ اس علاقے کے متعلق امریکی سوچ بچار جس نہج پر کام کر رہی ہے اور جس کا انکشاف اسرائیل، مصر اور شام کے مابین ۱۹۷۵ء کے عبوری معاہدوں میں ہوا تھا، اس کا رخ نہ تو ماضی کی طرف ہے اور نہ مستقبل کی طرف بلکہ سارا زور محض اس بات پر دیا جاتا ہے کہ صرف زمانۂ حال کے متعلق غور و فکر کیا جانا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ امریکی پالیسی صرف موجودہ صورتِ حال (STATUS QUO) کو برقرار رکھنا چاہتی ہے (حالانکہ تاریخ اس بات کی نفی کرتی ہے۔ جس کسی نے بھی اور جہاں بھی صورتِ حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی کوشش کی یا کوشش کی گئی، سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا) امریکی پالیسی کے اس میلان کا، جس کا نقطۂ عروج کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ تھا، نچوڑ یہ ہے کہ اس نے سیاسی توجہ اور اہمیت کی اکائی سکیڑ دی۔ بجائے اس کے کہ معاملات کا جائزہ ان کی حرکی کلیت میں رکھ کر لیا جاتا، امریکہ نے علاقے کی حکومتوں کی کچھ اس طرح حوصلہ افزائی کی کہ وہ معاملات پر اپنی علیحدہ علیحدہ حیثیت سے ہی غور کریں اور اس سے آگے

ایک قدم بھی نہ بڑھائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف امور میں جو تسلسل پایا جاتا ہے اور انسانی زندگی میں جو التصاق[1] موجود ہوتا ہے، وہ اچانک ختم ہو گیا۔ مختلف ممالک کے مابین، ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے والے مختلف فرقوں اور طبقوں کے مابین جو تعلقات ہوتے ہیں اور اسی طرح زمانۂ حال کے مسائل کا ماضی اور مستقبل کے مسائل کے ساتھ جو رشتہ ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو باطل اور کالعدم قرار دے دیا گیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ اصل بات جسے اہمیت دی گئی تھی وہ بس یہ تھی کہ ہنری کسنجر کی طرح کی کوئی گشتی امریکی شخصیت، جسے مختلف فریقوں اور گروہوں کے مابین سمجھوتے کرانے میں مہارت حاصل ہو، آئے گی اور "سمجھوتوں" کو ایک لڑی میں پرو دے گی۔ مختلف ملکوں، قوموں اور اداروں کے مابین بیچ بچاؤ کرانے اور ثالثی کے فرائض سرانجام دینے کا فریضہ امریکہ نے خود سنبھال لیا۔ مختلف ممالک اور اقوام کے مابین جو علاقائی تعاون ہونا چاہیئے، اس کو نظرانداز کر دیا گیا اور اس کی جگہ امریکہ نے اپنے مفادات کو آگے کر دیا اور یوں اپنے نقطۂ نظر کو دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرنے لگا۔

چنانچہ آج کل کے مشرق وسطیٰ میں مشترکہ مفادات کے متعلق جو رویہ اختیار کیا جا رہا ہے، اس کے مطابق ان مفادات کو ایک وسیع تر مربوط تناظر میں رکھ کر نہیں دیکھا جاتا (کہ علاقے کے تمام ممالک کی بھلائی کس بات میں ہے) بلکہ زیادہ زور محدود نوعیت کے دو طرفہ تعلقات پر دیا جانے لگا ہے اور یہ دو طرفہ تعلقات بھی اقلیتوں ـــــ اقلیتی حکومتوں، اقلیتوں کے چھوٹے چھوٹے طبقوں اور گروہوں ـــــ کو ایک دوسرے کا اتحادی بنانے کے لیے استوار کیے یا کرائے جاتے

---

[1] التصاق (Coherence) : ہم آہنگی: مختلف اجزاء کو سلیقے کے ساتھ یا منطقی انداز سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے یا منسلک کرنے کا عمل تاکہ ایک مکمل چیز وجود میں آ سکے۔

ہیں تاکہ وہ اپنی بقا کا بندوبست کرسکیں۔ وہی طریقے، جو کسی زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ نے اپنائے تھے، دوبارہ مروّج کئے جا رہے ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اس سارے عمل میں صرف فلسطینیوں کو، جن کی حیثیت عام معنوں میں اب ایک قوم کی نہیں رہی اور اس لیے وہ دوسروں سے بہت مختلف نظر آتے ہیں، باہر رکھے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یوں فلسطینی باشندوں کو بار بار اپنی جلاوطنی کی سزا بھگتنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ لبنان جس مخمصے میں گرفتار ہے اور جس کا کوئی حل بھی نظر نہیں آتا، وہ اصل میں فلسطینیوں ہی کی قابلِ رحم حالت کی ایک ٹھوس شکل ہے۔ چونکہ انہیں (فلسطینیوں) مختلف علاقوں اور ممالک میں منتشر کیا جا چکا ہے اور ان کے پاس کوئی ایسا خطۂ زمین بھی نہیں، جسے وہ اپنا کہہ سکیں، چنانچہ اس علاقے کے تمام ممالک ان کی بقا کو ایک ایسا مسئلہ تصور کرتے ہیں جو خود ان کی اپنی بقا کو متاثر کرتا ہے اور یوں ان کے لئے صورتِ حال کو سنگین تر بنا دیتا ہے۔

یہ بتانے کے لیے کہ فلسطینی کہاں پر موجود ہے اور یہ کہ اس کی بقا کا مسئلہ کیسے ترتیب دیا جا سکتا ہے، جو تصوری[1] الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں (بلکہ وہ الفاظ بھی جو اس کی ذات اور شخصیت کا ذکر کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں) وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک ایسا مستعد، کارگر لیکن فتوری[2] نظام موجود ہے

۱؎ تصوری (Conceptual) جس کا تعلق کسی چیز کے ذہن میں تصور باندھنے یا خاکہ بنانے سے ہو۔

۲؎ فتوری (aphasic) یہ لفظ (aphasia) سے نکلا ہے۔ بعض اوقات انسان کا دماغ چوٹ لگنے سے یا کسی دوسری وجہ کی بنا پر اس حد تک ضعف کا شکار ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے خیالات صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتا یا کر پاتا بھی ہے تو صرف جزوی طور پر۔ یہاں "فتور" سے یہ مراد ہے کہ صیہونی اور ان کے حمایتی جان بوجھ کر الفاظ کو غلط معانی پہناتے ہیں یا انہیں غلط بنا کر پیش کرتے ہیں۔

جس کے ذریعے اس کی موجودگی کو یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ موجودگی موجودگی نہیں
رہتی بلکہ موجودگی کی محض ایک علامت بن جاتی ہے اور پھر اسی نظام کے ذریعے
اس کی ضروریات، اس کی تاریخ، ثقافت اور سیاسی حقیقت کو ایسے الفاظ بنا کر
پیش کیا جاسکتا ہے جنہیں انسان اپنی زبان سے ادا کرنے میں شرم محسوس کرے
اور وہ یہ سمجھے کہ یہ تو بڑے غلیظ الفاظ ہیں۔ مغرب میں فلسطینیوں کو نہایت عجلت
سے دہشت گردی کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے اور اس معاملے میں اسرائیل
اس بات کا پورا اہتمام کرتا ہے کہ وہ اور دہشت گردی لازم وملزوم نظر آئیں فلسطینیوں
کا کوئی بھی فعل خواہ وہ انہوں نے تنگ آمد بجنگ آمد کی کیفیت میں ہی سر انجام
دیا ہو، جب اپنے سیاق وسباق سے محروم کر دیا جائے، تو وہ سنگدلانہ ارادی قتل
نظر آنے لگتا ہے ——— جیسا کہ میرے خیال کے مطابق انفرادی مہم جوئی
کی بے شمار کارروائیاں (طیاروں اور انسانوں کا اغوا، وغیرہ) غیر متوازن، انجام کار
اخلاق سے عاری اور بے منفعت تباہ کاری کے افعال تھے۔ تاہم ہمیں یہ بات
فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل ہی سے
دہشت گردی سے گریز کرتی بلکہ اس کی مذمت کرتی چلی آئی ہے۔ تاہم امریکہ میں
جس چیز کو نہایت رسوا کن اور اہانت آمیز انداز سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور
ذرائع ابلاغ میں جس کا کوئی ذکر اذکار تک نہیں کیا جاتا، وہ یہ ہے کہ ۱۹۷۴ء میں
"معلوت" کے مقام پر جو واقعہ پیش آیا یا ایسے ہی واقعات بعض دوسرے مقامات
پر رونما ہوئے، تو ان واقعات کے معرضِ ظہور میں آنے سے قبل اسرائیل جنوبی لبنان
میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں پر نہایت تسلسل کے ساتھ ہفتوں نیپام[1] بموں کی

---

[1] نیپام بم: ایک قسم کا بم، جو جہاں گرتا ہے، وہاں آگ لگا دیتا ہے۔ یہ بم مختلف قسم کے تیزابوں کی پٹرول کے ساتھ آمیزش کر کے بنائے جاتے ہیں۔

بارش کرتا رہا تھا۔ لعینہ اسرائیل، مغربی کنارے یا غزہ میں مختلف مقامات پر جو بم پھٹتے ہیں، تو کیوں پھٹتے ہیں جو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان علاقوں پر اسرائیل نے ایک طویل مدّت سے فوجی حکومت قائم رکھی ہے اور یہ فوجی حکومت آئے روز فلسطینیوں پر جبر کرتی ہے، انہیں چیرہ دستیوں اور ستم رانیوں کا نشانہ بناتی ہے اور وہ کون سا ظلم ہے، جو وہ ان پر نہیں ڈھاتی۔ ایسے میں فلسطینی بم نہ چلائیں تو اور کیا کریں۔ چنانچہ ان کے ان افعال کو اسرائیلی کارروائیوں کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ صہیونیوں نے عربوں کے خلاف، دوسرے یہودیوں کے خلاف، اقوام متحدہ کے کارندوں کے خلاف اور برطانوی باشندوں کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیوں کے جو ریکارڈ قائم کئے ہیں، فلسطینی تاریخ تو ان کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کر سکتی۔ مزید برآں، عرب ممالک کے داخلی معاملات میں صہیونیوں کے ملوث ہونے کی تازہ ترین مثال لبنان ہے جہاں صہیونیوں نے اپنے مذموم کارروائیوں پر کسی قسم کی پردہ پوشی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی بلکہ کھلے عام بیروت پر بھی چڑھائی کر دی اور جنوبی لبنان پر تو ابھی تک اس کا قبضہ برقرار رہا ہے)، فلسطینیوں پر اسرائیلیوں کے ظلم وستم

۵۱؎ ایران، انڈونیشیا کے صوبے مشرقی تیمور اور بعض دوسرے علاقوں میں جو کچھ ہوا، امریکی اخبارات ان کے متعلق منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ آزادانہ تحقیقات پر مائل نہیں تھے، یا وہ پریشان کن تاریخ کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر سمجھتے تھے اور یا پھر وہ سرکاری پراپیگنڈے پر اکتفا و صدقنا کہنے کے لیے آمادہ تھے۔ "کولمبیا جرنلزم ریویو" کی جلد نمبر ۱۷، شمارہ نمبر ۵ (جنوری، فروری ۱۹۷۹ء) میں ولیم اے ڈورمن اور امیش اومید کا مضمون Reporting the Shah's Way" ملاحظہ فرمائیں۔ اسلام کے متعلق جو غلط بیانیاں شائع ہوتی ہیں، ان کے متعلق ایڈورڈ سعید کے مضمون کا بھی مطالعہ فرمائیں۔ یہ مضمون "نیویارک ٹائمز" میں ۲۹ جنوری ۱۹۷۹ء کو شائع ہوا تھا (مصنف)

WHOSE ISLAM

ڈھانے، مملکت کی رضامندی سے دوسروں کو اذیتیں پہنچانے اور بین الاقوامی قوانین وضوابط کی دھجیاں اڑانے (اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے سے انکار، شہری یعنی غیر فوجی آبادیوں سے سلوک کرنے کے لیے جنیوا کنونشن[لے] کی خلاف ورزیاں، جوہری اسلحہ کی تحدید کے معاہدے[لے] پر دستخط کرنے سے انکار،

لے جینوا کنونشن (یا موافقہ): انیسویں صدی کے دوران میں یورپی ممالک اکثر ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتے تھے۔ جنگ کے دوران میں مریضوں، ضعیفوں، عورتوں اور بچوں کا بھی کوئی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں جینوا کے مقام پر اہم یورپی طاقتوں کا اجلاس ہوا اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر کسی متحارب فریق کی تحویل میں کوئی بیمار یا زخمی دشمن ہے، تو اسے مناسب طبی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ مزید برآں وہ افراد اور ادارے، جو مریضوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، انہیں نا وابستہ فریق تصور کیا جائے گا اور ان کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوگی۔ ان افراد میں ایمبولینسوں اور ہسپتالوں میں کام کرنے والے، صفائی کا عملہ، مذہبی رہنما اور بعض دوسرے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں اس موافقہ پر نظر ثانی کی گئی اور اسے نئے تقاضوں کے مطابق بنایا گیا۔

لے ۱۹۷۱ء میں امریکہ اور روس کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ ایٹمی دھماکے صرف زیر زمین کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دوسرے ممالک پر یہ پابندی لگا دی کہ جن کے پاس ایٹمی ہتھیار نہیں وہ نہ تو یہ ہتھیار بنا سکتے ہیں اور نہ ان کے تجربے کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے فرانس اور چین نے اس معاہدے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ دونوں ممالک مسلسل ایٹمی ہتھیار بنا بھی رہے ہیں اور ان کے تجربے بھی کر رہے ہیں۔ بھارت، اسرائیل اور جنوبی افریقہ معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ بھارت نے ۱۹۷۴ء میں ایٹمی دھماکہ بھی کر دیا تھا۔ تاہم اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے پاس کافی ہتھیار موجود ہیں برازیل اور ارجنٹائن بھی یہ ہتھیار بنا چکے ہیں یا بنا رہے ہیں۔ پاکستان نے بھی اس معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک بھارت دستخط نہیں کرے گا، وہ بھی نہیں کرے گا۔

یورپی ممالک میں عرب باشندوں کا چوری چھپے قتل، اس سلسلے کی چند مثالیں ہیں۔ لیکن بدترین مثال یہ ہے کہ اسرائیلی آئے دن اردن اور لبنان میں فلسطینیوں کے خلاف چڑھائی کرتے رہتے ہیں) کی صیہونیت کی جو طویل تاریخ ہے، اس کے سامنے فلسطینی "دہشت گردی" تو بالکل پھیکی، بے آب بلکہ نااہلی کا شاہکار نظر آتی ہے۔ لیکن میری یہ قطعاً خواہش نہیں کہ صورت اس کے برعکس نظر آئے۔

تو تان یہاں آن کر ٹوٹتی ہے کہ اسرائیل کی نظروں میں فلسطینی یا تو "دہشت گرد" ہے، یا وہ لازماً ایک غیر سیاسی (کیونکہ وہ غیر یہودی ہے) شے ہے جو اسرائیل کے اعداد و شمار میں اضافے کا موجب بنتی رہتی ہے، یا پھر وہ ایک ایسی رعیت کا فرد ہے جو مفید بھی ہے، فرمانبردار بھی ہے اور جسے آسانی سے اپنے ڈھب کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ آج اسرائیل میں وہ لوگ جو محنت مزدوری کرتے ہیں، ان میں اسّی ہزار سے ایک لاکھ تک وہ عرب کارکن شامل ہیں جو غزہ اور مغربی کنارے سے آتے ہیں۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ عرب محض لکڑیاں پھاڑنے اور کنوؤں سے پانی نکالنے والے ہیں۔[1] عام اسرائیلی اپنی روزمرہ کی گفتگو میں جب لفظ "عربی" کو اسم صفت کے طور پر استعمال کرتے ہیں، تو اسے "غلیظ، کور عقل، اور ناداہل" کا مترادف بنا دیتے ہیں۔ اس قسم کے استحصال (جو عملاً نسلی امتیاز کی بنا پر کیا جاتا ہے) کی مرتکب اگر کوئی اور قوم یا ملک ہوتا تو عرب

[1] "MERIP Reports" کی جلد نمبر ۷۴، شمارہ نمبر ۹ (جنوری ۱۹۷۹ء) کے صفحات نمبر ۲۰-۹ پر سارہ گراہم براؤن کا مضمون "The Structural Impact of Israeli Colonization" ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اس موضوع کا مکمل ترین تجزیہ پیش کرتا ہے

کے لبرل جمہوریت پسند بیک زبان اس کی مذمت کرنے لگیں گے، لیکن اسرائیل کے ریکارڈ سے نہ صرف درگزر کیا جاتا ہے بلکہ اس کی تحسین بھی کی جاتی ہے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ اسرائیل نے عربوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے[1] اس کے متعلق وہ نہ صرف اپنی آنکھیں بند کرنے بلکہ دنیا کی نگاہوں میں بھی دھول جھونکنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ مغرب کے دانش وروں اور مفکروں کی ایک پوری منظم جماعت موجود ہے، جو اسرائیل کے ان "کارناموں" کی تعریف میں رطب اللسان رہتی ہے، جن کے تاریک پہلوؤں نے انسانی اور قومی اصطلاحات میں ایک پوری قوم کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ حال ہی میں اسرائیل میں امن کی "فاختاؤں"[2] کا ایک گروپ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس گروپ کے ارکان امن اور مفاہمت کی خاطر

---

[1] مثلاً بیت المقدس میں اسرائیل نے جو مذموم کارروائیاں کی تھیں جب یونیسکو نے ان کی مذمت کی اور اپنی رپورٹ شائع کی تو اسرائیل کی حمایت میں مغرب کی برگزیدہ اور ممتاز شخصیات اکٹھی ہو گئیں۔

[2] "فاختہ" امن کا نشان گردانی جاتی ہے اور سیاست میں یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو تشدد کے مقابلے میں مذاکرات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسرائیل میں یہ لوگ مختلف جماعتوں کے زیر سایہ کام کر رہے ہیں۔ ایک جماعت کا نام "اب امن" تحریک ہے۔ اس کے ارکان اپنے مقاصد کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہتے ہیں۔ ایک گروپ SHELI کے نام سے کام کر رہا ہے۔ اس گروپ کا ایک رکن اسرائیلی پارلیمنٹ کا بھی ممبر ہے۔ ایک اور گروپ "اسرائیلی فلسطینی کونسل برائے امن" ہے۔ لیکن یہ تمام گروپ گانٹھ کے پکے ہیں اور کوئی ایسا کام کرنے کے لیے تیار نہیں جو اسرائیل کے مفادات کے خلاف جاتا ہو۔ بس وہ "امن" کی ضرورت لگائے رکھتے ہیں۔ ویسے بھی وہ اقلیت کے اندر اقلیت ہیں۔

کچھ خطرات مول لینے کے لیے آمادہ ہیں۔ تاہم یہ بات حوصلہ شکن بھی ہے کہ اسرائیل کی سلامتی اور عرب خطرات کے بارے میں جو گھسے پٹے اور فرسودہ دلائل دیئے جاتے ہیں، ان کے سامنے اس گروپ کے ارکان بھی سپر انداز ہو جاتے ہیں اور تمام متبادل صورتیں ان کے ذہنوں سے نکل جاتی ہیں۔ ان فلسطینیوں کے لیے بھی جو دوسرے عرب ممالک میں مقیم ہیں، صورت حال کوئی خاص بہتر نہیں۔ کیونکہ ہر مملکت ان کے وجود کو اپنے مخصوص مفادات کا محض حاشیہ تصور کرتی ہے۔ کوئی عرب مملکت بھی فلسطینی مسئلے کے متعلق کوئی نہ کوئی مؤقف اختیار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی لیکن اکثر و بیشتر یہ مؤقف محض ایک تجریدی تصور ہوتا ہے جس کا "تقدس" برسر اقتدار حکومت کو خفیف سی عزت اور وقار عطا کر دیتا ہے۔ لیکن بین الاقوامی طور پر اسے عزت اور وقار تصور نہیں کیا جاتا بلکہ فلسطینیوں کی تائید و حمایت میں یہ حکومتیں جو لفاظی برتتی ہیں اسے اکثر و بیشتر یہود دشمنی محمول کیا جاتا ہے اور یوں بلند ترین سیاسی عزائم بھی، جن کی نوعیت اکثر و بیشتر مذہبی اور ثقافتی ہوتی ہے، اپنا اعتبار کھو بیٹھتے ہیں۔ کون وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ مصر، لبنان، اردن اور شام بھی فلسطینیوں کے اسی حق خود ارادیت کے خواہاں ہیں، جس کے خود فلسطینی متمنی ہیں کوئی شخص یہ کیسے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ فلسطینیوں کے حقوق کی خاطر جو جدوجہد کی جا رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عربوں نے اسرائیل کے ساتھ مفاہمت کر لی ہے؟

فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کے حصول میں جو رکاوٹیں حائل ہیں، ان کا یہ سرسری جائزہ بھی کسی قسم کے مغالطے کے بغیر یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہے کہ سیاسی سیاق و سباق کتنا حوصلہ شکن ہے۔ باقی رکاوٹیں تو جو ہیں، سو ہیں، ایک اور بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ خود فلسطینی بھی نسبتاً اس بات کی کم ہی تکرار کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک حق خود ارادیت سے مثبت طور پر مراد کیا ہے میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں، میرے خیال کے مطابق اس کا مفہوم مندرجہ ذیل ہے:

چونکہ فلسطینی وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے گھروں اور املاک سے بے دخل کیا جا چکا ہے اور جو سیاسی طور پر ایک اجنبی قوم بنائے ہیں اور چونکہ (جیسا کہ میں بار بار عرض کرتا رہا ہوں) اسرائیلی صہیونیت کی کامیابی میں جن بڑے بڑے عناصر نے حصہ لیا ہے، ان میں سے ایک عنصر یہ ہے کہ اس (صہیونیت) میں یہ طاقت اور صلاحیت تھی کہ وہ اپنا وجود، اپنے نظریات اور اپنی امنگوں کو مؤثر انداز سے منوا سکتی تھی، اس لیے ان فلسطینیوں کا جو جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا بھی جو ابھی تک اسرائیل کے زیر تسلط ہیں، اکثر و بیشتر صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اس بات سے انکار کرتے رہیں کہ وہ "لاشے" نہیں ہیں۔ جہاں تک ان (فلسطینیوں) کے اس مؤقف کا تعلق ہے کہ وہ صہیونی دعاوی کو مسترد کرتے رہیں گے، صہیونیوں کے خلاف مزاحمت جاری رکھیں گے اور ان کی مخالفت کرتے رہیں گے، تو اسکی آج کے فلسطینی سیاسی کلچر میں ایک طاقتور روایت موجود ہے۔ صہیونیت کا بین الاقوامی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فلسطین کے اندر سینہ ٹھونک کر فلسطین پر قبضہ کر لیا ہے اور پھر یہ بات بھی کوئی کم اہم نہیں ہے کہ اس نے مقامی آبادی کے ساتھ کچھ ایسا سلوک کیا ہے کہ وہ خارجی دکھائی دینے لگی ہے۔ اور اس کے بعد فلسطینی بیشتر وقت اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کی صورت حال میں جو پھنسا ہوا پاتے ہیں جو خود تو باہر ہو لیکن دیکھ اندر کی طرف رہا ہو اور اب انہیں معلوم ہوا ہے کہ ان کی جلاوطنی ہی وہ اصل حقیقت ہے جو ان کی زندگی کی حدود متعین کرتی ہے۔ چنانچہ اس بات کا ادعا کرنے کے لیے کہ ہمارا تو اس سرزمین کے ساتھ بہت پرانا تعلق ہے، ہمیں وہاں رہنے کا یوں حق حاصل ہے کیونکہ تاریخی اعتبار سے ہمارے آباؤ اجداد وہاں مدتوں سے رہتے چلے آئے ہیں، ہم اس بات سے انکار کرتے رہیں گے کہ ہم وہ نہیں جو کہ ہم بنا دیئے گئے ہیں۔ یعنی کہ صہیونیوں نے جس طرح ہمیں اپنے گھروں اور املاک سے بے دخل کیا ہے اور

جس طرح ہمیں خارجی بنایا ہے، ہم وہ خارجی بننے سے انکار کرتے رہیں گے۔
اور ہمارا یہ انکار اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس طرح خارجی بنے رہنے
کا عمل ختم نہیں ہو جاتا اور ہمیں اپنا قومی حق خود ارادیت استعمال کرنے کا موقع نہیں مل
جاتا۔ اس کے فوراً بعد ہمارا واسطہ ان مشکلات سے پڑتا ہے جو میں نے ابھی ابھی
گنوائی ہیں۔ وہ حالات، جو ہمارے دائرہ عمل کو محدود کر دیتے ہیں، ہم ان سے کیسے
پیچھا چھڑا سکتے ہیں؟ اب تک ہم نے جو منفی طرز عمل اپنائے رکھا ہے، اس سے
کیسے اوپر اٹھا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اور جو کچھ ہم چاہتے ہیں، اس کا مثبت انداز سے
اظہار ہو سکے؟ لیکن یہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق محض ارادے سے نہیں (کہ ہم جو
چاہیں گے، وہ ہو جائے گا) بلکہ ان باتوں سے بھی ہے کہ ہم صحیح جہت اور صحیح طریقہ کار
تلاش کریں، وہ قوتیں جنہیں کام پر لگایا جا سکتا ہے، ان کی صحیح انداز سے آمیزش
کریں۔ صحیح پیرایہ بیان اور صحیح تصورات کا کھوج لگائیں تاکہ اپنے عوام اور اپنے
دوستوں کی لام بندی کر سکیں، صحیح منزل مقصود کا تعین کریں اور اس کا ادعا کریں،
صحیح ماضی کو دریافت کریں تاکہ اس سے پیچھا چھڑا سکیں اور صحیح مستقبل کو تلاش کریں
تاکہ اس کے لیے جدوجہد کر سکیں۔

میرا خیال ہے کہ ہم نے ان تمام امور کو کچھ کچھ سمجھنا شروع کر دیا ہے لیکن جیسا
کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اتنے مؤثر انداز سے نہیں اور نہ اس میں اتنے
استقلال کا مظاہرہ کیا ہے جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ قوتیں، جو ہمارے خلاف
آمادہ ہیں، ابھی تک مہیب اور بے پناہ حد تک طاقتور ہیں۔ عصری تاریخ نے ہمارے
لیے جو الجھاؤ اور پراگندگی پیدا کر رکھی ہے، اس کا تو خیر ذکر ہی چھوڑیں، عرب
ممالک، عظیم طاقتوں (سپر پاورز) اور ہمارے ان اتحادیوں کے ساتھ ہمارے
بارے میں جن کا رویہ دوستانہ ہے اور جو بعض اوقات ہمارے لیے انتہائی

اہم بن جاتے ہیں، معاملات میں بعض اوقات جو پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، وہ ہمارے لیے زنجیر بن جاتی ہیں۔ اور ہماری سرگرمیاں محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تاہم مجھے یہ نظر آتا ہے کہ چند ایک لازمی سچائیاں اب فلسطینی واقعیت کا ایک حصہ بن چکی ہیں اور انہی کے بل بوتے پر ہم اپنے مستقبل کی تعمیر کا کام شروع کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسرائیلیوں کے برعکس اکثر فلسطینی اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ ان کا فریق مخالف یعنی اسرائیلی یہودی قوم ایک ٹھوس سیاسی حقیقت ہے، مستقبل میں جس کے ساتھ انہیں رہنا ہے۔ اس کے مساوی ایک اور بات، جس کا انہیں شدید احساس ہے، یہ ہے کہ فلسطینی حق خود ارادیت میں، محض مغربی کنارے یا غزہ کے فلسطینی شامل نہیں، بلکہ تمام کے تمام فلسطینی اس میں شامل ہیں۔ تنظیم آزادی فلسطین کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہم سب میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ ہم سب ایک قوم ہیں اور یہ احساس ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی جنگوں کے بعد ابھرا ہے۔ اگر فلسطینیوں کے متعلق کلیت[۵] کا کوئی احساس موجود ہے اور اگر یہ احساس تنظیم آزادی فلسطین کی ساخت اور طریقہ کار کی ٹھوس شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے تو فلسطینیوں کے نئے مستقبل کے متعلق بھی تفہیم موجود ہے (یعنی جب سے انہوں نے اپنے آپ کو ایک متحد قوم سمجھنا شروع کیا ہے، انہیں ایک نئے مستقبل کی امید ہونے لگی ہے) اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ فلسطینیوں کے موقف میں یہ جو تبدیلی آئی ہے کہ انہوں نے سارے فلسطین کو آزاد کرانے کا خیال ترک کر دیا ہے

---

[۵] کلیت (holism)۔ وحدت فطرت کا نظریہ کہ فطرت (نیچر) مختلف یا متضاد عناصر پر مشتمل نہیں بلکہ اجزا کُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی فلسطینی مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کُل (فلسطینی قوم) کا حصہ سمجھتے ہیں۔

اور اب انہوں نے اپنی توجہ کا مرکز فلسطین کے صرف ایک حصے کو بنا لیا ہے ـــــ یعنی پہلے تو انہیں یہ امید تھی کہ وہ سارے فلسطین میں ایک سیکولر جمہوری حکومت قائم کر سکیں گے، وہ امید انہوں نے چھوڑ دی ہے اور اب وہ مغربی کنارے، اور غزہ میں ایک فلسطینی ریاست کے قیام کے تصور کی طرف مائل ہو گئے ہیں ـــــ تو بھی انہوں نے نہ تو اپنے حق خود ارادیت کی منزل سے منہ موڑا ہے اور نہ اپنی اقدار کا دامن ہاتھ سے چھوڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے اکثر کو یہ خیال پریشان کرتا رہے گا کہ جافہ، حیفہ اور الجلیل کی حیثیت کبھی بھی دوبارہ وہ نہیں ہو سکے گی جو انہیں ۱۹۴۸ء تک حاصل تھی۔ اور یہ کہ ہم میں سے ہزاروں نے ایک مرتبہ جو کچھ کھو دیا، وہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ اس کے باوجود (ہمیں ہمیشہ یہ احساس ستاتا رہے گا کہ) فلسطین میں، جہاں اب ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں، ہمیں مساوی اقتدارِ اعلیٰ مل سکتا تھا۔ تاہم اگر کوئی مصالحت ہو بھی جاتی ہے اور ہمیں (ہمارے مطالبے کے مطابق) ایک ننھی منی مملکت (منی سٹیٹ) مل بھی جاتی ہے جہاں ہمارا اپنا جھنڈا ہو گا، اپنا پاسپورٹ ہو گا، اور اپنی قومیت ہو گی، تو بھی مجھے یقین ہے کہ ہمارے سامنے جو ایک عظیم آدرش تھا کہ نسل یا مذہب کی بنا پر انسانوں (جن میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں) کے مابین کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا، وہ ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہے گا اور ہمارے افعال اور رویوں کو متعین کرتا رہے گا۔

میرا اپنا یقین ـــــ میں اس کے حق میں اس کتاب کے آخری باب میں تفصیلی دلائل پیش کروں گا ـــــ یہ ہے کہ اس مرحلے پر ایک آزاد اور خود مختار فلسطینی مملکت کی ضرورت ہے تاکہ گزشتہ ایک صدی کے دوران میں ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے جو زندگی گزاری ہے، اس کی تاریخ کی تکمیل ہو سکے۔ ہم جو کچھ ہیں، ہم نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے، اس کا مکمل جواز ایک مملکت کی صورت

میں نہیں ڈھونڈا جا سکتا اور نہ مملکت اس کی تجسیم کر سکتی ہے۔ (یعنی جو دکھ ہم نے جھیلے ہیں، اگر ہمیں ایک مملکت مل بھی جائے، تو بھی ان کا مداوا نہیں ہو سکتا اور نہ مملکت ان دکھوں کی ایک ٹھوس صورت بن سکتی ہے)۔ اس نقطۂ نظر کے معکوس نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر ایک مملکت حاصل ہو جائے، تو وہ سابقہ) مصائب کا مداوا کر سکتی ہے، آئندہ کے لیے ان (مصائب) کے خلاف تحفظ دے سکتی ہے اور ان (مصائب) کی سابقہ تاریخ کی یادوں کو ایک ٹھوس صورت دے سکتی ہے۔ فلسطینی سمجھتے ہیں کہ یہودیوں کی علیحدہ مملکت کی تخلیق کے لیے اسرائیلی جس قسم کے نظریے گھڑتے رہے ہیں اور صیہونی اس مقصد کے حصول کیلئے عملی طور پر جو کارروائیاں کرتے رہے ہیں، ان کے پیچھے یہی نقطۂ نظر کارفرما تھا۔ یہودی خواہ وہ اندرونِ اسرائیل قیام پذیر ہوں اور خواہ وہ ابھی تک دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر ہوں، جب وہ فلسطینی مسائل سے جن کے زیادہ تر وہ خود موجب بنے ہیں، کنی کتراتے ہیں، تو وہ بہت کچھ کھو دیتے ہیں۔ انہیں ایک موقع ملا تھا کہ وہ ایک دوسری قوم کی معیت میں ایک مشترکہ سرزمین پر ایک مشترکہ (نہ کہ صرف اپنے) مستقبل کی مشترکہ تلاش میں مصروف ہو جاتے لیکن انہوں نے یقینی طور پر یہ موقع کھو دیا۔ فلسطینی مادرِ وطن کے لیے کام کرنے والا میں اب اکیلا شخص نہیں (میں جو اس مقصد کے لیے سرگرم عمل ہوں، تو اس کی وجہ میرا یہ ایمان ہے کہ اس صدی کے دوران میں ہماری تاریخ کے یہی مثبت معانی ہیں) بلکہ میرے کئی اور بھی رفقائے کار ہیں جو میری طرح یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اس قسم کی مادرِ وطن کا قیام فلسطینی عربوں اور اسرائیلی یہودیوں کے مابین امن قائم کرنے کے لیے اوّلین، اور غالباً انتہائی اہم، قدم ہوگا کیونکہ ہمسایہ مملکتوں کے مابین امن کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی سرحدیں مشترک ہیں، وہ آپس میں خیالات، وفود، اشیا وغیرہ کا باقاعدگی کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں اور ان میں باہمی مفاہمت بھی موجود ہے۔ پھر کون ہے جو یہ فرض نہیں کر سکتا کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ سرحدیں

ان انسانی روابط کے مقابلے میں جو ان قوموں کے مابین استوار ہوں گے، کم اہمیت کی حامل ہوں گی اور ان قوموں کے اختلافات مخاصمت کو کم ہوا دیں گے اور انہیں باہمی تبادلۂ خیالات پر زیادہ اکسائیں گے؟ —— علاوہ ازیں ان اختلافات کی نوعیت اور اس کے ساتھ فلسطینی حق خودارادیت کی طرف پیش قدمی کی کیفیت میں بھی غیر معمولی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہم پر یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ اسرائیل کی سیاست کا جس میں ایک خاص قسم کی موثریت پائی جاتی ہے، نقطۂ عروج تھا اور نقطۂ عروج ہے۔ اس سیاست سے اسرائیلی یہودی بھی متاثر ہوئے اور فلسطینی عرب بھی۔ ان میں سے ایک یوں کہ وہ اس سے غیر مبہم طور پر متمتع ہوا ہے اور دوسرا یوں کہ وہ سراسر خسارے میں رہا ہے۔ چونکہ فلسطینیوں نے اس چیز کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس لیے ان کے لیے اس کا مفہوم اور ہے اور جن لوگوں نے اس کا صرف علم حاصل کیا ہے، ان کے لیے اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ میں خود اپنی زندگی کے دو ڈرامائی طور پر مختلف اور متضاد تجربوں کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ ۱۹۴۰ کے عشرے کے وسط میں، جب میں عالم طفولیت میں سے گزر رہا تھا، میں اکثر اپنے بزرگوں کی سیاسی گفتگوئیں سنا کرتا تھا۔ ایک موقع پر جب ایسی ہی گفتگو ہو رہی تھی، تو میری توجہ خاص طور پر اس کی طرف مبذول ہو گئی اور میں اسے کبھی بھول نہیں پایا۔ ایک بزرگ شخص کے ساتھ ہمارے خاندانی مراسم تھے —— یہ بزرگ ایک وکیل تھے اور بیت المقدس کی عرب برادری میں انہیں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ وہ اس بات سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ صیہونیت روز بروز ملک میں مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور ایک ادارے کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے —— ہوا یوں کہ ایک روز یہ بزرگ ہمارے گھر تشریف لائے۔ حسب معمول سیاسی گفت گو شروع ہو گئی۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اب تک

جتنی بھی بحث ہوئی تھی، اس کا موڈ بہت حوصلہ شکن تھا۔ سب کی متفقہ رائے یہی تھی کہ "وہ (صیہونی) بے حد منظم ہیں۔ وہ تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ وہ سرتا پا مسلح ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ان کی نظریں ہماری جائدادوں اور ہماری املاک پر لگی ہوئی ہیں" وغیرہ، وغیرہ۔ پھر ان بزرگ نے لب کشائی کی اور بڑے رازدارانہ انداز سے گویا ہوئے: "دوستو، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہمارے اور ان کے مابین واقعی جنگ چھڑ گئی تو ہم خلیلوں[۵] کا جتھا لے آئیں گے اور وہ انہیں (صیہونیوں کو) مار مار کر بھگا دیں گے"۔

صیہونیت کے بارے میں اس انتہائی احمقانہ گفتار کو میں برسوں فلسطینی سرزمین کو ہتھیانے کے لیے صیہونیوں کی جدوجہد کے متعلق عربوں کے ردِعمل کا نچوڑ سمجھتا رہا۔ تاہم یہ بات بھی میرے فہم میں آتی ہے کہ اس کے متعلق میرا تنقیدی رویہ قدرے غیر منصفانہ ہے۔ اس صدی کے دوران میں عربوں کو جس قسم کے الجھاؤ، دباؤ اور متخالف مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ بے پناہ ہیں اور وہ چیزیں جو انہیں اس آزمائش کے لیے تیار کر سکتی تھیں، ان کی تاریخ یا معاشرے میں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ فلسطینی معاشرے کی تشکیل جاگیردارانہ اور قبائلی خطوط پر ہوئی تھی۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کا اپنا کوئی التصاق نہیں تھا۔ وہ چیزیں جو معاشرے کے مختلف افراد اور طبقوں کو ایک دوسرے کے ساتھ چپکائے رکھتی ہیں، وہ اس میں موجود تھیں۔ تاہم جنگ عظیم اول کے بعد اسے جس زبردست سہ رخی دباؤ ——— برطانوی انتداب، صیہونیوں کی سرزمینِ فلسطین پر نوآبادیاں قائم کرنے کی مساعی اور جدیدیت کا آغاز ——— کا سامنا کرنا پڑا، اس سے اس کی قومی سالمیت آسانی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکتی

۵؎ خلیلی حبرون کے عرب باشندے تھے۔ یہ اپنی جنگجویانہ قوت کے لیے ہمیشہ مشہور رہے لیکن تھے بہت کوڑھ مغز۔ (مصنف)

تھی ۔ کوئی بھی معاشرہ جو چار سو سالہ عثمانی حکومت کے بعد اپنی آزادی کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا ہو، اگر ان میں سے ایک یا دو دباؤوں سے بھی کامیابی کے ساتھ نپٹ سکتا، تو وہ اس کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوتا ۔ لیکن اگر ایک طرف صیہونی قومی سالمیت کے جذبے سے سرشار تھے، تو (دوسری طرف) عربوں کا یہ حال تھا کہ برطانوی انتداب کے زمانے میں، جو ۱۹۴۸ء تک قائم رہا، وہ استعماری حکومت کے بارے میں جن پالیسیوں پر کاربند تھے، وہ کبھی کبھی الجھاؤ کا شکار ہو جاتی تھیں (اور پھر ان میں واضح استعمار دشمن نظریے کا بھی فقدان تھا) ۔ مزید یہ کہ اس معاشرے میں اس لیے بھی دراڑیں نمودار ہونے لگی تھیں کہ ایک طرف تو نامور اور "ممتاز" شخصیتوں کی، جن کی صیہونی اور برطانوی مخالفت کرتے تھے، روایت پرستانہ قیادت تھی اور دوسری طرف عام کسان اور محنت کش تھے جو اس قیادت سے وفاداری کا دم تو ضرور بھرتے تھے لیکن معاشی اور معاشرتی اعتبار سے ان سے کٹے ہوئے تھے ——— ان سب امور نے مل ملا کر ایسے تفرقوں کو جنم دیا جن کی عکاسی عربوں کی اس بارے میں تباہ کن حد تک نامکمل آگہی میں ہوتی تھی (یعنی عربوں کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا) کہ فلسطینی معاشرے کا ڈھانچہ برقرار رکھنے کیلئے ایک شخص مؤثر طور پر کیا کر سکتا تھا (یا کیا کرنے کے قابل تھا) ۔

تاہم اگر وہ معاشرہ خود نہیں، تو اس معاشرے کا تصور ابھی تک موجود ہے ۔ اور یہ ایک ایسا امر ہے جو انسان کو ہکا بکا کر دیتا ہے ۔ فلسطینی اپنی واپسی کی خواہش سے دستبردار نہیں ہوئے اور نہ انہوں نے اس کی متبادل صورت یعنی اپنے اردگرد کے عرب سمندر میں بلا تفریق گم ہونے اور اپنی شناخت کھو دینے کے بارے میں کبھی زیادہ سوچا ہے ۔ عربوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جس نے اتنے مختصر عرصے میں ——— یہ عرصہ ایک نسل کی زندگی سے بھی کم عرصے پر محیط ہے ———

ایک طبقے (یا قوم) کی حیثیت سے اپنی تاریخ کے مفہوم پر اتنی گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کیا ہو جتنا کہ فلسطینیوں نے کیا ہے۔ پھر دنیا کے مختلف ممالک اور خطوں میں جو کثیر النسل معاشرے موجود ہیں اور ان میں سے اکثر کو جس خستہ د خراب مقدر میں سے گزرنا پڑا ہے اس کے باوجود فلسطینیوں نے ایک کثیر النسل معاشرے کے معانی کے متعلق جو گہرا اور سنجیدہ غور و فکر کیا ہے، وہ اور کسی نے کاہے کو کیا ہو گا۔ یہی نہیں بلکہ جب پس منظر میں جلا وطنیاں، استعماری چیرہ دستیاں اور نوآبادیاتی بے دخلیاں موجود ہوں، تو پھر قومی آزادی اور حق خود ارادیت کے کیا معانی بنتے ہیں، اس پر بھی انہوں نے بہت سوچا ہے۔ یہ تمام باتیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ فلسطینیوں نے اجتماعی طور پر بلوغت حاصل کر لی ہے لیکن ان میں یہ تمام باتیں اس لیے آئیں کہ انہوں نے اب یہ سمجھ لیا ہے کہ سیاسی طور پر مؤثر کیسے ہوا جا سکتا ہے اور یہ چیز اس قوم کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ ہے۔

یہاں مجھے اپنے دوسرے تجربے کا ذکر کرنا ہے اور یہ تجربہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ سیاسی طور پر مؤثر ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا ڈرامائی انداز سے (نہ کہ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے) مجھے علم کیسے ہوا۔ ۱۹۷۷ء کے موسم بہار میں ایک رکن کی حیثیت سے میں فلسطینی قومی کونسل کے، جو جلاوطن فلسطینیوں کی پارلیمنٹ ہے، اجلاس میں شریک ہوا۔ یہ اجلاس قاہرہ میں عرب لیگ کی عمارت میں منعقد ہوا تھا۔ کونسل کے ارکان تقریباً دو سو نوے نمائندوں پر مشتمل تھے۔ مغربی کنارے اور غزہ کے تقریباً ڈیڑھ سو نمائندے اس لیے شرکت نہ کر سکے کیونکہ اسرائیل نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر وہ قاہرہ گئے اور وہاں انہوں نے کونسل کی کارروائی میں حصہ لیا، تو انہیں واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ پھر بھی کونسل فلسطینیوں کے ہر طبقے اور فلسطینی قوم کے ہر فرد کی وسیع تر نمائندگی کر رہی تھی۔ قرار دادیں

مرتب کرنے اور ان پر بحث کرنے سے پہلے ایک ہفتہ کھلے عام تقاریر ہوتی رہیں۔
ان تقاریر میں زیادہ تر ان واقعات کا جائزہ لیا گیا تھا جن میں فلسطینی ملوث ہوئے تھے۔
اصل موضوع، جو زیر بحث آیا، یہ تھا کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین، جو حقیقتاً اس معاملے
میں کونسل کے قانون ساز شعبے کی مجلسِ منتظمہ تھی، اپنے فرائض سے کس طرح
عہدہ برآ ہوئی ہے۔ کونسل کا گزشتہ اجلاس ۱۹۸۴ء میں منعقد ہوا تھا اور
اس اجلاس کے بعد کے برسوں کے دوران میں اہمیت سے بھرپور متعدد واقعات
رونما ہو چکے تھے۔ لبنان میں جنگ چھڑ چکی تھی، بے شمار سفارتی اور سیاسی
تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی تھیں اور داخلی طور پر خود فلسطینی اپنے متعدد رویوں میں ردّ و
بدل کر چکے تھے۔ سب سے اہم تبدیلی، جو منظرِ عام پر آئی، یہ تھی کہ اسرائیل کے
ٹروس میں ایک نئی مملکت کے قیام اور جن اسرائیلی (یہاں مراد صیہونی ہیں) "فاختاؤں"
نے فلسطینی حقوق کی حمایت کی تھی، ان کے ساتھ ملاقاتیں کرنے کے فیصلے ہو چکے
تھے۔

میں اس وقت سے اب تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوں کہ اس
حقیقت کے باوجود کہ اس وقت قاہرہ میں اخباری نامہ نگاروں اور دوسرے ذرائع
ابلاغ کے نمائندوں کی فوج ظفر موج موجود تھی، لیکن ان میں سے ایک بھی اتنی فراست
اور ژرف نگاہی سے بہرہ ور نہیں تھا کہ وہ ان تاریخ ساز واقعات کا ادراک کر سکتا
جو وہاں رونما ہو رہے تھے۔ یورپ اور امریکہ میں مشرقِ وسطیٰ کے "ماہرین"
انبوہ در انبوہ موجود ہیں۔ کونسل کے اجلاس کو منعقد ہوئے مہینوں بیت گئے،
لیکن ان میں سے اللہ کے کسی بندے کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ فلسطینیوں کے
فیصلوں کی تہہ تک پہنچ سکتے۔ سبھی نے اسی ناکامی اور نااہلی کا مظاہرہ کیا جو قاہرہ
میں موجود ذرائع ابلاغ کے نمائندے ظاہر کر چکے تھے۔ حالیہ تاریخ کے دوران

میں یہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ عرب دنیا کا ایک وسیع تر نمائندہ قومی ادارہ ایک مکمل جمہوری انداز سے اہم مسائل پر حقیقتاً بحث مباحثہ کر رہا تھا۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین کو تند و تیز تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اس کی مجلسِ منتظمہ، یاسر عرفات اور دیگر (متعلقہ) اشخاص پر زبردست اعتراضات کی بارش ہو رہی تھی اور انہیں دقیق تنقیدی احتساب میں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ آپ کو ایک عرب ملک بھی ایسا نظر نہیں آئے گا جہاں اس قسم کی باتیں ہو سکتی ہوں، جہاں قیادت کا یوں مؤاخذہ کیا جاتا ہو اور اس کی ذمہ داری اور فرائض کو یوں کھلے عام منظم طریقے سے دیکھا پرکھا اور جانچا جاتا ہو، اس پر بحث کی جاتی ہو اور اس کا تجزیہ کیا جاتا ہو۔ اس کے متعلق شکوک و شبہات رفع کئے جاتے ہوں اور پھر ان کے بارے میں فیصلے کئے جاتے ہوں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ قاہرہ میں جو مرد اور خواتین اکٹھے ہوئے تھے، وہ سبھی کے سبھی جلاوطن تھے، ان کا کوئی علاقہ نہیں تھا، کوئی وطن نہیں تھا۔ وہ سب کے سب کسی ایک یا دوسرے ملک میں قیام پذیر تھے جہاں سیاسی آزادی کے حالات ایک دوسرے سے مختلف لیکن بنیادی طور پر محدود تھے۔ تاہم متعدد احمقانہ تقریروں کے باوجود، جن کی پیش گوئی کی جا سکتی تھی، کونسل کی کارروائیوں کا زور، جیسا کہ میں سمجھ سکا، اس اجتماعی عزم پر تھا کہ ہر اس چیز کو، جو فلسطینی مسئلے کو ذرا بھی متاثر کرتی ہو، بالتفصیل سمجھنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ وہاں جتنے لوگ بھی موجود تھے، ان میں سے ایک بھی شخص ایسا تھا جو محض اتنی سی حقیقت پر، کہ آخرکار ایک فلسطینی قومی کونسل معرضِ وجود میں آ چکی تھی یا یہ کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین نے معاشرتی، عسکری اور سفارتی پروگرام مرتب کر لیے تھے، لاابالی رجائیت یا محض عارضی حوصلہ افزائی کا شکار ہو گیا ہو۔ تاہم چونکہ فلسطینی وہ طبقہ ہیں جسکے وجود کو ماننے سے وہی لوگ انکاری ہیں، جنھوں نے انھیں اپنے

وطن سے بے وطن کر دیا تھا۔ پھر یہ وہ طبقہ ہیں جس کے افراد دنیا کے کونے کونے میں بکھر چکے ہیں اور یوں صورت حال بہت پیچیدہ اور گھمبیر ہو چکی ہے (پھر بھی جو لوگ کونسل کے اجلاس میں شریک ہوئے وہ شام، اردن، لبنان، سعودی عرب، کویت، مصر، لیبیا اور دیگر عرب ممالک ہی سے نہیں آئے بلکہ یورپ، شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے دور دراز علاقوں سے بھی آئے تھے)۔ پھر یہ طبقہ بھی ہیں جو ابھی تک اپنے اس مقصد سے بھی، جو انہیں کم سے کم قابل قبول ہے اور جس سے وہ کسی صورت میں نیچے نہیں جا سکتے، کہ اسرائیلی فوجیں ان کے وطن کے (ایک تہائی) حصے سے اپنی فوجیں ہٹا لے، کوسوں دور ہے۔ تو اس طبقے کے لیے یہ تمام باتیں (قومی کونسل کا قیام اور تنظیم آزادی فلسطین کے پروگرام) بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ ہر وہ شخص، جو وہاں موجود تھا، یہ جاننے کے لیے بیتاب تھا کہ جدوجہد کس طرح جاری رکھی جائے گی اور اس سلسلے میں وہ تمام ممکنہ یا دستیاب جزئیات وتفصیلات بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مزید برآں —— اور یہ بات بڑی متاثر کن ہے —— اس بات کی کوشش کی جا رہی تھی کہ اسرائیل اور یہودیوں سے کچھ اس طور نپٹا جائے کہ وقتی طور پر وہ بے شک ایک ایسی سیاسی حقیقت نظر آئیں جس سے دامن نہیں چھڑایا جا سکتا لیکن انجام کار انہیں ایک ایسی سیاسی حقیقت نہ تصور کیا جائے جس سے دامن چھڑانا ضروری ہو بلکہ انہیں ایک ایسا عنصر گردانا جائے جس کا وجود فلسطین کے سیاسی مقدر کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہے۔ صیہونی تحریک، جس کی عمارت فلسطینیوں کی موجودگی کے کامل انکار پر استوار کی گئی تھی، کبھی بھی گردن بلند کر کے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس نے اس (فلسطینیوں کی موجودگی) کی کامل حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے کبھی اتنی مغز کھپائی کی ہو گی جتنی کہ قاہرہ میں فلسطینیوں نے خود اس (صیہونیت)

کو تسلیم کرنے کے بارے میں کی تھی۔

مجھے یہ جو دو خالصتاً فلسطینی تجربے ہوئے، ان دونوں کے مابین جو سیاسی فاصلہ حائل ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے حد گھمبیر ہے اگر میں یہ کہوں کہ اس فاصلے کو ماپا جا سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں کسی عامیانہ یا موقع پرستانہ طریقے سے "حقیقت پسند" بن گیا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ جو میں نے دو مثالیں، جن میں سے ایک کا تعلق ۱۹۴۰ء کے اور دوسری کا ۱۹۷۰ء کے عشرے سے ہے، پیش کی ہیں، دونوں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دونوں مواقع پر فلسطینی جس مؤقف کا اظہار کر رہے تھے، وہ یہ تھا کہ وہ اپنے سیاسی اور انسانی حقوق گنوا رہے ہیں۔ تاہم موجودہ زمانے کے فلسطینی کو اس بات کا دوبارہ ادراک ہو رہا ہے کہ اس کے لیے کون سی چیز احتمالی ہے اور کون سی ممکن۔ اور اس ادراک کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ یہ خوب سمجھنے لگا ہے کہ وہ خود کیا ہے، وہ کس انداز سے مؤثر ثابت ہو سکتا ہے، وہ کہاں کھڑا ہے اور اسے زمانۂ حال میں جس کے متعلق اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خود تو یہ ماضی کی پیداوار ہے، لیکن یہ مستقبل کو اپنی کوکھ سے جنم دے گا، اپنی جدوجہد کو کس نہج پر چلانا ہے۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ موجود ہے کہ آج فلسطینی حقیقتاً جو کچھ ہے، اس پر یہ احساس حاوی ہے کہ اسے صیہونیت کے ہاتھوں براہِ راست کیا کیا مصائب برداشت کرنا پڑے، کیا کیا دکھ جھیلنا پڑے، کیا کیا زخم کھانا پڑے۔ اس کی یہ وہ تاریخ ہے، یہ وہ واقعیت ہے، جس سے وہ کسی صورت بھی دامن نہیں چھڑا سکتا لیکن وہ اپنا کوئی مستقبل بھی اس وقت تک نہیں بنا سکتا جب تک وہ اپنی اس تاریخ اور اس واقعیت سے اوپر نہیں اٹھ جاتا، ماورا نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ قاہرہ میں جو گھمسان کا رن پڑا، اس میں زیادہ تر توجہ اس مخصوص

حقیقت پر، جو کہ اسرائیل ہے، مرکوز رہی۔ اس کے ساتھ ہی اس معاملے پر بھی خوب کھل کر بحث ہوئی کہ اس (اسرائیل کی حقیقت) نے فلسطینیوں کے ردِ عمل کو کس طرح متاثر، بلکہ ایک خاص حد تک اس کی کیسے تشکیل کی ہے۔

چنانچہ اگر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو (قاہرہ کے اجلاس میں) فلسطینی شعور و آگہی نے جو ایک قدم اوپر اٹھایا ہے، وہ یہ ہے کہ صیہونیت اور اسرائیل فلسطین کی مقامی آبادی کو اپنی چیرہ دستیوں کا شکار بنانے کے لیے جس طرح آئے روز مؤثر طریقے سے کامیاب رہا ہے، اس کی اس (فلسطینی شعور) نے اجتماعی قومی اور تفصیلی تفہیم حاصل کی ہے، اس کی تاریخ خار سرگزشت مرتب کی ہے، اس کو خوب اچھی طرح کھنگالا ہے اور اس کے ساتھ مفاہمت کا ایک راستہ تلاش کیا ہے۔ فلسطینی طریقے میں خوب صورت مستقبل کی جو جھلک نظر آتی ہے اور اس میں دونوں قوموں کے حقوق کو جس طرح تسلیم کیا گیا ہے، وہ صیہونی کور چشمی کا ایک جدلیاتی جواب ہے۔ یہ خوب صورت مستقبل کے خواب اور ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کرنے کی کارروائیاں ابھی تعمیر کے مراحل میں سے گزر رہی ہیں، لیکن ان دونوں نے مل کر فلسطینیوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اس صیہونیت کا، جسکا عمل اور کردار یہودیوں کو اپنی تنظیم میں ضم کرنا اور غیر یہودیوں کیخلاف امتیاز برتنا رہا ہے۔ تنقیدی جائزہ لے سکیں اور اس کا ایک متبادل پیش کر سکیں۔ لیکن جب تک حقیقی تاریخی تجربے کی اساس پر ایک محتاط تنقیدی جائزہ مکمل نہیں ہو جاتا، اس قسم کا کوئی متبادل پیش کرنا ممکن نہیں۔

اور چنانچہ فلسطینیوں کے موجودہ سیاسی پروگرام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے[۱] کہ

---

[۱] میں یہاں ایک وسیع تر اتفاق رائے یا اجماع کا ذکر کر رہا ہوں۔ آپ خواہ کتنی ہی قراردادیں منظور کر لیں۔ کتنی ہی دستاویزات مرتب کر لیں، کتنے ہی رہنما یا دانشور علیحدہ علیحدہ بیانات دیدیں فلسطینی تو کیا، کوئی قوم بھی کسی بھی طریقے سے اس اجماع کو مناسب انداز سے پیش نہیں کر سکتی اور نہ اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ اجماع اپنی جگہ موجود ضرور ہوتا ہے (مصنف)

حقیقت کی تعریف و توضیح تاریخی طور پر کی جائے۔ مثلاً یہ معلوم کیا جائے کہ صیہونیت نے اپنے ستم گزیدگان پر جو اثرات مرتب کئے ہیں، ان کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی صیہونیت نے جن لوگوں کو اپنے ثمرات سے مستفید ہونے کے لیے چنا تھا، انہیں حقیقی معنوں میں فائدہ پہنچانے کے سلسلے میں اسے جو کامیابیاں حاصل ہوئیں، ان کا اعتراف کیا جائے۔ چنانچہ فلسطینی واقعیت میں جو تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں، وہ ان معنوں میں ہیں کہ پہلے تو فلسطینی یہ پروگرام بناتے تھے کہ (صیہونیت کی) مزاحمت لاٹھیوں سے مسلح جفاکش دیہاتیوں کے ذریعے کی جائے لیکن اب وہ اس قسم کی مزاحمت کے لیے جو پروگرام بناتے ہیں، ان کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ مقامی عرب فلسطینیوں کے خلاف صیہونیت جس طرح موثر رہی ہے، اسی طرح خود بھی مؤثر بننے کی کوشش کرنا چاہیے بلکہ اس طریقۂ کار پر نظر ثانی کر کے اسے بہتر انداز میں اپنانا چاہیے۔ یوں یہ بات نمایاں ہوتی جا رہی ہے کہ فلسطینی مؤثر بننے کے لیے جو کارروائیاں کر رہے ہیں، ان میں انہیں بتدریج کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

چنانچہ فلسطینی ہونے کے لغوی طور پر ناقابل تخفیف اور تفاعلی معانی یہ ہیں کہ آپ کو ایک ایسی صیہونیت کے ساتھ گزارہ کرنا ہے جو

اوّل: فلسطین کے حصول کا ذریعہ بنی۔

دوم: فلسطینیوں کو اپنے گھر بار سے بے دخل کرنے اور انہیں ملک بدر کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

سوم: اسرائیل کو ایک ایسی مملکت کے طور پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے جس میں فلسطینیوں کے ساتھ بحیثیت غیر یہودی سلوک کیا جاتا ہے اور جہاں وہ سرزمین پر اپنی مسلسل موجودگی کے باوجود (اسرائیل میں ساڑھے چھ لاکھ فلسطینی

موجود ہیں) سیاسی طور پر جلاوطن ہی قرار پاتے ہیں۔

یہ جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، اس کی اساس صہیونیت کے اس مقدمے پر ہے کہ فلسطین سے اس کے اکثریتی مقامی باشندوں کا انخلا عمل میں لایا جائے اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس بھیانک سچائی کو کسی طور بھی کم کر کے پیش نہیں کیا جا سکتا اور ہر نامور صہیونی رہنما نے بھی اس سچائی کا کھلے بندوں اور نہایت ایمانداری کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ جب آپ ایشیا کے کسی خطے میں ایک مملکت کی بنیاد رکھنا اور اس میں ایسے لوگوں کو آباد کرنا چاہتے ہوں، جن کی بیشتر تعداد ابتداً یورپ کے تارکینِ اوطان پر مشتمل ہو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو، جو یہاں آباد تھے، باہر نکال رہے ہیں۔ صہیونیت کی سیدھی سادھی یہی ضرورت تھی اور یہی خواہش لیکن اس کے جو شاخسانے وجود میں آئے، وہ بے حد پیچیدہ ہیں۔ تاہم جہاں تک مقامی عرب فلسطینی کا تعلق ہے اور اس یہودی تارک وطن کا بھی، جس نے اس (فلسطینی) کی جگہ سنبھالی ہے، دونوں کے لیے ادل بدل کی اس حقیقت میں اصلاً کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جہاں سے مشرق وسطیٰ میں تلاشِ امن کا کام شروع ہونا چاہیے لیکن جس کے ساتھ اس (تلاش) نے عہدہ برآ ہونے کی ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی۔

چوتھا باب

کیمپ ڈیوڈ کے بعد مسئلۂ فلسطین

۱
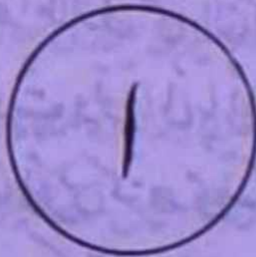
امورِ حوالہ، لفاظی اور قوتِ توانائی

اس بات کی توقع رکھنا چاہیے کہ اب مشرقِ وسطیٰ اور عرب دنیا کے متعلق جو بھی اور جہاں بھی ذکر اذکار ہوگا، اس میں سب سے زیادہ توجہ کا مرکز جو امور بنیں گے، وہ یا تو اس قسم کے پریشان کن سوالات ہوں گے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے اور کیا نہیں ہونے والا ــــ خاص طور پر یہ سوال تو لازماً زیرِ بحث آئے گا کہ اسرائیل اور اسرائیل کے معاہدۂ امن اور فلسطینیوں کا کیا بنے گا؟ ــــ یا پھر بحث و تمحیص کا موضوع وہ مثبت یا منفی لیکن مرصع اور مسحور کن بیانات، تفصیلات[1]، اطلاعات اور داستانیں بنیں گی جن میں اس دور کا ذکر ہوگا جو کیمپ ڈیوڈ یا شاہِ ایران[2] کے زوال کے بعد شروع ہوا ہے۔ جب سے کارٹر انتظامیہ برسرِ اقتدار آئی ہے، مشرقِ وسطیٰ کے واقعات میں اتنا ڈرامائی الجھاؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے کہ ان کی کوئی کل سیدھی نظر نہیں آتی اور یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس جہت کی طرف جا رہے

---

[1] ضمیمہ ملاحظہ ہو

ہیں حالانکہ ایرانی انقلاب کے بعد جو نئی صورتیں بننا شروع ہوئی تھیں، وہ روز بروز واضح سے واضح تر ہوتی جا رہی تھیں، فضا سے دھند چھٹنے لگی تھی، اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ قطعی اور فیصلہ کن تبدیلی کے لیے زمین ہموار ہو رہی ہے۔ مغرب کے متعدد تجزیہ نگار یہ استدلال کرتے ہیں کہ جنگ عظیم دوم کے بعد عربوں کی سیاسی زندگی کو جن سامراج دشمن اور حصولِ آزادی کی خواہش سے بھرپور جذبات و احساسات اور خیالات سے غذا ملا کرتی تھی، ان کا تعلق ان کے دلوں کی عمیق گہرائیوں سے تھا اور ان میں جو قوت و توانائی پائی جاتی تھی، وہ تقریباً رفیع و برتر تھی۔ لیکن اب اس قوت و توانائی میں کمزوری کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔[1] اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ قدیم حد بندیاں اور امتیازات جن کا احترام کیا جاتا تھا، تقویٰ اور پارسائی، جس کو عملاً اختیار کیا جاتا تھا، مستحکم طبقے، سبھی اپنی اہمیت کھوتے جا رہے ہیں، اور میرے خیال میں یہ بات درست ہے کہ عرب فضا میں ایک نئی قسم کی قوم پرستی ابھر رہی ہے۔ یہ قوم پرستی اپنی نوعیت کے اعتبار سے محدود تر ہے اور اس میں دوسروں کے بارے میں کم دریا دلی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ یہ قوم پرستی نہیں بلکہ اسے آپ گروہ بندی یا دھڑے بندی کہہ سکتے ہیں۔ صدر سادات نے جس بے قراری لیکن جس سراسر اچنبھے میں ڈال دینے والے انداز سے اسرائیل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور بعد میں اسی انداز سے اس سے صلح بھی کر لی، عرب دنیا نے دیکھا کہ (صدر سادات کا یہ) تھیٹرانہ[2] فعل ایک

---

[1] اس نقطۂ نظر کی تائید میں امریکی جریدے "فارن افیئرز" کی جلد نمبر ۵، شمارہ نمبر ۲ (زمستان ۱۹۷۰،۹) میں فواد عجمی کا مضمون "پان عرب ازم کا خاتمہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ میرے خیال میں اس مضمون میں بلا ضرورت سب کو ایک لاٹھی سے ہانک دیا گیا ہے۔

[2] تھیٹرانہ (Theatrical) ایسی گفتگو، رویہ یا حرکات و سکنات جیسی تھیٹر کے اداکار کرتے ہیں۔ اس کا مقصد دوسروں کو ڈرامائی انداز سے متاثر کرنا اور اپنی تشہیر کرنا ہوتا ہے۔

مرتبہ تو تھیٹر کے کارندوں کی تھیٹرانہ حرکات و سکنات اور لفاظی سے بھی بازی لے گیا ہے۔ امریکہ کو جو اثر و رسوخ حاصل ہوا ہے، اس کی حیثیت اب ایک لہر کی نہیں رہی کہ آئی اور گزر گئی، بلکہ وہ ایک ادارے کی صورت اختیار کر گیا ہے (کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ادارے کی طرح یہ بھی ہمیشہ یا کم از کم ایک طویل عرصے تک قائم رہے گا)۔ پھر اس اثر و رسوخ کو ضمانت ان بین الاقوامی معاہدوں نے فراہم کی ہے جن پر واشنگٹن اور میری لینڈ کی پہاڑیوں (کیمپ ڈیوڈ) میں دستخط ہوئے اور جنہیں وہیں مہر بند کیا گیا اور یہ وہ مقامات ہیں جو حتی الامکان حد تک سینائی کے میدان ہائے کارزار، فلسطین کے کھیتوں اور سنگتروں کے باغوں اور شام کی پہاڑیوں (جن کے متعلق حقیقتاً یہ معاہدے ہوئے تھے) سے دور تھے۔ لبنان، جو کسی زمانے میں عربوں کے ثقافتی اور سیاسی مناظرے کا تعقلی مرکز تھا، اب بمشکل ایک وجود ہے۔ اس کے شہر اور دیہات زمین بوس ہو چکے ہیں۔ اس کے شہریوں کو قابلِ قبول حدود سے کہیں زیادہ سزا مل چکی ہے اور اس کے آدرش طنز و تعریض سے بھرپور یادداشتوں کے گچھوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس (لبنان) کے علاوہ جدھر بھی آپ کی نظر پڑتی ہے، آپ کو غیر معمولی عرب دولت، غیر معمولی عرب الجھاؤ، غیر معمولی عرب جبر و تشدد کے حقائق دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی صحبت بھی اختیار کرتے ہیں لیکن مجال ہے کہ ان میں ذرا بھی تغیر و تبدیلی آئی ہو۔ اور ان سب کے باوصف، اور عربیت کی نام نہاد موت کے باوجود اور اس سے ماوراء آپ کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ ان لوگوں میں ابھی تک ایک عظیم عرب قوم میں ڈھلنے کے اجتماعی امکانات موجود ہیں۔ لہٰذا ہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ یہ قوم اختلافات اور نا اتفاقی کا شکار ہو چکی ہے۔ پھر بھی اس میں اتنی صلاحیت اور قوت موجود ہے کہ اب بھی اس کے باشندوں کے دلوں اور دماغوں میں ایک

نئی جوت جگائی جا سکتی ہے، ان کی نئے سرے سے صف بندی کی جا سکتی ہے۔
- - - - - - - - - - - - - - شرط صرف یہ ہے کہ انہیں
مستقبل کے متعلق جو خواب دکھائے جائیں، وہ جھوٹے نہ ہوں بلکہ حقیقی اور سچے
ہوں، یہ وہ حقیقت ہے جس کی اہمیت کبھی بھی گھٹا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔
تاہم اس امر کے باوصف کہ حالیہ مہینوں کے دوران میں مشرقِ وسطیٰ (اور
اس کے مسائل) کے متعلق بے حد و حساب توجہ دی گئی ہے، اس توجہ میں کسی خاص
قسم کا تجزیاتی وصف نہیں پایا جاتا۔ امریکہ میں اخبارات، ماہرین، دانشوروں،
اور سب سے بڑھ کر سرکاری پراپیگنڈہ کرنے والے حکام نے مشرقِ وسطیٰ
کے ساتھ ایک ایسے تماشے کا سا سلوک کیا ہے جس کے متعلق یہ فرض کر لیا جاتا
ہے کہ اسے دیکھ کر تماشائی بہت محظوظ ہوں گے اور زبردست جوش و خروش
کا مظاہرہ کریں گے۔ (یہ کہا گیا کہ اس علاقے سے) امریکہ کے مفادات وابستہ
ہیں۔ اکثر اوقات یہ اشارے دیئے گئے کہ عسکری اور تہذیبی اعتبار سے یہ
خطہ بہت اہم ہے۔ شان و شوکت جاہ و جلال اور ڈرامے سے بھرپور (اخبارات
میں) شہ سرخیوں کا سیلاب آگیا ـــــــــ کبھی سرخی لگتی "شہنشاہ کا تختہ
الٹ گیا"، کبھی "تھیٹرانہ چوٹی کانفرنس کا انعقاد"، اور کبھی "بحری جنگی جہازوں کے
بیڑے" یا "غیر مسلح ایف پندرہ (لڑاکا) طیاروں کی اچانک آمد" کی نوید دی جاتی۔
آخر ان تمام باتوں کا بنیادی ڈھانچہ کیا تھا جس کے اندر یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا؟
ایک طرف تو آویزش، جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی، اب بھی پورے زور شور
سے جاری تھی۔ دوسری طرف حالات نے ایسا زبردست پانسہ پلٹا تھا کہ بالکل
ہی ایک نئی قسم کا ماحول معرضِ وجود میں آگیا تھا۔ اسرائیل، مصر اور امریکہ کا آپس میں
معاہدہ ہو چکا تھا، ایران میں حالات قلابازیاں کھا چکے تھے، نومبر ۱۹۷۸ء میں

بغداد میں چوتھی کانفرنس منعقد ہو چکی تھی ، افغانستان ، ایتھوپیا ، یمن اور مشرق بعید کے بعض ممالک میں صورتِ حال دگرگوں ہو رہی تھی ۔ خطرناک ہتھیاروں کی تعداد محدود کرنے کے متعلق مذاکرات کا ڈول ڈالا جا رہا تھا ۔ اور ایک جریدے کے بقول کیا دنیا میں ایک نیا نظم (یا بدنظمی) وجود میں آ رہی ہے؟[1] تو ان حالات اور اس ماحول میں فلسطینی مسئلے کا سر پیر کیسے تلاش کیا جا سکتا تھا؟

خیر ، ہم اپنی بات کا آغاز کچھ یوں کر سکتے ہیں کہ چین کے برعکس ، کیوبا کے برعکس ، ویت نام کے برعکس ، بلکہ الجزائر کے بھی برعکس ، مشرقی عرب دنیا تاریخ ، جغرافیے اور ثقافت میں کچھ عجیب انداز سے ایک درمیانی اور مخلوط حیثیت اور مقام کی مالک ہے ۔ تیسری دنیا کے متعدد دوسرے خطوں کے ساتھ عرب دنیا کی مماثلت بھی ہے اور عدم مماثلت بھی ۔ یوں الجزائری اور فلسطینی مزاحمت کے مابین متعدد امکانی مماثلتیں موجود ہیں لیکن انجام کار ، وہ دم توڑ دیتی ہیں ۔ بعینہ جیسا کہ یہ بات درست ہے کہ اسرائیل مقامی عرب آبادی کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا ہے ، اس کی بنا پر وہ ایک آبادکاروں کی مملکت بنتا ہے اور جنوبی افریقہ سے مشابہ ہے ۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ بات بھی پوری طرح عیاں ہے کہ یہ کہنا کہ یہودیوں اور افریقہ کے نوآبادکاروں کے مابین کوئی مکمل مشابہت پائی جاتی ہے ، کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے ۔ عرب دنیا نہ تو ہندوستان ، چین یا جاپان کی مانند ہے کہ ان ممالک میں تو نسبتاً یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے دروازے پوری طرح مشرق یا مغرب کے لیے بند کر لیں لیکن وہ (عرب دنیا) ایسا نہیں کر سکتی ۔ اور نہ یہ ان ممالک کی مانند ہے جہاں کے مختلف اداروں کو نسبتاً خوداختیاری حاصل ہے ۔ یہ تمام

---

[1] جان شائن برگ : "The New World (Dis) order" مطبوعہ جریدہ "سیون ڈیز" جلد سوم ، شمارہ نمبر ۳ ۔ ۳ مارچ ۱۹۷۹ء ، صفحات نمبر ۱۶ ۔ ۱۴

امور اس ان گھڑت سچائی میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں کہ عرب دنیا،
تیسری دنیا کے باقی ممالک سے آگے بھی ہے اور پیچھے بھی، ان سے مشابہ بھی
ہے اور غیر مشابہ بھی، ان سے مختلف بھی اور ان سے مماثل بھی۔ چنانچہ زمان و مکان
نے جو تفریقات، ناچاقیاں، دراڑیں، انقطاعات اور عدم تسلسل پیدا کر دیئے
ہیں، ان پر کسی بھی عظیم الشان اور رفیع الدرجات تصور ـــــ مثلاً اسلام،
عربیت یا قومی آزادی کے حصول کے تصورات ـــــ کا نہ تو آسانی سے اطلاق
ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے تصورات کو عملی شکل دینے سے پہلے
ہمیں ان کی دوبارہ تعریف و تشریح کرنا پڑے گی، ان معنوں میں نہیں کہ ہم ایک
اساطیری ماضی (کہیں کہ ہے، پر نہیں ہے) کو بحال کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ان معنوں
میں کہ ہم زمانۂ حال اور ایک امکانی مستقبل میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں تعریف نو
اور سیاسی اطلاق کے یہ مسائل وہ مسائل ہیں جو جدید عرب کلچر اور اس علاقے کے
متعلق مغربی ماہرین کے تجزیوں میں بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن
عربوں کی جوشیلی، گرماگرم اور جذباتی بحثیں ہوں یا امریکہ کے پالیسی سازوں اور
اعلیٰ درسگاہوں سے وابستہ علماً اور فضلا کا جذبات سے عاری تجزیہ، دونوں
ہی صورتوں میں ٹھوس تجزیے کو تو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اور ان کی
جگہ نظریاتی رویے اپنی انتہائی مسموم قوت کے ساتھ جلوہ فگن ہو جاتے ہیں۔
(اور یوں سارا معاملہ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔)

اب ایک اور ٹھوس بات لیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عرب دنیا کو صحیح طور پر
دیکھا (اور سمجھا) جانا چاہیے تو اس سے ہمارا مطلب کیا ہوتا ہے؟ زیادہ تر اس
کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہم عرب خطے کو دنیا کا ایک علیحدہ حصہ کہہ سکتے ہیں جس
کا اپنا تاریخی التصاق اور اپنی ثقافتی شناخت ہے، پھر بھی عالم عرب اسی دنیا

میں ہے اور یہ ایشیا اور افریقہ کا ، اور ایک مفہوم میں یورپ کا بھی، حصہ ہے ۔ تاہم اگر ہم عربوں کی نظریاتی بحثوں کو سنیں، یا ان کے حالیہ ثقافتی اور معاشرتی افکار کا مطالعہ کریں تو ان میں ہمیں بے شمار ایسی باتیں نظر آئیں گی جن کا مقصد عالم عرب کو دنیا کی ہر دوسری چیز سے علیحدہ کرتا ہے تاکہ ببانگِ دہل یہ ثابت کیا جا سکے کہ عربی یا اسلامی اعتبار سے یہ فقید المثال ہے ، گناہ و ثواب کی ایک مخصوص عربی قسم ہے اور اس (عرب دُنیا) کا ایک مخصوص مقدر ہے ۔ اس قسم کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے والوں میں ایسے مغربی ماہرین بھی بکثرت شامل ہیں جو مخصوص قسم کے اسلامی یا عرب "ذہنی رویئے"[1] ، "ایشیائی شخصیت" یا "اسلام" کی مراجعت جیسے تصورات کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں اور انہیں بتکرار ہوا بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں (گویا کہ یہ یک لفظی تصورات ہر مسئلے ، ہر مشکل کی توضیح کر سکتے ہیں) ۔ چنانچہ عرب اور فرنگی دونوں ہی اکثر اپنے آپ کو اس مقام پر پاتے ہیں جہاں انہیں ہر استدلال یا حقیقت کو مسترد کرنا پڑتا ہے جو ان کے پہلے سے کسی گھڑے گھڑائے تصور[2] سے مطابقت نہیں رکھتی ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض اوقات دلائل اور خیالات یوں نظر آنے لگتے ہیں ، جیسے وہ ہوا روک ڈبوں[3] میں بند ہوں اور بیرونی دنیا سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو

---

[1] ذہنی رویّہ : مصنف نے یہاں انگریزی لفظ "mind-set" استعمال کیا ہے جس کا مطلب ایسا ذہنی رویہ یا رجحان ہے جو کسی صورتِ حال کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کے متعلق آپ کا ردِ عمل متعین کر چکا ہوتا ہے ۔

[2] گھڑا گھڑایا تصور : یہاں مصنف نے انگریزی ترکیب "reductive idea" استعمال کی ہے ۔ اصل لفظ "reductionism" ہے ۔ فلسفے کی اس اصطلاح کے مطابق یہ ایک ایسا نقطۂ نظر ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ کسی بھی نظام کو اس کے علیحدہ علیحدہ اجزا کی اصطلاحوں میں پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے یا یہ کہ کسی بھی تصور کو نہایت آسان بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے ۔ [3] صفحہ ۴۷۸ پر

لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ ملفوف دلائل و خیالات اتنے زیادہ سیاسی مفہوم کے حامل نہیں رہتے جتنے کہ انہیں ہونا چاہیے تھا، اپنے تجزیے میں بھی وہ حقیقی اور جیتی جاگتی دنیا کو کم ہی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور ہماری توقع کے برعکس وہ اسے (اس دنیا کو) اتنا آزاد اور خود مختار نہیں رہنے دیتے جتنا کہ ہماری نظر میں اسے ہونا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی کہ صحیح صحیح وہ کون سا انداز ہے جو ہر قومی تجربے یا ہر ثقافتی گروہ بندی کو باقی دنیا سے مختلف بھی بناتا ہے اور اس کے باوجود اسے باقی دنیا کے ساتھ ایک رشتے کی زنجیر میں منسلک بھی رکھتا ہے، وہ کون سا انداز ہے جو زمانے میں بھی اور انسانوں میں بھی تغیر برپا کرتا رہتا ہے، اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ بہ اعتبار مجموعی مشرقِ وسطیٰ پر یا تو ایسی آرار (یا پالیسیوں) کا اطلاق کر دیا جاتا ہے جو ہر قوم پر موزوں آ سکتی ہیں اور یوں وہ (مشرقِ وسطیٰ) کچھ ایسے طریقوں سے دوسری قوموں اور ثقافتوں سے مماثل نظر آنے لگتا ہے جن سے آپ (وہ لوگ جو یہ اطلاق کرتے ہیں) کی انا کی تسکین بھی ہو جاتی ہے لاکہ ہائیں یہ تو ہم جیسے ہی ہیں) اور ان طریقوں کا سمجھنا بھی دشوار نہیں رہتا۔ یا پھر معاملہ ہیچمدانِ دیگرے نیست کا بن جاتا ہے۔ (دوسروں کے مقابلے میں) آپ اپنے آپ کو برتر تصور کرنے لگتے ہیں اور یوں اپنے منہ میاں مٹھو بننے لگتے ہیں۔ اس رویے سے اس عندیے کا اظہار ہوتا ہے کہ تاریخ محض آپ کے ساتھ ہے اور اس سے جو چاہیں آپ استدلال کر سکتے ہیں۔

؎ بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۷: ہوا روک (Hermetic) ڈبہ: ڈبے کو اس طرح سر بند کرنا کہ اس میں نہ تو ہوا داخل ہو سکے اور نہ اس سے باہر نکل سکے۔ اگر آپ اپنے خیالات میں بے حد ہٹ دھرم ہوں اور کسی معقول سے معقول بات کا بھی آپ پر اثر نہ ہوتا ہو، تو آپ بھی خیالات روک کر ڈبے میں بند ہیں۔

یہ باتیں حصولِ آزادی کے تصوّر اور اس (تصور) سے وابستہ امن، حرّیت، نمو اور انقلابی ترقی کے تصورات پر خاص طور پر صادق آتی ہیں۔ اس تجویز NOTION کے حق میں خوب دلائل دیئے جا سکتے ہیں کہ اجتماعی طور پر عربوں کو جس چیز نے ان کی موجودہ حالتِ زار تک پہنچایا ہے، وہ ان کی یہ ناکامی تھی کہ وہ حصولِ آزادی کے متعلق ان خیالات کے جو انہوں نے دوسروں سے مستعار لیے تھے، اور ان خیالات کے جو انہوں نے تجربے کی بھٹی میں سے گزرنے کے بعد خود تشکیل دیئے تھے، مابین امتیاز نہ کر سکے۔ صدر سادات کی ابتکاری، جو امریکی شرائط پر اسرائیل کے ساتھ معاہدے پر منتج ہوئی ہے، ایک مقصد یہ سوال پوچھا جانا تھا کہ آیا کھلے عام شکست تسلیم کرنے یا جنگ کرنے میں اپنی نااہلی ظاہر کرنے سے حصولِ آزادی کے متعلق باتیں بنانا یا حصولِ آزادی کے ڈھول بجانا بہتر ہے، خاص طور پر جب ایسا کرنے سے آپ کو اسرائیل سے اپنا کھویا ہوا علاقہ بھی مل سکتا ہو اور زبردست امریکی امداد پر بھی ہاتھ صاف کیا جا سکتا ہو؟ اگرچہ اس بات کا امکان کم ہی نظر آتا ہے کہ صدر سادات نے جو کچھ کیا، اس کا متبادل قبول کر لیا جائے گا تاہم یہ متبادل ابھی تک موجود ہے۔ بچہ بچہ جانتا ہے کہ قومی جنگ لڑنے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ملک کے تمام وسائل ـــــ انسانی اور مادی ـــــ مجتمع کیے جائیں اور ان کی لام بندی کی جائے، اس کا مطلب قربانی ہے۔ اور اس کا مطلب ایسے رہنماؤں کی دستیابی ہے، جو بصیرت، بالغ نظری، دوربینی اور حوصلے سے بہرہ ور ہوں۔ فی زمانہ اس قسم کے رہنماؤں اور اس قسم کی قومی

لہ باہر جا کر تو آپ آزادی کی باتیں کرتے رہیں لیکن جب گھر واپس آجائیں تو اپنے ہی عوام کو جبر و تشدد کا نشانہ بناتے رہیں۔ اوّل تو میدانِ جنگ کا رخ کرنے سے ہی احتراز برتیں اور اگر جانا بھی پڑے، تو اچھی کارکردگی دکھانے کے بجائے وہاں سے دم دبا کر بھاگ آئیں۔ (مصنف)

تحریکوں کی مثالیں ذرا کم ہی ملیں گی۔ اکثر وبیشتر ان کا وجود محض زبردست قسم کی لفاظی یا مبالغہ آرائی اور میلوڈراما[1] سے بھرپور اندازِ بیان میں ہی ملتا ہے۔

موجودہ زمانہ عرب دنیا سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ "ہم کس قسم کی آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں (اور یا کیا یہ آزادی کا حصول ہی ہے جس کے لیے یہ ساری جدوجہد ہو رہی ہے) ؟ اس کے ساتھ ساتھ عربوں کو یہ سوال بھی اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ "جب یہ آزادی حاصل ہو جائے گی، تو پھر ہم کیا کریں گے؟" یہاں ایک مرتبہ پھر اس بات کا اعادہ کر دینا چاہیے کہ باطل مماثلوں پر مبنی درآمدہ جوابات سے کام نہیں چلے گا، ہاں، البتہ ایک مختصر مدت کے لیے (جب گلا پھاڑ پھاڑ کر کی جانے والی تقاریر اور مرصع و دشنام طرازیاں اور دھمکیاں موجودہ مخمصوں کے جوابات کے طور پر تسلیم کر لی جائیں گی) یہ ضرور کارآمد ثابت ہوں گے۔ بہر حال، جیسا کہ جیرار و شالیاں[2] نے اپنی تلخ کتاب "تیسری دنیا کا انقلاب" میں استدلال کیا ہے کہ سیدھی سادھی اور مبالغے سے معرّیٰ حقیقت یہ ہے کہ تیسری دنیا میں حصولِ

---

[1] اس قسم کے ڈرامے میں ایسے واقعات پیش کیے جاتے ہیں جن کی ایک کڑی کو دوسری کڑی سے ملانے کے لیے کھینچ تان کرنا پڑتی ہے۔ خلافِ فطرت حالات و حادثات کی کشمکش دکھائی جاتی ہے اور زیادہ تر زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ اداکار اپنی گفتگو اور اپنے افعال میں ایسا رویہ اختیار کریں جو ناظرین پر رقت طاری کر دے اور انہیں جذباتی تسکین پہنچا دے۔ رسشلہ بیان مؤثر بھی باتوں کے ایسے طوطا مینا بناتے ہیں کہ حاضرین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اور یوں معمولی قد کاٹھ کے لوگ بھی بہت اہمیت حاصل کر لیتے ہیں اور معمولی تحریکیں "عظمت" کا "جھومر" اپنے ماتھے پر سجا لیتی ہیں

[2] Gerard Chaliand: "Revolution in the Third World. Myths and Prospects"(Viking Press, New York, 1977)

آزادی کے لیے جو تحریکیں چلی ہیں، وہ ایسی حکومتوں کو معرضِ وجود میں لائیں جو کارنامہ تو کوئی سرانجام نہیں دے سکیں کیونکہ ان کے کرتا دھرتا معمولی فہم و فراست کے مالک لوگ تھے۔ البتہ اگر ان کا کوئی طرۂ امتیاز تھا تو یہ تھا کہ انہوں نے مملکت کی پرستش کو فروغ دیا اور غیر پیداواری (کام کی نہ کاج کی) نوکر شاہی اور ظالم و جابر پولیس کو امورِ مملکت پر حاوی کر دیا۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ فی الحال عرب دنیا حصولِ آزادی کی منزل سے دور، بہت دور ہے، پھر بھی اس بات میں کوئی ہرج نہیں، بلکہ یہ ایک خوبی کی بات ہو گی کہ ابھی سے یہ طے کر لیا جائے کہ مستقبل میں کن چیزوں سے احتراز کرنا ہو گا اور وہ کون سی چیزیں ہیں جن کا اپنانا قابلِ قبول ہو گا۔ لیکن اس قسم کا غور و فکر فوراً یہ احساس دلا دے گا کہ عربوں کے عصری سیاسی اور معاشرتی کلچر میں انسانی طبقے کو جو مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ توقع کے برعکس اس کے متعلق کوئی خاص تبادلۂ خیالات نہیں ہوا۔ نیز نوآبادیت کا دور گزر جانے کے بعد مملکت کی نوعیت اور کیفیت کیا ہو گی، اس پر بھی سنجیدگی کے ساتھ کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اس ناکامی کو دو بالکل ہی مختلف کتابوں "مقدمات للدراست المجتمع العربی" از ہشام شرابی[1]۔ اور ۱۸۶۸ء اور ۱۹۳۶ء کے مابین ہسپانیہ کی نراجی تحریک کا مطالعہ[2] کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ڈرامائی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ہشام شرابی کی کتاب میں عرب معاشرے کی چیر پھاڑ کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس معاشرے کی خرابی یہ ہے اور اس خرابی کا علاج

---

[1] یہ کتاب دار المتحدہ بیروت نے ۱۹۷۵ء میں شائع کی تھی۔

[2] انگریزی میں کتاب کا نام ۱۸۶۸ء - ۱۹۳۶ء "The Spanish Anarchists: The Heroic Years, 1868-1936" ہے اس کا مصنف Murray Bookshin اور ناشر ہارپر اینڈ رو نیویارک ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہ کتاب دوبارہ چھپی تھی۔

بھی کوئی نہیں کہ ساخت کے اعتبار سے یہ ابویانہ[1] ہے۔ تحکم پسند اور استبدادی ہے اور قدیم زمانے سے ہی خاندان کو اس میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ شرابی ایک بہت مشہور و معروف اور باوقار عرب دانش وریں اور امریکہ میں پیشۂ تدریس سے منسلک ہیں۔ انہوں نے جو تشخیص کی ہے، آپ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔ پھر بھی کتاب کے اختتام پر ہمارے ذہنوں میں ایک سوال کلبلانے لگتا ہے اور ہمارا جی چاہتا ہے کہ شرابی سے پوچھیں، "حضرت، اتنا تو بتا دیں کہ آخر آپ خاندان کی جگہ کس کو دینا چاہتے ہیں؟" آپ لاکھ سر پٹکیں، شرابی کی کتاب آپ کو اس سوال کا کوئی جواب مہیا نہیں کرے گی۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کے مبہم اشارے کتاب میں ضرور ملتے ہیں کہ اگر روایتی خاندان کا (ڈھانچہ) تس نہس کر دیا جائے تو عربوں کو آزادی، جمہوریت اور جدیدیت نصیب ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی بس اشارے ہی اشارے ہیں جو کوئی یہاں ہے اور کوئی وہاں ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ کیوں؟ اس کی سیدھی سادھی وجہ محض یہ ہے کہ نہ تو شرابی نے اس بارے میں کچھ تفکر کیا ہے اور حقیقتاً یوں نظر آتا ہے کہ سماجی امور کے متعلق سوچ بچار کرنے والے اہلِ فکر و نظر نے بھی ـــــ بالخصوص ان لوگوں نے جو علمی انداز سے ان امور کا جائزہ لیتے ہیں ـــــ کہ عربوں کو کس قسم کے

---

[1] ابویانہ (patriarchal) ایک ایسا معاشرتی یا سیاسی نظام، جس میں تمام اختیارات خاندان یا قبیلے کے سربراہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ یہ سربراہ ہمیشہ مرد اور اپنے باپ کا سب سے بڑا بیٹا ہوتا ہے۔ قبیلے کے تمام افراد ایک دوسرے کے رشتے دار ہوتے ہیں کہ ان کی شادیاں قبیلے سے باہر نہیں ہو سکتیں۔ سربراہ کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور اس کا ہر لفظ واجب التعمیل ہوتا ہے۔ یہ نظام دنیا کے متعدد ممالک میں مروج رہا۔ لیکن جدید تعلیم نے کافی حد تک اس کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔ بلوچستان میں اب بھی یہ نظام قائم ہے۔ مری، بگٹی، مینگل اور دوسرے قبائل کے سربراہ کا حکم حکومت کے حکم پر فوقیت رکھتا ہے۔

انسانی معاشرے کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے، کوئی بصیرت افروز نقطۂ نظر یا تصور پیش نہیں کیا۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۹۳۶ء کے مابین ہسپانیہ میں جو نراجی تحریک[۱] چلتی رہی، ہبک شن نے اس کا بڑا رقت انگیز مطالعہ پیش کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کی کتاب ہمیں بڑی بصیرت افروز باتیں فراہم کرتی ہے۔ اس زمانے میں لاکھوں ہسپانوی کسان اور محنت کش بنیادی طور پر افلاس اور پسماندگی کی چکی میں پس رہے تھے۔ اتنے میں نراجیت کی تحریک چل پڑی اور یہ تحریک ان کسانوں اور محنت کشوں کی اس خواہش کے اظہار کا ذریعہ بنی کہ کاش کہ وہ ایسی برادریاں تشکیل دے سکیں جو جبر و تعدی، مرکز پسند نوکر شاہیوں اور استبدادی حکومت کے چنگل سے آزاد ہوں۔ اگرچہ یورپی ممالک کی تمام دیگر تحریکوں کے ساتھ جو یوٹوپیت[۲] اور مارکسزم سے متاثر تھیں، اس (نراجی تحریک) کے بظاہر روابط تھے لیکن کسی دوسرے مغربی ملک میں اس قسم کی تحریک موجود نہیں تھی۔ میں یہاں جو نکتہ اٹھانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ دو مستثنیات کے علاوہ، جن میں سے ایک تو فلسطینیوں کی وہ کوشش تھی جو انھوں نے ایک نئی قسم کا معاشرہ منظم کرنے کے لیے اپنے خیالات ظاہر کرنے کے سلسلے میں کی تھی اور

---

[۱] نراجی تحریک یا نراجیت (anarchism): بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حکومت، خواہ وہ کسی بھی روپ میں لوگوں پر مسلط ہو، بیکار اور غیر ضروری ہے۔ ایسے لوگوں کو نراجی اور ان کے عقیدے کو نراجیت کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ حکومت اور اس کے وضع کردہ قوانین و قواعد برائی زیادہ پھیلاتے ہیں اور بھلائی کم کرتے ہیں۔ اگر یہ قوانین و قواعد ختم کر دیئے جائیں تو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی کریں گے اور ان کا رویہ بھی بہتر ہوگا۔

نراجیت کو ماننے والے زمانۂ قدیم سے چلے آ رہے تھے۔ یونان کے رواقی فلسفی اس خیال کے حامی تھے کہ دنیا میں نہ کوئی قوانین ہونے چاہییں اور نہ تعلیمی ادارے۔ افراد کے خلاف کوئی طاقت بھی استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ اٹھارویں صدی میں انگریز فلسفی گوڈون، انقلابی مفکر میخائل کوبونن اور بعض دوسرے یورپی علما نے حکومت کی تمام اقسام کے خلاف کتابیں لکھیں اور دلائل پیش کیے۔ یہ نظریہ فرد کو سرمایہ داری کے چنگل، ریاست کی محکومیت اور مذہبی اخلاق کے تسلط سے آزادی دلانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس تحریک کو ووین نے روس کے زار، انگریزوں، اطالیہ کے شاہ ہمبرٹ، فرانس کے صدر کارنو، آسٹریا کی ملکہ الزبتھ اور امریکہ کے صدر میکنلے کو بھی ملک عدم کیا۔

[۲] Utopianism

اس کوشش کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے اور دوسری کوشش اس لبنانی قومی تحریک نے، جو ۷۷ - ۱۹۷۵ء کی خانہ جنگی کے دوران میں منظرِ عام پر آئی تھی، کی تھی تو اس نے لبنانی معاشرے کی نئی صورتوں کے متعلق عوام الناس کو بحث مباحثے پر اکسانے کے لیے کی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسی ٹھوس معاشرتی صورتیں ہوں گی جن کے لیے عرب دنیا کے عوام، دانشوروں اور معاشروں نے کسی نہ کسی ٹھوس انداز سے جدوجہد کی ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ جو ہوتا رہا اور ہو رہا ہے، وہ بس اتنا ہے کہ حصولِ آزادی اور عرب قوم کے متعلق مبہم خیالات و بیانات، جنہیں باہر کی دنیا کی ہوا تک لگنے نہیں دی جاتی، اشاعت پذیر ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ میرا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس رویے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ آپ ایسی اصطلاحات کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں جن کی مدد سے آپ اس قسم کی گفتگو یا بحث کا، خواہ یہ مملکت کے متعلق ہو، معاشرے کی ساخت سے یا خواہ عرب زندگی کی حقیقی صورتوں سے، آغاز کر سکیں لیکن آپ کو کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا اور آپ کفِ افسوس ملنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے[1]۔ زیادہ سے زیادہ اگر آپ کو کچھ مل سکتا ہے، تو وہ دو قسم کی لفاظی ہے۔ ان میں سے ایک لفاظی تو وہ ہے جس کا تعلق منفی تنقید استرداد، اور سب و شتم سے ہے۔ دوسری قسم کی لفاظی کا تعلق عربوں کی اجلالِ ذات[2] خودستائی[3] اور خودپسندیگی[4] سے ہے۔ لیکن ان دونوں ہی اقسام کی لفاظی کا تاریخ یا

---

[1] بہر حال چند مفکرین ایسے بھی ہیں جن کی تصانیف کو مستثنیات کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سرفہرست منیف الرزاز کے رشحاتِ فکر ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا انگریزی میں کم ہی ترجمہ ہوا ہے۔ تاہم انور عبدالملک نے فرانسیسی زبان میں دو کتابیں مرتب کی ہیں اور ان میں آپ کو عربوں کے جدید سیاسی اور ثقافتی افکار کی جھلکیاں مل جائیں گی (مصنف)

[2] اجلالِ ذات (Self - glorification) اپنی بڑائی اور عظمت کے زعم میں گرفتار رہنا۔

[3] خودستائی SELF ADMIRATION اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا۔

[4] خودپسندیگی۔ (Self-approbation)

سیاست کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہیں بنتا۔ دونوں ہی اپنی اپنی ذات کے گنبد میں کچھ اس طرح بند ہیں[1] کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکال سکتیں۔ اور وہ دونوں محض اس بات کی ضمانت دیتی ہیں کہ مستقبل میں عرب دنیا کا جو خاکہ بنے گا، اس میں وہ ایک ایسی جگہ نظر آئے گی جس کے ساتھ کچھ بیتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک ایسی جگہ دکھائی دے گی جہاں مردوں اور عورتوں نے اس قدر ہاتھ پیر نہیں ہلائے کہ وہ اس انسانی معاشرے میں، جس کے لیے انہوں نے جدوجہد کی تھی، اپنے خیالات اور اقدار کے مطابق تبدیلیاں لا سکتے۔

عربوں کی عمومی ناکامیوں کی، جن کی عکاسی موجودہ صورتِ حال میں ہوتی ہے، تکمیل اس چیز سے ہوتی ہے جسے کسی بہتر ترکیب یا لفظ کے فقدان کے پیشِ نظر عرب اور مشرقِ وسطیٰ کی دنیاؤں میں اشیاء کے متعلق امریکی نقطۂ نظر یا امریکی بصیرت کہا جا سکتا ہے۔ امریکی اخبارات و جرائد، حکومت، اور علمی اداروں سے وابستہ دانشوروں کے خیالات میں کچھ تنوع تو نظر آجاتا ہے لیکن ہر جگہ آپ کو امریکی پالیسی اور امریکی مفادات کے متعلق اس (پالیسی) کے تصورات کی گہری چھاپ نظر آئے گی۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ اس پالیسی کے بڑے بڑے مقاصد بلکہ فرائض تیل کا حصول اور عوامی اور/ یا قومی میلانات کے خلاف مسلح اتحادات کا قیام ہیں۔ دنیا کے متعلق جان فوسٹر ڈلس[2] نے جو رائے قائم کی تھی یہ اس کی طرف بھونڈے انداز کی معاودت[3] ہے۔ موجودہ امریکی پالیسی کے متعلق واضح ترین

---

[1] Self-enclosed

[2] جان فوسٹر ڈلس (Dulles) (۱۸۸۸ء - ۱۹۵۹ء): صدر آئزن ہاور کے زمانے (۱۹۵۲ء - ۱۹۵۹ء) میں امریکہ کے وزیر خارجہ۔ انہیں فوجی معاہدے کرانے کا بہت شوق تھا۔ سنٹو اور سیٹو انہی کے دماغ کی پیداوار تھے۔

[3] معاودت (Reversion) اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جانا۔

بیان نائب وزیر خارجہ ہیرالڈ ۔ ایچ ۔ سانڈرز[1] نے بارہ جون ۱۹۸۰ء کو ایوانِ نمائندگان[2] کی اس کمیٹی کے، جس کا کام یورپ اور مشرق وسطیٰ کے امور کی نگرانی کرنا ہے، کھلے اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران میں دیا تھا ۔ سانڈرز نے عمومی انداز سے جو "مفادات کی بنیادی فہرست" گنوائی تھی، اس میں اور باتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل امور شامل تھے

تصادم و آویزش روکنے کی امریکی خواہش ۔

"اسرائیل کی سلامتی، طاقت اور بہبود کے متعلق ناقابلِ تنسیخ پیمان"۔

عرب دنیا (خصوصاً "بڑے عرب ممالک کی قوت اور اعتدال پسندی") کی اہمیت کا اقرار اور "مشرق وسطیٰ کے عوام کے ساتھ ایک ایسی آویزش کو، جس نے ایک پوری نسل کو مصائب و آلام سے دوچار کیا ہے، ختم کرنے کے لیے امداد کا اخلاقی اور ہمدردی پر مبنی پیمان"۔

ان مفادات سے ہم آہنگ سانڈرز نے امریکی پالیسی کے چار مقدمات کا اجمالی خاکہ بھی پیش کیا :

---

[1] صدر کارٹر کے دور میں نائب وزیر خارجہ ۔

[2] امریکی کانگرس (پارلیمنٹ) دو ایوانوں پر مشتمل ہے ۔ ایوان بالا کو "سینٹ" کہتے ہیں ۔ اس کے ارکان کی کل تعداد ۱۰۰ ہے اور امریکہ کی پچاس ریاستوں میں ہر ریاست عام انتخابات کے ذریعے اپنے دو نمائندے سینٹ میں بھیجتا ہے ۔ سینٹ کے ارکان ۶ سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں ۔ لیکن ہر دو سال کے بعد ایک تہائی ارکان کا دوبارہ انتخاب ہوتا ہے ۔ یوں سینٹ ہمیشہ برقرار رہتی ہے ۔

ایوانِ زیریں کو "ایوانِ نمائندگان" کہتے ہیں ۔ اس ایوان میں ہر ریاست اپنی آبادی کے حساب سے اپنے نمائندے بھیجتی ہے اور ان کا انتخاب صرف دو سال کے لیے ہوتا ہے ۔

مختلف امور پر غور و فکر کرنے کے لیے دونوں ایوان مختلف کمیٹیاں (مثلاً امور خارجہ یا امور دفاع کی کمیٹی) تشکیل کرتے ہیں ۔ اصل اختیارات انہی کمیٹیوں کے پاس ہوتے ہیں ۔ چنانچہ یہ کمیٹیاں جو رائے دیں، عام طور پر سینٹ یا ایوانِ نمائندگان اسے یوں کا توں قبول کر لیتے ہیں ۔

اوّل: چونکہ مشرق وسطیٰ کے ساتھ ہمارے جو مفادات وابستہ ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ اہم ہے، اس لیے واحد قابل عمل پالیسی صرف وہی ہو سکتی ہے جو ہمیں اس قابل بنا دے کہ ہم اپنے ان تمام مفادات کی بیک وقت پیروی کر سکیں......

دوم: گزشتہ چار برسوں کے تجربے نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ہم ان تمام مفادات کی پیروی صرف انہی حالات میں کر سکتے ہیں۔ جب اسرائیلی عرب آویزش کے پُرامن تصفیے کے لیے کچھ پیش قدمی ہو.......

سوم، گزشتہ چند برسوں کے دوران میں مشرق وسطیٰ کی بڑی اقوام اور مشرق وسطیٰ سے باہر کی عظیم طاقتوں کے مابین تعلقات میں یہ اہم تبدیلی واقع ہوئی ہے کہ ان کا رُخ اب واضح طور پر مغرب کی طرف ہو گیا ہے.....

اس خطے میں روس کو واضح تفوق حاصل رہا ہے، یہاں سانڈرز نے اس کے خاتمے کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ مشرق وسطیٰ کی اقوام مغرب کو اس لیے ترجیح دیتی ہیں "کیونکہ وہ انہیں ایسی ٹیکنالوجی اور انتظامی مہارتیں فراہم کرتا ہے جو ان ممالک کی ترقی کے لیے ضروری ہیں" اس نے اس بات کا بھی ذکر کیا (اور یہ بات بھی کوئی کم اہم نہیں) کہ "امن اور ترقی و نمو کے حصول کے لیے اعتدال پسند عرب ہم امریکی تعاون کے خواہاں ہیں۔ ان کی کامیابی انتہا پسند قوتوں کے کردار کو محدود کر دیگی...

چہارم: ہم نے جو دوسرے وعدے وعید اور عہد و پیمان کئے ہیں، ان میں کسی قسم کی تخفیف کئے بغیر مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کی تعریف کرتے وقت اس علاقے میں امریکہ کے اقتصادی تعلقات کے نئے پہلوؤں کو سنجیدگی سے پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔

سانڈرز جو یہ کھلے عام بیان دے رہا تھا، اس میں اس نے کچھ ہی دیر بعد یہ دعویٰ

کیا کہ (صدر) سادات کے دورے کے بعد امریکہ کی پالیسی یہ ہوگئی ہے کہ امریکہ اب "دونوں فریقوں کے مابین محض چیٹھی رسان کا کردار ادا نہیں کرے گا بلکہ وہ اس سے بڑھ کر بھی کچھ کرے گا۔" امریکہ نے اسرائیل، مصر، اردن، شام، لبنان اور سعودی عرب کے ساتھ جو مذاکرات کرنا چاہے ان کے مرکزی نکات یہ تین نکات تھے۔

اوّل: امن کی نوعیت

دوم: اسرائیلی انخلاء اور "سلامتی کے اقدامات، جو اس انخلا کے ساتھ ساتھ عمل میں لائے جائیں گے"

سوم: فلسطینیوں کا کردار

حالانکہ عرب مملکتوں اور اسرائیل، دونوں ہی کے ساتھ ان امور پر امریکہ کو سخت اختلاف یا اتفاق تھا، گفتگو کا ڈول ڈالنے کی سوچی گئی۔ البتہ ایک نکتے کے متعلق سانڈرز کا رویہ بالکل قطعی تھا (یا کم از کم قطعی نظر آتا تھا) اور وہ یہ تھا کہ "ہمارے نقطہ نظر کے مطابق مغربی کنارے اور غزہ کا مستقبل یہ ہے کہ ان کی اردن کے ساتھ گہری وابستگی ہو۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس علاقے میں، جس کی پہلے ہی قطع برید ہو چکی ہے، ایک آزاد فلسطینی مملکت کا، قیام، جو اپنے دل کے کونوں کھدروں میں ذ(لسطین) واپسی کے جذبات پال رہی ہو، (سکے کا) حقیقی یا دیرپا حل ثابت نہیں ہو گا۔"[۲]

---

[۱] : یہاں مصنف نے انگریزی زبان کا لفظ "irredentist" استعمال کیا ہے اور یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو اس بات کا پرچار کرتا ہو کہ وہ علاقے، جو کسی زمانے میں اسکی اپنی قوم کی تحویل میں تھے لیکن اب ان پر غیروں نے قبضہ کر لیا ہے، بازیاب کرائے جائیں۔

[۲] MERIP Reports کی جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ۸ (دسمبر ۱۹۷۷) کے صفحات نمبر ۱۵ اور ۱۶ پر ہیرلڈ سانڈرز کا بیان۔

سانڈرز کے اس سارے بیان کی عمارت "امن اور اعتدال پسندی" کے اردگرد کھڑی کی گئی ہے اور صاف ظاہر ہے کہ یہ ترکیب اس لیے وضع کی گئی ہے تاکہ وہ "انتہاپسندی"، قوم پرستی اور موجود عسکری، معاشرتی اور معاشی صورتِ حال کی مخالفت کو بروئے کار نہ آنے دیا جائے۔ میرے خیال میں اس سے بھی اہم تر یہ رائے ہے جس کا اگرچہ کھل کر اظہار تو نہیں کیا گیا لیکن بین السطور مطلب سعدی خوب واضح ہے کہ ہر قسم کی آویزش ـــــ جائز یا ناجائز، معقول یا غیر معقول، حقیقی یا غیر حقیقی ـــــ امریکہ کے لیے ناخوب اور ناپسندیدہ ہے، کیونکہ "ہمارے" لیے یہ جو بات اہم ہے، وہ صرف یہ ہے کہ (علاقے میں) کوئی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ مشرقِ وسطیٰ کا تیل حاصل ہوتا رہے، وہاں اشیاء کی کھپت کی جو وسیع و عریض منڈیاں ہیں، وہ امریکی کارپوریشنوں کی دسترس میں رہیں اور امریکی حکومت اور مشرقِ وسطیٰ کی ہر بڑی "اعتدال پسند" انتظامیہ کے مابین دوطرفہ تعلقات قائم رہیں چنانچہ عربوں اور اسرائیلیوں کے مابین جو آویزش جاری ہے اس میں تخفیف یوں نہیں ہونا چاہیے کہ جن مسائل نے اس آویزش کو جنم دیا ہے، ان کو حل کر دیا جائے بلکہ اس آویزش میں کمی اس طریقے سے آنا چاہیے جو امریکہ سمجھتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے (جس کا خواہ مخواہ بتنگڑ بنایا جا رہا ہے)۔ اگر اس عمل میں علاقائی عسکری اور سفارتی مسائل بھی حل ہو جائیں تو سبحان اللہ (امریکہ کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے)۔ اسرائیل اور مصر کے مابین جو سمجھوتہ کرایا گیا، اس کا مقصد سانڈرز کے الفاظ میں امریکہ کو اس علاقے میں "ایک قومی موجودگی ـــــ نہ کہ محض حکومتی موجودگی" ہی عطا کرنا نہیں تھا بلکہ ان تمام مقاصد کو بھی حاصل کرنا تھا جن کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ فوقیت ایسے عسکری استتاق[1] قائم کرنے کے لیے مخصوص کی

---

[1] استتاق (Convergence) مختلف سمتوں سے ایک ہی نقطے یا مقام کی طرف پہنچنا۔

گئی جو امریکہ کے لیے تو مساعد ہوتے اور رجائی طور پر انتہا پسندوں، قوم پرستوں، اور عوامی تحریکوں کے لیے، جو حالات کا ایک مختلف عینک سے جائزہ لیتی تھیں، نامساعد ہوتے۔ اس کا ٹھوس نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اپنی جی حضوری کی بنا پر مصر اور اسرائیل مکمل طور پر امریکہ کی صنعت اسلحہ سازی کے دست نگر ہو گئے ہیں۔

آئیں! امریکہ کے پالیسی مفادات کو تھوڑا سا اور کھنگالیں۔ تیل اور جغرافیائی سیاست[1] کی اہمیت کی اساس جس عزم پر قائم ہے، وہ محض یہ نہیں کہ قوم پرستی اور انتہائی پسندی (یہ کبھی کھل کر نہیں بتایا جاتا کہ ان دونوں چیزوں سے مراد کیا ہے) کی مخالفت کی جائے بلکہ ان (مفادات) کے منطقی مخالفین کو تہس نہس کرنا ہے، اور یوں ایرانی اور فلسطینی تحریکوں جیسی قوتوں کے خلاف، جو کسی امریکی اتحاد کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں، غیر مشروط امریکی عداوت کا اعلان کرنا ہے۔ اور

---

[1] جغرافیائی سیاست (Geopolitics) یہ وہ مضمون ہے جس کا موضوع سیاست پر جغرافیے کے اثرات کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس مضمون میں یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی قوم کی پالیسی یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے علاقے حاصل کرے اور انہیں اپنے قبضے میں رکھے جہاں اس کے افراد خوراک اگا سکیں ضروری معدنیات تلاش کر سکیں اور جہاں وہ اپنے آپ کو بیرونی حملوں سے محفوظ تصور کریں۔ لیکن بعض اوقات یہ خطہ عسکری اعتبار سے اہم ہوتا ہے اور صرف اس وقت کام آتا ہے جب جنگ جاری ہو۔ برطانیہ نے جبرالٹر پر صرف اس لیے اپنا قبضہ برقرار رکھا ہوا ہے کہ وہاں اس کا ایک بہت بڑا بحری اڈہ ہے۔ یہ لفظ ۱۹۱۰ء میں سویڈن کے ایک باشندے نے گھڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سکینڈے نیویا اور جرمنی کے باشندے متحد ہو جائیں۔ ہٹلر نے اس تصور کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر جرمنی کو جوع الارض کا اصول اپنا لینا چاہیے۔ بہرحال اس فلسفے کا ماحصل یہ ہے کہ سیاسی حالات جغرافیائی حالات کے تابع ہوتے ہیں۔

مزید یہ کہ انسانی حقوق میں سرکاری دلچسپی کے باوجود[ل] جس کا اتنا زور شور سے ڈھول پیٹا جاتا ہے، امریکہ فعال طور پر ہر اس کوشش کے مخالفین کی صف میں شامل ہو جاتا ہے، جو جچہ گیر حکومتوں (اس بات سے قطع نظر کہ وہ کتنی ہی جابر اور غیر مقبول کیوں نہ ہوں) کو تبدیل کرنے کے لیے کی جائے۔ ایران میں اس کا مطلب محض یہ نہیں تھا کہ امریکہ شاہ کی حمایت کر رہا تھا بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ جنوری ۱۹۷۹ء میں شاہ کے ایران سے فرار کے بعد اس امید پر فوج کو تیل کی رسد پہنچائی گئی تاکہ مسلح افواج امام خمینی کے ساتھیوں کے خلاف انقلاب برپا کر سکیں گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اردن، سعودی عرب اور کویت کی مخالفت کے علی الرغم اسرائیل اور مصر کے مابین ایک علیحدہ صلح نامے پر دستخط کرا لیے جائیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسی حکومتوں کے ساتھ، جو ظالم و جابر ہیں اور باقی دنیا سے الگ تھلگ ہو چکی ہیں، امریکی مفادات کی وابستگی کا سلسلہ جاری رکھا جائے، جب کہ ان حکومتوں کی بڑی "خوبیاں" (یہ بات اسرائیل اور مصر پر بالخصوص صادق آتی ہے) یہ تھیں کہ وہ امریکی ہتھیاروں، قرضوں اور اس قسم کی ٹیکنیکی مہارت کے خوشدل وصول کنندہ تھے جو عوام کی ایک وسیع اکثریت کو ٹرانسسٹر (آلات) کا تو مزید شیدائی لیکن سیاسی طور پر انہیں ناخواندہ بنا دے گی کیونکہ ان عوام کے مفادات کی آبیاری کنٹکی[ت] طریقے سے چکن فرائی کرنے (مرغ بھوننا) کے

ل امریکہ کے مشہور ماہر لسانیات نوم چومسکی نے اپنی کتاب "انسانی حقوق اور امریکہ کی خارجہ پالیسی" (مطبوعہ سپوکس مین کمپنی، واشنگٹن ۱۹۷۸ء) میں اس سرکاری پالیسی کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑ دیا ہے (مصنف)

ت کنٹکی (Kentucky) امریکہ کی ایک ریاست کا نام۔ یہاں کی آدھی آبادی زراعت سے وابستہ ہے مختلف فصلیں کاشت کرنے کے علاوہ یہاں کے لوگ مویشی بھی پالتے ہیں اور مرغبانی کی صنعت بھی چلاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کے بعض لوگوں نے مرغ بھوننے کے جو طریقے نکالے ہیں، انہیں بہت شہرت ملی ہے متعدد ممالک کے تاجر اپنا کاروبار چمکانے کیلئے ان طریقوں کو استعمال کرنے کے حقوق حاصل کرتے رہتے ہیں۔

اجازت نامے[1] حاصل کرنے کو کاکولا اور ڈٹرائیٹ[2] کی ساختہ کاریں درآمد کرنے اور میری آٹ[3]
ہوٹلوں کے قیام سے نہیں ہو سکتی اور جہاں تک اس پالیسی کی ناکامی کا تعلق ہے، جس
کا عملی مظاہرہ، متعدد ممالک ——— ویت نام سے ایران، ایتھوپیا، افغانستان، پاکستان
اور ارادن تک — میں ہو چکا ہے، اس (ناکامی) کو تو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ البتہ پالیسی
کی نوک پلک دوبارہ سنواری گئی۔ اسے پہلے سے زیادہ مضبوط بنایا گیا اور اس میں رقوم بھی پہلے
سے کہیں زیادہ لگائی گئیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں شاہ ایران اور ایتھوپیا کے
ہیل سلاسی جیسی ناکامیاں برداشت کرنے کی اہلیت لامتناہی ہے۔

یہ درست ہے کہ جب تک امریکہ کو سادات اور بیگن جیسے پُراشتیاق اور بیقرار
گاہک ملتے رہیں گے، امریکی پالیسی بلا روک ٹوک ان کے حق میں مرتب ہوتی رہے گی۔ لیکن
یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایران کے بعد جہاں اربوں ڈالر مالیت کے ہتھیار اور

---

[1] اجازت نامہ (franchise) ایک صنعت کار کسی تاجر کو اپنا مال فروخت کرنے یا دوسرے صنعت کار کو اس قسم کا مال بنانے کا جو اختیار دیتا ہے اسے فرنچائز کہا جاتا ہے۔

[2] ڈائرائٹ (Detroit) امریکی ریاست مشی گن کا ایک شہر۔ صنعت موٹر سازی کا سب سے بڑا مرکز۔ پیکارڈ، لنکن، کیڈلک، کرائسلر اور پلائی ماؤتھ کاریں یہیں بنتی ہیں۔

[3] میری آٹ (Marriot) یہ امریکی بھی خوب قوم ہیں۔ دنیا کے مختلف سرمایہ دار بڑے بڑے ہوٹل تعمیر کرتے ہیں لیکن وہ انہیں چلانے کے حقوق امریکی کمپنیوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یہ کمپنیاں اپنے نام سے یہ ہوٹل چلاتی ہیں۔ لاہور کا ہلٹن ہوٹل (اواری)، کراچی کا شیرٹن ہوٹل اسی قبیل کے ہوٹل ہیں۔ میری آٹ بھی ایک ایسی ہی کمپنی ہے۔ کراچی میں بھی ایک ہوٹل اسی کے نام سے زیر تعمیر تھا، پھر پتہ نہیں کیا افتاد آپڑی کہ اس کی عمارت دس سال سے ادھوری پڑی ہے۔ آجکل وہاں شاید اُلو بول رہے ہیں۔

شاہ (اور اس کی خفیہ اور عام پولیس) کی حمایت میں دیے گئے متعدد پُرجوش بیانات
عام طور پر غیر مسلح لیکن بنیادی طور پر عوامی مخالفت کے آگے بند نہ باندھ سکے
اور شاہ کے تخت و تاج کا تحفظ کرنے میں ناکام رہے، کیا اسباق سیکھے گئے؟
غالباً جو کچھ سیکھا گیا، وہ براہ راست اس معاہدے میں، جو مصر اور اسرائیل کے مابین
کرایا گیا، ٹھوس شکل میں موجود ہے۔ اس معاہدے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ امریکہ
کوئی غیر تھوڑے ہی ہے۔ بلکہ وہ تو ان علاقائی حکومتوں جیسا ہی ہے (آپ کا جی
چاہے تو ان میں سے کسی بھی حکومت کی جگہ امریکہ کو بٹھا دیں، کوئی فرق نہیں پڑے
گا کیونکہ یہ سبھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں) جو غیر مبہم انداز سے یہ کہتی ہیں کہ وہ ان
معاشی وسائل سے، جو دراصل دوسروں کی ملکیت ہیں، چمٹے رہنے کے لیے جنگ کرنے
پر بھی آمادہ ہیں، جو ہر اس تحریک پر چڑھائی کرنے کے لیے تیار ہیں جو امن، اعتدال پسندی
اور ترقی کے متعلق درآمدہ خیالات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر راضی نہیں ہیں اور جو
امریکہ کے ان پیشگی اندازوں کے، کہ روس کیا کرنے والا ہے اور کیا نہیں کرنے والا ہے،
احترام میں عوامی بہبود کو بھی داؤ پر لگانے کے لیے بے چین رہتی ہیں۔

موجودہ سیاق و سباق میں اس قسم کے پالیسی خطوط کی خامیوں کا تجزیہ کرنے بلکہ
ان کی نشاندہی تک کرنے میں جو اصل مشکل پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ اور
لبرل دانشوروں نے ـــــ جنہیں ایک ایسی حکومت مہمیز دیتی رہتی ہے جس
کی مفادات کی مفت میں آبیاری ہو جاتی ہے ـــــ امن، اعتدال پسندی
جدیدیت اور ترقی جیسے تصورات کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مخصوص حکمت عملیوں
کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ آئی ایف۔ سٹون جیسے ممتاز صحافی اور تبصرہ نگار بھی، جو
نہایت جوش و جذبے کے ساتھ اپنی آزاد رائے کا اظہار کرتے ہیں، ان معاہدوں اور
فیصلوں کے خلاف، جو کیمپ ڈیوڈ میں طے پائے تھے۔ ایک لفظ تک نہ کہہ سکے

بلکہ اتنی دور نکل گئے کہ انہوں نے صدر کارٹر کو ایک ایپک[1] ہیرو قرار دے دیا[2]
جیسا کہ ستمبر ۱۹۷۸ء کے بعد دوسرے لبرل کالم نگاروں[3] کے استدلال سے مترشح
ہوتا ہے؛ عام خیال یہی تھا کہ "ہمارے پاس جو کچھ ہے، وہ بس وہی ہے جو کیمپ ڈیوڈ
(کے فیصلوں نے) نے ہمیں دیا"۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچا بھی نہیں
جا سکتا۔ ان فیصلوں کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں قیام امن کے متعلق جو خیالات و
تصورات پیش کیے جاتے ہیں، وہ بنیادی طور پر متشددانہ، رنگ میں بھنگ ڈالنے
والے اور شرارت آمیز ہیں۔ درحقیقت نظر کچھ یہی آتا تھا کہ بیگن اور سادات کے
مابین معاہدے کی صورت میں ایک قدم آگے بڑھایا گیا ہے۔ اور نیز کیا پھر اس کا یہ
مطلب نہیں تھا کہ آئندہ اسرائیل اور اس کے طاقتور ترین اور سب سے بڑے عرب
حریف کے مابین کوئی جنگ نہیں ہوگی؟ نیز کیا اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا تھا کہ دوسرے
عرب ممالک جنہوں نے کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کی مخالفت کی تھی، امریکہ دشمن، امن دشمن
اور یہود دشمن تھے؟ اور سب سے بہترین بات، کیا یہ صحیح نہیں تھا کہ فلسطینی مسئلے کے
نہ صرف وجود کے متعلق، بلکہ اسے حل کرنے کے ایک طریق کار کے متعلق بھی اولین بار
کھلے عام ایک بین الاقوامی سمجھوتہ طے پایا؟ کیا کیمپ ڈیوڈ میں طے پانے والے

---

[1] ایپک (Epic) یہ اس طویل نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص یا قوم کے شجاعانہ کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ ایسے واقعات جو مذہب یا حق و صداقت کی حمایت میں سرزد ہوں، اس قسم کی نظم کے لیے خاص طور پر مناسب سمجھے جاتے ہیں۔ رزم ایپک کے لیے لازمی خصوصیت نہیں لیکن واقعات کا پرشکوہ ہونا اور ان میں تسلسل کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ "رزمیہ نظم" غالباً درست نہیں ہے۔

[2] آئی ایف سٹون: "دی کیس فار کیمپ ڈیوڈ"۔ مطبوعہ "نیویارک ریویو آف بکس" مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء

[3] اس نکتے کے بارے میں ایک اور صحافی انتھونی لوئیس خاص طور پر بہت پرجوش تھا۔

معاہدوں کی ایک اضافی خوبی یہ نہیں تھی کہ ان کے ذریعے کمیونزم کو نکال باہر کرنے اور خوش کردار عربوں کے لیے امن اور خوشحالی کے اسباب فراہم کیے گئے تھے؟ تو کیا اب یہ دعویٰ نہیں کیا جائے گا کہ اپنی توانائیاں بیکار قسم کی جنگوں میں جھونکنے اور ضائع کرنے کے بجائے بالآخر عربوں اور یہودیوں کو امریکہ کے زیر اہتمام (اور اس کے اشیر باد کے ساتھ) نئے، ترقی پسند اور خوشحال معاشروں کی تعمیر کے کام میں جُت جانا چاہیے!

ایک طرف تو اس قسم کے دلائل کا انبار لگایا جا رہا تھا، لیکن ان دلائل کو جن اصطلاحات میں بیان کیا جا رہا تھا، وہی نئے سوالات بھی ابھار رہی تھیں جن کا کسی کو کوئی جواب نہیں سوجھتا تھا۔ دوسری طرف یہ حال تھا کہ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کے جو عواقب، خاص طور پر وہ جن کا تعلق مسئلہ فلسطین سے بنتا تھا، ظاہر ہونا تھے، ان کے بارے میں کامل خاموشی اختیار کر لی گئی۔ بلکہ نہایت رعونت اور اکڑ فوں کے ساتھ ان کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا گیا حالانکہ یہ رویہ تاریخی اصولوں کے سراسر خلاف تھا مغربی کنارے، غزہ اور جولان کی پہاڑیوں میں اسرائیل جو بستیاں تعمیر کر رہا ہے، کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں میں نہ صرف یہ کہ ان کا کوئی علاج نہیں سوچا گیا بلکہ ان کا ذکر تک نہیں کیا گیا لیکن آپ کو ڈھونڈے سے ایک بھی (مغربی) تبصرہ نگار ایسا نہیں ملے گا جس نے بھولے سے بھی اس فروگذاشت کا ذکر کیا ہو۔ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے کے بارے میں اسرائیلی پارلیمنٹ میں جو بحث ہوئی، اس میں بیگن نے واشگاف الفاظ میں یہ کہا کہ (کیمپ ڈیوڈ میں) جو تبادلۂ خیالات ہوا، جو سمجھوتے طے پائے وہ مصر اور "عربوں" کی نسبت اسرائیل کے زیادہ حق میں جاتے ہیں (بیگن کے الفاظ میں) صحرائے سینا تو مصر کے حوالے کر دیا جائے گا لیکن باقی (مقبوضہ) علاقے اسرائیل اپنی تحویل میں رکھے گا۔ کسی مبصر نے اس (دھاندلی) کے متعلق بھی ایک لفظ

تک نہ کہا۔ ایک بھی صاحب الرائے شخص نے یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین اور نیز ایک ایک فلسطینی کے پاس نام نہاد حکومت خود اختیاری کے منصوبے[1] کی مذمت کرنے کی وجہ موجود ہے ۔ یہ منصوبہ تو فریب بھی نہیں بلکہ علانیہ اپنے مقاصد پر روشنی ڈالتا ہے کہ اس کے ذریعے فلسطینیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسرائیل کے فوجی حکام کی ماتحتی میں کسی بنتوستان میں دھکیل دیا جائے گا حالانکہ بنتوستان جن اصولوں کے تحت قائم کئے جا رہے ہیں، (مثال کے طور پر) امریکہ نے بھی ان کی زبردست مذمت کی تھی کیونکہ ان سے حق خود ارادیت کے اصولوں کی نفی ہوتی ہے ۔ یہ درست ہے کہ کیمپ ڈیوڈ کے مذاکرات کے دوران میں اور ان کے بعد بھی یہی تاثر دیا گیا (ذرائع ابلاغ کے لیے "پس منظر" مہیا کرنے کے لیے جو اخباری کانفرنسیں منعقد کی جاتی تھی اور جن کے متعلق یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان کے انعقاد کی باقاعدہ اجازت دی جاتی تھی، ان میں شرما شرما کر اور لجا لجا کر یہ بات کہی جاتی تھی) کہ حکومت خود اختیاری کا منصوبہ اس "غیر منعکس" عمل کی طرف پہلا قدم ہے جس کا مقصد انجام کار فلسطینیوں کو ان کے حق خود ارادیت سے بہرہ ور کرنا ہے ۔ تاہم نہ تو کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ صدر سادات نے، جو فلسطینیوں کے خود ساختہ مربی بنے ہوئے تھے، معاہدوں کے متن میں اس کا کوئی اندراج کرایا ۔ البتہ ان معاہدوں کے ساتھ جو چند خطوط منسلک کئے گئے ہیں، انہوں (سادات) نے ان میں اس کا ذکر ضرور کیا تھا لیکن ان خطوط کے جواب میں اسرائیلیوں نے جو خطوط تحریر کئے تھے، ان میں اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیا تھا اور یوں مغربی کنارے کے باشندے اور دوسرے فلسطینی آزادی

---

[1] اسرائیل کسی قیمت پر بھی مقبوضہ عرب علاقوں سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ان علاقوں کے عرب باشندوں کو صرف میونسپل سطح کے اختیارات دینا چاہتا ہے ۔

کی جو آس لگائے بیٹھے تھے، اس پر پانی پھر گیا[۱] ۔ (صدر سادات کے دورۂ اسرائیل کے ساتھ ہی جو خاکہ بننا شروع ہوا تھا، وہ اب ایک واضح صورت اختیار کرتا جا رہا تھا تل ابیب سے بیت المقدس تک کار کے سفر کے دوران میں موشے دایان نے مصر کے قائم قائم وزیر خارجہ سے یہ کہا تھا۔ "صدر سادات سے کہیں کہ وہ اسرائیلی پارلیمنٹ کے سامنے جو تقریر کرنے والے ہیں، اس میں تنظیم آزادیٔ فلسطین کے ذکر کو بالکل حذف کر دیں[۲]۔ ۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء کو معاہدوں پر دستخط کرنے کے سلسلے میں جو تقریب منعقد ہوئی، اس میں تقریر کرتے ہوئے سادات نے فلسطینیوں کے کسی بھی ذکر سے عمداً اجتناب کیا مبادا اسرائیلی "برافروختہ" ہو جائیں۔) حکومت خود اختیاری کا یہ منصوبہ مقبوضہ طور پر فلسطینیوں کو کیا دینا چاہتا تھا، اس کی اگر کوئی دو ٹوک وضاحت ہو سکتی تھی تو وہ وہی ہو سکتی تھی جو اسرائیلی کرتے۔ اور اسرائیلیوں کی قطعی اور فیصلہ کن وضاحت وہ تھی جس کا اظہار وہ اپنے عمل کے ذریعے کر رہے تھے۔ جس روز "امن" کے معاہدوں پر دستخط ثبت ہو رہے تھے عین اسی روز اسرائیل نے اعلان کیا کہ مغربی کنارے پر، جہاں پہلے ہی جگہ جگہ یہودیوں کی ۷۰ بستیاں تعمیر ہو چکی تھیں مزید بیس (یہودی) بستیاں بسائی جائیں گی۔

مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل جس پالیسی پر عمل کر رہا ہے، میں اس کا ذکر کچھ دیر کے لیے اٹھائے رکھتا ہوں۔ یہاں یہ سوال پوچھا جانا چاہیئے کہ "امن کا عمل" فلسطینیوں کے

---

[۱] اس ضمن میں یہ خطوط قابل مطالعہ ہیں: سادات کا خط کارٹر کے نام۔ کارٹر کا خط سادات کے نام، بیگن کا خط کارٹر کے نام اور کارٹر کا خط بیگن کے نام۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۸ء کو کیمپ ڈیوڈ میں جو معاہدے طے پائے تھے، ان خطوط کی نقول ان کے ساتھ منسلک ہیں۔

[۲] ایک صحافی نے اس کی تفصیل فرانس کے ایک جریدے Le Monde Diplomatique (دسمبر ۱۹۷۷ء) میں دی تھی۔

ساتھ حقیقتاً جو سلوک روا رکھ رہا تھا اور اس کے متعلق فلسطینی (بلکہ پوری دنیا کے بیشتر لوگ) جو کچھ کہہ رہے تھے یا جو کچھ ان پر بیت رہا تھا، حکومت (امریکہ) اخبارات اور لبرل دانشوران کے درمیان کوئی تعلق کیوں قائم نہیں کر رہے تھے؟ جس روز واشنگٹن میں امن کے معاہدوں پر دستخط ہوئے، اس سے اگلے دن "نیویارک ٹائمز" میں مغربی کنارے کے ایک قصبے حلحول کے متعلق جوناتھن کینڈل کی ایک رپورٹ شائع ہوئی ہوا یہ کہ اس قصبے کے باشندوں نے پندرہ مارچ کو صلح نامے کے خلاف مظاہرے کئے۔ اس مظاہرے کے دوران میں اسرائیلی فوجیوں نے ایک اکیس سالہ محنت کش اور ایک سترہ سالہ طالبہ کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ اس مظاہرے کی پاداش میں قصبے کے آٹھ ہزار باشندوں کو اجتماعی تعزیر کا سزاوار ٹھہرایا گیا۔ قصبے میں مسلسل ۲۴ گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ٹیلی فون کاٹ دیئے گئے، تعلیمی ادارے اور کاروباری مراکز بند کر دیئے گئے اور کھیتوں میں کام کرنے کی ممانعت ہوئی۔ کینڈل مزید رقم طراز ہے۔

باہر کے کسی شخص کو قصبے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ مسلح اسرائیلی فوجیوں کی چوکس نگاہوں کے سامنے لوگوں کو دن میں ایک گھنٹے کے لیے اپنے گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت دی جاتی ہے تاکہ خواتین کھانے پینے کی اشیاء خرید سکیں، بچے ورزش کر سکیں اور مرد جنہیں زبردستی بیکار رہنے پر مجبور کیا گیا ہے، آپس میں گپ شپ لڑا سکیں۔

"اس سے مت بات کرو!" ایک اسرائیلی فوجی نے ایک رپورٹر سے چلا کر کہا، جس نے ایک گھنٹے کے وقفے کے دوران میں قصبے کی ایک مضافاتی شاہراہ پر ایک سن رسیدہ شخص سے بات کرنا چاہی تھی۔ "ان کے ساتھ کسی کو بات کرنے کی اجازت نہیں ہے!" ۲۷ مارچ ۱۹۷۹ء)

۱۹۷۸ء کے دوران میں جب امریکہ کے محکمہ خارجہ نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعلق اپنی رپورٹ شائع کی تو "نیویارک ٹائمز" نے حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا اور اپنے ایک اداریے میں اسے جھاڑ پلائی کہ وہ مسائل کو خواہ مخواہ خلطِ مبحث کا شکار بنا رہی ہے (ایک طرف وہ امن امن پکار رہی ہے اور دوسری طرف ایذارسانی کی "داستانیں" سنا رہی ہے)۔ گویا کہ مؤقر اخبار یہ کہنا چاہتا ہو کہ اس قسم کے امور، جیسا کہ ایک کے متعلق کینڈل نے اپنی رپورٹ بھیجی تھی، جن میں انسانی حقوق کے بارے میں تمام معاہدوں اور یادداشتوں کی مٹی پلید کر دی گئی تھی معمولی قسم کی غیر متعلقہ چیزیں تھے۔ میرے خیال میں اس سے بھی بدتر وہ مفروضہ تھا جو "امن کے عمل" کے متعلق تمام مباحث میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا کہ فلسطینیوں کو جو کچھ نہایت دریادلی کے ساتھ ان کی اپنی بھلائی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ انہیں اس پر مطمئن ہو جانا چاہیے حالانکہ نہ ان سے کبھی مشورہ کیا گیا، نہ ان کی کہیں نمائندگی ہوئی اور نہ انہیں کبھی قابل توجہ سمجھا گیا۔ اور یہ سب کچھ ایک ایسے وقت پر کہا جا رہا تھا جب مقبوضہ علاقوں کے لاکھوں فلسطینی باشندے، تنظیم آزادی فلسطین اور لغوی طور پر ہر مقام کے فلسطینی حکومت خود اختیاری کے منصوبے کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے تھے اور انہوں نے اپنے لیے حق ارادیت اور آزادی کے جو اہداف مقرر کیے تھے، ان کے متعلق وہ اصرار کر رہے تھے اور اپنی آواز دنیا کے کونے کونے میں پہنچا چکے تھے۔ سوال تو یہ ہے کہ آخر امریکہ میں کسی بھی شخص نے بیانگِ دہل یہ سوال کیوں نہیں اٹھایا کہ تقریباً چالیس لاکھ انسان جو کم و بیش دنیا کے ہر مقام پر بکھرے ہوئے ہیں، آخر ابھی تک کیوں اپنے اس مؤقف پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی جلاوطنی ختم کرنے اور اپنے مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے، جن کے انہیں ناقابلِ انتقال حقوق حاصل ہیں، اپنی جنگ جاری رکھیں گے؟ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس پر واقعی عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں

اور جو کچھ انہیں پیش کیا جا رہا ہے، اس کے متعلق وہ واقعی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

اس کے بجائے برزنسکی[1] نے فلسطینیوں کو مطلع کیا کہ ان کی جماعت "تنظیم آزادیٔ فلسطین" ختم ہو چکی ہے۔ "خدا حافظ، تنظیم آزادیٔ فلسطین"۔ انہوں نے فاتحہ پڑھ دی۔ صدر کارٹر جنہوں نے "عالی ظرفی" کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا کہ فلسطینیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو متعین کرنے کی کارروائی میں شریک ہوں" (جو کچھ کہا اور کیا جا رہا تھا، اس کے پیش نظر یہ کوئی معمولی رعایت نہیں تھی) تاہم اس کے ساتھ ان کا یہ استدلال بھی تھا کہ "ہمارے" نزدیک تنظیم آزادیٔ فلسطین امریکہ کی نازی پارٹی کو کلکس کلین[2] اور کمیونسٹ پارٹی سے مشابہ ہے "اور" ہماری یہ خواہش ہے کہ اس کا وجود صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے"۔ جب سے صدر کارٹر نے اپنا عہدہ سنبھالا ہے، وہ متعدد مواقع پر فلسطینیوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر چکے

---

[1] برزنسکی (Zbigniew Brzezinski) (۱۹۲۸ء -): صدر کارٹر کے پولش نژاد سیاسی مشیر۔ عقیدے کے اعتبار سے یہودی ہیں۔

[2] کو کلکس کلین (Ku Klux Klan) صدر لنکن کے زمانہ صدارت (۱۸۶۱-۶۵ء) کے دوران میں امریکہ میں خانہ جنگی برپا ہوئی تھی۔ ملک کی جنوبی ریاستیں کپاس کی پیداوار کے لیے مشہور تھیں۔ وسیع و عریض زرعی فارم گوروں کی ملکیت تھے لیکن ان پر کام حبشی غلام جنہیں افریقہ سے اغوا کر کے لایا جاتا تھا، کرتے تھے۔ صدر لنکن اور شمالی ریاستیں غلامی ختم کرنے کے حق میں تھیں۔ اس پر جنوبی ریاستوں نے بغاوت کر دی اور یوں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ انجام کار جنوبی ریاستیں ہار گئیں۔ ملک کا اتحاد برقرار رہا اور غلامی سرکاری طور پر ختم کر دی گئی۔ لیکن بعض سفید فام اس پر خوش نہ تھے۔ انہوں نے نہ صرف صدر لنکن کو قتل کرا دیا بلکہ ایک خفیہ تنظیم کو کلکس کلین کے نام سے قائم کی۔ اس تنظیم کا مقصد دہشت گردی کے ذریعے گوروں کا تفوق برقرار رکھنا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اس کا دوبارہ احیاء ہوا۔ اب اس کا کام گوروں اور کالوں کے درمیان نسلی تفریق برقرار رکھنا ہے۔

ہیں لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے، فلسطینیوں کے کسی نمائندے کے ساتھ بات چیت تو درکنار، انہوں نے ابھی تک اتنا بھی نہیں کیا کہ کسی بھی (ایرے غیرے ہی سہی) فلسطینی کو ملاقات کا شرف بخش دیتے۔ جہاں تک لبرل دانشوروں، امریکہ کی امن پسند یہودی "فاختاؤں"، شہری حقوق کے علم برداروں اور اس (امریکی) معاشرے میں اخلاقی اعتبار سے بلند و بالا شخصیتوں کا تعلق ہے —— ان میں سے آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے فلسطینیوں کے حقوق کے بارے میں کبھی کسی علانیہ مؤقف کا اظہار کیا ہو گویا کہ فلسطینی ایک ایسی گالی ہیں جس سے شرفا اور نستعلیق گو احباب کی مجلس میں احتراز کرنا چاہیے، گویا کہ وہ فلسطینی شہری باشندے، جن کے ساتھ اسرائیل —— خود اپنے اقرار کے مطابق —— نہایت منظم طریقے سے وحشیانہ سلوک کر رہا ہے، بالکل وہ لوگ نہیں تھے جنہیں یورش آور صیہونیت نے اپنے گھروں سے بے دخل کیا اور اپنی املاک سے محروم کیا تھا۔ ہاں وہی صیہونیت جو ابھی تک ان کے بچے کھچے علاقوں کو بھی اپنی نوآبادیاں بنانے کے درپے ہے۔ جب بھی مناحم بیگن کی اخباری نمائندوں سے ملاقات ہوئی، اس سے کبھی یہ نہیں پوچھا گیا کہ اس نے ایک ایسے منشور کے بل بوتے پر، جس کا مقصد دریائے اردن کے مغربی اور مشرقی دونوں کناروں[1] کا اسرائیل میں الحاق کرانا تھا، انتخابات میں کیسے کامیابی حاصل کر لی یا یہ کہ صیہونیت کے متعلق وہ جس اخلاقی جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی وہ فلسطینی معاشرے کی تباہی و بربادی کے ساتھ کیسے مطابقت کرتا ہے! لیکن اس کے برعکس جب کبھی یاسر عرفات کی اخباری نمائندوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی، ان پر ہمیشہ اس قسم کے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی گئی: "کیا آپ یہودیوں

---

[1] بیگن کی پارٹی کے منشور کی اس شق سے صیہونیوں کے عزائم پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ دریائے اردن کا مشرقی کنارہ لندن میں واقع ہے اور اس ایسے آج سے چند سال پہلے تک ملک کا نام ہی "مشرقی اردن" تھا

کو سمندر میں دھکیل دیں گے؟ کیا آپ اسرائیل کو تسلیم کریں گے؟ تنظیم آزادیٔ فلسطین کا میثاق کیا ہے؟ ـــــ لیکن کسی اخباری نمائندے کو کبھی اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ کھلم کھلا نہ سہی اشارۃً ہی کبھی اتنا کہہ دیتا کہ وہ (یاسر عرفات) اور فلسطینی، جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں، درحقیقت روزانہ ایک ایسی مملکت کے حملوں کا شکار ہو رہے ہیں جس کے سر پر انہیں نیست و نابود کرنے کا بھوت سوار ہے۔

یہ کہنا کوئی زیادتی نہیں ہوگا کہ مشرق وسطیٰ کے امن کے بارے میں امریکہ میں کسی قسم کے اختلاف کے بغیر جو لفاظی استعمال کی جا رہی ہے، اس کے ڈانڈے اس خواہش سے جا ملتے ہیں کہ مسئلہ فلسطین کے یا تو پُرخچے کیے جائیں یا پھر شاید کسی طرح اس کا ڈبہ ہی گول کر دیا جائے۔ یہ جو قطعی حل کے طور پر مسئلے کا ڈبہ ہی گول کر دینے کے متعلق سوچا جاتا ہے، پتہ نہیں کہ یہ پیشگی منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا ہے یا ویسے ہی، لیکن فلسطینی جس چیز کی اب مزاحمت کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ مسئلہ فلسطین دفن نہ ہونے پائے۔ چنانچہ آج کل "امن" کو جو یہ معنی پہنائے جا رہے ہیں کہ مسئلہ فلسطین کی اہمیت کم کر دی جائے یا اسے بالکل ہی ختم کر دیا جائے، اگر کوئی فلسطینی اس سے متفق ہوتا نظر نہیں آتا، تو کسی کو قطعاً کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور یہ اس وقت اور بھی زیادہ حیرتناک دکھائی دینے لگتی ہے جب ہمیں یہ یاد آتا ہے کہ صیہونی نو آبادکاری کے خلاف اپنی صد سالہ جدوجہد کے دوران میں فلسطینی عوام نے اپنی صفوں میں ایک بھی کوئزلنگ[1] پیدا نہیں کیا۔ اور ان کا کوئی نمائندہ

---

[1] کوئزلنگ (Vidkun Quisling) ۱۸۸۷ء میں ایک یورپی ملک ناروے میں پیدا ہوا۔ یہ اپنے ملک کا میر جعفر تھا کہ اس نے جنگ عظیم دوم کے دوران میں جرمنی کو اپنا ملک فتح کرنے میں مدد دی تھی۔ پہلے یہ فوجی افسر بنا اور پھر سیاستدان۔ ۱۹۳۱ء میں وہ ناروے کا وزیر دفاع مقرر ہوا تاہم دو سال بعد وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گیا اور اس نے اپنی فاشی پارٹی قائم کر لی۔ جب جرمنی نے ۱۹۴۰ء میں ناروے پر حملہ کیا، تو یہ ان کا مددگار بن گیا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بھی معاندقوتوں کی زبردست سے زبردست تنظیم کے بھی سامنے، جس کے تقدس پر مغربی طاقتوں نے بھی اپنی مہر ثبت کردی ہو، گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار نہیں اور نہ وہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ فلسطینی ان (معاندطاقتوں) کا دم بھرنے لگیں۔ حقیقی معنوں میں مشرق وسطیٰ میں امن کا قیام صرف دو راستے ہی اختیار کرنے سے ممکن ہے اور ان دونوں راستوں کے مابین جو خلیج حائل ہے، فی الحال بالکل انہی حقیقی معنوں میں ان کا پاٹا جانا ناممکن ہے۔ ایک راستے کا آغاز کیمپ ڈیوڈ سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ایک ایسی "حکومت خود اختیاری" پر ہوتا ہے جو غیر معین عرصے تک اسرائیل، مصر اور امریکہ کی تحویل میں رہے گی۔ اس کا جو یقینی نتیجہ برآمد ہوگا، وہ یہ ہوگا کہ آویزش جاری رہے گی، ہتھیاروں کی فراہمی (اور استعمال) میں روزافزوں اضافہ ہوتا رہے گا اور امریکہ اور اس کے حواریوں کے خلاف عوامی طاقتیں عددی اعتبار سے بڑھتی رہیں گی۔ اس راستے کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہے وہ یہ امید ہے کہ طاقت میں اتنی ترغیب ہے کہ اس کے سامنے حق خودارادیت کے حصول کے لیے فلسطینی عزم (خود بخود) چکنا چور ہو جائے گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اس میں نہ کوئی ہیر پھیر ہے اور نہ اگر مگر۔ تاہم اس بات سے قطع نظر کہ آپ جدیدیت، ترقی اور امریکی امداد کے وعدوں سے حقیقت کو خواہ کتنا ہی حسین بنا کر کیوں نہ پیش کریں، بنیادی مسئلے پر جو سودے بازی ہو رہی ہے، اس کے ضرررساں پہلوؤں کی شدت میں کوئی تخفیف نہیں کر سکیں گے۔ اور یہ سودے بازی کیا ہے، فلسطینیوں سے یہ عہدو پیمان کیا جارہا ہے کہ آپ کی قومی عدم آزادی کا سلسلہ جاری رہے گا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۲: اور اسکے عوض ملک کا وزیراعظم مقرر ہوا۔ تاہم جنگ کے بعد ۱۹۴۵ء میں وہ گرفتار ہوا۔ اس پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلا اور پھر اسے گولی ماردی گئی۔ اس نے دنیا کی زبانوں کو ایک نیا لفظ "کوئزلنگ (یعنی غدار) دیا ہے۔

اس راستے کے کنارے کنارے جو نشاناتِ راہ لگائے گئے ہیں، ہر فلسطینی کے لیے ان کا مفہوم سمجھنا نہایت آسان ہے۔ اگرچہ (مثال کے طور پر) آپ کو شاید ہی کوئی ایسا امریکی ملے گا، جسے ان علامتوں کو، جن کے ذریعے یہ نشانات ظاہر کیے جاتے ہیں، سمجھانے کے لیے کوئی مناسب ہدایت نامہ فراہم کیا گیا ہو۔ لیکن جب یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد کے چند سالوں کے دوران میں فلسطینیوں کو چار بڑی جنگیں لڑنا پڑیں[۱]، (یہ جنگیں، شام، اردن، اسرائیل اور لبنانیوں کے دائیں بازو نے شروع کی تھیں اور ان میں انہیں اکثر و بیشتر امریکہ کی کھلم کھلا حمایت حاصل تھی جو ابھی تک اپنے آپ کو فلسطینی حق خود ارادیت کی تائید کرنے کے لیے آمادہ نہیں کر سکا[۲]۔) تو فلسطینیوں کے جنگجویانہ رویہ سمجھنے میں کم دشواری پیش آئے گی۔ اس قسم کی پالیسی اپنانے کے بعد ایران میں جو کچھ ہوا ــــ جہاں امریکہ نے عوام کی زبردست اکثریت کے خلاف اپنے آپ کو ایک جابر کٹھ پتلی کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا ــــ اگر اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس قسم کا راستہ اختیار کرنے کے، جس میں امریکہ کو کہیں زیادہ براہ راست سرمایہ کاری کرنا پڑ رہی ہے، نتائج نہایت بھیانک ہوں گے۔ علاوہ ازیں، اسرائیل نے ایک ایسے مصر کے ساتھ علیحدہ معاہدۂ امن کر لیا ہے جو بظاہر اس بات پر خوش ہے کہ اسے اب لیبیا کے خلاف چکر چلانے کی کھلی چھٹی مل گئی ہے اور اسے ان سیاسی اور معاشرتی ذمہ داریوں سے بھی چھٹکارا

---

[۱] ۱۹۸۰ء کے عشرے کے دوران میں لبنان میں فلسطینی پناہ گزینوں کو جن آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا، ان کے بعد اس قسم کی جنگوں کا کوئی شمار ہی نہیں رہا۔ (مترجم)

[۲] اگر ان اخراجات کو پیش نظر رکھا جائے جو امریکہ کو فلسطینیوں کو منظرِ عام سے اوجھل کرنے کے سلسلے میں برداشت کرنا پڑ رہے ہیں، تو امریکہ کا یہ موقف اتنا معقول بھی نظر نہیں آتا (مصنف)

مل گیا ہے جنہیں اس کے رہنماؤں نے امریکہ سے علیک سلیک بڑھانے کے لیے ترک کر دیا ہے۔ (چنانچہ اب) اسرائیل فلسطینیوں اور بچی کھچی عرب قوم پرستی کے خلاف مزید جارحانہ کارروائیاں کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ امریکہ سے اسے تقریباً غیر محدود اسلحہ دھڑا دھڑ پہنچ رہا ہے۔ اپنی قوم کی اس حقیقی ضرورت کو، کہ کسی نہ کسی وقت اسے عرب دنیا کے ساتھ کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کرنا ہی ہوگا، پس پشت ڈال کر اسرائیل اب مستقبل کا سامنا کر رہا ہے۔

ان تمام امور کے پیش نظر یہ مفروضہ کیسے قائم کر لیا گیا ہے کہ ان سے مشرقِ وسطیٰ میں جامع امن کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی ہے، آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ہر وہ جائزہ، جو نہایت دیانتداری سے لیا گیا ہو، اس راستے کے صحیح ہونے کی تصدیق کر دے گا جس کا میں ذکر کرتا چلا آ رہا ہوں اور جس کے بارے میں اقبال احمد[۱] نے حال ہی میں تحریر کیا ہے: "یہ ورثے میں پائی ہوئی ان جبلتوں کی ایک مثال ہے جو رہنماؤں کو اتنا کورچشم بنا دیتی ہے کہ وہ تاریخ کے عمل کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتے۔"[۲] کیا ہر اس چیز کی مخالفت میں، جس میں مقبول عام قوم پرستی کا خفیف سا شائبہ بھی موجود ہو، امریکی رہنما اتنے کورچشم ہو چکے ہیں (ویت نام اور ایران کے واقعات کے بعد تو یہ حال ہو گیا ہے کہ کسی کو اتنی بھی فرصت نہیں رہی کہ

---

[۱] اقبال احمد نہایت ذہین و فطین پاکستانی دانشور ہیں اور وہ "واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی سٹڈیز" سے وابستہ ہیں۔ (مصنف)۔ اقبال احمد کئی مرتبہ پاکستان بھی آ چکے ہیں اور اپنے لیکچروں میں، جو انھوں نے مختلف مواقع پر یہاں دیئے، ان خطرات کی نشاندہی کر چکے ہیں جو پاکستان کو درپیش ہیں۔ وہ پاکستان کی موجودہ خارجہ پالیسی کے بھی بہت بڑے نقاد ہیں۔ (مترجم)

[۲] روزنامہ "نیو یارک ٹائمز" مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء

ان رہنماؤں کے رویے پر غور/تنقیدی جائزہ ہی لیں، ان کی اس کورچشمی اور بے بصیرتی کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جاتا ہے) کہ وہ اپنے ردعمل کا کسی اور صورت میں اظہار کرنے سے قاصر ہو چکے ہیں، ماسوا اس کے کہ وہ مزید اسلحہ دھڑا دھڑ جنت کرتے یا مہیا کرتے رہیں اور یا پھر اسرائیلی مصری معاہدۂ امن جیسی مزید سکیموں پر سرمایہ کاری کرنے کے لیے اپنی کوششیں تیز سے تیز تر کر دیں؟

یہ ضد، یہ ہٹ دھرمی، یہ تمرد خاص طور پر حوصلہ شکن ہے اور اسے ایک ایسی لفاظی کے ذریعے امریکی عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو ذہانت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسے وقت پر کیا جا رہا ہے جب کہ دوسرے مواقع ـــــ دوسرا راستہ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا تھا ـــــ واضح طور پر موجود ہیں میں اس راستے کی حقیقتیں آئندہ صفحات پر بیان کروں گا۔ یہاں میں صرف اس حقیقت کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ ہر عرب مملکت اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کو اس علاقے میں امن کی اساس کے طور پر قبول کر چکی ہے۔ تنظیم آزادی فلسطین اس بات کا عندیہ دے چکی ہے کہ اگر امریکہ فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کی حمایت میں جس کا نقطۂ عروج ایک آزاد مملکت کا قیام ہو گا، اعلان کر دے تو وہ جوابی کارروائی کے طور پر امن کے متعلق نہایت ٹھوس تجاویز پیش کر دے گی۔ مزید براں جدید فلسطینی تاریخ میں پہلی مرتبہ مندرجہ ذیل امور کا ظہور ہوا ہے:

(الف) صحیح، سچی اور جائز فلسطینی قیادت۔

(ب) فلسطینی قومی اتفاق رائے (اجماع)۔

(ج) ان دونوں صورتوں میں نہ صرف اپنے حق خود ارادیت کے خدوخال (ان خطوط پر جن کا تعین فلسطینی قومی کونسل نے اپنے گزشتہ تین اجلاسوں ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۹ء میں کیا تھا) کی وضاحت کرنے کی بلکہ اپنے موقف

کو کچھ اس طرح تبدیل کرنے کی صلاحیت تاکہ فعال انداز سے امن کو فروغ دیا جاسکے۔

یہ امور تو اپنی جگہ موجود ہی ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور باتیں بھی ہیں:

۱۔ امریکہ کے ساتھ مستقبل میں تعلقات استوار کرنے کے متعلق عرب قیادت کا واضح جھکاؤ "اعتدال پسندی" کی طرف ہے۔

۲۔ اس کے باوجود کہ امریکہ عرب قومیت کی مخالفت کرتا چلا آرہا ہے (اور اس کی اس مخالفت کا عرصہ پوری ایک نسل پر محیط ہے) یہی عرب قیادت اب بھی اس بات پر آمادہ ہے کہ اسے امریکہ کے متعلق جو حسن ظن تھا، اسے برقرار رکھا جائے۔

اگر ان تمام امور اور باتوں کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو پھر امریکیوں کو ایک ایسی پالیسی کی طرف جو پہلے کی نسبت زیادہ فراخ دلی پر مبنی ہو اور جس میں خبطِ عظمت کا احساس بھی نسبتاً کم ہو، کشاں کشاں کھنچے جانا چاہیے۔

اب سوال یہ ہے کہ امریکہ کب تک نیک، عرائم اور امن کی زبان استعمال کرتا رہے گا جب کہ عملاً وہ اس زبان کے بالکل متضاد مقاصد کے حصول کے راستے پر گامزن ہے؟ اپنے متعدد دوسرے پیش روؤں کی طرح صدر کارٹر بھی ہر شخص کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تنگ نظری، عسکریت دھڑے بندی اور مداخلت کاری کے ذریعے کسی وقت بھی ایک منصفانہ اور جامع امن کا مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میرا نکتہ یہ ہے کہ جبتک آپ ان اصطلاحوں کیساتھ، جو محدود مفاہیم کی حامل ہیں چمٹے رہیں گے، کوئی تبدیلی عمل میں نہیں لا سکیں گے کیونکہ اس قسم کی تبدیلی کی اساس اس امر پر رکھی جارہی ہے (اور تاریخی طور پر بھی یہی ہوتا رہا ہے) کہ فلسطینی اپنے قومی وجود سے دستبردار ہو جائیں۔ ان دو باتوں کے مابین جو ناقابل قبول گرہ" لگائی جارہی ہے، جبتک اسکی تفہیم نہیں کیجائیگی، التباسات، تشدد اور انسانی جانوں کے ضیاع کا سلسلہ جاری رہیگا۔

مصر، اسرائیل اور امریکہ معاہدے میں اور کیا کچھ شامل تھا؟

جب ۲۶ مارچ ۱۹۷۹ کو واشنگٹن میں جمی کارٹر، انور السادات اور مناحم بیگن تمتماتے چہروں کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس معاہدۂ امن پر، جس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ کی مشکلات و مصائب کے خاتمے کا نقطۂ آغاز بن جائے گا، دستخط کرنے کے لیے تیار کھڑے تھے تو اس لمحے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس مہیب، دہشت ناک اور پیچ در پیچ تاریخ کو صفحۂ ہستی سے محو کرنے کی فکر میں ہیں جس نے انہیں اتنی کامیابی اور طمطراق کے ساتھ عالمی سٹیج کے عین مرکز میں لا کھڑا کیا تھا (اور تمام دنیا کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں)۔ تصویر کا یہ رُخ، جس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ اب آویزش اور مخاصمت کے دور کا خاتمہ ہو جائے گا، کتنا طاقتور نظر آتا تھا۔ لیکن افسوس، صد افسوس، یہ تصویر حقائق کی سچی تصویر نہیں تھی۔ بلکہ یہ تو ایک مسلسل جدل کے متعلق، جس کے خلاف امریکہ نے اپنی بے پناہ قوت براہ راست جھونک دینے کا سرکاری طور پر پہلی مرتبہ عہد و پیمان کیا تھا، بس ایک قسم کی ٹیلی ویژن کی اشتہاری فلم تھی اور اس سے زیادہ وہ کچھ اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ (جب ادھر معاہدۂ امن پر دستخط ثبت ہو رہے تھے) عین اسی وقت لگ بھگ ایک سو امریکی فوجی مشیر

شمالی یمن کی حکومت کو جنوبی یمن کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھنے کے لیے اپنے
مشوروں سے نواز رہے تھے۔ جہاں تک خطے کے باقی ممالک کا تعلق ہے،
وہاں بھی امریکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ نہایت خاموشی اور رازداری
کے ساتھ ہر اس طبقے، جماعت یا حکومت کی جو عوامی "بدنظمی" عدم استحکام، یا
نام نہاد بحران کے خلاف صف آراء تھی، دامے، درمے اور سخنے مدد بھی کر رہا تھا
اور انہیں ہلہ شیری بھی دے رہا تھا (جہاں تک سعودی عرب اور اردن کا تعلق
ہے، وہ ان کی ناز برداری بھی کر رہا تھا اور چاپلوسی بھی)۔ خود اپنی تاریخ کے جن عوامل
ـــــ آزادی اور انسانی حقوق کے حصول اور جبر و استبداد سے رہائی پانے کی جدوجہد
ـــــ کو امریکہ کبھی خراجِ تحسین پیش کرنے سے نہیں چوکتا، مشرقِ وسطیٰ کے بارے
میں اس نے جو موقف اختیار کر لیا تھا، اس کے پیش نظر یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ
وہاں وہ ایسے طبقوں کی حوصلہ افزائی کرتا جو اپنے لیے انہی چیزوں کے حصول کیلئے
برسرِپیکار تھے۔ جب حال یہ ہو کہ ایک طرف تو عوام کے ذہنوں میں اسلامی سرکشی
کے خلاف نفرت، کراہت اور خوف کے جذبات بھی کوٹ کوٹ کر بھرے جا رہے
ہوں[1] اور دوسری طرف ان قیمتوں کے خلاف، جو عربوں نے اپنے تیل کی مقرر کی
تھیں، غم و غصہ میں اضافہ ہو رہا ہو، انتظامیہ کی اسی کوشش کو جو مصری اسرائیلی معاہدے
کو ایک معرکے کی چیز بنا کر پیش کرنے کے ضمن میں کی جا رہی تھی، عام سوجھ بوجھ پر مبنی اچھی
خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مارچ کے اواخر میں نیویارک ٹائمز اور کولمبیا براڈکاسٹنگ

---

[1] ۔ اسلامی مشرق سے مغربی تہذیب کو جو نام نہاد خطرات لاحق ہیں، ان کے متعلق
لاتعداد مضامین، مقالات اور کتب منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں اور ہر شخص کی نظروں سے
گزرتی رہتی ہیں۔ (مصنف)

سسٹم[1] نے مشترکہ طور پر ایک محدود رائے شماری[2] کا انتظام کیا۔ جب اس رائے شماری کا تجزیہ کیا گیا تو انکشاف ہوا کہ (امریکی) عوام کی ایک بھاری اکثریت اس معاہدے سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی (امریکہ کو) جو قیمت چکانا پڑ رہی تھی، عام لوگوں کے تخمینے کے مطابق وہ بہت زیادہ تھی۔ مصر اور اسرائیل کو اسلحہ کی فراہمی کے لیے جو رقم مہیا کی جانا تھیں (اس سلسلے میں مختلف اندازے لگائے گئے ہیں جو پانچ ارب اور پندرہ ارب ڈالر کے مابین ہیں) ان کے بارے میں عوام کے ایک بہت بڑے طبقے نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ۷۰ فیصد سے زیادہ جواب دہندگان کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ امریکہ نے اسرائیل کو آئندہ پندرہ سالوں تک تیل مہیا کرنے کا قول دیا ہے[3]۔

---

[1] امریکہ میں ریڈیو اور نشریات کا انتظام نجی اداروں کی تحویل میں ہے۔ جس شخص کی جیب میں چند پیسے ہوں، وہ اپنا ریڈیو یا ٹی وی سٹیشن کھول لیتا ہے۔ آمدنی کا ذریعہ اشتہارات ہیں۔ لیکن جن کمپنیوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر اہمیت حاصل ہے۔ وہ "کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم" (C.B.S)، "امریکن براڈ کاسٹنگ کمپنی" (A.B.C) اور "نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن" (N.B.C) ہیں۔

[2] یہ دیکھنے کے لیے کہ مختلف معاملات کے بارے میں عوام کیا سوچتے ہیں محدود رائے شماری کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مختلف طبقوں کے چیدہ چیدہ افراد کو خطوط بھیج دیئے جاتے ہیں۔ یا رائے شماری کرانے والے اپنے نمائندے بالمشافہ ملاقات کے لیے روانہ کر دیتے ہیں۔ اس طریقے سے جو آراء موصول ہوتی ہیں، انہیں عوام کی رائے تصور کر لیا جاتا ہے۔ کیونکہ رائے دینے والوں کا تعلق ہر طبقے سے ہوتا ہے۔ عام انتخابات سے پہلے اس قسم کی رائے شماری کا عام رواج چل پڑا ہے۔ سب سے پہلے اس طریقے کو امریکہ کے ایک شخص جارج ہوریس گیلپ (Gallup) (سال پیدائش ۱۹۰۱ء) نے استعمال کیا تھا۔ اس لیے اس قسم کی رائے شماری کو "گیلپ پول" کہا جاتا رہا۔ اب جو شخص یا ادارہ یہ رائے شماری کراتا ہے، وہ اپنا نام ساتھ لگا دیتا ہے۔

[3] تفصیلات کے لیے روزنامہ "نیویارک ٹائمز" کا شمارہ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء ملاحظہ فرمائیں۔

تاہم، جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں، یہاں ایک ایسا تناقضہ پایا جاتا ہے، جس سے صرفِ نظر کرنا نری بد دیانتی ہوگی۔ جمی کارٹر پہلے صدر تھے، جنہوں نے اگرچہ تجریدی طور پر ہی سہی لیکن پہلی مرتبہ سنجیدگی کے ساتھ فلسطینی قوم کا ذکر کیا تھا۔ شمعون پیریز[1] جیسے مخالف پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے اسرائیلی رہنماؤں نے بھی پہلی مرتبہ فلسطینی حقوق اور/یا مفادات کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ معاملہ ماضی کے مقابلے میں خاصا مختلف ہو چکا ہے چنانچہ یہ امر تسلیم کر لیا گیا کہ فلسطینی ایک ایسی موجودگی ہیں جن کے ساتھ سنجیدگی سے نپٹنا ہوگا۔ تاہم یہاں ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ مخالف پارٹیوں کے ان رہنماؤں کو سیاسی طور پر اتنا سخت دھچکا لگا اور ان کا اپنا وجود اس قدر مسلسل خطرے کی زد میں رہا کہ انہیں عرب دنیا کے باہر اپنے مؤقف اور ضروریات کے پیچیدہ نکات کا ابلاغ کرنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جب فضا اس قسم کی ہو چکی تھی، تو پھر معاہدے میں انہیں نظر انداز کیوں کر دیا گیا اور یا اگر ان کے بارے میں کوئی توجہ دی گئی تو وہ نہ ہونے کے بغیر کیوں تھی؟ اور کیا کچھ وقوع پذیر ہونے والا تھا جس کے بارے میں آنکھیں بند کر لی گئیں؟

آئیں۔ ہم اپنی گفتگو کا آغاز مصر کے حوالے سے کرتے ہیں۔ صدر سادات کے متعلق لوگوں کا رویہ یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کج بحثی پر اتر آتے ہیں (عرب دنیا میں ان

---

[1] اسرائیل کی لیبر پارٹی کا سربراہ۔ پیریز خود بھی اسرائیل کا وزیر اعظم رہ چکا ہے۔ اسرائیل میں دراصل زیادہ عرصہ لیبر پارٹی ہی برسر اقتدار رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے کے وسط میں بیگن کی لیکوڈ پارٹی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ۱۹۸۳ء میں بیگن سیاست سے ریٹائر ہو گیا۔ اس کے بعد جو انتخابات ہوئے، اس میں کسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ لیبر پارٹی اور لیکوڈ پارٹی کو مخلوط حکومت بنانا پڑی۔ معاہدے کے مطابق پہلے دو سال پیریز وزیر اعظم رہا۔ آجکل وہ اسی مخلوط حکومت میں وزیر خارجہ ہے۔ تاہم فلسطینیوں کے متعلق ان دونوں پارٹیوں میں اچھا خاصا اختلاف دیکھنے میں پایا جاتا ہے۔

کی مخالفت میں اور مغرب میں ان کی حمایت میں دلائل کے ڈھیر لگا دیے جاتے
ہیں)۔ چنانچہ وہ بھی ایک ایسی تمثال (امیج) بن چکے ہیں جس کی نہ کوئی تاریخ ہو اور نہ
کوئی سیاسی مفہوم۔ یہ بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اقوام متحدہ
کے سیکریٹری جنرل کے نمائندے کی حیثیت سے سویڈن کے سفارت کار گنار
جارنگ مشرق وسطیٰ کا دورہ کر رہے تھے۔ جارنگ کے ساتھ اپنی ملاقات کے
دوران میں ہی سادات نے یہ وعدہ کر لیا کہ اگر انہیں (مفتوحہ) علاقہ[1] واپس کر دیا جائے
تو اس کے عوض میں وہ اسرائیل کو تسلیم کر لیں گے اور اس کے ساتھ نارمل تعلقات
قائم کر لیں گے۔ انہوں نے اپنی سیاست میں مصر کی جو مرکزی پشت پناہ بنائی
ہے، اس میں فلسطینی شعبے کی حیثیت ایک ضمیمے سے بڑھ کر نہیں۔ ہاں، اپنے اس
رویے میں وہ صدر ناصر سے بھی، اور شامی بعث[2] پارٹی کے ارکان سے بھی جو عالم
عرب میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے سلسلے میں مصر کے حریف تھے، مختلف ہیں[3]
تاہم ان دونوں کے فلسفوں[4] کو عالم عرب میں اپنا تفوق برقرار رکھنے کے لیے دو نئے
حریفوں کی چشمک کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک حریف تو سادات کا مصر اور
دوسرا اسرائیل کی دولت سے مالا مال سعودی عرب تھا اور ایک لحاظ سے یہ دونوں نئے

---

[1] یہاں مراد مصر کے علاقے صحرائے سینا ہے جس پر ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دوران میں اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا۔ تاہم مصر اور اسرائیل کے معاہدہ امن کی شرائط کے تحت اسرائیل نے اسے واگزار کر دیا ہے۔

[2] بعث پارٹی ایک بائیں بازو کی جماعت ہے۔ یہ مختلف ممالک میں کام کرتی ہے۔ لیکن ہر ملک میں اس کا انداز سیاست دوسرے ملک کی پارٹی کے انداز سیاست سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔ شام اور عراق دونوں کے حکمران بعث پارٹی کے ارکان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن ان کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔

[3] ملاحظہ فرمائیں میلکم کر (Kerr) کی کتاب "The Arab Cold War" (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن، ۱۹۷۱ء)۔

[4] یہاں صدر ناصر اور بعث پارٹی کے فلسفے مراد ہیں۔

حریف عربوں کے اس کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں جسے غیر قوم پرست کیمپ کہا جاسکتا ہے۔ اب تک عالم عرب میں عموماً جس انداز کی سیاست چلائی جارہی تھی، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ماورائے ممالک تھی اور ہمہ عربیت پر زور دیتی تھی۔ لیکن بیسویں صدی میں یہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں مختلف ممالک نے اپنی انفرادی حیثیت سے پر پرزے نکالنا شروع کردیئے اور وہ کوشش کرنے لگے کہ ان کی چھاپ ساری عرب دنیا پر لگ جائے۔ ۱۹۷۳ء میں سادات نے اسرائیل کے خلاف جس جنگ کا آغاز کیا تھا، اس میں ان کی کوشش یہ تھی کہ اسے مصر کی سیاسی جنگ کے طور پر لڑا جائے اور انھوں نے جس موقع پر اسے شروع کیا تھا، اس کا انتخاب بھی بڑی احتیاط سے کیا گیا تھا تاکہ بعد میں پیش آنے والے واقعات میں امریکہ کو بھی براہِ راست ملوث کیا جاسکے۔ جب بعد ازاں سادات نے یہ کہا کہ مصر اور اسرائیل کے مابین جو رکاوٹیں حائل ہیں، وہ نفسیاتی نوعیت کی ہیں، تو درحقیقت وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اس صدی کے دوران میں ایک بھی ایسا عرب رہنما منظر عام پر نہیں آیا جس نے صیہونیت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خود اس کا اپنا علاقہ منتخب کیا ہو۔ یہ علاقہ کون سا تھا اور کہاں تھا؟ یہ علاقہ دراصل مغرب کا وہ نفسیاتی اور ثقافتی میدان تھا جہاں صیہونیت بلا شرکت غیرے حکمران تھی اور صیہونیت وہاں اس لیے بلا شرکت غیرے حکمران تھی کیونکہ عربوں نے وہاں کبھی قدم رکھنے کی جرأت ہی نہیں کی تھی۔ یہ کہ سادات نے وہاں صیہونیت کے مقابلے پر آنے کا قصد کیا تھا، اسرائیل سے دور مغربی شعور میں اپنے لیے تائید و حمایت حاصل کرنا چاہا تھا، ان کا ایک کارنامہ تھا۔ اور ۱۹۷۳ء کی جنگ اس سلسلے کی پہلی اہم چال تھی جس نے انجام کار انہیں پہلے بیت المقدس اور بعد میں واشنگٹن پہنچانا تھا۔ لیکن سادات نے اپنی انتہائی تخلیقی چال بے دردی کے ساتھ ضائع کردی۔

یقیناً ان کا یہ پروگرام سراسر مصری تھا اور یہ محض اتفاق کی بات نہیں تھی کہ اس کا بڑا حصہ جمال عبدالناصر کے پروگرام، ورثے اور عرب دنیا میں ان کے مقام کو تخریبانہ انداز سے منہدم کرنے پر مشتمل تھا۔ سادات نے جو حکمتِ عملی وضع کی تھی، اس کے مؤثر ہونے کا انحصار اس بات پر نہیں تھا کہ اسرائیل کے ساتھ براہِ راست ٹکر لی جائے بلکہ اس بات پر تھا کہ اسرائیل کو امریکہ میں تائید و حمایت کی جو اجارہ داری حاصل تھی، اس کا توڑ کیا جائے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ جب تک وہ اپنی اعتدال پسندی برقرار رکھ سکیں گے اور دنیا کی نگاہوں کا مرکز بنے رہیں گے، اسرائیل اپنے ردِ عمل کا اظہار اس طور کرے گا کہ جن علاقوں پر اس کا قبضہ ہے، وہاں وہ اپنی گرفت مضبوط بنانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں اسرائیل کے مؤقف میں شگاف ڈالنے کا موقع دستیاب ہوتا رہے گا۔ اس حد تک تو یہ بات واضح تھی کہ امریکہ کی براہِ راست امداد اور حمایت کے بغیر اسرائیل کوئی جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔ یہ بات بھی واضح تھی کہ سادات امریکہ، اسرائیل اور مصر کو آپس میں نتھی کرنے کی جتنی کوشش کریں گے، ان کی اپنی پوزیشن اتنی ہی مضبوط ہوگی اور اس کے مقابلے اسرائیل کی پوزیشن اتنی ہی کمزور ہوگی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے سوویت یونین کے ساتھ اپنے تمام تعلقات اور روابط بالکل منقطع کر دیے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سادات پہلے عرب رہنما تھے جنہوں نے صیہونیت کو اپنے ان مؤقفوں سے، جن پر وہ پہلے ڈٹی ہوئی تھی، پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور یہی ان کی ہمہ وقت حکمتِ عملی رہی۔ ان کے مقابلے میں سعودی عرب کے حکمرانوں کی بے پناہ دولت، جس کا سنبھالنا بھی دشوار ہوتا جا رہا تھا، ان کے اپنے پاؤں کی زنجیر بن چکی تھی اور پھر اس تفاوت نے جو ان کی دولت اور ان کی سیاسی اور فوجی قوت کے مابین پایا جاتا تھا، انہیں بالکل اپاہج بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کچھ

بھی کرنے کے قابل نہ رہے ۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کر سکتے تھے کہ کسی ہنگامی صورتِ حال سے نپٹ لیں یا لبنان کے دائیں بازو اور تنظیم آزادئ فلسطین جیسی ایک دوسرے سے متصادم قوتوں کو عام طور پر زبردست مالی امداد فراہم کر کے عالم عرب میں مخالفت کی طوفانی لہروں کو محدود کرنے کی کوشش کریں اور یہی انہوں نے کیا ۔ یوں مصر اور سعودی عرب دونوں ہی عرب قوم پرستی کی اس آگ کو سرد کرنے کی کوشش کرنے لگے ، جو ابھی شدید طور پر بھڑک رہی تھی ، جسے لبنان کے تصادم نے اور ہوا دے دی تھی اور یوں اسے مزید بھڑکا دیا تھا ۔ چنانچہ فیصلہ کن اور قطعی اہمیت کا حامل سال ۱۹۷۵ء کا سال تھا کیونکہ یہی وہ سال ہے جس کے دوران میں مصر اور شام کے راستے ، جو ۱۹۷۳ء کی جنگ میں ایک دوسرے کے حلیف تھے ایک دوسرے سے مختلف ہونا شروع ہو گئے ۔ اور دونوں کے مابین اختلافات کی جو خلیج حائل ہونے لگی تھی ، اب وہ فیصلہ کن انداز سے اتنی وسیع و عریض ہو چکی تھی کہ اس کا پاٹنا ناممکن ہو گیا ۔ اول الذکر کام سینائی دوم[۵] نے کیا اور موخر الذکر لبنانی جنگ نے سر انجام دیا ۔ صدر سادات نے سینائی دوم کی صورت میں جو قدم اٹھایا تھا ، وہ اس لیے اٹھایا تھا تاکہ وہ اپنا کھویا ہوا علاقہ واگزار کرا سکیں ۔ شام کو بھی کڈھب صورت حال کا سامنا تھا کہ اسے بھی اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینا تھا ۔ لیکن مصر کے برعکس وہ اپنے اس مسئلے کا جائزہ عربوں کی اصطلاحوں میں لیتا تھا اور

---

۵ ۔ یہ معاہدہ سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی کوششوں سے اسرائیل اور مصر کے مابین یکم ستمبر ۱۹۷۵ء کو طے پایا تھا ۔ اس کے تحت فریقین نے جنگ بندی کا احترام کرنے اور اپنے اختلافات پرامن طریقوں سے طے کرنے کا عہد کیا تھا ۔ امریکہ یہ معاہدہ کرانے میں اس لیے بے چین تھا کیونکہ عربوں نے تیل فروخت نہ کرنے کا جو عہد کیا تھا ، ہنری کسنجر نے اپنے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ "پانچ لاکھ امریکیوں کو اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے ۔ قومی پیداوار میں دس ارب ڈالر کی کمی واقع ہوئی ۔ قیمتوں میں جو بے تحاشا اضافہ ہوا ، وہ اس پر مستزاد ہے ۔" دی مڈل ایسٹ ۱۹۱۴ء - ۱۹۷۹ء ۔ از ڈی ۔ بی فریزر

چاہتا تھا کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو ایک جامع سمجھوتے کے بعد واگزار کرائے۔
ان دونوں نے اس معاملے میں جو جو مؤقف اختیار کیا، آج تک وہ ایک دوسرے کے متضاد ہے اور آج کل لبنان میں شام جس طور ملوث ہے، اس سے (اس کے حمائتیوں کی نظروں میں) عرب بین الاقوامیت کی اہمیت عیاں ہوتی ہے جب کہ اس کے مخالفوں کے نزدیک لبنان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس پالیسی کے نتائج دلدل میں دھنسے جانے کے مترادف ہیں۔ شام لبنان میں جو کچھ کر رہا تھا اس کے پیچھے) شامی بعثیوں کی یہ سوچ کارفرما تھی کہ عرب قوم پرستی کو ان تمام کوششوں پر، جو اجتماعی عرب حلقہ بندی (جس کے بعثی اپنے آپ کو نگران تصور کرتے تھے) کی زنجیر کو توڑنے اور اس سے باہر نکلنے کے لیے کی جائیں، تفوق حاصل ہے۔ (چنانچہ شام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لبنان میں مداخلت کرے اور ان فریقوں کے خلاف، جن کے متعلق وہ سمجھتا ہے کہ وہ عرب حلقہ بندی سے باہر نکلنا چاہتے ہیں، جنگ کرے)۔ چنانچہ وہ اسی جوش و جذبے کے ساتھ وہ مصری تخصیص پسندی[۱] اور سب سے بڑھ کر فلسطینی قوم پسندی سے، جس کے مقاصد عربوں کے نزدیک ان کی مقدس ترین متاع ہیں، بھی ٹکر لینے کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی فوجوں نے جون ۱۹۷۶ء میں تنظیم آزادی فلسطین کے ٹھکانوں پر، جس کے متعلق صدر اسد کا خیال تھا کہ اس نے فلسطینی قوم پرستی کے مقاصد سے غداری کی ہے، زبردست چڑھائی کر دی۔

اس سیاسی معاہدے نے، جس کے خدوخال اکتوبر ۱۹۷۶ء میں ریاض کانفرنس میں متعین کئے گئے تھے، سعودیوں کے زیر اہتمام مصر، شام اور تنظیم آزادی فلسطین کو

---

[۱] تخصیص پسندی (Particularism) یا فرقہ پرستی۔ کسی فرقے یا انتظامی علاقے مثلاً صوبے کے خاص مفادات کے ساتھ پرجوش عقیدت اور وفاداری کا اظہار کرنا اور پورے ملک (یا خطے) کے مفادات سے نظریں پھیر لینا۔

دوبارہ مگر بالکل عارضی طور پر ایک دوسرے کو تعلقات کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ پھر جمی کارٹر کا ستارہ طلوع ہوا اور وہ اقتدار کی مسند پر متمکن ہو گئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسطینیوں اور جامع امن کے بارے میں بیانات کا تانتا باندھ دیا۔ ادھر عرب دنیا کی بے بسی ملاحظہ فرمائیں۔ کیا حکومتیں، کیا عوام، سبھی ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ان بیانات کی اہمیت کا تو صحیح اندازہ لگا سکا اور نہ ان کا کوئی تدارک کر سکا۔ چنانچہ صدر کارٹر کا برسر اقتدار آنا اہم تبدیلیوں کا سبب بنا۔ ایک موقع تو ایسا بھی آیا جب یہ بات تقریباً یقینی نظر آتی تھی کہ صدر کارٹر ـــ خواہ یہ ان کے مزاج کی وجہ سے تھا، یا پھر انہوں نے حالات کا جو تجزیہ کیا تھا اس نے انہیں یہ راہ سجھائی تھی ـــ (مشرق وسطیٰ کی) آویزش کے حل کے بارے میں عرب قوم پرستوں (یعنی شام کے بعثیوں) کے استدلال سے اتفاق کرنے لگے ہیں۔ وسط نومبر ۱۹۷۷ء تک ہر چیز ناگزیر طور پر اس بات کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی تھی کہ شامی طرز فکر کو (صحیح) تسلیم کر لیا جائے گا۔ ماہ مئی میں جنیوا میں صدر اسد کے ساتھ اپنی ملاقات کے بعد صدر کارٹر نے نہ صرف یہ کہا کہ "میں ان (صدر اسد) سے بہت متاثر ہوا ہوں" بلکہ قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ امریکہ اس بارے میں بہت بے چین ہے کہ نہ صرف عرب منظم اور متحد انداز سے جنیوا امن کانفرنس کی حمایت کریں بلکہ تنظیم آزادیٔ فلسطین بھی اس کانفرنس میں شرکت کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ضمن میں سوویت یونین کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اکتوبر کے اوائل تک اس امر کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ عرب بمقابلہ اسرائیل خطوط پر جنیوا کانفرنس لازماً منعقد ہوگی۔ دو طرفہ تعلقات کی جس پالیسی کو ہنری کسنجر نے پروان چڑھایا تھا یہ اس کے خاتمے کی علامت تھی۔ لیکن اس سے مصر اور اسرائیل خائف ہو گئے۔ انہیں یہ امکان نظر آنے لگا کہ (اگر جنیوا کانفرنس منعقد ہوئی تو) ایک ایسے سیاسی تصفیے

کی راہ ہموار ہونے والی ہے جس کے ذریعے عربوں کی اکثریت فلسطینیوں کے ساتھ اتحاد کر لے گی اور دونوں عظیم عالمی طاقتیں اسرائیل کے خلاف ہو جائیں گی۔

چنانچہ یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء کو امریکہ اور سوویت یونین نے جو مشترکہ بیان جاری کیا صدر سادات نے اس کی اسرائیلیوں سے کم مخالفت نہیں کی۔ اس بیان نے نہ صرف مسئلۂ فلسطین کو مصری علاقے کی واپسی کے مسئلے کے ہم پلہ بنا دیا بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ شام بہ عربیت (پان عرب ازم) کی جس پالیسی پر گامزن تھا، وہ بھی واضح طور پر کامیاب رہی تھی۔ ۱۹۷۷ء کے اوائل میں مصر میں خوراک کی ناکافی دستیابی کی وجہ سے جو ہولناک ہنگامے اور فسادات ہوئے تھے ان کے بعد صدر سادات یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کہ

الف: اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس لینے اور حالتِ جنگ کو ختم کرنے کے کام کو معرضِ التوا میں ڈال دیں۔

ب: فسادات نے جن وسیع پیمانے کی ترقی پسندانہ اور مخالفانہ امروں کے بند کھول دیئے تھے، مصر کے دروازے ان پر وا ہو جائیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے اور وہ ٹھیک ہی سمجھتے تھے کہ ان کا تعلق اس قسم کے سیاسی رجحانات سے ہے جس قسم کے (رجحانات) فلسطینیوں سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔

ج: ان کے ملک کو معاشی اور معاشرتی طور پر جس تباہ کن انتشار اور توڑ پھوڑ کا اندیشہ لاحق تھا، اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۷۷ء کے دوران میں انہوں نے جو کچھ کیا ـــــ مثلاً جولائی میں ان کا لیبیا پر حملہ ـــــ اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ انہیں کسی طرح امریکہ کی توجہ اور خوشنودی حاصل ہو جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تک انہوں نے یہ اعلان نہیں کیا کہ "میں ۷ار نومبر کو بیت المقدس کے دورے پر روانہ ہوں گا" امریکہ نے انہیں

اپنی غیر منقسم اور سنجیدہ توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ ان کے محولہ بالا اعلان سے ایک بھونچال آگیا اور ہر چیز تبدیل ہو گئی ہے۔

امریکی انتظامیہ کا یہ دعویٰ کہ "صدر سادات کا یہ اعلان ہمارے لیے بالکل غیر متوقع تھا" میرے خیال میں درست نہیں کیونکہ کم از کم گزشتہ سات سالوں کے دوران میں جن کا عرصہ ۷۷۔۱۹ء کے اواخر تک محیط ہے، صدر سادات جو کچھ کرتے رہے تھے، وہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ یک طرفہ طور پر اسرائیل کے ساتھ صلح کا ڈول ڈالنے کے لیے پوری طرح (ان کے ناقدوں کے استدلال کیمطابق کامل ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ) تیار ہیں۔ بہر حال امریکہ جو کچھ کہتا تھا، وہ ٹھیک ہی کہتا ہو گا۔ تاہم اس (امریکہ) نے نہایت سرعت کے ساتھ اپنے آپ کو نئی صورتِ حال کے مطابق ڈھال لیا۔ اس نے فوراً اپنی ترجیحات کا از سرِ نو تعین کیا تاکہ اسرائیل اور مصر کے مابین ایک علیحدہ معاہدے کی راہ ہموار ہو سکے۔ اس ضمن میں اس نے جو پہلی کارروائی کی، وہ یہ تھی کہ اقوامِ متحدہ کے ایوانوں میں مسئلہ فلسطین نے جو شکل و صورت اختیار کی تھی، وہ اس سے دستکش ہو گیا۔ اس کے بعد امریکہ اور سوویت یونین کے مشترکہ بیان اور جنیوا کانفرنس میں "فلسطینیوں کو نمائندگی دینے کے مسئلے سے بھی، جس پر سب فریقوں نے اتفاق کیا تھا، کنارہ کشی اختیار کر لی گئی۔ خود سادات نے بھی ـــ ان کے بارے میں یہ سبھی کو معلوم ہے کہ وہ اپنی نجی محفلوں میں یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ یاسر عرفات سے کسی بات کی "توقع کرنا" محض خام خیالی ہے ـــ اپنے آپ کو تنظیم آزادیٔ فلسطین اور بچی کھچی عرب قومیت سے علیحدہ کرنے میں مطلق ذرا دیر نہ لگائی۔ اندرونِ مصر حکومت کے مخالف تمام قوم پرست عربوں کی زباں بندی کر دی گئی اور فلسطینی تحریک کے مقاصد کو نئے الفاظ کا جامہ پہنایا گیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ سادات اس کے سب سے بڑے مربی ہیں۔ یوں

معلوم ہوتا تھا کہ اسرائیل اور امریکہ خواہ کسی بھی رعایت کے طلبگار ہوں، مصر کے لیے اس کا مہیا کرنا کوئی ناممکن امر نہیں۔ سادات نے بہت سوچ بوجھ اور ہشیاری کے ساتھ اس حقیقت پر تکیہ کیا کہ (تنظیم آزادیٔ فلسطین کے علاوہ) ان کے مخالفین یا تو اپنے ہی ممالک میں اتنے غیر مقبول تھے کہ وہ ان (سادات) کے خلاف کسی قسم کی مہم جوئی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے یا پھر وہ (سعودی عرب اور اُردن) اتنے کمزور اور ناتواں تھے کہ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر تھے۔ زیادہ سے زیادہ ان میں اگر کوئی ہمت تھی تو بس اتنی کہ بڑی فروتنی اور بے بسی کے ساتھ ان کی اپنکاری میں شامل ہونے سے انکار کر دیں۔

مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اسرائیلیوں کے ساتھ صدر سادات کا رابطہ نومبر سے قبل ہی استوار ہو چکا تھا اور یہ کہ انہوں نے سب سے پہلے ان معاشی فوائد پر اتفاق کیا جو انہیں اسی صورت میں حاصل ہو سکتے تھے اگر وہ امریکہ کی اشیر باد سے آپس میں مشترکہ اتحاد کر لیں۔ وہ آپس میں جس قسم کا اتحاد کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ سعودی عرب کھل کر تو نہیں لیکن اندرونِ خانہ اس کی ضرور حمایت کرے گا، کیونکہ یہ تمام فریقوں کو مشترکہ خوشحالی کی ضمانت دیتا تھا۔ اس کے فوری فوائد تو ان دونوں ممالک کے فوجی حلقوں اور عام صارفین نے سمیٹنا تھے۔ لیکن اس کے دوررس نتائج یہ نکلنا تھے (اور یہ اس کا سب سے بڑا فائدہ تھا) کہ اس نے مشرق وسطیٰ کو "امیر[1] اور غریب[2]" ممالک میں تقسیم کر دینا تھا اور موخرالذکر وہ ممالک تھے جن میں انتہا پسندی اور ہمہ عربیت محدود ہو کر رہ جائے گی اور یوں ایک دن اس کا قلع قمع کرنا آسان ہو گا۔

---

[1] "haves" [2] "have notes" انگریزی میں یہ دونوں الفاظ ان لوگوں یا قوموں کے لیے استعمال ہوتے ہیں جو (۱) ہر قسم کی مادی آسائشوں سے مالامال ہوں اور (۲) بالکل تہی دامن اور نادار ہوں۔

مزید برآں سادات اپنی توانائیاں نہ صرف افریقہ ـــــ چاڈ، زائرے اور صومالیہ
میں مصر پہلے ہی چوری چھپے اپنی ٹانگ اڑا چکا تھا ـــــ پر مرکوز کر سکیں گے
بلکہ مصر کو ایک نئی سہ فریقی دنیا کا حصہ بنانے پر بھی صرف کر سکیں گے۔
اگست ۱۹۸۰ء تک سادات اس حد تک آگے جا چکے تھے کہ انہوں نے فرانس
اور آسٹریا کو اپنا جوہری فضلہ[1] دفن کرنے کے لیے اپنا مغربی صحرا دستیاب
کر دیا تھا۔ ستمبر تک، جب کیمپ ڈیوڈ میں امریکہ، اسرائیل اور مصر کے سربراہی
اجلاس کا انعقاد ممکن ہوا، ایرانی واقعات نے سادات کے اس عزم میں پختگی
پیدا کر دی تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ اسرائیل اور امریکہ کے ساتھ صلح کریں
گے حالانکہ یہ بات بھی واضح تھی کہ عرب ممالک کے سربراہوں کی چوٹی کانفرنس
منعقدہ بغداد (خاص طور پر دس سال کی محاربت کے بعد شام اور عراق کا متوقع انضمام)[2]
ایرانی سرکشی اور بغاوت، اور تنظیم آزادیٔ فلسطین اور ایران کا اتحاد[3]، جو ابھی اپنے

---

[1] بعض کارخانوں اور تنصیبات میں جو جوہری (ایٹمی) ایندھن استعمال ہوتا ہے، امتدادِ زمانہ کے ساتھ وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ اس بیکار ایندھن کو جوہری فضلہ کہتے ہیں۔ چونکہ یہ فضلہ بھی جوہری شعاعیں پیدا کرتا ہے جو انسانوں اور دوسری جاندار مخلوق کے لیے بے حد ضرر رساں ہیں، اس لیے ایسے ٹھکانے لگانا اور اس سے جان چھڑانا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ بعض ممالک اسے سمندر اور بعض غیر آباد علاقوں میں دفنا دیتے ہیں لیکن خطرے کی گھنٹی پھر بھی بجتی رہتی ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صدر سادات نے اس فضلے کو اپنے علاقے میں، بے شک وہ صحرا ہی تھا، دفنانے کی سہولت دے کر کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔

[2] شام اور عراق کے اس انضمام کی بیل سرے نہ چڑھ سکی اور یہ ممالک آج بھی ایک دوسرے سے اتنا ہی دور ہیں جتنا کہ کبھی پہلے تھے۔

[3] تنظیم آزادی فلسطین اور ایران کی دوستی بھی زیادہ دیر نہ چل سکی اور ایران عراق جنگ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پھر لبنان کی شیعہ عمل ملیشیا فلسطینیوں کو جس طرح لبنان سے باہر نکالنے کے درپے ہے اور اکثر ان کے کیمپوں پر حملے کرتی رہتی ہے۔ اس نے بھی اس سلسلے میں کچھ کردار ادا کیا ہے۔

ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا، ایسے امور تھے جنہوں نے مل ملا کر ان کے اس عزم کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ خشم ناک اور تندوتیز سطحی لفاظی کے باوجود ستمبر ۱۹۷۷ء اور مارچ ۱۹۷۹ء کے مابین ہر عرب مملکت کا ہر دوسری عرب مملکت کے ساتھ رابطہ قائم تھا۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک ہر دوسری کو اپنی طاقت اور ذمہ داری کے احساس سے مرعوب کرنا چاہتی ہے اس طریقے سے بھی امریکہ اور اسرائیل کے حق میں نکتہ طرازی کی جاسکتی تھی۔ ان سب باتوں کے پیچھے ایک ہی خیال کام کرتا نظر آتا تھا کہ مصر اور اسرائیل کے مابین جو علیحدہ معاہدہ ہو رہا ہے، امریکہ کو اس کے دلکش متبادل پیش کئے جائیں۔ کسی بھی عرب مملکت نے اس بارے میں نہ تو ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور نہ اس کے ضمیر کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچی کہ وہ اسرائیل کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے اور امریکی امداد اور دوستی کے عوض سوویت یونین کے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کرنے کے لیے تیار ہے۔ اور یہ بات تقریباً ہر مملکت پر صادق آتی ہے۔

تاہم امریکہ اپنی اس پالیسی کے ساتھ چمٹا رہا جو اس نے مصری اور اسرائیلی امن کے متعلق تشکیل کی تھی اور جس کی ترجیحات کو زیادہ سے زیادہ محدود کر دیا گیا تھا۔ اس پالیسی کے بارے میں اس کا استدلال یہ تھا کہ یہ جامع تصفیے کی راہ میں پہلا قدم (ثابت) ہو گی۔ پتہ نہیں امریکہ یہ ارادتاً کر رہا تھا یا غیر ارادی طور پر، لیکن وہ کام بھی کرتا تھا، اس سے یہی مترشح ہوتا تھا کہ وہ ہر اس چیز کی حمایت کر رہا ہے جو اسرائیل اور مصر کے بارے میں یا تو ہٹ دھرمی پر مبنی تھی یا پھر اس کا مقصد رجعت قہقری اختیار کرنا تھا۔ امریکہ کی اس بے لوچ پالیسی کا، جس پر وہ نہایت

ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ عمل پیرا تھا، میرے خیال میں تباہ کن نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس نے فلسطینیوں، عرب عوام اور باقی دنیا کو اس (امریکہ) سے بے گانہ کر دیا جن کی دانست میں ایرانی انقلاب کے ردِ عمل میں امریکی پالیسی مدافعانہ بھی ہو گئی تھی اور اس کا رخ بھی "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو" کی طرف ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریکی پالیسی کی یہ تعبیر نادرست نہیں ہے۔ عربوں کی اکثریت تو ایک طرف رہی، ان یورپی باشندوں کی نگاہوں میں بھی، جو آزاد سوچ بچار کے مالک تھے، سادات اپنے آپ کو امریکی شعور پر کچھ اس طور سوار کرانے میں کامیاب رہے تھے کہ ان کے متعلق (امریکہ میں) یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ وہ رہتے تو بے شک تیسری دنیا میں ہیں لیکن درحقیقت وہ وفا شعار امریکی ہیں اور پوری تندہی اور لگن کے ساتھ امریکی مفادات کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ ایک بار پھر اپنی اس مہلک عادت کا شکار ہو گیا ہے جس کا اظہار وہ ہمیشہ یوں کرتا رہا کہ اس نے صحیح معنوں میں مقبولِ عام، ہردلعزیز اور نمائندہ رہنماؤں کو تو کبھی اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا اور مارشل کی[1]، چیانگ کائی شیک[2] اور محمد رضا شاہ پہلوی

---

[1] کی (Nguyen Kao Ky) جنوبی ویت نام کا ایک سیاسی رہنما۔ جب امریکہ ویت نام کی جنگ میں الجھا ہوا تو کی نے پتلو صدر کے فرائض سرانجام دیے لیکن انجام کار اسے ملک سے فرار ہونا پڑا۔

[2] چیانگ کائی شیک (١٨٨٧-١٩٧٥) چین کا غیر مقبول صدر۔ چینی کمیونسٹ رہنما ماؤزے تنگ کی فوجوں کے سامنے اس کی فوجیں ٹھہر نہ سکیں اور ١٩٤٩ء میں اسے ملک سے فرار ہونا پڑا۔ تاہم اس نے تائیوان (فارموسا) کے جزیرے میں امریکی امداد سے اپنی حکومت قائم کر لی۔ اب بھی اس جزیرے پر اس کے بیٹے اور ساتھیوں کی حکومت ہے چین نے بھی اس جزیرے پر جو اس کا حصہ ہے قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے ڈر ہے کہ کہیں امریکہ سے جنگ نہ چھڑ جائے۔

جیسے لوگوں کے دامِ تزویر میں آنے کو احسن خیال کیا۔ اور سب سے تباہ کن بات یہ ہوئی کہ سادات، بیگن اور رضا شاہ جیسے رہنماؤں کی حمایت کرنے کے جو نتائج عواقب ظہور میں آتا تھے، وہ (امریکہ) ان کا اندازہ لگانے میں بری طرح ناکام رہا۔ یہ رہنما تو امریکہ کے کندھوں پر سوار ہو کر اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتے تھے اور صرف وہ اقدامات کرنے پر تلے ہوئے تھے جن کی مدد سے ان کے فوری مقاصد (عام طور پر انتہائی غیر مقبول) کی تکمیل ہو سکتی۔ اور زیادہ تر یہ مقاصد کیا تھے؟ یہی کہ اپنے اقتدار کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے، بلکہ اسے دوام بخشا جائے۔ اور یہ وہ بات تھی جو امریکہ کے پلے نہیں پڑ رہی تھی (اور اب بھی نہیں پڑتی)۔ اس پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ ان رہنماؤں کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچا کر ان کے عزائم کو مزید مستحکم بنایا جائے۔

کسی دوسرے ملک پر یہ بات اتنی صادق نہیں آتی، جتنی کہ یہ اسرائیل پر صادق آتی ہے۔ اولین اور میری دانست میں فالِ بد سے معمور علامت وہ تعجیل تھی جو مناحم بیگن کو اس کی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے مقام سے اٹھا کر اسے نیک نام بنانے کے لیے برتی گئی اور سادات اور امریکی جس عمل کا آغاز کرنا چاہتے تھے، یوں اس میں اس (بیگن) کی شمولیت کی گنجائش نکالی گئی۔ یہ بات بیگن کے حق میں جاتی ہے کہ اس نے کسی کو بھی کوئی ٹھوس مراعات نہیں دیں۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ مقبوضہ علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ برقرار رہنا چاہئے وہ فلسطینی عربوں کو قلیوں سے بہتر مقام دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور کسی قسم کی لگی لپٹی رکھے بغیر اس نے یہ بات جتا دی تھی کہ ایک برتر مغربی مملکت کی حیثیت سے علاقے میں اسرائیل کی سیادت قائم رکھی جائے گی۔ اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دوران میں اس نے اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کے بارے میں

اسرائیل کے مؤقف میں مؤثر طور پر تبدیلی پیدا کردی تھی۔ اس (اسرائیلی) شخص نے، جسے بعد میں اس (بیگن) نے اقوام متحدہ میں اپنے ملک کا نمائندہ مقرر کرنا تھا، ۱۹۷۷ء میں امریکی سینیٹ کی ایک کمیٹی کے سامنے یہ استدلال کیا کہ اسرائیل کو مقبوضہ علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور یہ کہ اسرائیل ان علاقوں میں جو کارروائیاں کر رہا تھا، ان سے جنیوا یا کسی دوسری کنونشن کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی تھی اور ویسے بھی اس کنونشن کا نہ تو وہاں اطلاق ہوتا ہے اور نہ ہوگا۔[1] دریں اثنا اسرائیل نے جنوبی افریقہ، چلی[2] اور نکاراگوا[3] کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط تر

---

[1] امریکی سینیٹ کی عدالتی کمیٹی کی تارکین وطن کی سب کمیٹی کے سامنے اسرائیل کی مغربی کنارے پر یہودی بستیاں تعمیر کرنے کی کارروائیوں کے متعلق یہودا بلوم (Blum) کا بیان۔ (۱۷، ۱۸، ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء) صفحات نمبر ۲۶-۴۴۔

[2] ریاستہائے متحدہ امریکہ (U.S.A.) کے جنوب میں امریکی براعظم میں جتنے ممالک واقع ہیں ان میں سے بیشتر میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ سبھی (برازیل اور جزائر غرب الہند بشمول گیانا کے ماسوا) ہسپانوی زبان بولتے ہیں کیونکہ یہ نسلاً بھی زیادہ تر ہسپانوی ہی ہیں۔ صدر جیمز منرو (۱۸۱۷-۲۵ء) کے زمانہ میں امریکہ نے ان تمام ممالک کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا اور یورپی ممالک کو ایک قسم کا حکم دے دیا تھا کہ یہاں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔ اس اصول کو منرو اصول (doctrine) کہتے ہیں۔ اس اصول پر پہلی ضرب ۱۹۵۹ء میں پڑی جب کاسترو نے کیوبا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ چلی کے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ایک کمیونسٹ رہنما سلواڈور آیاندے گوسنز صدر منتخب ہو گئے۔ امریکہ یہ کڑوی گولی نگل نہ سکا اور اس کی شہ پر فوج نے نہ صرف حکومت کا تختہ الٹ دیا بلکہ آیاندے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تب سے اب تک اس ملک پر فوج کی حکمرانی چلی آ رہی ہے۔

[3] نکاراگوا میں بھی ستمبر ۱۹۷۹ء میں بائیں بازو کے لوگ برسر اقتدار آ گئے۔ امریکہ ان سے بھی جان چھڑانے کی فکر میں ہے اور وہ حکومت کے باغیوں کو جنہیں Contras کہا جاتا ہے سی آئی اے کے ذریعے مالی امداد دیتا رہتا ہے لیکن ابھی تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

کر لیے، جبکہ اس کے فوجی رہنما یہ بار بار کہتے نہیں تھکتے تھے کہ اسرائیل ایک فاتح مملکت ہے اور یہ کہ عربوں (بالخصوص فلسطینیوں) کے متعلق اس کی پالیسی یہ ہے کہ انہیں غیر معین عرصے کے لیے دوبارہ مفتوح بنا لیا جائے۔ ۱۹/ جنوری ۱۹۷۹ء کو جب (اسرائیلی افواج کے) چیف آف سٹاف (سربراہ) جنرل ایتان سے "جودیہ اور سماریہ" (مغربی کنارے) میں یہودی بستیوں (کی تعمیر) کے متعلق سوال کیا گیا، تو اس نے جواب دیا کہ اسرائیل اس طریقے (یہودی بستیوں کی تعمیر) سے نہ صرف اس علاقے (مغربی کنارے) کو مستقل طور پر اپنے قبضے میں رکھنے کی تدابیر کر رہا ہے بلکہ ان عربوں پر بھی قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے جو بالائی توالجلیل[1] کے ہیں لیکن وہ اس علاقے میں زمینوں اور ملازمتوں پر قبضہ کرنے غیر قانونی طور پر یہاں آنے اور تشدد کی کارروائیاں کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔" یہاں اس امر کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ فلسطینی جن کا ذکر جنرل ایتان کر رہا تھا، نووارد لوگ نہیں تھے بلکہ گزشتہ تیس سالوں سے (خاصے ابتر اور رذیل حالات میں) وہیں (اندرون اسرائیل) مقیم ہیں۔ لیکن اس کے نزدیک یہ حقائق کافی نہیں تھے۔ وہ تو بس اس حقیقت کا اعادہ کرنا چاہتا تھا۔ "ہم اسرائیل کے قیام سے قبل اس ملک کو فتح کرنے آئے تھے اور اس مقصد کے (حصول کے) لیے مملکت (اسرائیل) کا قیام عمل میں لایا گیا۔"[2]

چونکہ اسرائیل کی مصر کے ساتھ حقیقی معنوں میں کوئی علاقائی آویزش نہیں تھی۔ چنانچہ سادات کے ساتھ ایک ایسے سینائی کی واپسی کا، جہاں مصر کو فوجیں رکھنے یا قلعہ بندیاں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، وعدہ کرنا نسبتاً آسان تھا۔ اس معاملے

---

[1] الجلیل، ۱۹۶۷ء سے قبل ہی اسرائیل میں شامل تھا اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں اسرائیلی فلسطینیوں کی سب سے زیادہ تعداد آباد ہے۔

[2] "Yediot A haronot" January 19, 1979

کی وجہ سے اسرائیل نہایت آسانی کے ساتھ جو مزید فوائد حاصل کر سکتا تھا، وہ یہ تھے :۔

صیہونیت کو اپنا جواز مل جاتا۔ وہ اپنے اس جواز کو منوانے کی گزشتہ سو سال سے کوشش کر رہی تھی (لیکن کسی عرب نے اسے گھاس نہیں ڈالی تھی)۔

سب سے بڑی عرب مملکت کو بے اثر بنا دیا جاتا اور پورے عالم عرب میں اسرائیل کو جو الگ تھلگ زندگی گزارنا پڑ رہی تھی، اس کا خاتمہ ہو جاتا۔

امریکہ کے ساتھ "سلامتی" کا ایک "ہمہ گیر" معاہدہ ہو جاتا۔

آئندہ پندرہ برسوں کے لیے تیل کی فراہمی یقینی ہو جاتی۔

تقریباً پندرہ ارب ڈالر مالیت کا اسلحہ اور دیگر امداد مل جاتی۔

ایک ایسی وسیع و عریض منڈی دستیاب ہو جاتی جہاں آسانی سے اپنا مال کھپایا جا سکتا تھا۔ اسے اپنے قابو میں رکھا جا سکتا تھا اور من مانے طریقے سے اس کا استحصال کیا جا سکتا تھا۔

لاتعداد غیر تربیت یافتہ اور سستے مزدور مہیا ہو جاتے۔

لیکن جہاں مسئلہ علاقے کا تھا تو اس ضمن میں انتہائی غیر معمولی اقدامات کیے گئے تاکہ ان پر اسرائیل کا تسلط برقرار رکھا جا سکے۔ اسرائیل جو کچھ کہہ رہا تھا اور جو کچھ وہ مغربی کنارے پر کر رہا تھا، چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر امریکی اخبارات و جرائد نے ان پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ صحافت کی تاریخ میں اس قسم کے قبیح اور شرمناک تغافل کی شاید ہی کوئی مثال ملے گی۔ فلسطینیوں کو جس قسم کی حکومت "خود اختیاری" پیش کی جا رہی تھی، اسے اس طور دکھانے کے لیے کہ یہ لفظ کے مفہوم کے ساتھ کچھ مشابہت رکھتی ہے، امریکی ذرائع ابلاغ نے مغربی کنارے اور غزہ میں اسرائیل کی چیرہ دستیوں اور جبر و تشدد، یہودی

بستیوں کی تعمیر اور وہاں اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لیے اس کی کارروائیوں کو جائز ٹھہرا دیا اور اس سلسلے میں دلائل کے انبار لگا دیئے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہوئی کہ اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں کے بارے میں جس پالیسی پر عمل پیرا تھا، اس پر نہ تو امریکی ذرائع ابلاغ نے کسی قسم کی نکتہ چینی کی اور نہ کیمپ ڈیوڈ میں طے پانے والے معاہدوں کے متن میں اس پر کوئی گرفت ہوئی، چنانچہ جب فلسطینیوں اور اردن نے اس حکومتِ "خود اختیاری" کے عمل میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تو ان کی یہ حرکت معقولیت سے عاری، بے استحقاق اور بے دلیل نظر آئی۔ مغربی کنارے اور غزہ میں جو کچھ ہو رہا تھا، جب اسرائیل کو یقین ہو گیا کہ مصر اور امریکہ اس کے متعلق لب کشائی نہیں کریں گے، تو اسے (اسرائیل کو) محسوس ہوا کہ اب اسے کھلی چھٹی مل گئی۔ اب اس کا جو جی چاہے گا، وہ اس کا نہ صرف اظہار کر سکے گا یا اس کے متعلق منصوبہ بندی کر سکے گا، بلکہ اسے عملی جامہ بھی پہنا سکے گا اور اس نے یہ سارے کام — جیسا کہ اسرائیل کے جبر و تشدد تلے زندگی بسر کرنے والے فلسطینیوں کو علم ہے کیونکہ انہیں ان کا براہِ راست تجربہ ہوا ہے — کر کے بھی دکھا دیئے۔

تاریخی طور پر صیہونیت کا ہمیشہ یہ معاملہ رہا ہے کہ اس کے لیے عام اصولوں کی نسبت جزئیات (تفصیلات) کہیں زیادہ اہم رہی ہیں۔ جب صیہونیت ان جزئیات کو قوت اور قانونی "حقائق" دونوں کا لبادہ اوڑھا دیتی ہے، تو اسے یقین ہونے لگتا ہے کہ اس کی یہ نو تخلیق حقیقتیں "دوام" حاصل کریں گی۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لیبر پارٹی نے جو کچھ کیا تھا، اس کو مزید آگے بڑھانے کے لیے بیگن نے برسرِ اقتدار آنے کے

بعد اپنی تمام مخصوص قانونی صلاحیتیں صرف کر ڈالیں۔ (مثال کے طور پر) اس کی پالیسی سابق لیبر وزیر اعظم جنرل رابین کی پالیسی سے صرف ان معانی میں مختلف تھی کہ بیگن محض طاقت یا/ اور فی البدیہہ اقدامات پر کہیں کم اعتبار کرتا تھا۔ اس کے نزدیک مقبوضہ یا زیر انتظام علاقوں کی حیثیت بھی تبدیل ہو گئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان علاقوں کو "آزاد" کرایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے ۲۶ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو اسمٰعیلیہ[1] میں صدر سادات سے یہ اعتراف بھی کرا لیا کہ اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں عربوں پر جو حملہ کیا تھا، وہ اپنے دفاع کے لیے[2] تھا۔ ان دونوں باتوں نے اسے یہ سمجھنے اور کہنے کے قابل بنا دیا کہ اسرائیل نے عربوں کا جو علاقہ ہتھیایا تھا، قانون کی نگاہوں میں اس پر قبضہ کرنا جائز تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ جب ڈیوڈ بن گوریان نے ۱۹۴۸ء میں مملکتِ اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا تھا، تو اس نے اپنے اعلان میں اسرائیل کی سرحدوں کا کوئی

---

[1] نہر سویز کے کنارے مصر کی بندرگاہ اور شہر۔

[2] یہ وہ استدلال ہے جس کی صدائے بازگشت بآسانی نہ صرف دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے امریکیوں کی تحریروں اور گفتگوؤں میں ملتی ہے بلکہ وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو لبرل یا بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کہتے ہیں، اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں، بلکہ ان کا تو اوڑھنا بچھونا بھی یہی استدلال ہے۔ ان لوگوں نے اسرائیل کو جارحانہ حملے کے الزام سے جس طرح بری الذمہ قرار دیا ہے، اس کی ایک مثال مائیکل والزر (Walzer) کی کتاب "Just and Unjust Wars" (مطبوعہ بیسک بکس، نیویارک ۱۹۷۷ء) میں ملتی ہے۔ تاہم نوئم چومسکی اور رچرڈ فاک (Falk) نے اپنے مضامین میں والزر کے دلائل کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔

(مصنف)

ذکر کرنے سے عمداً احتراز کیا تھا[1]۔ ان وسعت پذیر سرحدوں کو قانونی طور پر جائز اور صحیح قرار دینے کے لیے بگین نے کہیں زیادہ مہارت اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا۔ مزید برآں، جب اس نے فلسطینی حکومت "خود اختیاری" کے سلسلے میں اپنے منصوبے کا اعلان کیا تو اس نے (مقامی فلسطینی) باشندوں کے لیے "حکومت خود اختیاری" اور اس علاقے پر، جہاں وہ رہائش پذیر تھے، قانونی اقتدار اعلیٰ کے مابین امتیاز برتنے کے سلسلے میں نہایت احتیاط سے کام لیا۔ اپنے نظریاتی گرو ولادی میر جیبوٹنسکی[2] کی طرح وہ اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ اگر یہودی ایک ادنیٰ قوم کے متعلق کسی قسم کی پریشانی کا اظہار کریں گے، تو وہ ایک ناپسندیدہ (بلکہ بے حد ضرر رساں) حرکت کے مرتکب ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس علاقے پر، جس کے متعلق (اس کی دانست کے مطابق) خداوند نے کہیں نہ کہیں فرمایا تھا کہ یہ ان کا ہے، اختیار برقرار رکھنے اور وہاں یہودی بستیاں تعمیر کرنے کا حق اسرائیل کے لیے محفوظ رکھا۔ مذہبیت، قانونی موشگافیوں اور سوفسطائیت[3] کے اس امتزاج کے متعلق امریکہ کے ذرائع ابلاغ، اعلیٰ تعلیمی اداروں اور لبرل طبقے نے اپنے منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں اور ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ ایک ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب وہ ایران میں اسلامی "زیادتیوں" کے خلاف زبردست غم و غصے کا اظہار

۱۔ بن گوریان، سوانح حیات از مائیکل بار زوہر (Bar - Zohar) مطبوعہ ویڈن فلڈ اینڈ نکلسن۔ لندن، ۱۹۷۸ء۔ صفحہ نمبر ۱۶۱

۲۔ ولادی میر جیبوٹنسکی JABOTINSKY.

۳۔ سوفسطائیت (Casuistry) مذہبی یا اخلاقی اصولوں کا عیارانہ لیکن گمراہ کن یا غلط اطلاق

کر چکے ہیں ۔ انہی ایام میں جب رُوح اللہ خمینی کی اسلامی جمہوریہ کے امکانی معانی کے متعلق غیر مختتم، اکثر و بیشتر جہالت اور لاعلمی پر مبنی، مُروح فرسا تحقیقاتی مقالوں کا طوفان امڈ آیا تھا، بیگن مختلف امور کے بارے میں خالص مذہبی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کر رہا تھا لیکن کسی نے ذرا بھی کوشش نہ کی کہ وہ یہ معلوم کرتا کہ آخر ان باتوں سے اس (بیگن) کی مراد کیا ہے۔ جب حالت یہ ہو تو پھر جب وہ (بیگن) یہ کہتا پھرتا تھا کہ لوگوں کو تو حکومت "خود اختیاری" حاصل ہو گی لیکن وہ جس سرزمین پر رہتے ہیں، اسے اس قسم کی کوئی "خود اختیاری" نہیں دی جائیگی تو اس سے اس کی کیا مراد تھی، اس کی تفصیلات معلوم کرنے کی کسے فرصت ہوتی۔

یہ بات اسرائیلی صحافیوں اور سیاسی شخصیتوں کے حق میں جاتی ہے کہ ان امور کے بارے میں ان کا رویہ بہت سچا، کھرا اور بے لاگ تھا، وہ جو بات کہتے تھے، ڈنکے کی چوٹ کہتے تھے۔ تاہم، جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، الفاظ کی نسبت اعمال زیادہ مؤثر انداز سے عزائم کا اعلان کر رہے تھے۔ کیمپ ڈیوڈ کانفرنس کے فوراً بعد بیگن نے مزید بستیوں کی تعمیر پر زور دینا شروع کر دیا۔ اس نے (بستیوں کی تعمیر کے) اس منصوبے کو جنرل ایرک شیرون[۵۷] کے قابل ہاتھوں میں دے دیا۔ اس زمانے میں شیرون وزیر زراعت تھا اور وہ ان لوگوں میں شامل

---

۵۷ جنرل شیرون بعد میں بیگن کی کابینہ میں وزیر دفاع مقرر ہوا۔ ۱۹۸۲ء میں جب لبنان کی عیسائی ملیشیا نے اسرائیل کی امداد اور تائید سے فلسطینیوں کے کیمپوں کو تاخت و تاراج کیا اور وہاں بے پناہ قتل و غارت کی، تو یہ جنرل شیرون ہی تھا جس نے یہ سب کچھ کرایا تھا۔ جب اس قتل عام کے لیے ساری دنیا نے اسرائیل کی مذمت کرنا شروع کر دی، تو شیرون کو اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اسرائیلی حکومت نے یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ جنرل شیرون نے یہ ساری کارروائی اپنی صوابدید پر کی تھی اور اس (حکومت) سے اس نے کوئی اجازت یا اختیار نہیں لیا تھا۔

تھا جو عربوں کے بارے میں نہایت جارحانہ رویہ رکھتے ہیں اور انہیں کسی قسم کی کوئی رعایت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں [۱] ۔ اس کے "کارناموں" میں فلسطینیوں کی شہری آبادیوں پر اس کے متعدد سفاکانہ اور قاتلانہ حملے بھی شامل ہیں [۲] ۔ نمبر ۱۹۸۰ کے اواخر تک اسرائیل صرف مغربی کنارے پر ۷۰ بستیاں تعمیر کر چکا تھا اور وہاں کے کل رقبے کا تقریباً ستائیس فیصد حصہ ضبط کر چکا تھا ۔ جب کہ یہ بات درست ہے کہ کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات میں یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی افواج مقیم تھیں، پانچ سالوں پر محیط عبوری مدت کے دوران میں ان میں "تخفیف کر دی جائے گی، لیکن اس (اسرائیلی افواج کا قیام) سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس علاقے میں اسرائیلی آبادکاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ ان آبادکاروں کا ہراول دستہ "گش ایمونیم" "Gush Emuq" کہلاتا تھا ۔ یہ انتہائی متعصب اور متشدد یہودیوں کا ٹولہ تھا ۔ اس کے سامنے "اسلامی" جتھوں کا جوش و خروش اور تشدد ماند پڑ جاتا ہے بلکہ وہ مثبت طور پر نرم اور بامروت نظر آتے ہیں ۔ معتبر ذرائع کے مطابق عرب بیت المقدس سمیت مقبوضہ علاقوں میں اس ٹولے کے افراد کی تعداد نوے ہزار تک پہنچ چکی ہے جب کہ مزید لاکھوں افراد کو ادھر بھیجنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں ۔

---

[۱] مصنف نے ان لوگوں کیلئے انگریزی کا لفظ Hawk (شکرہ) استعمال کیا ہے ۔ وہ لوگ جو امن کے پجاری ہوں، "فاختائیں" (doves) کہلاتے ہیں تو وہ لوگ جو خارجہ پالیسی میں سخت گیر بلکہ جارحانہ پالیسی اختیار کرنے کے حامی ہوں ۔ "شکرے" کہے جاتے ہیں ۔

[۲] اسرائیل کے بدنام زمانہ "یونٹ نمبر ۱۰۱" میں شیرون نے جو کارنامے سرانجام دیئے اس کی تفصیل ایک مضمون "Voice of Zionism" میں دیکھی جا سکتی ہے اس مضمون کو جریدہ "مڈل ایسٹ انٹرنیشنل" کمرہ نمبر ۱۰۵، گرینڈ بلڈنگز، ٹریفالگر سکوائر لندن نے شائع کیا تھا ۔ ویسے جس شمارے میں یہ مضمون شائع ہوا تھا اس پر کوئی نمبر / مہینہ درج نہیں تھا (مصنف)

فلسطینیوں کے اذہان میں اس بارے میں مطلق کوئی شک وشبہ نہ رہا کہ ان کے لیے جس حکومت "خود اختیاری" کا اہتمام کیا جا رہا ہے، اس کا مقصد انہیں محض چند مخصوص علاقوں میں محدود کرنا ہے جن کا نظم ونسق چلانے میں نہایت احتیاط اور غور وفکر کے بعد قوانین اور ضوابط تشکیل دیے جائیں گے اور ان پر عمل کرتے وقت تمام جزئیات کا پوری طرح خیال رکھا جائے گا۔ اور جیسا کہ ایک دانشور نے، جو عرب قومیت پرسند کی حیثیت رکھتا ہے اور تل ابیب یونیورسٹی میں بطور ایک مضمون اس کی تدریس کرتا رہا ہے، کہا تھا کہ اس منصوبے کا مقصد "فلسطینیوں کی قومی آرزوؤں اور امنگوں کا گلا گھونٹنا اور ان کے ذہنوں سے فلسطینی قومیت کا کیڑا نکالنا ہے"[1]۔ قصہ زمین برسر زمین کے مصداق، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے مغربی کنارے پر کئی اہم اقدامات کیے جا رہے تھے[2]۔ اسرائیل کی سوچ یہ تھی کہ سبز لکیر (قبل ۱۹۶۷ء کی سرحد) کے مشرق میں اسرائیل کا جو علاقہ واقع ہے، وہ اس وقت تک حملوں کی زد میں رہے گا جب تک خاص اسرائیل کے متوازی خود مغربی کنارے میں دفاعی اقدامات اختیار نہیں کر لیے جاتے۔ اس مقصد کے لیے مغربی کنارے کو شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً سڑکوں کے ایک سلسلے کی تعمیر کے ذریعے مختلف علاقوں میں تقسیم کرنا تھا بلکہ پہلے ہی تقسیم

---

[1] کلفٹن ہیلی نے اس کا حوالہ اپنے ایک مضمون مطبوعہ "یروشلم پوسٹ" مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۷۹ء میں دیا ہے۔

[2] مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل جس طرح عربوں کی زمینیں ہتھیا اور وہاں یہودی بستیاں تعمیر کر رہا ہے، اس کے متعلق پال کیرنگ (Quiring) کی ایک رپورٹ "اسرائیلی بستیاں اور فلسطینیوں کے حقوق" کے عنوان سے جریدہ "مڈل ایسٹ انٹرنیشنل" کے شمارہ نمبر ۸۰ (ستمبر ۱۹۷۷ء) اور شمارہ نمبر ۸۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

کیا جا چکا ہے (نقشہ ملاحظہ فرمائیں)۔ یہ شاہراہیں نہ صرف فوج کے لیے رسائی کا کام دیں گی (اور سب کچھ صدر سادات اور صدر کارٹر کی دریا دلی اور مہربانی کی بدولت ہوا جو انہوں نے کیمپ ڈیوڈ کے "ڈھانچے" کی حدود میں رہ کر دکھائی) بلکہ چوتھائی رُبع دائرے کی شکلوں کے ان علاقوں کی بیرونی سرحدوں کا تعین بھی کر دیں گی جن کے اندر فلسطینی آبادی کو محصور کر دیا جانا تھا۔ چنانچہ فلسطینیوں کے ہر قابل لحاظ گروپ کو اس طریقے سے محصور کر دینے والی یہ سڑکیں اس بات کو بھی یقینی بنا دیں گی کہ اس علاقے پر اسرائیل کا فوجی تسلط جاری رہے گا۔ علاوہ ازیں، اسرائیلی بستیوں کا قیام ان سڑکوں کو اور بھی مضبوط بنا دے گا۔ جیسا کہ شیرون نے ایک انٹرویو میں جو اسرائیلی روزنامہ "معارف" کے شمارے مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا، کہا تھا کہ "وہاں نہ صرف (یہودی) بستیوں کا قیام عمل میں آنا چاہیے بلکہ ایسی سڑکیں بھی تعمیر ہونا چاہئیں جو قصبوں اور ان بستیوں کے مابین علاقائی تسلسل کو یقینی بنا دیں۔ پھر صرف سڑکوں کی تعمیر کافی نہیں ہے بلکہ فوجی چوکیوں اور تربیت گاہوں کا قیام بھی لازمی ہے تاکہ عسکری نقطۂ نظر سے تمام سہولتیں دستیاب ہو سکیں"۔ یوں صیہونیت کے تسلسل اور فلسطینیوں کے عدم تسلسل کے منصوبے پروان چڑھائے جا رہے تھے۔

چونکہ اسرائیل کی آبی ضروریات کا تقریباً تیس فیصد حصہ مغربی کنارے سے

ا۵ اسرائیل نے خود اسرائیل کے اندر اور مغربی کنارے پر سڑکوں کا جو جال بچھا دیا ہے اسے وہ عسکری نقطۂ نظر سے "ریڑھ کی دوہری ہڈی" کہتا ہے۔ ایک ہڈی تو خود اسرائیل کے اندر ہے اور دوسری مغربی کنارے پر۔

۵۲ چوتھائی رُبع دائرہ (quadrant) ایک ایسی شکل جو قوس اور ان دو نصف قطروں سے محصور ہو جو ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ بنا کر کاٹتے ہیں۔

فراہم کیا جاتا ہے، اس لیے (فلسطینیوں کو حق خود اختیاری ملے یا نہ ملے)، کوئی پرواہ نہیں، اسرائیل کے استعمال کے لیے آبی وسائل لازماً حاصل ہونا چاہئیں۔ چنانچہ آب رسانی کا یہ مربوط نظام مغربی کنارے کی میونسپل مقتدرہ سے بالکل علیحدہ کام کر رہا ہے۔ مغربی کنارے اور غزہ کی سلامتی کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر (اسرائیلی) فوجی گورنر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہر تحریر کو سنسر کر سکتا ہے، مشتبہ تخریب کاروں کو ملک بدر یا نظر بند کر سکتا ہے یا ان کے گھروں کو مسمار کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ بلکہ عملی طور پر وہ ہر وہ اقدام کر سکتا ہے جس کا مقصد مملکت اسرائیل کا تحفظ کرنا ہو۔ لیکن جیسا کہ "ہاآرتیز" کے چودہ اور سولہ جنوری ۱۹۷۹ء کے شماروں میں ایک صحافی زلیف شف نے تحریر کیا تھا کہ "جو چیز یقینی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر فلسطینیوں کو حکومت خود اختیاری مل گئی تو اس سے اسرائیلی حکومت اور فوج کو یہ اختیار مل جائے گا کہ وہ معاملات کی موجودہ صورت کو کم و بیش غیر معین عرصے کے لیے جاری رکھ سکیں۔" کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کی شرائط کے تحت اسرائیل کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سیاسی "تخریب کاری" کے خلاف نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ اسرائیل کے نزدیک یہ سیاسی "تخریب کاری" کیا ہے؟ شف نے بالکل ایمانداری سے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسرائیل ہر اس چیز یا کارروائی کو سیاسی "تخریب کاری" کا نام دیتا ہے جو کسی بھی امکانی طریقے سے فلسطینی ریاست کے قیام میں مددگار ثابت ہو سکتی ہو۔ چونکہ فوج مغربی کنارے پر مقیم رہے گی، اس لیے نظر بندیوں، ملک بدریوں اور اجتماعی سزاؤں کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ ایک ایسی حکومت "خود اختیاری" میں جس کی حکمران کونسل اسرائیلی، فلسطینی، اردنی اور مصری نمائندوں پر مشتمل ہو گی۔ "سلامتی کی کارروائیاں" کس طرح عمل میں آئیں گی۔ شف نے اس کا جو پیشگی اندازہ

لگایا ہے، وہ درج ذیل ہے۔

(مغربی کنارے اور غزہ میں) عام سلامتی (جنرل سیکورٹی) کے حکام جاسوسی کا ایک عمدہ اور پیچیدہ جال بچھانے میں کامیاب رہے ہیں ہم یہ مفروضہ قائم کر سکتے ہیں کہ حکومتِ خود اختیاری کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن مسئلہ محض معلومات اکٹھی کرنے کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان معلومات کا مصرف کیا ہوگا؟ کیا انہیں (اسرائیلی حکام کو) اپنی مرضی سے کام کرنے کی اجازت ہوگی یا ان کی سرگرمیاں معلومات جمع کرانے اور صورت حال کو جاننے تک محدود کر دی جائیں گی؟

جاسوسی کے ذریعے حاصل شدہ معلومات کے صحیح مصرف کو یقینی بنانے کے لیے تاکہ تخریب کاروں (ان فلسطینی قوم پرستوں کے لیے، جو آزادی کے خواہاں ہیں، شف اسرائیلیوں کا سٹینڈرڈ کوڈ لفظ استعمال کرتا ہے۔) کے خلاف جنگ کی جا سکے۔ ضرورت ایسے خاص حالات کی ہے جن کے ڈانڈے دوسرے پہلوؤں سے جا ملتے ہیں۔ ایک مضبوط مقامی پولیس فورس، جس کا کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں میں ذکر ہے، کافی نہیں ہے۔ فلسطینی پولیس کے افسروں اور اسرائیل کے سلامتی کے حکام کے مابین مشاورت کافی نہیں ہے۔ سلامتی کے نقطۂ نظر سے جو بات روز روشن کی طرح عیاں ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص، جو دہشت گردوں کے خلاف سینہ سپر ہونا چاہتا ہے، وہ ان لوگوں کو، جن کے بارے میں دہشت گردی یا عناد کا شبہ ہو، گرفتار کرنے کا حق دوسروں کے سپرد نہیں کر سکتا۔

ایک ایسے فلسطینی پولیس افسر کو، جسے ان لوگوں کے متعلق جن پر دہشت گردی کی کارروائیاں کرنے کا شبہ ہو، اسرائیل کے سلامتی کے حکام سے معلومات حاصل ہوتی ہیں ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں گے۔ اگر وہ دہشت گردوں کو یہ نہیں بتا دیتا کہ وہ خطرے کی زد میں ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی گرفتاریوں کے سلسلے میں مقامی (یعنی فلسطینی) پولیس کا تعاون حاصل کرنا محض ایک رسمی ضابطے کی کارروائی ہونا چاہیے اور اس بارے میں کسی شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہونا چاہیے کہ مستقبل میں بھی سلامتی سے متعلق تمام امور کی پوچھ گچھ کا کام اسرائیل کے عام سلامتی کے حکام کے سپرد رہے گا۔ اگر ہم حکومتِ خوداختیاری کے علاقوں اور خود اسرائیل میں دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں، تو اس کی بنیادی شرط یہی ہے۔ جہاں تک دہشت گردوں کے خلاف عدالتوں میں استغاثے دائر کرنے اور ان پر مقدمات چلانے کا تعلق ہے، تو صورتِ حال مختلف ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں اسرائیل اور حکومت خوداختیاری کے حکام کے مابین مکمل تعاون ہو سکتا ہے۔ عدالتی امور میں بھی تعاون کی راہیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن استغاثے دائر کرنے اور مقدمات چلانے کی نسبت یہ زیادہ نازک موضوع ہے۔ اس شعبے میں اسرائیل کو کچھ ترجیح حاصل ہونا چاہیے اور یہی بات اس کمیٹی کے اسرائیلی ارکان کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جس کے سپرد پناہ گزینوں کو واپسی کی اجازت دینے کا کام ہوگا اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ

(کمیٹی کے اسرائیلی ارکان) ان ہدایات اور احکام کی تعمیل کریں گے جو عام سلامتی کے (اسرائیلی) حکام انھیں دیں گے۔ (دیع ریتز" مورخہ ۱۲ جنوری ۷۹ء")

اسرائیل فلسطینیوں کو جس قسم کی حکومت خود اختیاری کی پیشکش کر رہا ہے، اس کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ اس سے فلسطینیوں کے حقِ خود ارادیت کے مطالبات پورے ہو جائیں گے، حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اونچی رکھنا چاہتا ہے اور اصل اختیارات سے دستبردار ہونے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔[1] چنانچہ شف اپنے مضمون کا اختتام یوں کرتا ہے: "اب یہ بات واضح ہو جانا چاہیے کہ اسرائیل کی سلامتی کا انتظام فلسطینی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوگا۔ اب ہم یہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ حکومت خود اختیاری کے متعلق یہ نقطۂ نظر، جس کی محولہ بالا انداز سے توضیح کی گئی ہے، کس طرح فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی عناد اور مخاصمت سے موافقت رکھتا ہے۔ لیکن قاری بے سود ان دلائل و براہین کی تلاش کرتا ہے جن کے مطابق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ یہ منصوبہ فلسطینیوں کے لیے جنہیں اس کی سختیاں اور درشتیاں جھیلنا پڑیں گی، قابلِ قبول ہوگا۔ اسرائیل کا کوئی قول و فعل (بالخصوص جو کچھ بیگن کہتا ہے، وہ تو بالکل نہیں) فلسطینیوں کو یہ آس باندھنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ حکومت "خود اختیاری" مسلسل فوجی تسلط و تغلب سے بڑھ کر کوئی چیز ہوگی۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ حکومت "خود اختیاری" کا اطلاق صرف ان فلسطینیوں پر ہوگا جو مغربی کنارے اور غزہ میں رہائش پذیر ہیں۔ فلسطینیوں کی واپسی کے متعلق دفعات میں صرف ان فلسطینیوں

---

[1] اس سلسلے میں فرانس کے جریدے "Le Monde Diplomatique" کے جنوری ۱۹۷۹ء کے شمارے میں Amnon Kapeliouk کا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے (مصنف)

کا ذکر کیا گیا ہے جو ۱۹۶۷ء کی جنگ سے قبل مغربی کنارے اور غزہ میں رہتے تھے لیکن اس جنگ کے بعد انہیں باہر ہانک دیا گیا تھا۔ اندازاً ان فلسطینیوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ چونکہ واپسی کے ان "جائز دعویداروں" کو بھی اسرائیلی جانچ پرکھ کی بھٹی میں سے گزرنا ہوگا، اس لیے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان بیس لاکھ سے زائد فلسطینیوں کے لیے، جن کا تعلق غزہ یا مغربی کنارے سے نہیں، اور جو اب جلاوطنی کے ایام گزار رہے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ وہ واپسی کا خواب بھی دیکھ سکیں۔ موشے دایان کے الفاظ میں، ان فلسطینیوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جہاں ہیں، وہیں مقیم رہیں گے۔ چنانچہ، جیسا کہ ایک نامور فلسطینی مصنف نے تحریر کیا ہے، کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات میں جس حکومتِ خود اختیاری کا ذکر کیا گیا ہے، کسی قسم کے ابہام یا شک وشبہ کے بغیر اس کا صحیح صحیح مطلب یہ ہے کہ

"فلسطینی قوم کی ایک قلیل تعداد (مجموعی طور پر ایک تہائی سے بھی کم) کو اپنے وطن کے ایک قلیل حصے (جو مجموعی رقبے کے پانچویں حصے سے بھی کم ہے) پر اپنے حقوق کی ایک قلیل مقدار (جس میں خود ارادیت اور مملکت کا درجہ حاصل کرنے کے حقوق شامل نہیں) عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس وعدے کی تکمیل بھی، ایک ایسے قدم بہ قدم عمل کے ذریعے، جس میں اسرائیل کو کسی بھی سمجھوتے کے بارے میں فیصلہ کن انداز سے استرداد (ویٹو) کا اختیار حاصل ہوگا، کئی سالوں کے بعد ہوگی۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ فلسطینیوں کی ایک زبردست اکثریت کو یہ سزا سنا دی گئی ہے کہ وہ اپنی فلسطینی قومی شناخت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم

ہو گئی ہے۔ وہ سدا جلاوطنی کی زندگی گزاریں گے، ان کے پاس کوئی ملک نہیں ہوگا جسے وہ اپنا ملک کہہ سکیں گے اور وہ مدام فلسطین سے ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بھی دور اور الگ تھلگ رہیں گے۔ وہ ایک ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے جس میں نہ تو کوئی قومی امید ہوگی اور نہ وہ کسی قسم کے مفہوم کی حامل ہوگی[1]

اسرائیل اور مصر کے معاہدے نے کسی قسم کے ابہام کے بغیر اس صورتِ حال کو مقدس بنا دیا ہے۔ امریکہ کے لبرل دانشوروں کا استدلال یہ ہے کہ

الف: موجودہ صورتِ حال میں فلسطینیوں کو زیادہ سے زیادہ یہی کچھ دیا گیا ہے اور اس لیے انہیں آمنّا و صدقنا کہہ کر اسے قبول کر لینا چاہیے۔

ب۔ علاوہ ازیں، اگر ایک مرتبہ حکومت خود اختیاری کا عمل شروع ہو گیا۔ جس میں عام انتخابات منعقد ہوا کریں گے، سیاسی زندگی معمول پر آجائے گی، وغیرہ۔ حالات غالباً ایسا رخ اختیار کریں گے کہ وہ ارتقار کی منازل طے کرنے لگیں گے اور یوں ایک دن وہ فلسطینی مملکت کا روپ دھار لیں گے۔ یہ مملکت یونہی وجود میں نہیں آئے گی بلکہ کسی پودے کی طرح آہستہ آہستہ نمو پاتی رہے گی اور یوں ایک دن وہ قطعی شکل اختیار کرے گی۔ اس کا کتا یتاً ذکر امریکی صحافی انتھونی لوئیس نے اپنے ایک ہمدردانہ مقالے "اور اب فلسطینی" مطبوعہ "نیویارک ٹائمز" مورخہ ۲ مارچ ۱۹۷۹ء میں کیا تھا۔ لیکن اس قسم کے دلائل براہینِ ان تین عناصر کو پیشِ نظر نہیں رکھتے جنہوں نے فلسطین کے سوال کو وہ

---

[1] فیاض ہمایون: معاہدہ کیمپ ڈیوڈ اور مسئلہ فلسطین"۔ "جرنل آف پاکستان سٹڈیز" جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۲ (زمستان ۱۹۷۹ء)

مستلہ بنا دیا ہے جو کہ وہ آج کل صحیح معنوں میں بن چکا ہے ۔ وہ عناصر یہ ہیں :۔

(۱) صیہونیت کی یہ اصلیت کہ وہ ایک منتظم طریقے سے یہودیوں کے حق میں اور غیر یہودیوں کے خلاف کام کرتی ہے ۔

(۲) فلسطینی تاریخ کی یہ اصلیت کہ یہ (فلسطینی تاریخ) اٹکل پچو واقعات کا ایک مختلف العناصر مجموعہ نہیں ہے بلکہ صیہونیت کے ہاتھوں فلسطینیوں کو جس بے دخلی کا سامنا کرنا پڑا، یہ اس کے مربوط تجربے کا بیان ہے ۔ نیز یہ کہ فلسطینی لڑتے بھڑتے ہی خود ارادیت کی منزل کی طرف جس طرح قدم بہ قدم بڑھ رہے ہیں، (یہ فلسطینی تاریخ) اس جدوجہد کو جدلیاتی اصولوں کے مطابق منطقی انداز سے پیش کرتی ہے ۔

(۳) صیہونیت اور فلسطینیوں کے مابین آویزش کی اصل حقیقت ۔ یہ آویزش کسی غلط فہمی کا نہیں بلکہ مخالف قوتوں کے مابین حقیقی مخالفت کا نتیجہ ہے مزید برآں اس آویزش کی جڑیں ایک مخصوص علاقے میں پیوست ہیں ۔ اس کی اپنی ایک ٹھوس تاریخ ہے اور یہ مختلف قسم کے متعدد علاقائی، بین الاقوامی اور ثقافتی عوامل یکجا کرنے کا موجب بن رہی ہے ۔

ایک طرف ان تینوں عناصر کی ژولیدگی اور پیچیدگی ہے اور دوسری جانب نیک نیت پالیسی سازوں کی رجائیت ہے جس کا وہ بعض مواقع پر اظہار کرتے رہتے ہیں، تو ان دونوں (ژولیدگی اور رجائیت) میں جو تضاد پایا جاتا ہے، وہ وہ ایک امید شکن ستم ظریفی کا حامل ہے ۔ اس ستم ظریفی کی کاٹ میں اس وقت اور بھی شدید اضافہ ہو جاتا ہے جب لبظاہر فلسطینیوں کی حکومت خود اختیاری کی کامیابی کو اس بات کے ساتھ مشروط کر دیا جاتا ہے کہ تنظیم آزادی فلسطین اپنا گلا گھونٹ دے ۔ یا کم از کم منظر عام سے اوجھل ہو جائے ۔

______

اور اس کی جگہ وہ "معقول" فلسطینی کوئزلنگ (غدارانِ وطن) سنبھال لیں جو غیر معین عرصے کے لیے سیاسی خواجہ سرا بننے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی تک تو کوئی ایسا کوئزلنگ سامنے نہیں آیا۔ مستقبل کا حال خدا جانے۔ اس بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ آئندہ بھی لوگ (غدار بننے کے اس تصور) کی اسی طرح مزاحمت کرتے رہیں گے۔

اب ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ہوگا کہ — کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات اور اسرائیلی/مصری معاہدے میں جس قسم کے انتظامات کی تصریح کی گئی ہے۔ اس کو بیک زبان اور متحدہ طور پر مسترد کرنے کے علاوہ — فلسطینیوں نے کیا کیا اور کیا کہا ہے۔ یہ وہ ڈرامہ ہے جس کے متعلق لوگوں کو بہت کم علم ہے اور جس کا اب مجھے ذکر کرنا ہوگا۔

۳

فلسطینی اور علاقائی واقعیتیں

جب میں نے قبل ازیں یہ کہا تھا کہ مشرق وسطیٰ ایک مخلوط مشرقی خطہ ہے تو اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسئلہ فلسطین فی نفسہٖ اس قسم کے دوسرے تمام مسائل سے قطعی مختلف ہے اور یوں یہ کچھ عجیب اور نرالا سا نظر آتا ہے، دوسری وجہ یہ تھی کہ ثقافتی، سیاسی اور تاریخی اعتبار سے وہ جس خطے کے ساتھ منسلک ہے، اس کی کچھ اپنی نرالی خصوصیات ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے تو یقینی طور پر ان کی سوچ یہ ہے کہ انہیں جس بے دخلی سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کا ذمہ دار وہ استعمار ہے جس نے آباد ہونے کی نیت سے ان کے وطن پر یورش کی تھی۔ ستم رسیدگان کی حیثیت سے ان کے ساتھ جو کچھ بیتا یہ نقطۂ نظر صرف اسی سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر نہ تو یورپ کی یہود دشمن ہولناک اور سفاکانہ کارروائیوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور نہ موجودہ سیاق و سباق میں ان حقائق کو خاطر میں لاتا ہے کہ

یہودیوں کے نزدیک اسرائیل ایک ایسی مملکت ہے جس نے حقیقی معنوں میں زبردست کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔

اسرائیل کے باشندے اور دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک اس (مملکت
اسرائیل) کے ساتھ پیمانِ وفا باندھ چکے ہیں۔

اسرائیلی صیہونیت اور فلسطینی مزاحمت ان خالص، مصفا اور نسبتاً
غیر پیچیدہ اوصاف سے عاری ہے جو جنوبی افریقہ کی سیاہ فام اکثریت کی سفید فام
اقلیت کے خلاف جد وجہد کا طرۂ امتیاز ہیں۔

پھر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ بن گئی ہے کہ اس قسم کی دوسری تحریکوں
کے برعکس عربوں کی حصولِ آزادی کی تحریک کو نسبتاً آسانی سے اور کافی زیادہ
سرمایہ فراہم ہو رہا ہے۔ تقریباً غیر محدود سرمایے کی محض موجودگی اور دستیابی
ایک ایسی چیز ہے جو حصولِ آزادی کے تصور سے کوئی لگا نہیں کھاتی، بلکہ اس
کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس بارے میں کوئی خاص دلیل
دینے کی ضرورت نہیں کہ جس چیز کو عام طور پر عربوں کی حصولِ آزادی کی جدوجہد
کہا جاتا ہے، اس کے متعلق گفتگو کرتے وقت یہی مسئلہ — جو اگرچہ کیفیت
کے اعتبار سے اتنا شدید نہیں ہے — پیش آتا ہے۔ اپنے نکتے کو مستند
انداز سے پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لفظی کے اس سیاق و سباق میں
ہم یہ سوال اٹھائیں کہ ترکیب "عربوں کی آزادی" کے صحیح صحیح معانی کیا ہیں؟
(اس سوال کا اٹھایا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ ایک طرف تو "عربوں
کی آزادی" کے متعلق باتیں بنائی جاتی ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ عین
اسی وقت مغربی معیشتوں نے تیل کی دولت سے مالا مال عرب مملکتوں کو بڑی
خوشی کے ساتھ اپنا شریکِ کار بھی بنا لیا ہے حالانکہ ان ممالک کی سیاسی زندگی
آزادی کی چھاپ سے نمایاں طور پر عاری ہے اور پھر ان میں سے ان مملکتوں
نے بھی جو اپنے آپ کو انقلابی کہلوا کر خوش ہوتی ہیں، فلسطینی جدوجہد کی تائید د

حمایت میں جس رویے کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی زیادہ سے زیادہ صرف یہی تعریف کی جا سکتی ہے کہ ان کا یہ رویہ خالی از عیوب نہیں۔)

پھر بھی میں اپنی اس کتاب اور (اپنی دوسری کتاب) "اورینٹلزم" میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، اس کی دوبارہ یہاں تکرار کرنا چاہوں گا کہ عرب دنیا کے متعلق بالعموم اور فلسطینیوں کے متعلق بالخصوص مغرب میں جو بحث ہوتی ہے اس میں خلط مبحث سے اس قدر کام لیا جاتا ہے اور اس میں غیر منصفانہ جانبداری برتنے کا رجحان اتنا غالب ہے کہ فلسطینی اور عرب حقیقتاً جن حالات میں سے گزر رہے ہیں انہیں سمجھنے کے لیے زبردست کوششیں درکار ہوں گی۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ان کوششوں کے نتائج اچھے برآمد ہوتے ہیں یا بُرے۔ مجھے اندیشہ صرف یہ ہے کہ فلسطینی/صیہونی آویزش کے پیچیدہ حالات کو منصفانہ انداز سے پیش کرنے کی سعی میں شاید میں اتنا کچھ نہ کر سکوں جس سے وہ زبردست غبار ہٹ جائے جو کذب و افترا کے انبار، تحریفات اور ارادی لاعلمیوں نے ہماری جدوجہد کی حقیقت کے گرد تان رکھا ہے۔ شاید اس قسم کا کوئی سیدھا سادھا کلیہ موجود نہیں جو اس قسم کے معاملوں میں سچائی کے ظہور میں مدد ہو سکے۔ اور یقیناً میں مزید یہ کہنا چاہوں گا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اس بارے میں پختہ یقین ہے کہ فلسطینی جس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں، اس میں تاریخی اور اخلاقی اعتبار سے اتنی جان اور استعداد موجود ہے کہ اس کے متعلق غلط بیانیاں کرنے اور اسے توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی جو بھی اور جتنی بھی مساعی کی جائیں گی، انجام کار وہ دم توڑ جائیں گے اور جدوجہد بہت آگے نکل جائے گی اور اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ عوام کے متعلق جو کچھ مصنفین تحریر کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں وہ صرف

وہ نہیں، بلکہ عوام کی یہ اپنی جد وجہد ہوتی ہے جو یقیناً انجام کار ان کی تاریخ متعین کرتی ہے۔ تاہم تحریروں کی کچھ نہ کچھ اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض نکات پیش کرنا ضروری ہیں۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کے متعلق اس تمام تر زبانی جمع خرچ کے باوجود سیاسی، صحافتی بلکہ ثقافتی سطح پر بھی یہ رجحان عام ہے کہ ان کے بارے میں سنجیدہ گفتگو اور بحث کو ہمیشہ معرضِ تعویق میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سرکاری اداروں سے وابستہ جارج بال[1] جیسی ذہین و فطین شخصیتوں کا یہی وطیرہ ہے اور اس نے اپنے مضمون "مڈل ایسٹ چیلنج" میں، جو یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو "نیویارک ٹائمز" کے ادارتی صفحہ کے بالمقابل صفحہ[2] پر شائع ہوا تھا، یہی نکتہ پیش کیا تھا۔ اسرائیل اور مصر کے معاہدۂ امن کا تحفظ کرنے اور اسے تقدیس عطا کرنے کے لیے امریکی حکومت جس قابلِ فہم جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی ہے، وہ تعویق و التوا کے اس رجحان کی محض حمایت ہی نہیں کرتا، بلکہ غالباً اس کا مقصد اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ (اگر ایسا نہیں تو) پھر حکومت اس مہمل اور نامعقول تصور سے کیوں چمٹی ہوئی ہے کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین سے کنی کترا کر نکلا جا سکتا ہے جب کہ یہ بات بالکل عیاں ہے (جیسا کہ اعلیٰ سرکاری حکام نجی طور پر یہ کہہ رہے ہیں) کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین ہی تو فلسطینی مسئلہ ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بالکل مساوی طور پر واضح ہے کہ اس امر کا ذرہ برابر امکان بھی موجود نہیں کہ کبھی کوئی متبادل قیادت منصۂ شہود پر نمودار ہو سکے گی۔

---

[1] صدر کارٹر کے زمانے میں امریکہ کا نائب وزیرِ خارجہ۔

[2] مغربی اخبارات کے ادارتی صفحہ کے بالمقابل صفحہ پر جو مضمون شائع ہوتا ہے، وہ بہت اہم تصور کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ انداز روزنامہ "نیشن" نے اپنایا ہے۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین اتنی جائز اور نمائندہ جماعت ہے کہ اس قسم کی کسی (متبادل) قیادت کے ظہور پذیر ہونے کا کوئی احتمال سرے سے موجود ہی نہیں۔ (معاہدہ) سینائی دوم کی شرائط اور اس سمجھوتے کی رو سے جو اسرائیل اور ہنری کسنجر کے مابین طے پایا تھا، امریکہ اس وقت تک تنظیم آزادیٔ فلسطین کو نہ تو تسلیم کرے گا اور نہ اس سے کسی قسم کی کوئی بات چیت کرے گا، جب تک کہ مؤخر الذکر اقوام متحدہ کی قرار داد نمبر ۲۴۲ کو منظور اور اسرائیل کو تسلیم نہیں کر لیتا۔ اس انتہائی علمی[۱]، بے لوچ اور سخت گیر شرط نے، جس نے نہایت بے شرمی ڈھٹائی اور ناشائستگی کے ساتھ ایک عظیم ملک (امریکہ) کو اس کی ایک اپنی بچہ مملکت (اسرائیل) کے گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ جھکی اور تنک مزاجانہ رویوں کے سامنے سرنگوں کر رکھا ہے اور جس نے فلسطینیوں کے معاملے کو محض پناہ گزینوں کا مسئلہ بنا دیا ہے، امریکہ کے سیاسی اکھاڑے میں تنظیم آزادیٔ فلسطین اور نتیجتاً فلسطینیوں کے مؤقف کو جائز قرار دینے کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ اس کا انجام البتہ یہ ہوا ہے کہ جس التوا کا ذکر جارج بال نے کیا ہے، اس شرط نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اور ہاں، اس نے ایک اور کارنامہ جو سر انجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اسرائیل اور اس کے امریکی حمائتیوں کی، جو بالکل چکنے گھڑے ہیں اور ہرگز ٹس سے مس نہیں ہوتے، یہ حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ ہر وقت طوطے کی طرح ہی رٹ

---

[۱] علمی (academic): بعض تحریریں اتنا عالمانہ رنگ لیے ہوتی ہیں کہ حقیقت کی دنیا سے ان کا تعلق برائے نام رہ جاتا ہے یا میدان میں جو باتیں کہی جاتی ہیں، وہ ناقابل عمل ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر وہ چیز جو ناقابل عمل ہو یا جس کا حقائق سے برائے نام واسطہ ہو، اس پر انگریزی کا لفظ academic چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

لگائے رکھتے ہیں، چھوڑیں صاحب، تنظیم آزادی فلسطین تو کیا سارے فلسطینی دہشت گرد ہیں، انتہا پسند ہیں، غیر ذمے دار ہیں۔

اور یہ محض خالی خولی لفاظی نہیں، بلکہ مسئلہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے پیچھے متعدد وجوہات کام کر رہی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر تمام ذرائع ابلاغ اور دانشوروں کے طبقے نے من حیث المجموع ہمیشہ یہی نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ حال ہی میں ایک ٹیلی وژن کمپنی نے جس کی نشریات سارے ملک میں دیکھی جاتی ہیں، ایک زبردست اقدام یہ کیا کہ اس نے فلسطینیوں کے متعلق ایک ایسی فلم، جو غیر ہمدردانہ نہیں تھی حقیقتاً ایک ایسے وقت پر دکھانے کا اہتمام کیا جب ناظرین کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ٹیلی وژن کی نشریات دیکھنے کی فرصت ہوتی ہے۔ اس فلم میں فلسطینیوں کے کردار کی تصویر کشی کی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ دہشت گرد ہیں آخر کیوں دہشتگرد بنے ہیں (یعنی دہشت گردی اختیار کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ وجوہ ہیں)۔ فلم کے آغاز سے قبل راوی نے ایک تقریر کی (اس قسم کی تقریر کی پہلے سے کوئی روایت یا نظیر موجود نہیں تھی)۔ اپنی تقریر میں راوی نے ناظرین کو یہ یقین دلایا کہ "ہم دہشت گردی سے نہ تو چشم پوشی کر رہے ہیں اور نہ اسے معاف کر رہے ہیں۔" اور یہ امر بھی کوئی کم اہم نہیں کہ اس فلم کے پیش کرنے میں کسی تجارتی ادارے کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ (کمپنی نے اپنے خرچ پر یہ فلم پیش کی تھی)[۵]۔ میرے خیال میں سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ وہ امریکی، جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اسرائیل

---

۵ چونکہ امریکہ میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات نجی اداروں کی تحویل میں ہیں، اس لیے ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ اشتہارات ہیں۔ چنانچہ تجارتی اداروں کے تعاون کے بغیر کسی پروگرام کو پیش کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کی بطور ایک مملکت حمایت کرنا چاہیے، اس بات سے قطعاً لاعلم ہیں کہ فلسطینی وہاں رہتے تھے جہاں آجکل اسرائیل قائم ہے اور یہ کہ وہ اس لیے پناہ گزیں نہیں بنے تھے کہ وہ یہودیوں کے دشمن تھے بلکہ انہیں اس لیے پناہ گزیں بننے پر مجبور ہونا پڑا کیونکہ ان میں سے بیشتر کو اسرائیل نے ڈنڈے مار کر باہر نکال دیا تھا۔ اس صورت حال (امریکیوں کی لاعلمی) نے صیہونی پراپگنڈے کی خوب مدد کی ہے اور یہ اسی صورت حال کی برکت ہے کہ کسی اختلافی نقطہ نظر پر سنجیدگی سے توجہ دینا تو بہت دور کی بات ہے، اسے سننا بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ اگر کوئی (امریکی) شخص فلسطینی حقوق کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو اس پر یہ لازم ہے بلکہ وہ مجبور ہے کہ وہ اس زندانی ڈھانچے کو تسلیم کرے جو کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں نے مہیا کیا ہے یا پھر وہ ان باتوں کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرے کہ تنظیم آزادی فلسطین کے میثاق کا مفہوم کیا ہے؟ "عرب" یہودیوں کو کیوں ہلاک کرتے ہیں؟ یا یہ کہ اسرائیل ظالم و جابر مسلمانوں کے ساتھ، جن کی سوچ اور اعمال قرونِ وسطیٰ کے لوگوں کے سے ہیں، کیوں گزارہ کرنے پر مجبور ہے؟ دریں اثنا حکومت فلسطینی "انتہاپسندی" — عراق اور لیبیا جیسی مملکتوں کو الگ تھلگ کرنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں، ان کا یہاں ذکر نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے — کو ان پالیسیوں کی ترویج کے لیے، جن میں اس نے بے دھڑک اور ناعاقبت اندیشانہ انداز سے سرمایہ کاری کی ہوئی ہے، اپنی پوری قوت سے استعمال کرسکتی ہے اور جب اس کا جی چاہتا ہے تو اسی "انتہاپسندی" کو بہانہ بنا کر فلسطینیوں، عراقیوں اور لیبیا والوں پر فوجی حملے کرسکتی ہے۔

چنانچہ فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کو جس انداز سے شیطان بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اس سے ایک مفید مطلب حاصل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اسرائیل

کی اس وحشیانہ یلغار کے بارے میں، جو اس نے مارچ ۱۹۷۸ء میں جنوبی لبنان پر کی تھی[1]، امریکہ اور اس کے دانشور طبقے نے جو مکمل خاموشی اختیار کئے رکھی، اس کی توجیہہ کیسے کی جاسکتی ہے؟ امریکہ کے اتحادیوں (اسرائیل، لبنان کے عیسائی وغیرہ) کو یہ کھلی چھٹی دی جارہی تھی کہ وہ شہری باشندوں کے خلاف کلسٹر بموں[2] جیسے امریکی ہتھیاروں سے مسلح ہوکر زبردست "انسدادی" جنگوں کا آغاز کرسکتے ہیں تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ "انتہاپسندی" اور "دہشت گردی" سزا سے بچ نہیں سکتی جب امریکہ کے اسرائیل جیسے اتحادی ایسی جنگیں چھیڑتے ہیں جن کا مقصد نہایت ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اپنے مخالفین کا قتل عام ہوتا ہے (ایسا ہی ایک قتل عام انڈونیشیا نے اپنے ایک صوبے "تیمور" کی شہری آبادی کا کیا تھا) تو اس کے متعلق ایک لفظ تک نہیں کہا جاتا اور مکمل سکوت اختیار کرلیا جاتا ہے۔

اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اسرائیل کی پیٹھ ٹھونکی جاسکتی ہے کہ وہ سوویت یونین کے یہودیوں کی حمایت کرتا رہے جو اپنی حکومت کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں (اور وہاں سے اسرائیل آنا چاہتے ہیں) یا پھر وہ فلسطینی قوم پرستی کو بیخ وبن سے اکھاڑتا رہے کیونکہ مغرب کی نگاہ میں یہ دونوں مقاصد مبنی "احسن" ہیں۔

عام بحث مباحثہ، پالیسی کی تشکیل اور ثقافتی گفتگوئیں، جس دائرے کے اندر

---

[1] اسرائیل نے صرف جنوبی لبنان پر وحشیانہ حملے کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ۱۹۸۲ء میں اس نے تقریباً سارے لبنان کو روند ڈالا اور بیروت میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں کو اس نے اور اس کے اتحادیوں نے جس طرح فضائی، بحری اور بری بم باری کا نشانہ بنایا، اس کی مثال ذرا مشکل سے ہی ملے گی۔ عالمی رائے عامہ کے دباؤ کے تحت اسرائیل نے ۱۹۸۳ء میں بیروت سے اپنی فوجیں واپس بلالیں لیکن جنوبی لبنان میں وہ ابھی تک ڈیرہ جمائے ہوئے ہے۔

[2] کلسٹر (Cluster) بم ایک قسم کا بموں کا گٹھا جس میں دھماکوں کے ساتھ پرخچے ہوجانے اور آگ لگنے والے بم ملے جلے ہوتے ہیں۔

کی جاتی ہیں، وہ روز بروز تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے، چنانچہ نقطۂ نظر
کو محدود کرنے والا ایک رجحان ایسے ہی ایک دوسرے رجحان کی آبیاری کرتا
اور اسے مضبوط تر بناتا ہے۔ اس رویے نے جس سانحے کو جنم دیا ہے،
اس کا سب سے بڑا شکار فلسطین کا مسئلہ ہے جو کہ مشرق وسطیٰ اور عرب ممالک
کی جدید سیاست کا انتہائی زبردست اور طاقتور عنصر ہے[۵۰]۔ لیکن اس مسئلے کے
بارے میں امریکہ کے لوگوں کی دلچسپی میں اتنی کمی پہلے کبھی نہیں آئی تھی جتنی کہ اب آئی ہے۔
اس کی وجوہات کیا ہیں، ان کا ذکر کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ چنانچہ میں مندرجہ
ذیل صفحات میں صرف اتنی کوشش کروں گا کہ جن کارروائیوں میں عرب اور فلسطینی ملوث
ہیں، ان کا مفہوم واضح کر سکوں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ میرے قارئین شاید امور کو ذرا
اس انداز سے سمجھ سکیں گے جس انداز سے مشرق وسطیٰ کی ایک زبردست اکثریت
انہیں دیکھتی ہے اور ممکن ہے کہ یوں بحث مباحثے اور گفتگو کے لیے ایک
وسیع تر اور صحیح تر تناظر بتدریج سامنے آجائے۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ
مجرد مسائل کو یوں پیش کیا جاتا ہے جیسے وہ جیتی جاگتی چیزیں ہوں اور ان کے متعلق
نعرے بھی ایسے لگائے جاتے ہیں جیسے روایتی طور پر جیتے جاگتے انسانوں کے متعلق
لگائے جاتے ہیں۔ مسئلہ فلسطین بھی کچھ ایسا ہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ سیاسی
اور انسانی سطح پر اس سے یوں نپٹا جائے جیسے یہ فوری توجہ کا مستحق ہو۔ سب
سے بڑھ کر جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں اس کتاب میں جو باتیں کہتا
چلا آ رہا ہوں۔ ان کو کہنے کا سلسلہ جاری رکھوں، مطلب سعدی یہ ہے کہ میں مسئلہ
فلسطین کی تفصیل یوں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک مسئلہ ہے جس نے خالص انسانی

۵۰۔ اس ضمن میں مائیکل سی ہڈسن کی کتاب "Arab Politics" (عرب سیاست)، مطبوعہ ییل یونیورسٹی
پریس نیو ہیون (امریکہ) (۱۹۷۰ء) کا مطالعہ مفید رہے گا۔ (مصنف)

وجوہ کی بنا پر بے شمار لوگوں کو متاثر کیا ہے، یہ وہ چیز ہے جو محض وقوع پذیر نہیں ہوئی بلکہ یہ لوگوں کے ذہنوں اور روحوں میں رچ بس گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ حرکی اور تاریخی بھی ہے۔

میں دو باتوں کو خاص طور پر وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے، اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو یہ دونوں باتیں اتنی اہم بن جاتی ہیں کہ کیمپ ڈیوڈ کے بعد کے حالات کا جو تجزیہ کیا جاتا ہے، اس میں عام طور پر انہیں پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ لیکن اگر کوئی شخص مشرق وسطیٰ کی صحیح اور اصلی سیاسی حقیقتوں کا ادراک حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انہیں سمجھنے کی بھرپور کوشش کرے۔ ان میں سے اولین بات تو یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء کے بعد فلسطینی موقف میں بعض انتہائی اہم تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں اور اس نے نئے خطوط پر نمو پائی ہے۔ ان تبدیلیوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ــــ تاہم انہیں سیاسی طور پر وہ اہمیت نہیں دی جاتی جن کی کہ وہ مستحق ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں بڑے بڑے تاریخی عمل رونما ہوئے ہیں۔ اگر مسئلہ فلسطین پر اس انداز سے غور کیا جائے کہ یہ (مسئلہ) ان تاریخی عملوں کے ساتھ ایک مضبوط رشتے میں بندھا ہوا ہے تو اس کی اصلی اور سچی مرکزیت اور قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یا اس مرکزیت اور قوت کو بہتر انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔

میں نے اس کتاب کا آغاز اس اختلاف کو زیر بحث مسئلہ بنا کر کیا تھا جو فلسطین کی دو حیثیتوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ ان میں ایک حیثیت تو تاریخی حقیقت (جو اب موجود نہیں رہی) کے اعتبار سے ہے اور دوسری اس سیاسی جدوجہد کے اعتبار سے جس کا مقصد فلسطینیوں کے لیے،

جن کا نہ تو کوئی ملک ہے اور نہ کوئی مناسب قومی وجود، حق خود ارادیت حاصل کرنا ہے۔ ایک وقت وہ آیا جب فلسطین نام کا کوئی ملک روئے زمین پر باقی نہ رہا۔ پھر ایک وقت وہ آیا جب فلسطینی اپنے حق خود ارادیت کے حصول کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے اور عملی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں اوقات کے مابین جو وقفہ حائل ہے، اس کے دوران میں اچھی خاصی تاریخ کو وقوع پذیر ہونا تھا اور اس تاریخ کی ایک اچھی خاصی واردات خود فلسطینیوں کے ساتھ پیش آنا تھی۔ ان فلسطینیوں ـــ ہمارے سیاسی رہنماؤں کی زبان میں میرے والدین کی نسل ـــ کے لیے جنہوں نے حقیقتاً فلسطین گنوایا فلسطین عرب فلسطین یا فلسطین عربیہ تھا۔ کسی بھی قابل لحاظ انداز سے یہ نسل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ فلسطین اسرائیل بن چکا ہے اور یا یہ کہ ان کے عرصۂ حیات کے دوران میں یہ دوبارہ ہماری عرب اکثریت کا ملک نہیں بن پائے گا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیانی عرصے میں عرب دنیا کی بیشتر سیاسی اور ثقافتی زندگی اسی قسم کے تصورات کی عکاسی کرتی تھی۔ اسرائیل نے جو کہ بیک وقت ہمارے تمام عوارض کا ناقابلِ بیان سبب بھی تھا اور ایک حقیقت بھی جسے ہم نے سب سے کم پہچانا تھا، غیر معمولی حد تک عربوں کی توانائیوں کو ہڑپ کر لیا تھا۔ یہ کابوس کی طرح ہمارے سروں پر سوار ہو گیا تھا۔ ہم جو کچھ کرتے تھے اسی کے حوالے سے کرتے تھے۔ عربیت کیا ہے؟ اس کی حدود اس کے حوالے سے متعین ہوتی تھیں۔ ہمارے دشمن (استعمار، مغرب وغیرہ) کون ہیں؟ انہیں ہم اسی کے حوالے سے پہچانتے تھے۔ ہماری نگاہوں میں کون سے عرب ممالک کی حکومتیں جائز ٹھہرتی تھیں؟ اس کا فیصلہ بھی کم و بیش ان کے ہر اس فعل سے ہوتا تھا جو وہ "صیہونیت" کے خلاف جدوجہد کے نام پر انجام دیتی تھیں۔ ان برسوں

کی تاریخ ——— ان ادلروں اور رسوم و رواج کے تناظر میں، جنھیں استعمار پہلے ہی ٹیڑھا میڑھا بنا چکا تھا اور جن کا رُخ بھی وہ تبدیل کرچکا تھا، اور جنھیں اسرائیل اور نا اہل جابر فوجی حکومتوں کے مابین غیر مساوی آویزش نے اور بھی ٹیڑھا میڑھا بنا دیا تھا ——— ابھی لکھی جانا ہے۔ لیکن (ان برسوں کی) تاریخ نے فلسطینیوں کو کچھ بھی تو نہیں دیا سوائے ان فلسفوں اور سیاسی جماعتوں کے جن کی اساس اس قسم کے عظیم اور فرحت بخش نعروں پر رکھی گئی تھی کہ ہمیں دوبارہ "عرب قوم" بننا ہے جس کا ماضی نہایت درخشاں تھا اور ہمیں عرب فلسطین دوبارہ حاصل کرنا ہے۔

۱۹۶۷ء کے بعد ڈرامائی طور پر جو کچھ وقوع پذیر ہوا۔ اس کے پیش نظر ہی میں ان تمام امور کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ ناصرازم، بعث ازم، عرب قوم پرست تحریک، اسلامی بنیاد پرستی[۲] اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی تقریباً ساری پارٹیوں کا سلسلہ جنگ

---

[۱] اس سلسلے میں کچھ کام شروع بھی ہو چکا ہے۔ ایک بہت نفیس مضمون باربرا کلکاس (Kalkas) نے Diverted Institutions: "A Remiter-pretation of the process of Industrialization in Nineteenth Century Egypt" کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ مضمون "عرب سٹڈیز کوارٹرلی" کی جلد اوّل شمارہ اوّل (زمستان ۱۹۷۹ء) میں صفحات نمبر ۳۱-۴۸ پر شائع ہوا۔

[۲] بنیاد پرستی (Fundamentalism) اصل میں یہ تحریک اس صدی کے آغاز میں امریکہ کے پروٹسٹنٹ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں، بالخصوص ایک وکیل اور سیاسی رہنما ولیم برائن (Bryan) نے چلائی تھی۔ اس کا مقصد اس نظریے کو فروغ دینا تھا کہ انجیل کا ایک ایک لفظ لفظاً و معناً درست ہے۔ یہ تحریک یہ بھی چاہتی تھی کہ عقائد جدیدہ کی بجائے عقائد قدیم دوبارہ مروّج ہوں۔ اس کے پانچ اصول تھے (۱) انجیل کی مطلق سچائی (۲) حضرت عیسیٰ کی کنواری ماں کے بطن سے تولید۔ (۳) حضرت عیسیٰ قبر سے اٹھایا جانا (۴) انسان کی نجات اور (۵) حضرت عیسیٰ کا دوبارہ ظہور۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جون (۱۹۶۷ء) کے بعد زمین بوس ہوگیا۔ اگرچہ (ان میں سے) بعض طبقے ابھی تک مراعات یافتہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن اس شکست نے ان کا جس طرح پڑا کیا ہے اس سے وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جن معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی حقیقتوں پر ان کی توجہ اور مساعی مرکوز تھیں، ان کے ساتھ ان کا رابطہ محض جزوی تھا۔ جہاں تک باقی باتوں کا تعلق ہے، یہ محض ایسے فلسفے تھے جنہیں دنیا کے مختلف خطوں اور تاریخ کے مختلف ادوار سے مستعار لیا گیا تھا۔ انہیں نہ تو ہضم کیا گیا تھا اور نہ ان کی مناسب و موزوں انداز سے تدوین نو کی گئی تھی تاکہ وہ ان عصری تقاضوں کو، جو ان کے سپرد کئے گئے تھے، پورا کرسکیں۔ کسی بھی مشرقی عرب ملک (حتیٰ کہ خود مصر میں بھی نہیں) میں نوآبادیاتی دور اور نوآبادیات کے اختتام کے دور کے مابین فیصلہ کن انقطاع عمل میں نہیں آیا تھا۔ یوں کہیں کہ استعمار اور نوآبادیات کا زمانہ تو لد گیا تھا۔ لیکن اس کے آثار و باقیات ختم نہیں کئے جا سکے تھے۔ ان کا اب بھی چلن تھا۔ اگر الجزائر کا (مثال کے طور پر) مصر، شام یا عراق سے موازنہ کریں تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ حکومت میں جو بھی، جہاں بھی اور جب بھی کوئی تبدیلی رونما ہوئی، وہ محض چہروں کی تبدیلی بن کر رہ گئی۔ اس میں کلام نہیں کہ طبقاتی ڈھانچوں ثقافتی گروہ بندیوں اور معاشی اداروں میں نہایت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لیکن یہ تمام تبدیلیاں کبھی بھی ایک ایسے مقام کو نہیں چھو سکیں کہ ہر چیز زیر و زبر ہو جاتی اور ایک انقلابی کایا پلٹ ممکن ہو جاتی۔ ان معنوں میں بھی عرب مشرق وسطیٰ ایک وسطی مقام پر رہا اور یوں وہ دنیائے اوقیانوس کے مجموعی بورژوازی استحکام اور مابعد جنگ کی تیسری دنیا کے طوفانی انقلابات کے مابین دونوں سے تقریباً

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۵۵۴: چنانچہ اسلامی ممالک میں احیائے اسلام کی جتنی بھی تحریکیں چلیں یا چل رہی ہیں، مغرب ان سب کو بلا تمیز "بنیاد پرست" قرار دے دیتا ہے۔

ایک قسم کے مساوی فاصلے پر قائم رہا۔
جمال عبدالناصر اپنی نسل کے واحد رہنما تھے جنہوں نے تیسری دنیا کے استعمار دشمن تصور پر سنجیدگی سے توجہ دی لیکن انہوں نے بھی بائیں بازو اور سوویت یونین میں صرف اسی وقت دلچسپی کا اظہار کیا جب مغرب نے انہیں دھتا بتا دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ (تلخ) حقیقت ہمیشہ ان کی سیاست پر اثر انداز ہوتی رہی۔ ایک لحاظ سے اس نے انہیں ایک عظیم رہنما بنا دیا لیکن ایک دوسرے لحاظ سے یہ ان کے پاؤں کی زنجیر بھی بن گئی اور یوں ان کا دائرہ عمل بہت محدود ہو گیا۔ عرب سیاسی زعما کی صفوں میں ان کے بہت سے مقلدین اور پیروکار بھی تھے۔ بجائے اس کے کہ ناصر انہیں اپنے پیچھے چلاتے کئی معاملات میں الٹا انہوں نے ان کی تقلید کی اور یوں انہوں نے بھی ان کی طرح اپنے ملک میں ایک سچی اور کھری اپوزیشن کو پنپنے نہیں دیا اور سارا زور مملکت کی سلامتی کے ایک ایسے نظام کی تشکیل پر لگا دیا جو بھاری بھرکم بھی تھا اور جس پر اخراجات بھی بے تحاشا ہو رہے تھے۔ اس مملکت کے مخالفین کی صفوں میں ایک تجریدی تصور، جسے "صیہونیت" کہتے ہیں، امریکہ (جس سے پینگیں بڑھانے کے لیے مصر بہت بے قرار تھا)، مصر کے بائیں بازو اور ہر اس عرب رہنما کو، جو مصری بالادستی کو خوش دلی سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، شامل کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مارکسزم (مارکسیت) کو کبھی بھی مصر میں مضبوطی سے پاؤں جمانے کا موقع نہ مل سکا، حالانکہ ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ناصر کے دور اقتدار کے دوران میں یہ مصری اور عرب ثقافت ہی تھی جس نے عام طور پر دوسری حکومتوں اور مملکتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر سیاسی طور پر ہراول دستے کا کردار ادا

کیا۔[۵] تاہم ناصر ایک دیو قامت شخصیت تھے۔ اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود انہوں نے عربوں کو طویل خواب خرگوش سے بیدار کیا اور ان کی توانائیوں کو بحال کیا۔ اس عمل کے دوران میں انہوں نے مصر کو عرب دنیا کا نقطۂ ماسکہ بنا دیا جب کہ اپنی عرب لطافت سے محروم ہو جانے کے بعد سادات کا مصر نائیجیریا یا برازیل کی طرح ایک وسیع لیکن بے حیثیت ملک کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔

جیسا کہ میں قبل ازیں ذکر کر چکا ہوں کہ ۱۹۶۷ء سے قبل فلسطینی سیاست نمو کے ایسے مراحل میں سے گزر رہی تھی، جو ان لہروں کے، جو عرب دنیا میں چل رہی تھیں متوازی بھی تھے اور ان سے بے پناہ طور پر متاثر بھی۔ جب ۱۹۶۷ء کے بعد فلسطین کی تحریک مزاحمت نے زور پکڑا اور اس میں تیزی آگئی، تو یہ عرب دنیا میں ایک ایسی اولین سیاسی تحریک کے طور پر ظہور پذیر ہوئی جس نے اندرون فلسطین یہودیوں سے براہِ راست ٹکر لی تھی۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کے مابین مغربی کنارے پر اردنی حکومت کے دورِ اقتدار کے دوران میں فلسطینی قومیت پھلتی پھولتی رہی تھی[۶] لیکن پھر جب اس علاقے پر بھی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا تو فلسطینی مسئلے نے نیا رخ اختیار کر لیا۔ اب فلسطینیوں کو اسرائیلی صیہونیت کے خلاف براہِ راست

---

[۵] اس موضوع پر بہترین کتاب انور عبد الملک کی تصنیف "مصر ایک فوجی معاشرہ ہے"۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ چارلس مارکھم (Markham) نے کیا تھا اور رینڈم ہاؤس، نیویارک نے ۱۹۶۸ء میں سے شائع کیا تھا۔

[۶] ۱۹۴۹ء اور ۱۹۶۷ء کے مابین فلسطینی قوم پرستی کا جائزہ سال مشعل نے اپنی کتاب

"East Bank West Bank The Palestinians in Jordan 1949 اور

1967- میں لیا ہے۔ اسے ییل یونیورسٹی پریس نیو ہیون نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔

زبردست ٹکر لینا تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطینی صہیونیت
کی جو مخالفت کر رہے تھے، وہ سیاسی اعتبار سے نہ مربوط تھی اور نہ مؤثر۔ ملک
سے محرومی کی صورت میں جو نقصان اٹھانا پڑا، اسے زیادہ تر عربوں کا نقصان تصور
کیا گیا اور جیسا کہ میں قبل ازیں عرض کر چکا ہوں کہ صہیونیوں نے جو پالیسیاں وضع اور اختیار
کی تھیں، ان کا مقصد تمام ملک کو عربوں سے خالی کرانا، نہ کہ ان پر حکومت کرنا تھا۔
۱۹۶۷ء کے بعد یہ صورتِ حال تبدیل ہو گئی۔

اس حقیقت کے باوجود کہ فلسطینی جلا وطن ہیں اور دنیا کے مختلف مقامات
پر بکھرے ہوئے ہیں، فلسطینی تحریکِ مزاحمت (جو بعد ازاں تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کے
نام سے معروف ہوئی) نے مشرقِ وسطیٰ کے متعلق ایک ایسا تصور اور اس کے
مستقبل کے بارے میں ایک ایسا خاکہ تشکیل دیا جو ماضی کے تمام تصورات سے
قطعی طور پر مختلف تھا۔ اس تصور کے تحت فلسطین کو ایک ایسی سیکولر جمہوری
مملکت بنانا مقصود تھا جس میں عرب اور یہودی دونوں مل جل کر رہ سکیں۔ اگرچہ اس
تصور میں کیڑے نکالنا اور اس کی ہنسی اڑانا بعض لوگوں کی تقریباً عادتِ ثانیہ بن
چکا ہے لیکن کوئی ایسا سنجیدہ طریقہ نظر نہیں آتا جس کی مدد سے اس کی زبردست
اہمیت کو گھٹا کر پیش کیا جا سکے۔ اس تصور کے ذریعے وہ سب کچھ قبول کر لیا
گیا جو عربوں اور فلسطینیوں کی کئی نسلیں قبول نہیں کر سکی تھیں —— یعنی اس تصور
کے واسطے سے یہ اقرار کر لیا گیا کہ فلسطین میں ایک یہودی قوم، جس نے لڑ بھڑ کر ایک
ملک حاصل کر لیا تھا، موجود ہے —— لیکن اس تصور نے یہودیوں کو محض
قبول ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس سے بھی کہیں آگے نکل گیا۔ فلسطینی تصور نے وہ حل
پیش کیا ہے جو میرے خیال کے مطابق کثیر الاقوام مشرقِ وسطیٰ کا واحد ممکنہ
اور قابلِ قبول مقسوم ہے۔ اس کے ذریعے ایک ایسی مملکت کا قیام مقصود

ہے جس کی اساس سیکولر انسانی حقوق پر ہو گی۔ اس مملکت میں کسی مذہبی یا اقلیتی طبقے کو اپنی بالادستی قائم کرنے اور دوسروں کو امورِ مملکت سے دور رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ اس میں جغرافیائی سیاست کے اصولوں پر مبنی وحدت[۱]، جس کو بہت مثالی بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور جس کا شام کے قوم پرست پرچار کرتے نہیں تھکتے، قائم کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ ایک ایسے خطے میں، جہاں سیاست کا کاروبار یا تو استعمار اور یا مذہب کے بل بوتے پر چلتا تھا، مذہبی اور غیر فوجی آویزشوں نے معاشرتی زندگی کی تنظیم کے لیے ایک نئی اساس فراہم کرنا ہی تھی۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر فلسطین (اسرائیل) کو مختلف ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔ اسے یہودی مملکت[۲] بھی کہا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ وہ مملکت ہے جو قومی سلامتی کے بارے میں بہت حساس ہے اور بعض سمجھتے ہیں کہ یہاں ایک اقلیت کی حکمرانی ہے۔ ان تمام

---

۱ جغرافیائی سیاست کن اصولوں پر کام کرتی ہے۔ اس کی وضاحت اوپر کی جا چکی ہے۔ شامی قوم پرست شاید ایسی سیاست کے قائل ہیں جس میں غیر عربوں (یا یہودیوں) کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔

۲ یہاں مصنف نے انگریزی ترکیب "Ghetto state" استعمال کی ہے۔ Ghetto کسی شہر کے اس محلے کو کہتے ہیں جو ہماری کچی آبادیوں کی طرح ہر قسم کی شہری سہولتوں سے محروم ہو۔ امریکہ میں اس قسم کے محلوں میں عام طور پر اقلیتی طبقے کے افراد رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ نیویارک شہر کا محلہ ہارلم (Harlem) جہاں زیادہ تر حبشی باشندے رہتے ہیں۔ اس طرح کا بدنام ترین محلہ ہے۔ لیکن بیسویں صدی سے قبل یورپ میں یہودیوں سے اتنی نفرت کی جاتی تھی کہ انہیں الگ تھلگ محلوں میں رہنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ ان محلوں کو "یہودی باڑے" Ghetto کہا جاتا تھا۔ اس رعایت سے اسرائیل کو Ghetto state کہہ سکتے ہیں۔

تصورات پر صرف ایک تصور ہی تفوق حاصل کر سکتا ہے اور وہ تصور ایک سیکولر جمہوری معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے۔ اس معاشرے میں تمام قوموں کے لیے گنجائش نکال لی جا سکے گی اور وہ مل جل کر سارے ملک کی عظیم تر بھلائی کے لیے کام کریں گے۔

فلسطینیوں نے فلسطین کے مستقبل کے متعلق یہ جو خاکہ پیش کیا ہے، اس کی راہ میں متعدد مشکلات اور مسائل سنگ گراں بن کر حائل ہو چکے تھے۔ بنیادی طور پر بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس تصور کو قبول کرنے کے لیے آمادہ تھے اور وہ جچے تلے اور صحیح ذرائع تو کسی کے بھی پاس نہیں تھے جن کے ذریعے اس تصور کو عملی شکل دینا ممکن ہوتا۔ لیکن بہت سا کام تو اسی وقت ہو چکا تھا جب یہ تصور تشکیل و ترتیب کے مراحل میں سے گزر رہا تھا اور اس کی نوک پلک سنواری جا رہی تھی۔ عربوں نے فلسطین کو ہمیشہ اس تناظر میں دیکھا کہ یہ ایک عرب ملک ہے لیکن اب کے بار پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس میں ایک دوسری ثقافت کی قلم[1] بھی لگا دی گئی۔ اس خطے کی جدید تاریخ میں پہلی مرتبہ — اور میرے نزدیک یہ امر بے پناہ قدر و قیمت کا حامل ہے — انسانی اور سیاسی مواد سے عہدہ برآ ہونے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ ماضی میں ان سے نپٹنے کے لیے درآمد شدہ یا مطلقیت بلا استثنا

---

[1] یہاں مصنف نے انگریزی لفظ 'acculturation' استعمال کیا ہے۔ جب کسی تہذیب ثقافت یا فرد کا دوسری تہذیبوں، ثقافتوں یا افراد سے واسطہ پڑتا ہے، تو اس میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس عمل کو acculturation کہتے ہیں۔ جب فلسطین میں یہودی اور عرب مل جل کر رہیں گے، تو وہ اس عمل میں سے بھی گزریں گے۔

پر مبنی فلسفوں (مثلاً صیہونیت اور عربیت) سے کام لیا جاتا رہا تھا (فلسطینوں کی سوچ میں) یہ جو اتنی بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے، مغرب کا ایک بھی سیاسی تبصرہ نگار اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔

یہی نہیں، خود صیہونی بھی اس کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے متعلق جو فی زمانہ بحث و تمحیص ہوتی ہے، اس میں فلسطینیوں کی سوچ کی اس تبدیلی کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی جاتی جتنی کہ کتاب کے حاشیے پر کسی تحریر کو حاصل ہوتی ہے۔ فلسطینیوں کے متعلق یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا کہ وہ جاہل دہشت گرد ہیں۔ ان کے میثاق کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا کہ انہوں (فلسطینیوں) نے یہودیوں اور صیہونیت کا نام و نشان تک مٹا دینے کا جو عزم کر رکھا تھا، اس (میثاق) سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ ان کے اس (عزم) میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اب تو مخالفین کی یہ عادت بن گئی ہے کہ وہ سیکولر جمہوری ریاست کے تصور کو قتل عام کے مترادف قرار دینے لگے ہیں[۱]۔ دریں اثنا اسرائیل ابھی تک فلسطینیوں کو غیر یہودی کہہ کر پکارتا رہا اور یا ــ اور یہ بہت اہم واقعہ ہے ــ پھر انہیں "ارتیز اسرائیل کے عرب" کہنے لگا۔ دریں اثنا اسرائیل نے باقی ماندہ فلسطین کو اپنی نوآبادی بنانے کا کام جاری رکھا اور لاکھوں فلسطینیوں پر فوجی حکام حکومت کرتے رہے لیکن مغرب کے لبرل دانشوروں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اسرائیلی فلسطینی بچوں کا

---

[۱] اس نقطہ نظر کو سب سے زیادہ "ماہرانہ" انداز سے یہودی جنرل یہو شفاعت حرکابی نے پیش کیا ہے اسرائیلی فوج میں اس کی تصنیفات کا مطالعہ لازمی قرار دے دیا گیا ہے اور مغربیں اسرائیلی سفارت خانے انہیں باقاعدگی کے ساتھ لوگوں کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس کی کتاب "فلسطینی اور اسرائیل" مطبوعہ کیٹر (Keter) پریس، یروشلم کا مطالعہ فرمائیں۔ (مصنف)

استحصال کرتے رہے، وہ فلسطینی جو اندرون اسرائیل کام کرتے تھے۔ انہیں رات کو وہیں، جہاں وہ کام کرتے تھے، مقفل کر دیا جاتا رہا، تحقیقات اور تفتیش کے دوران میں انہیں باقاعدہ ایذائیں پہنچائی جاتی رہیں۔ اسرائیل اور مقبوضہ عرب علاقوں میں خصوصی قوانین کا اطلاق صرف عربوں پر ہوتا رہا اور یہودیوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا رہا۔ یہ باتیں کیوں ہوتی تھیں اور کیسے ہوتی تھیں، مجال ہے جو ان لبرل دانش وروں نے ان کے بارے میں جھوٹے منہ بھی ایک لفظ تک کہا ہو۔[1] اس کے برعکس ان امور کے بارے میں ریاکاری اور منافقت کی زبان استعمال کرنا باعث عزت اور باعث فخر خیال کیا جاتا تھا اور بڑے زور شور کے ساتھ یہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا، واہ واہ کیا کہنے اسرائیلی قبضے کے۔ یہ تو بہت نافع اور شفیق ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ اسرائیلی قبضے سے فلسطینیوں کو بے تحاشا معاشی فوائد پہنچے ہیں اور ان (نام نہاد) معاشی فوائد کے بارے میں بہت نکتہ چینی کی جاتی تھی (کہ یہ فلسطینیوں کو کیوں حاصل ہو رہے ہیں)۔ ادھر لبنان میں فلسطینی کیمپوں پر باقاعدگی کے ساتھ گولہ باری ہوتی رہی، ان پر گولیاں چلتی رہیں اور ان پر نیپام بم گرائے جاتے رہے۔ معلوم ہوا کہ جنگ کی یہ سختیاں "دہشت گردوں" کے ٹھکانوں کی "صفائی" کی خاطر ہو رہی ہیں۔

جب ہم گزشتہ دس سال کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر فلسطینیوں سے صحیح صحیح توقع کس بات کی کی جا رہی تھی

---

[1] اس سلسلے میں کتاب: The Market of Arab Children in Israel: A Collection by the Israel League for Human and Civil Rights" کا مطالعہ مفید رہے گا۔ یہ کتاب پوسٹ آفس باکس نمبر ۱۴۱۲۳ تل ابیب کے پتے پر مل سکتی ہے۔ اور یہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس بارے میں ایک تفصیلی نوٹ پہلے لکھا جا چکا ہے۔

ان کے دوست اور اتحادی یہ چاہتے تھے کہ ان کے حقوق کسی نہ کسی حد تک بحال ہو جائیں لیکن ایسے ممالک، اقوام، اداروں یا اشخاص کی تعداد بہت کم تھی جو اس بات کی حمایت کرتے تھے کہ فلسطینیوں کو اس سے کچھ زیادہ مل جائے جس کا بین السطور وعدہ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کو جو مسئلہ درپیش تھا، وہ یہ تھا کہ اسے جس حلقۂ انتخاب کی رہنمائی کرنا تھی، اس کے رائے دہندگان کی بیشتر تعداد ان جلاوطنوں پر مشتمل تھی جو مغربی کنارے یا غزہ سے نہیں آئے تھے (مثال کے طور پر وہ لاکھوں فلسطینی، جو لبنان میں مقیم ہیں، حیفہ، جافہ اور الجلیل سے آئے تھے) اس کے ساتھ ہی مغربی کنارہ اور غزہ وہ واحد مقامات تھے جہاں فلسطینی قومیت کے خواب کے شرمندۂ تکمیل ہونے کے امکانات تھے۔ تاہم فلسطینی اپنے قومی مقاصد کے حصول کے لیے جتنا زیادہ دباؤ ڈالتے تھے، اتنا ہی زیادہ جوابی دباؤ ان کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا اور آویزش کا رخ اتنا ہی زیادہ ان کی طرف ہو جاتا تھا۔ اردن اور لبنان اس آویزش کی دو گراں ترین مثالیں ہیں۔ ہر دن جو گزرتا جا رہا تھا، اس کے ساتھ یہ حقیقت واشگاف ہوتی جا رہی تھی کہ اگر فلسطینی اپنا حق خودارادیت حاصل کرنا چاہتے تھے تو انہیں فلسطینی آزادی (کے تصور) کو عربوں کی حمایت کے ساتھ مربوط کرنا پڑے گا۔ تاہم اس ربط کا امکان کم ہی نظر آتا تھا کیونکہ اکثر وہ نوں کا ایک دوسرے کے ساتھ متشددانہ تصادم ہو جاتا ہے۔

دریں اثنا فلسطین پر اسرائیل کا تسلط قائم تھا اور وہ بعض اوقات محض اسلئے کہ اس کی پالیسی ہی یہی تھی اور بعض اوقات محض اس لیے کہ انتہا پسند پہل کر جاتے تھے، مقبوضہ علاقے کو اپنی مستقل نوآبادی بنانے کے پرانے تصور پر قائم رہا۔ مغربی کنارے اور غزہ پر حکومت کرنے کی وجہ سے ایسے نوآبادیاتی ادارے

وجود میں آ گئے جنہیں اتنے سال گزرنے کے بعد برقرار رکھنا ہر حکومت اپنی پیشرو حکومت سے کہیں زیادہ اپنا فرض خیال کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسرائیل کو اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسے یہودی شہریوں سے واسطہ پڑا جو فلسطینیوں کو ایک مسئلہ تصور کرتے تھے اور جس سے ان کے خیال کے مطابق نپٹنا ضروری تھا۔ اسرائیل میں، یورپ میں، امریکہ میں، متعلقہ یہودیوں (ہر قسم کی مختلف وجوہات کی بنا پر) کو فلسطینیوں کی حقیقت کا احساس ہونے لگا۔ لاریب، فلسطینیوں کی مزاحمت اور ان کے جارحانہ رویے (جو بعض اوقات دہشت گردی کا روپ دھار لیتا تھا) نے بھی اپنا کردار ادا کیا لیکن یہ حقیقت بھی اپنا کام کر گئی کہ عام یہودیوں کے سامنے ہی اسرائیلی فوج فلسطینیوں کے ساتھ نہایت ناروا سلوک کرتے تھے۔ وہ انہیں (فلسطینیوں کو) یوں بندوقوں کے کندے مارتے، کچوکے لگاتے اور حوالۂ زندان کرتے دیکھتے تھے جیسے وہ (جیتے جاگتے) انسان نہ ہوں، بلکہ خالی خولی اجسام ہوں۔ میری رائے میں فلسطینیوں کی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے بڑھ کر اور کوئی شے اہم نہیں تھی۔ حالانکہ انہیں مفتوح بنا لیا گیا تھا، دھکے مار مار کر ملک سے باہر نکال دیا گیا تھا اور دنیا کے مختلف مقامات پر منتشر ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا، وہ پھر بھی منظر عام سے غائب نہیں ہوئے تھے۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو فلسطینی کہتے تھے۔ وہ اب بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انہیں فلسطین واپس جانے کا اختیار حاصل ہے۔ خواہ انہیں کتنے ہی سہانے خواب دکھائے جائیں اور انہیں کتنے ہی انعام و اکرام کا لالچ دیا جائے، انہیں اب بھی اس خیال سے وحشت اور بے چینی محسوس ہونے لگتی تھی کہ کوئی اسرائیلی (یا کوئی عرب بھی) ان کا آقائے ولی النعمت اور فرمانروا ہو سکتا ہے، محض اس لیے کہ صیہونیت تاریخی طور پر فلسطینیوں کو ہمیشہ نظر انداز کرتی چلی آئی تھی، ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر اور ۱۹۷۰ء کے عشرے

کے دوران میں فلسطینی سیاست نے جب نیا رُخ اختیار کر لیا، تو اسرائیلی تلملا اُٹھے کہ ہائیں، فلسطینی تو دہشت ناک حد تک زیادہ تعداد میں مصروفِ عمل ہیں۔ یہ تصور قبول کرنا کہ فلسطینی بھی موجود ہیں، ایک بات تھی لیکن اس بارے میں عملی تجاویز کرنا کہ آخر ان کے ساتھ کیا کیا جائے ــــ جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں انہیں آباد کیا جا سکے اور یوں انہیں اسرائیل کے علاقوں سے دور رکھا جا سکے ــــ ایک دوسری بات تھی۔

یہ بات مان لینا چاہیے کہ اسرائیلی اور ان کے معاونین اس بارے میں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے رہے اور بڑے ترغیبی ذرائع اور تراکیب استعمال کرتے رہے کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہودیوں کی ایک اپنی مملکت ہو لیکن انہوں نے یہ سمجھنے کے لیے اپنی ذہانتوں کا عشرِ عشیر بھی استعمال نہیں کیا کہ فلسطینی منظرِ عام سے اوجھل ہونے اور کسی کو پریشان نہ کرنے یا اس کا ناک میں دم نہ کرنے کے لیے کیوں آمادہ نہیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ چونکہ فلسطینی منظرِ عام پر موجود ہیں، اس لیے ان کا منظرِ عام پر موجود ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ وہ اسرائیل پر اپنا دعوٰے جتلا رہے ہیں۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ فلسطینیوں کا ایک وجود ہے اور یہ کہ انہیں فلسطین کے خواہ ایک حصے پر ہی سہی، اپنی قومیت کو بروئے کار لانے کا حق حاصل ہے، تو (صیہونیوں کے نزدیک) اس کا مطلب یہ ہو گا کہ صیہونی حقوق اور دعاوی سچے نہیں، رائے عامہ کی عدالت میں ان کی تکذیب کی جا سکتی ہے۔ اور جیسا کہ گش امونیم[۵] کے متشدد حامیوں نے زیادہ صاف گوئی اور راستبازی

---

۵ مغربی کنارے اور غزہ کے مقبوضہ علاقوں میں جب اسرائیل نئی بستیاں تعمیر کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ تو سب سے پہلے ایک ہراول دستہ بھیجا جاتا ہے۔ اس دستے کے ارکان کا تعلق ایک انتہائی متعصب اور متشدد جماعت سے ہوتا ہے۔ اس جماعت کا نام گش امونیم ہے۔

کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر کہا تھا کہ اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ یہودیوں کو "نبلوس یا حبرون میں آباد ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں تو اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہوگا کہ کل کلاں فلسطینی جافہ یا حیفہ میں آباد ہونے کا مطالبہ کرنے لگیں گے (اور آپ کو ان کا یہ مطالبہ ماننا پڑے گا)۔ وہ صیہونی بھی، جو اپنے آپ کو" امن کی فاختائیں" کہتے تھے، جنہیں مغربی کنارے پر اسرائیلی بستیوں (کے قیام) کے متعلق ضمیر کی خلش محسوس ہوتی تھی اور جو فلسطینیوں کی حق تلفیوں کی تلافی کرنے کی سچی ضرورت محسوس کرتے تھے، یہ کہتے ہوئے گھبراتے تھے کہ مغربی کنارہ اور غزہ فلسطینیوں کے حوالے کیا جا سکتا ہے تاکہ وہ وہاں اپنی مملکت قائم کر سکیں۔ جودیہ اور سماریہ صحرائے سینا نہیں تھے (ان سب کے دل کا چور یہ کہتا تھا کہ) اگر ان کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا کہ وہ فلسطینی (علاقے) ہیں تو پھر کیا یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں نہیں ہو جائے گی کہ اسرائیل درحقیقت نتیجہ ہے تسخیر کا اور اس امر کا کہ اس کے باشندوں نے دراصل دوسروں کو اپنے گھروں سے نکال دیا تھا اور ان کی جگہ خود قابض ہو گئے تھے؟ انفرادی ضمیر اور انتہائی بائیں بازو کی سیاست کے علاوہ اسرائیلی یا صیہونی سیاست میں کوئی عنصر ایسا نہیں جس کے دل میں فلسطینیوں کے لیے کوئی نرم گوشہ ہو یا وہ ان کے لیے کوئی گنجائش نکالنے کے لیے آمادہ ہو۔ ان (فلسطینیوں) کے لیے کوئی علاقہ، کوئی سیاسی یا معاشرتی مقام خالی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ باقی دنیا سمجھتی رہی کہ مغربی کنارہ اور غزہ فلسطینیوں کے حوالے کیے جا سکتے ہیں لیکن اسرائیلی یہی کہتے رہے کہ ایسا کرنے سے اسرائیل کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ بظاہر وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ اگر ان علاقوں (غزہ اور مغربی کنارہ) میں فلسطینی مملکت قائم کر دی گئی تو وہ اسرائیل پر حملے کرنے کا اڈہ بن جائے گی لیکن اصل حقیقت، جس کی تردید اور ہٹیلے پن سے

پر دہ پوشی کی جا رہی تھی، یہ تھی کہ صیہونیت نے فلسطین کے کسی بھی حصے پر اپنے کسی حریف کے حق کی موجودگی سے ہمیشہ انکار کیا تھا (اور وہ اب بھی اپنے اس انکار پر قائم تھی)۔ جس طرح ایک فلسطینی ریاست (اسرائیل کے لیے) ایک زبردست سیاسی خطرہ تھی، اسی طرح فلسطینی قوم پرستی بلکہ خود فلسطینی بھی خطرے کی علامت تھے۔

دہشت گردی کے متعلق جو گفتگو کی جاتی رہی، اس کا مقصد محض سے توجہ ہٹانا تھا۔ فلسطینیوں کو دہشت گردی کے مماثل ٹھہرانے کے لیے اسرائیلی اور مغربی باشندے جو مہمیں چلاتے رہے ہیں، وہ بھی ان حقائق کی پردہ پوشی نہ کر سکیں کہ

(الف) : فلسطینی دہشت (گردوں) نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جانی نقصان کم سے کم ہو۔ اور

ب : جیسا کہ اسرائیل کے جنرل گور (GUR) نے مئی ۱۹۷۸ء میں یہ اعتراف کیا تھا کہ اسرائیل کی سرکاری فوجی پالیسی یہ ہے کہ اجتماعی طور پر زیادہ سے زیادہ فلسطینی شہری باشندوں کو حملوں کا نشانہ بنایا جائے۔

تاہم ۱۹۷۴ء میں فلسطینی قیادت نے ایک اہم فیصلہ کیا کہ گو یہ بات بالکل عیاں ہے کہ (فی الحال) عرب فلسطین کی بحالی ناممکن ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ۱۹۷۳ء کی جنگ نے یہ بات ممکن بنا دی ہے کہ اگر عربوں کے عسکری اور سیاسی دباؤ کو کسی حد تک یکجا کر دیا جائے تو اسرائیلی بالادستی میں کچھ نہ کچھ دراڑیں ڈالی جا سکتی ہیں۔ مزید براں رباط کانفرنس نے اس حقیقت پر، جو پہلے ہی عیاں تھی، مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین امکانی طور پر فلسطینیوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ چنانچہ جب نومبر ۱۹۷۴ء میں یاسر عرفات اقوام متحدہ تشریف لائے، تو اس

قسم کے تصورات کو، کہ مسئلہ فلسطین کا کوئی خالص فوجی حل ہو سکتا ہے، ترک کیا جا چکا تھا۔ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ فلسطینی کم و بیش شعوری طور پر بین الاقوامی سیاسی اکھاڑے میں اترے جب کہ صہیونی یہ کام ان سے تقریباً ایک سو سال پہلے ہی کر چکے تھے۔

تنظیم آزادئ فلسطین نے بار بار اس بات کی تکرار کی کہ وہ مغربی کنارے اور غزہ میں ایک فلسطینی مملکت قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ ۱۹۷۴ء اور پھر ۱۹۷۷ء میں قومی کونسل کے جو دو اجلاس منعقد ہوئے، ان میں ساری (فلسطینی) قوم کو اس تصور کا پابند بنا دیا گیا اور اس تصور کے ساتھ بین السطور یہ وعدہ بھی وابستہ تھا کہ ایک ہمسائے کے طور پر اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائیگا لیکن یہ تبدیلیاں بڑی مشکلات کے بعد عمل میں آئیں۔ عرفات اپنے حلقہ انتخاب کی اکثریت سے یہ درخواست کر رہے تھے کہ وہ اپنے گھروں، املاک اور حقوق کی اصطلاحوں میں نہ سوچیں کیونکہ وہ انہیں ناقابل تنسیخ طور پر اسرائیلی ہاتھوں کھو چکے ہیں بلکہ وہ یہ دیکھیں کہ انہیں کون سے نئے سیاسی فوائد ـــــ مملکتی حیثیت، قومیت، حکومت، جیسے حقوق جن سے فلسطینیوں کو محروم رکھا گیا تھا ـــــ حاصل ہوں گے۔ ان کے مخالفین کا استدلال یہ تھا کہ انہوں نے "صہیونی استعمار" کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ استردادی محاذ نے ہر مقام پر غیر مختتم انقلابی جدوجہد شروع کرنے کا مطالبہ کیا گویا کہ وہ یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ عرفات جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں، اس سے فلسطینی انگلیں سکڑ جاتی ہیں جبکہ استردادی فلسفہ انہیں وسعت اور رکشادگی دیتا ہے۔ عرفات اور تنظیم آزادئ فلسطین جو سیاسی پیشکش کر رہے تھے، صہیونیوں نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ سرکاری طرز عمل کو صاف ہٹ دھرمی سے جاری رکھا گیا اور اس

میں مُو برابر فرق نہ آیا، بار بار یہی اصرار کیا جاتا رہا:

فلسطینی نام کی کوئی مخلوق روئے زمین پر موجود نہیں۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین ایک نازی ٹولہ ہے۔ اور

عرفات بچوں کا قاتل ہے۔

اسرائیلی فاختاؤں نے ایک سطح پر تنظیم آزادیٔ فلسطین کو تسلیم کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری سطحوں پر وہ اس سے دور ہٹتے چلے گئے۔ تنظیم سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلح جدوجہد ترک کردے اور اسرائیل کو پیشگی تسلیم کرے۔ عرفات سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ عملاً ایسے اقدامات کریں جو ثابت کریں کہ وہ (اس قسم کی) مراعات دینے کے لیے تیار ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین میں درحقیقت جو تبدیلی رُونما ہوئی تھی، اس کی کوئی قدر نہ کی گئی۔ اس تبدیلی کے جواب میں دوسرا فریق جو اقدام کرتا، ظاہر ہے کہ ردّعمل کے طور پر تنظیم بھی کوئی نہ کوئی کارروائی کرتی۔ لیکن کسی نے یہ سوچا تک نہیں کہ تنظیم نیک خواہشات کا جواب نیک خواہشات سے دے سکتی ہے۔ دریں اثنا اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ میں زیادہ سے زیادہ بستیاں تعمیر کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس پر کام جاری رہا۔ اس کے ساتھ ان دونوں علاقوں میں "متبادل" فلسطینی قیادت تخلیق کرنے کے لیے گاہے گاہے کوششوں کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۷ء کے مابین کے تین سالوں کے دوران میں امریکہ نے حیران کن انداز سے تخریبی اور غیر ذمے دارانہ طرزِعمل کا مظاہرہ کیا۔ ہنری کسنجر اور ان دو صدور[1] نے، جن کے تحت انہوں نے اپنے سرکاری فرائض سرانجام دیئے تھے، نسبتاً ایک مختصر عرصے کے دوران میں اسرائیل کو اتنا زیادہ اسلحہ فراہم کردیا جو اس سے

---

[1] صدر رچرڈ نکسن (۱۹۶۹ء-۱۹۷۴ء) اور صدر جیرالڈ فورڈ (۱۹۷۴ء-۱۹۷۷ء)

قبل اسے اپنی تاریخ میں کبھی دستیاب نہیں ہوا تھا۔ امریکہ نے عمداً یہ پالیسی اختیار کر رکھی تھی کہ فلسطینیوں کو نظر انداز کر دیا جائے، علاقے میں عربوں کے قوم پرستانہ جذبے میں سیندھ لگائی جائے اور اس کی تراش خراش کرکے اسے قابلِ قبول بنانے کی کوشش کی جائے اور سیاسی تحریک کو مجبور کیا جائے کہ وہ دو فریقی، قدم بہ قدم عمل کو تسلیم کرلے۔ مسئلہ فلسطین ہمیشہ امریکہ کی داخلی سیاست کا مسئلہ بنا رہا تھا اور اب کوشش یہ کی جارہی تھی کہ کسی طرح اس کی کچھ اس طور کایا پلٹ کر دی جائے کہ یہ مصری، شامی یا سعودی پالیسی (کی بھول بھلیوں) میں گم ہوتا نظر آئے۔ اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ کسنجر کے خیالات اتنی دور نکل گئے تھے کہ یہ تک سوچا جانے لگا کہ سی آئی اے[؎] کو لبنانی جنگ میں اس طرح جھونکا جائے کہ لبنانی جنگ طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے اور یوں تنظیم آزادیٔ فلسطین اس کی آگ میں بھسم ہو کر رہ جائے[؎]۔ مشرق میں ایران امریکی پالیسی کا حصار تھا۔ مغرب میں اسرائیل کی دفاعی صلاحیتیں اتنی وسعت اختیار کر گئیں کہ وہ شاہِ (ایران) کے دفاعی انتظامات کی تکمیل کرنے لگیں۔ اس طریقے سے امریکہ اس بات کا

؎ سی۔آئی۔اے (سنٹرل امریکن ایجنسی): امریکہ کا (بدنام زمانہ) بین الاقوامی جاسوسی کا ادارہ۔ یہ ادارہ محض جاسوسی ہی نہیں کرتا بلکہ ناپسندیدہ حکومتوں کے تختے بھی الٹواتا رہا ہے۔

؎ تفصیلات راجر مورس کی کتاب "غیر یقینی عظمت: ہنری کسنجر اور امریکہ کی خارجہ پالیسی" (ہارپر اینڈ رو، نیویارک، ۱۹۷۷ء) کے صفحہ نمبر ۲۶۱ پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ (مصنف) لبنان میں جنگ کی چنگاریاں ابھی تک سلگ رہی ہیں۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین اور خود یاسر عرفات کو اسرائیلی اور لبنانی عیسائی ملیشیا کے حملوں کے دوران میں جن آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا، اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ تاہم پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہیں جاسکا۔ تنظیم اور یاسر عرفات اب بھی بقید حیات ہیں اور دھڑلے سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

اہتمام کر رہا تھا کہ سوویت یونین کے لیے یہ علاقہ ایک طویل عرصے کے لیے ممنوعہ علاقہ بن جائے اور خود اپنے پنجے وہاں نہایت مضبوطی سے گاڑ لیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی یہ کوشش بھی تھی کہ ان قوم پرست اور انتہا پسند تحریکوں کا، جو ابھی تک غیر مقبول حکومتوں کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھیں، گلا گھونٹ دیا جائے۔[لہ]

فلسطینیوں نے عالمی برادری اور امریکہ کو اشاروں کنایوں میں جو پیغامات دیے تھے، انہیں عمداً پائے استحقار سے ٹھکرا دیا گیا۔ اب جب کہ تنظیم آزادی فلسطین اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۳۲۳۶ (۲۲ نومبر ۱۹۷۴ء) سے جس میں اس کے اس بین الاقوامی حق کی ضمانت فراہم کی گئی تھی کہ وہ خود ارادیت کے حصول کے لیے زور دے سکتی ہے اور جس میں اسے فلسطینیوں کی واحد جائز نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا گیا تھا، مسلح ہو چکی تھی، اس نے پہلے کی نسبت زیادہ اعتماد کے ساتھ یہ کوشش کی کہ امریکہ کے ساتھ سلسلہ جنبانی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ مثلاً ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء کے دوران میں تنظیم نے امریکی شہریوں کے تحفظ کے لیے ہر وہ کارروائی کی جو حتی الامکان اس کے بس میں تھی۔ ۲۲ جنوری ۱۹۷۶ء کو تنظیم نے سلامتی کونسل کی اس قرارداد کی علانیہ حمایت کی جس میں اس شق کا اعادہ کیا گیا تھا کہ "ایسے حالات پیدا کیے جانے چاہئیں جن میں فلسطینی عوام کو یہ موقع مل سکے کہ وہ اپنے غیر منفک اور

لہ اس عرصے کے دوران میں امریکہ جس پالیسی پر عمل پیرا رہا ہے۔ اس کا معقول ترین تجزیہ اقبال احمد کے مضمون "واشنگٹن کیا چاہتا ہے" میں کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ایک کتاب "مشرق وسطیٰ کی کٹھالی (Crucible) : عرب اسرائیلی جنگ اکتوبر ۱۹۷۳ء کے مطالعات" مرتبہ نصیر ایچ عاروری (مدینہ پریس، ولمٹ (Wilmette) الی نوائے، ۱۹۷۵ء) میں شامل ہے۔ "جرنل آف پیلسٹائن سٹڈیز" جلد دوم، شمارہ نمبر ۳ (بہار، ۱۹۷۳ء) میں میرے مضمون "امریکہ اور مشرق وسطیٰ کی قوتوں کی کشمکش" کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔ (مصنف)

ناقابلِ انتقال حق خود ارادیت کو، جس میں اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق فلسطین میں ایک آزاد سلطنت قائم کرنے کا حق بھی شامل ہے، بروئے کار لاسکیں" قرارداد میں کسی اگر مگر کے بغیر واضح طور پر مزید کہا گیا تھا کہ اس علاقے کی تمام مملکتوں کو امن چین سے رہنے اور اپنی علاقائی سالمیت اور آزادی برقرار رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے ـــــ یہ صریحاً اور کاملاً ایک غیر مبہم بیان تھا اور اس میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ اسرائیل کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اقوام متحدہ میں امریکی سفیر ڈینیل پی۔ موئنیہان[1] نے ایک لفاظی سے بھرپور لیکن احمقانہ تقریر کی اور اس کے ساتھ اس قرارداد کو ویٹو[2] کر دیا (اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیا)۔

جب صدر کارٹر برسر اقتدار آئے اور انہوں نے مارچ ۱۹۷۷ء میں کلنٹن[3] کے مقام پر اہم "فلسطینی" اعلانات کیے تو تنظیم آزادیٔ فلسطین کا ردعمل انتہائی مثبت تھا۔ اس وقت فلسطینی قومی کونسل کا اجلاس قاہرہ میں ہو رہا تھا اور اس ادارے کے سامنے عرفات نے جو اصل تقریر کی، اس میں انہوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ

---

[1] ڈینیل پی۔ موئنیہان (Moynihan): امریکہ کا ایک "برل" یہودی دانشور ہے جو امریکی سینٹ کا رکن بھی رہا ہے اور بھارت میں امریکہ کا سفیر بھی۔ اس ناطے پاکستان کے خلاف بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہتا ہے۔

[2] اقوام متحدہ کا اصل با اختیار ذیلی ادارہ "سلامتی کونسل" پندرہ ارکان پر مشتمل ہے۔ اس کے دس ارکان تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی، جس کا ہر ملک رکن ہے۔ دو سال کی میعاد کے لیے منتخب کرتی ہے (ہر سال پانچ ارکان منتخب ہوتے ہیں) لیکن پانچ ارکان ـــ امریکہ، روس، چین، برطانیہ اور فرانس ـــــ اس کے مستقل ارکان ہیں۔ اگرچہ چودہ ارکان بھی ایک قرارداد یا معاملے کی تائید کر دیں۔ لیکن ایک مستقل رکن نہ کرے تو وہ قرارداد منظور نہیں ہو سکتی۔ قرارداد کو اس طریقے سے نامنظور کرنے کے عمل کو "ویٹو" یا حق استرداد کہتے ہیں۔

[3] کلنٹن (Klinton) امریکہ کی ریاست "میساچوسٹس کا ایک" قصبہ۔

کارٹر کے بیانات پر تنظیم آزادیٔ فلسطین کے خوش گوار ردعمل کا اظہار کیا۔ اجلاس کے مجموعی لب ولہجہ نے فلسطینیوں کو اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں وہ امریکہ کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے بالکل آمادہ نظر آنے لگے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہی امریکہ ہے جو روایتاً فلسطینی امنگوں اور آرزوؤں کا مخالف رہا ہے۔ اسی سال بعدازاں معاملات اور بھی سعد نظر آنے لگے۔ کسنجر نے سینائی دوم کے اسرائیلی امریکی ضمیمے میں ایک شق تحریر کی تھی۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ امریکہ اس وقت تک تنظیم آزادیٔ فلسطین کو تسلیم نہیں کرے گا اور نہ اس سے کسی قسم کی بات چیت کا روادار ہوگا جب تک کہ وہ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ پر صاد نہیں کر دیتی۔ اب یہ قرارداد نمبر ۲۴۲ ایک ایسی سیاسی دستاویز ہے جو فلسطینیوں کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس قرارداد کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فلسطینی مسئلے کے قومی پہلو سے انکار کر دیا گیا ہے کیونکہ قرارداد نمبر ۲۴۲ صرف "پناہ گزینوں" کا ذکر کرتی ہے۔ پھر بھی ۱۹۷۷ء کے موسم گرما کے اواخر تک سعودی، مصری اور شامی پیغام رسانوں کی وساطت سے قرارداد نمبر ۲۴۲ کے متعلق امریکہ اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کے مابین ایک قسم کا سمجھوتہ طے پا چکا تھا۔ تنظیم نے قرارداد تسلیم کرنے کی حامی بھر لی تھی لیکن ساتھ ایک "شرط" لگا دی تھی کہ امریکہ اور تنظیم کے مابین جو سمجھوتہ طے پایا ہے اس میں ایک شق یہ رکھی جائیگی کہ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ میں فلسطینیوں کے حقوق کا، جو غیر منفک اور ناقابل انتقال ہیں، کوئی ذکر نہیں۔ بہرحال تنظیم نے قرارداد نمبر ۲۴۲ کو تسلیم کرنے کی جو حامی بھری اس کے جواب میں امریکہ نے یہ عندیہ دیا کہ وہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کو تسلیم کرے گا۔ اس سے بات چیت کرے گا اور فلسطینیوں کے حق خود ارادیت کے متعلق کوئی واضح بیان دے گا۔ اگست کے اواخر میں پتہ نہیں کیا پیچ آن پڑا کہ امریکہ نے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو عین آخری موقع پر یہ اطلاع دی کہ وہ تنظیم سے "مکالمے" سے آگے اور کچھ

نہیں کرے گا۔ چنانچہ قرارداد نمبر ۲۴۲ (کی کڑوی گولی) نگلنے کا انعام فلسطینیوں کو حقِ خود ارادیت کے حصول کی صورت میں نہیں ملنا تھا بلکہ امریکہ کے ساتھ گفتگو کرنے کا اعزاز حاصل ہونا تھا اور یہ اعزاز بھی اگر مگر سے خالی نہیں تھا۔

ظاہر بات ہے کہ تنظیم آزادئ فلسطین اس بنیاد پہ قرارداد نمبر ۲۴۲ تسلیم نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہر سیاسی منفعت سے دست کشی اختیار کی جا رہی ہے۔ فلسطینی قومی مسئلہ سارے فلسطینیوں کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ اس میں تخفیف ہو گئی ہے اور اب یہ پناہ گزینوں کے نئے مسئلے میں تبدیل ہو گیا ہے، گویا کہ "مڑ گھر کے کھوتی بوہڑ تھلے"[1] جب صدر سادات نے بیت المقدس کا سفر اختیار کیا، اس سے ایک ماہ قبل تنظیم آزادئ فلسطین اور امریکہ کے مابین بالواسطہ رابطوں کے ذریعے ایسے طریقے دریافت کرنے کی مساعی کی جا رہی تھیں جن کے سہارے جینوا کانفرنس میں فلسطینی شرکت ممکن ہو جاتی لیکن ۱۹ نومبر کو یہ کوششیں اچانک ترک کر دی گئیں۔

اس کے باوجود عرفات مستقل مزاجی کے ساتھ اشارے کنائے دیتے رہے۔ انہوں نے متعدد مواقع پر زور دے کر اس بارے میں فلسطینی رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ ایک مملکت قبول کر لیں گے، اسرائیل کو بالفعل[2] تسلیم کریں

---

[1] یہ پنجابی محاورہ انگریزی محاورے "Back to square one" کا ترجمہ ہے۔ دونوں کا مطلب ایک ایسی صورتِ حال ہے جہاں معاملات وہیں آ پہنچتے ہیں، جہاں سے ان کا آغاز ہوا تھا اور درمیان میں پیش قدمی مطلق نہیں ہوئی۔

[2] انگریزی میں حکومتوں اور مملکتوں کے لیے دو الفاظ de facto اور de jure استعمال ہوتے ہیں۔ وہ حکومت جو بالفعل موجود ہو لیکن اس کے موجود ہونے کا کوئی قانونی جواز نہ ہو۔ وہ DE FACTO (بالفعل) حکومت مشہور ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

گے اور امریکہ کے ساتھ براہِ راست معاملہ بھی طے کر لیں گے لیکن وہ یہ تمام امور صرف
اسی صورت میں بروئے کار لائیں گے "اگر"، جیسا کہ انہوں نے ایک موقع پر مجھ سے
بات چیت کرتے ہوئے کہا، "مجھ سے ناممکنات کا تقاضا نہیں کیا جاتا"۔ مئی ۱۹۷۸ء
میں عرفات نے "نیویارک ٹائمز" کے نمائندے انتھونی لوئیس کو بتایا کہ "میں ایک
مملکت قبول کرنے اور اس کے بعد اسرائیل کے پڑوس میں امن چین کے ساتھ رہنے
کے لیے تیار ہوں"۔ انہوں نے یہی بات جنوری ۱۹۷۹ء میں امریکی کانگرس (ایوانِ
نمائندگان) کے ایک رکن پال فنڈلی سے کہی۔ اس کے باوجود ناممکنات کا تقاضا
جاری رہا: اسرائیل کو پیشگی تسلیم کرو۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین کے میثاق میں ترمیم کرو۔
اپنے ہتھیار پھینک دو۔ تنظیم آزادیٔ فلسطین کو توڑ دو۔ سادات کی پیشکش قبول
کرو اور کسی پیشگی شرط کے بغیر قاہرہ کا طواف کرو۔ جب بھی اور جہاں بھی ——
لبنان میں، عرب دنیا کے دوسرے مقامات پر، مغربی کنارے اور غزہ میں ط امریکہ
میں، عرفات کے عوام کو مسلسل حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ۱۹۷۸ء کے موسم گرما کے
دوران میں اور پھر ۱۹۷۹ء کے اوائل میں تحریک میں ان کے ذاتی معاونین کے خلاف
قتل کی مہمیں چلائی گئیں۔ انہوں نے جنوبی لبنان میں تیس ہزار اسرائیلی فوجیوں کا مقابلہ
کیا۔ عربوں کی سیاسی حمایت نے لفظی سے غیر لفظی کالب و لہجہ اختیار کر لیا اور اس
کے باوجود صدر کارٹر کا یہ اصرار تھا کہ وہ "فلسطینی مسئلے کے تمام پہلوؤں" پر توجہ دینا ہوگی گویا کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۵۸۴ ہوگی۔ عام طور پر مارشل لاء کی حکومتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ لیکن جن حکومتوں کی
موجودگی آئینی اور قانونی جواز ہو، وہ de jure حکومت کہلائے گی۔ مؤثر حکومت وہی ہوگی جو دونوں اعتبار سے موجود ہو۔

ط ۱۹۸۲ء میں تنظیم آزادیٔ فلسطین اور یاسر عرفات کو اس سے بھی زیادہ مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جب وہ بیروت میں
فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں عیسائی ملیشیا کے، جس کی اسرائیل پورے زور شور سے پشت پناہی کر رہا ہے اور جسے مالی
اور فوجی امداد کے علاوہ باقاعدہ فوجی دستے بھی فراہم کر رہا تھا، گھیرے میں آ گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب یاسر عرفات زندہ
بچ کر نہیں نکل سکیں گے۔ فلسطینیوں کا بے پناہ جانی اور مالی نقصان ہوا لیکن عرفات اور ان کے ساتھی بیروت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ "تمام پہلو" ـــــ یا اس معاملے کی اصل روح ـــــ کہیں بیرونی خلا میں چکر لگا رہے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے زمین پر اترنے کے کب اور کیا انتظامات کیے جاتے ہیں۔

کیمپ ڈیوڈ کی دستاویزات میں ایک بات بھی ایسی نہیں تھی جو فلسطینیوں یا اردن کے شاہ حسین کے لیے حوصلہ افزائی کا محرک بنتی۔ جب زیر بحث علاقے میں اسرائیلی بستیوں کی بھرمار ہوتی جا رہی تھی، جب صدر سادات کو بیرونِ مصر کوئی سنجیدہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت سے مؤثر طریقے سے محروم کر دیا گیا تھا (معاہدے نے انہیں عرب دنیا میں بالکل تن تنہا کر دیا۔ ان کے افعال کے اس منطقی نتیجے کو اسرائیل اور امریکہ نے پہلے سے بھانپ لیا ہوگا) (فلسطینیوں کے لیے) بہترین حکمتِ عملی یہی ہو سکتی تھی کہ وہ استرداد پر ڈٹے رہیں ـــــ اسے بہرحال کسی قسم کی پالیسی نہیں کہا جا سکتا۔ اس صورتِ حال میں حزنیہ اور طربیہ دونوں قسم کی ستم ظریفی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ایک طرف سادات بڑے دبنگ اور دھانسو لہجے سے یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ فلسطینیوں کے حقوق بازیاب کر کے رہیں گے لیکن انہیں غالباً اس بات کا اندازہ نہیں کہ سوویت یونین کی تائید کے بغیر، عرب حمایت کے بغیر، اپنے اسرائیل کے ساتھ محدود معاہدے سے ماورا امریکی حمایت کے بغیر، وہ زیادہ سے زیادہ زبانی جمع خرچ ہی کر سکیں گے۔ دوسری طرف یہ نظر آتا ہے کہ امریکہ ابھی تک اس بارے میں متذبذب ہے کہ اسے مستقبل میں جو کردار ادا کرتا ہے، اس کے خطوط کیا ہوں گے۔ اسے دخل در معقولات دینا چاہیے یا اس سے احتراز کرنا چاہیے؟ یا اس کی یہ امید کہ انجام کار سعودی عرب اور اردن راہِ راست پر آجائیں گے، بار آور ہو گی یا نہیں؟ یا اس نے "مسئلہ فلسطین کے تمام پہلوؤں" کو پیشِ نظر رکھنے کا اپنے آپ کو جس طرح پابند بنا لیا ہے اور یہ پابندی اب جس طرح اس کے گلے کا ہار بن چکی ہے۔ کیا وہ اس پر قائم رہے گا یا نہیں؟

مزید بر آں، فلسطینی واضح طور پر، اور اس کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے، امن کی
طرف پیش قدمی کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں (بہر حال وہ کون سی قوم ہے جو اپنی
فلاکت و نکبت پر ڈٹے رہنے کی اتنی پابند ہو چکی ہے کہ وہ اس میں کسی قسم کی تخفیف
کرنے کے لیے سنجیدگی سے سوچ بچار نہیں کرے گی؟) جب کہ لفظاً اور معناً دونوں
اعتبار سے زمین ان کے پاؤں تلے کھسکتی جا رہی ہے۔ امریکہ، مصر اور تنظیم آزادی
فلسطین ایک دوسرے کے خلاف بر سر پیکار ہیں اور ان کی اس آویزش سے فائدہ
اسرائیل اٹھا رہا ہے۔

اس ملک (امریکہ) میں منظم یہودی حلقہ انتخاب نے با دل ناخواستہ معاہدے
کا خیر مقدم کیا ہے اور اس پر جو نکتہ چینی بھی کی ہے، وہ بھی دبی دبی زبان سے کی ہے
("کمنٹری" کے شمارہ برائے مارچ ۹۷۹ا میں تھیوڈور ڈریپر کا مضمون "مشرق وسطی
میں کس قسم کا معاہدۂ امن نہیں ہونا چاہیے" ملاحظہ فرمائیں۔) اس کو تسلیم کرنے کے حق
میں جو دلائل دیے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ اس سے مصر بے اثر ہو جاتا ہے اور
اسرائیل کو کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ جب کہ اسے نکتہ چینی کا ہدف اس لیے بنایا جاتا
ہے کیونکہ (نکتہ چینیوں کے خیال کے مطابق) اس سے فلسطینیوں کے حق خود ارادیت
کے بروئے کار آنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ امریکہ کے صہیونیوں نے اس مفروضے
کو صحیح مان لیا ہے۔ لیکن یہ طبقہ (امریکی صہیونی) وہ طبقہ ہے جو شاہ سے بھی زیادہ
شاہ کا وفادار ہے۔ چنانچہ جس طرح آنکھیں بند کر کے یہ طبقہ اسرائیلی پالیسیوں پر
آمنا و صدقنا کہتا ہے، خود اسرائیلی بھی کیا کہتے ہوں گے۔ اس معاملے میں ان سے اگر
کوئی لگا کھاتا ہے تو وہ اسرائیل کا انتہائی دایاں بازو ہے جس کی نظروں میں ہر وہ چیز
— بلکہ ان کا وجود بھی — جس کا تعلق فلسطینیوں سے بنتا ہے، ایسی تباہی
کی علامت ہے جس کا شاید کوئی مداوا نہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس قسم
کا نقطۂ نظر فہم و فراست سے کلیتہً عاری ہے لیکن جب "نیوری پبلک" اور "کمنٹری" جیسے جریدے بھی اس قسم

کا پرچار کرنے لگیں[1]، تو حال میں کالا کالا نظر آنے لگتا ہے اور دانشورانہ سطح پر یہ نقطۂ نظر منتقمانہ اور کینہ خواہانہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر فلسطینیوں سے کس جوابی کارروائی کا تقاضا کرتا ہے؟ یہی نا کہ وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ "حضور، آپ نے اپنی توپوں کے دہانے کھول دیئے اور ہمیں ہمارے اپنے وطن سے باہر دھکیل دیا۔ اب آپ وہاں تشریف فرما ہیں، ہم آپ کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم اب فلسطینی نہیں رہے۔ ہم تو مختلف النوع عرب پناہ گزیں ہیں جن کے حقوق اس لیے منسوخ ہو گئے کہ وہاں (فلسطین میں) دوسرے عرب ممالک کے یہودی پہنچ گئے ہیں۔ آپ مہاپرش ہیں، مہا گیانی ہیں، آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میدان سے پسپائی اختیار کرتے ہیں"۔ یا پھر "کمنٹری" اور "نیوری پبلک" کا لاجواب نقطۂ نظر کیا فلسطینیوں سے اور نہیں کہتا کہ "ہم نے تمہاری شکایات سماعت کر لی ہیں، چھی چھی، یہ تو بڑی بڑی بات ہوئی کہ آپ کو نکال دیا گیا (سچ پوچھیں تو جب تک انڈے توڑے نہیں جائیں گے، آملیٹ کیسے بنے گا)۔ لیکن بہر حال آپ چلے تو گئے۔ آپ ایک پسماندہ، دہشت گرد قوم ہیں۔ اور آپ ضرورت سے زیادہ مطالبات پیش کرتے رہتے ہیں۔ اگر

---

[1] اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں "نیوری پبلک" "کمنٹری" سے بھی زیادہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے (مصنف) "نیوری پبلک" امریکہ کا ایک ہفتہ وار رسالہ ہے۔ یہ امریکہ کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اور لبرل دانشوروں کا ترجمان ہے۔ ویسے تو اس کی اشاعت محدود ہے۔ لیکن اس کی تحریریں "ٹائم"، "نیوز ویک"، "یو ایس اینڈ ورلڈ نیوز" جیسے مقبول عام ہفتہ وار رسالوں سے زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہ خود بھی ان مقبول عام رسالوں کا سب سے بڑا ناقد ہے۔ ایک طویل سلسلہ مضامین میں اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ رسالے زیادہ تر جھوٹ کا پلندہ یا زیادہ سے زیادہ "نیویارک ٹائمز" کا عام فہم چربہ ہوتے ہیں۔ "کمنٹری" بھی لبرل طبقوں کا رسالہ ہے۔

ہم نے آپ کو ایک انچ بخش دیا تو آپ ایک میل کا تقاضا کرنے لگیں گے۔ ہم یہ بات مان ہی نہیں سکتے کہ آپ بھی کہیں موجود ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے آپ کی موجودگی کا اعتراف کر لیا تو اس بات کا خطرہ لاحق ہو جائے گا کہ دنیا کی نظروں میں اور اس سے بھی بدتر یہ بات کہ خود ہماری اپنی قوم کی نظروں میں ہمارا اخلاقی اعتبار ضرورت سے زیادہ کھو جائے گا۔ آپ کو صرف اسی پر مطمئن ہو جانا چاہیے جو ہم آپ کو عطا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم آپ کو عطا کرتے ہیں وہ حقیقتاً دو کوڑی کا بھی نہیں ہوگا"۔

جہاں تک امریکہ کے سرکاری رویے کا تعلق ہے، وہاں بھی معاملے کی نوعیت کچھ اسی قسم کی ہے۔ کچھ عرصہ قبل صدر کارٹر کو یہ یاد دلانا ممکن تھا کہ آپ نے جن باتوں کے سہارے اقتدار حاصل کیا، ان میں مشہور عالم بروکنگز رپورٹ[۵] (۱۹۷۵ء) بھی شامل تھی اور آپ کے منشور کی ترجیحات میں اسے ایک بلند مقام حاصل تھا۔ آخر اسے بلند مقام کیوں نہ ملتا کیونکہ ماہرین کی جس کمیٹی نے اس رپورٹ کو تحریر کیا تھا اس میں آپ کے قومی سلامتی کے مشیر برزنسکی بھی شامل تھے۔ پھر برزنسکی کے نائب ولیم کوانڈٹ (Quandt) بھی اس کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ لیکن اب تو یہ (رپورٹ) زمانۂ پارینہ کی ایک بھولی بسری نشانی بن کر رہ گئی ہے۔ اسرائیل اور مصر کے معاہدے نے جو مزین اور خوبصورت پردے تخلیق کئے ہیں، انہوں نے شام، عراق، تنظیم آزادیٔ فلسطین، بلکہ سعودی عرب اور اردن کو بھی اوٹ میں پہنچا دیا

---

[۵] امریکہ میں مختلف پرائیویٹ ادارے قومی و بین الاقوامی امور کے متعلق تحقیق و تفتیش کا کام کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک ادارے کا نام بروکنگز (Brookings) انسٹی ٹیوشن ہے۔ اسرائیلی عرب تنازعے کے تناظر میں مشرق وسطیٰ کے امور کے بارے میں جائزہ لینے کے لیے اس ادارے نے بعض ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ ان ماہرین کی رپورٹ "مشرق وسطیٰ میں امن کی طرف" کے عنوان سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ عرف عام میں اسے "بروکنگز رپورٹ" کہتے ہیں۔

ہے (اور وہ آپ کو نظر ہی نہیں آتے)۔ (اسرائیل اور مصر کے معاہدے کے نتیجے میں) صیہونیت کو بالآخر وہ سب کچھ مل گیا، جس کی وہ گزشتہ ساٹھ سال سے متمنی تھی، یعنی کہ ایک عرب مملکت نے اس کے جائز ہونے پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی لیکن اپنی اس حرکت سے وہ دوسرے عرب ممالک سے الگ تھلگ ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام باتوں کی معنویت امریکہ پر ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ اگر وہ اس خطے میں اسلحے کے انبار لگاتا رہا اور "امن کے عمل" کے متعلق بے حد و حساب وعدے کرتا رہا، تو کیمپ ڈیوڈ معجزاتی انداز سے نیم گرم پانی سے تند و تیز شراب میں تبدیل ہو جائے گا۔[1]

جہاں تک خطے کا اپنا تعلق ہے، وہاں کی اہم اور اصل حقیقتیں کیا ہیں؟ ۱۹۶۷ء کے بعد پہلی مرتبہ اس بات کا امکان پیدا ہوا ہے کہ امریکہ اور معاہدے میں شریک اس کے حلیفوں کی کارروائیوں کے جواب میں کوئی صحیح معنوں میں مقبول عام عرب قوم پرست ردعمل بتدریج نمو پا جائے اور یہ چیز اس بات کی علامت ہے کہ اس خطے میں ایک غیر معمولی تغیر عظیم کی لہر اٹھ سکتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مسئلہ فلسطین اب محض کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ اس سے بہت کچھ زیادہ بن چکا ہے۔ یہ علاقے کی تقریباً تمام عرب، اسلامی یا تیسری دنیا کے عوامی (اس لفظ کے لفظی معنوں میں) مسائل کو آپس میں منسلک کرنے کا واسطہ بن گیا ہے۔ اب جو بڑے بڑے سوال سامنے آ رہے ہیں، ان میں ایک بڑا سوال یہ ہے کہ کیا یاسر عرفات اور تنظیم آزادی فلسطین غیر معین عرصے کے لیے اس مسئلے کو حدود میں بند کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں ما

---

[1] اس مسئلے کو بلیغ انداز سے Amnon Kapeliouk نے اپنے ایک مضمون "Le Puri" میں پیش کیا ہے۔ یہ مضمون اپریل ۱۹۷۹ء میں ایک فرانسیسی جریدے Le Monde Diplomatique میں شائع ہوا تھا (مصنف)

اسکا ایک اشارہ اس جواب میں ملتا ہے جو فروری کے بعد ایران نے فلسطینیوں کو دیا تھا۔ کچھ اور اشارے بھی کم طاقتور نہیں ہیں۔ ۱۹۷۶ء کے اواخر میں کویتی پارلیمنٹ کو محض اس لیے برخاست کر دیا گیا کیونکہ وہاں مسئلہ فلسطین نے تھرتھرا کر کچھ ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جس نے اپوزیشن اور حکومت کو یک جان کر دیا ہے۔ تنظیم آزادی فلسطین نے اس صورتِ حال سے کوئی (جائز یا ناجائز) فائدہ نہ اٹھایا حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر وہ چاہتی تو ایسا کر سکتی تھی۔ علاقے کے اکثر ممالک میں اخبارات وجرائد پر سخت پابندیاں عاید ہیں تاہم ایسی تنقید کے لیے، جس کا مقصد مملکت کے حکام پر دباؤ ڈالنا ہوتا ہے، فلسطین ایک قابل قبول استعارہ بن چکا ہے اور یہ استعارہ اپوزیشن کی رگوں میں ایک نیا خون دوڑا دیتا ہے اور وہ پہلے سے بڑھ چڑھ کر اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتی ہے۔ مارچ ۱۹۷۹ء میں عرب ملکوں کی جو کانفرنس بغداد میں منعقد ہوئی تھی، وہ سادات، اسرائیل اور امریکہ کے خلاف متحدہ مؤقف اختیار کر چکی تھی لیکن یہ تنظیم آزادیٔ فلسطین ہی تھی جس نے بھاری بھرکم، بھدے اور بے ڈھب عرب "ڈھیلے"[1] کو ہراول میں لا کھڑا کیا۔ (تاہم ان باتوں کے باوجود) روز نئی سے نئی پوشیدہ لہریں ــــ علاقائی فرقہ بندیاں، قومیتوں کے مسائل، اسلامی احیا کی بے شمار (اکثر و بیشتر افسوسناک حد تک عقل وخرد سے عاری) صورتیں، دولت کی غیر مساوی تقسیم کے اہم مسائل، جنہیں بعض اوقات جنسی[2] اور گروہی جبر کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے

---

[1] عربوں کو ڈھیلے سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ مشترکہ خصوصیات اور اوصاف کے باوجود عربوں کا اتحاد کوئی واضح صورت اختیار نہیں کر سکا۔

[2] اواخر اگست (۱۹۸۰ء) کے پاکستانی اخبارات کی یہ خبر دلچسپی سے خالی نہیں کہ پاکستان کی وفاقی پولیس [illegible] نے رحیم یار خاں کے ایک باشندے کو اس الزام میں گرفتار کیا ہے کہ وہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ــــــ سر اٹھاتی رہتی ہیں (نتیجۃً مسئلہ فلسطین وہ اہمیت حاصل نہیں کر پاتا جس کا وہ مستحق ہے۔)

یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، اس میں خطرہ یہ نہیں کہ کوئی انقلابی تبدیلی رُونما ہو جائے گی، بلکہ یہ ہے کہ عدم التصاق طوالت اختیار کر جائے گا اور جہاں تک تنظیم آزادیٔ فلسطین کا، جو اب ایک ٹھوس قومی حقیقت بن چکی ہے، تعلق ہے، مسئلہ فلسطین کے ضمن میں وہ جن دعاوی کو بار آور دیکھنا چاہتی ہے، اندیشہ یہ ہے کہ ان کا حصول طویل عرصے کے لیے معرضِ التوا میں پڑ جائے گا۔ مصر اور اسرائیل کے مابین جو شتر مرغ نما معاہدہ[1] طے پایا ہے، اس میں فلسطینیوں کے لیے کسی قسم کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ چنانچہ اس قسم کے معاہدے مسئلہ کا نہ تو کوئی فوری اور نہ کوئی دُور رس حل پیش کر سکتے ہیں۔ البتہ اس معاہدے کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ دونوں ممالک (مصر اور اسرائیل) میں سے ہر ایک اپنی مخصوص داخلی حرکیات کے مطابق موجود سیاق و سباق میں اپنی عسکری، نظریاتی اور سیاسی مشینری کو علاقے کے خلاف مضبوط بنائے گا ــــ اور اس طریقے سے وہ خطے کا حصہ کم بنے گا اور اپنی ذات کے گنبد

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۵۸۱ چالیس پینتالیس بچوں کا (جن کی عمریں دو سے ۱۵ سال تک بتائی جاتی ہیں) اپنے لواحقین سے خرید کر عرب ریاستوں میں سمگل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ چھوٹے بچوں کو اونٹوں کی پشت کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور جب یہ اونٹ (جو مختلف ریسوں میں حصہ لیتے ہیں) دوڑتے ہیں تو بچوں کی چیخیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ چیخوں کی آواز پر اونٹ اور تیز دوڑتے ہیں۔ اس منظر سے عرب شیوخ خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان بچوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔

[1] کہا جاتا ہے کہ خطرے کو دیکھ کر شتر مرغ اپنی گردن ریت میں دبا لیتا ہے۔ مصر اور اسرائیل کا معاہدہ حقائق سے روگردانی کی ایک مثال ہے۔

میں زیادہ بند ہو جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی اسلحہ بند قلعہ کیوں
نہ بنا لے لیکن وہ رہے گا دوسروں سے بالکل الگ تھلگ۔ اور ایسے ایسے
طریقوں سے دوسروں کے حملوں کا ہدف بنے گا جن کا اس وقت تصور کرنا بھی محال
ہے۔

اوامر و نواہی بالکل واضح ہیں۔ میں ان کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "مسئلہ"
فلسطین ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ایک اپنی تفصیلی تاریخ ہے اور یہ تاریخ (۲) لاکھ
کے ۴۰ لاکھ باشندوں کی زندگی سے عبارت ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں،
جتنا جی چاہے قانونی، عسکری، ثقافتی، نفسیاتی یا منطقی ذرائع استعمال کریں، اسے
(اس تاریخ کو) منظر عام سے اوجھل نہیں کر سکیں گے۔ تاہم ایک اور نکتہ ہے اور یہ ایک
مثبت نکتہ ہے، جس پر میں اصرار کرنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ مسئلہ فلسطین ایک
ٹھوس تاریخی مسئلہ ہے جسے انسانی اصطلاحات میں سمجھا جا سکتا ہے، یہ کوئی
دیو پیکر، نفسیاتی بلائیں نہیں جو ساری دنیا کو تباہی کے غار میں دھکیلنے کے لیے پر تولے
بیٹھی ہو۔ لیکن سیدھی بات یہ ہے کہ اسے پیش بالکل اسی انداز سے کیا جاتا ہے (جیسے
یہ واقعی کوئی دہشت ناک بلا ہو۔) صہیونیت نے پہلے تو فلسطین کے مقامی باشندوں
کے وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب اس نے ان کے وجود کو تسلیم کیا بھی
تو اس نے یہ پخ لگا دی کہ "ہم ان مقامی باشندوں کے وجود کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن
انہیں کوئی سیاسی یا قومی حقوق نہیں دیئے جا سکتے"۔ جب کبھی یہ مقامی باشندے اپنے
حقوق کا مطالبہ کرتے رہتے تو نہایت منظم طریقے سے اہل مغرب کے کانوں میں یہ
بات ڈالی جاتی تھی بلکہ انہیں یہ ہدایت دی جاتی تھی کہ ان حقوق کے حصول کی خاطر جو
جدوجہد ہو رہی ہے تو اسے وہ (اہل مغرب) دہشت گردی، قتل عام اور یہود دشمنی

کے مترادف سمجھیں۔ یہ نری خرافات یا مہمل باتیں نہیں ہیں بلکہ اس بات کا اجازت نامہ بھی ہیں کہ گزشتہ ایک صدی سے فلسطینیوں کے خلاف جو متشددانہ کارروائیاں کی جا رہی ہیں، ان کا سلسلہ ایک مزید طویل مدت کے لیے جاری رکھا جا سکتا ہے اور کم و بیش ایک غیر معین عرصے کے لیے تاریخ اور سچائی سے آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ اس قسم کے رویہ سے مزید تشدد، مزید مصائب و آلام، مزید ضیاع، سلامتی کے مزید لیکن بے سود انتظامات کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

آج کل امریکہ میں یہ جو صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ مسئلہ فلسطین کے متعلق عقلی اور منطقی طریقے سے بات کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے، اس سے نہ تو اس ملک کی اور نہ یہودیوں کی کوئی خدمت ہو گی۔ مجھے جو ناقابلِ تردید حقیقت نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ منفیت کا، انکار کا، خوف کا رویہ ہر سطح کے لوگوں کے رگ و پے میں رچ بس چکا ہے ـــــ صیہونی اور امریکی جس مستقل مزاجی سے فلسطینیوں کے خلاف مصروفِ عمل تھے، اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا ـــــ لیکن اس رویے کا انجام یہ ہو گا کہ لوگ مزید خوف و ہراس کا شکار ہوں گے اور امن کے لیے حالات نسبتاً کم سازگار ہوں گے۔

کیا یہ ستم ظریفی کی بات نہیں کہ ایک طرف تو حکومت امریکہ اپنے ملک میں تنظیم آزادی فلسطین کے ارکان کو بلا قدغن سفر کرنے اور آزادانہ اپنا مؤقف بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی[1] جب کہ اس کے ساتھ ہی وہ دوسری طرف یہ کہتے نہیں تھکتی کہ فلسطین مشرق وسطیٰ کی ساری آویزش کی جڑ ہے؟ آخر میں اس بات کا احساس کرنا ہو گا کہ فلسطینی کبھی بھی منظرِ عام سے ناپید نہیں ہوں گے۔ علاوہ ازیں امریکہ کو سرکاری طور پر یہ بات

---

[1] اس موضوع پر ۲۱ر اپریل ۱۹۷۹ء کو روزنامہ "واشنگٹن پوسٹ" میں ایک اداریہ شائع ہوا تھا، اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں (مصنف) امریکہ نے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو واشنگٹن میں اپنا ایک دفتر قائم کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، ۱۸ر ستمبر ۱۹۸۰ء کو اسے بھی بند کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

لازماً تسلیم کر لینا چاہیے کہ فلسطینیوں اور ان کے نمائندوں سے، جنہیں دنیا متفقہ طور پر صحیح نمائندے قرار دیتی ہے، جو اندیشہ لاحق ہے، محض جھوٹ موٹ یہ ظاہر کر دینے سے کم نہیں ہو گا کہ یہ دونوں (فلسطینی اور ان کے رہنما) مل کر بھی کوئی خاص اہمیت اختیار نہیں کرتے۔

اکثر یہودیوں کے دلوں میں یہ جو خوف بیٹھا ہوا ہے کہ اسرائیل اپنی سلامتی کے جو انتظامات کر رہا ہے، وہ اصل میں قتل عام کی ان کوششوں کے خلاف تحفظ ہے جو مستقبل میں یہودی قوم کے خلاف کی جا سکتی ہیں۔ اس بارے میں مجھے ان سے ہمدردی بھی ہے اور میں اپنی بساط کے مطابق ان کے اس خوف کو سمجھتا بھی خوب ہوں۔ لیکن یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ کسی طریقے سے بھی ایک مطمئن زندگی نہیں گزاری جا سکتی جس کی بڑی تشویش ماضی کو دوبارہ وقوع پذیر ہونے سے روکنا ہے۔ صیہونیت کے نزدیک فلسطینی ایک سابقہ تجربے کے مترادف بن چکے ہیں جو موجودہ تخویف کی صورت میں دوبارہ مادی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے فلسطینیوں کا مستقبل اس تخویف کے پاس رہن رکھ دیا گیا ہے اور یہ چیز فلسطینیوں اور یہودیوں دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔ میں نے یہاں فلسطینیوں کو پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ اس لیے کی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اجتماعی تجربے، اشیاء کے بارے میں ہماری اجتماعی سوجھ بوجھ، ہماری اجتماعی امنگوں اور سب سے بڑھ کر ہماری اصلی اور موجودہ (تاریخی ہونے کی بناء پر) حقیقت کی اصطلاحوں میں ان کے خیالات و احساسات کی ترجمانی کی جا سکتی ہے۔ میں نے اس کتاب میں جو کچھ کہا ہے، اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہ لیا جائے کہ یہ ایک طرح سے فلسطینی اور یہودی تاریخ کا اعتراف ہے ــــ جو کافی عرصے سے ایک دوسرے کے خلاف

غضب ناک طور پر برسرِ پیکار ہیں لیکن بنیادی طور پر ان میں ایسے عناصر موجود ہیں کہ ان کی آپس میں مصالحت ہو سکتی ہے ، بشرطیکہ دونوں قومیں ایک دوسرے کو مشترکہ سیاسی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کریں۔ دوسرے فریق کے متعلق پوشیدہ اور غیر بیان شدہ اندیشوں اور غلو سے بھرپور کٹر مذہبی واہموں میں مبتلا ہونے کی بجائے بہتر یہی ہے کہ آویزش کا پورا اقرار کر لیا جائے ۔

اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ آج فلسطینی قومی تحریک نے قومی امنگوں کے ایک مخصوص مجموعے کی صورت میں ایک واضح شکل اختیار کر لی ہے اور اب یہ تحریک انہی امنگوں کے گرد گھومتی ہے ، تو فلسطینیوں کو صہیونیت کا جو تجربہ ہوا ہے ، میں اس کا ذکر اتنی تفصیل سے نہ کرتا ۔ چنانچہ میرا مقصد گڑے مردے اکھاڑنا نہیں بلکہ ماضی کو اس قدر واضح طور پر دیکھنا ہے تاکہ اس سے آگے نکلا جا سکے ۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہمیں جو ٹھوس تجربہ حاصل ہوا ہے ، فلسطینیوں کی قومی امنگیں اسی سے پھوٹی ہیں اور ان کا اس (تجربے) کے ساتھ گہرا ربط ہے ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ امنگیں قابلِ حصول ہیں بشرطیکہ ہماری تاریخ ، اسرائیل کی حقیقت ، باقی عرب دنیا کی حقیقت اور بین الاقوامی سیاسی ہیئت کو تسلیم کر لیا جائے ۔

یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ صہیونیت کے خلاف ہم جس جدوجہد میں مصروف ہیں ، اس کے بارے میں مغرب پہلی مرتبہ ہمارا نقطۂ نظر سننے کیلئے آمادہ دکھائی دیتا ہے ۔ چنانچہ ہمیں چاہیے کہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھائیں اور اس کے سامنے (اپنا نقطۂ نظر) کھل کر بیان کریں ۔ صہیونیت کے خلاف ہماری جدوجہد نے جو بین الاقوامی تھیئٹر تخلیق کیا ہے ، ہمیں اس میں لازماً کھڑے ہونا چاہیے تاکہ ہم اپنے پیغام کو ڈرامائی طور پر دور و نزدیک پہنچا سکیں ۔ مغرب میں بالخصوص ہماری یہ کوشش ہونا چاہیے کہ ہم صہیونیت کے پرزور حامی لبرل طبقے (جس میں یہودی

اور غیر یہودی دونوں شامل ہیں) کی توجہ جواب تک صیہونیت کے ستم رسیدگان سے منہ پھیرے رہا ہے، تا اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ مغربی کنارے اور غزہ میں اسرائیل کے قابض حکام اور فوجی آئے دن جو (شرمناک) کارروائیاں کرتے رہتے ہیں اور لبنان میں اسرائیلی جس طرح شہری باشندوں کو اپنے حملوں کا نشانہ بناتے رہے ہیں ان کے متعلق یہودی دانشور، جو روایتی طور پر انسانی حقوق کی مہموں میں ہراول دستے کا کردار سرانجام دیتے رہتے ہیں، اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے ایک انگلی تک نہیں اٹھاتے۔ ادیبوں، مصنفوں، دانش وروں، عالموں اور پیشہ ور اشخاص^ کے اس طبقے نے اپنے انسانی مشن سے بے وفائی کی ہے۔ مثلاً ۲۰۰۷ء کے موسم بہار کے دوران میں اسرائیلی فوجوں نے جس طرح کلسٹر بم گرا کر جنوبی لبنان سے اڑھائی لاکھ شہری باشندوں کو اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا، آخر اس کی مذمت میں کھلے عام ایک بھی بیان کیوں نہ شائع ہوا اور نہ نشر ہوا۔ اس قسم کی چیرہ دستیاں اور شرمناک کارروائیاں ہر روز ہو رہی ہیں، پھر بھی کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور ان کے متعلق ایک لفظ تک نہیں کہا جاتا۔ کیا اس سکوت اور خاموشی کا مناسب جواب اس استدلال میں تلاش کیا جا سکتا ہے کہ اسرائیل، جو کہ دہشت گردوں میں گھرا ہوا ہے، کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتا یا کم از کم کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا جس کے متعلق ذمہ دار یہودیوں کو تنقیدی انداز سے لب کشائی کی ضرورت محسوس ہو؟

دوم، مشرق وسطیٰ کے امن کے بارے میں جو سیاسی اور ثقافتی بحث و تمحیص ہوتی رہتی ہے، ہمیں اس میں بھرپور حصہ لینا چاہیے۔ ہم اس بات پر قناعت

---

^ اس طبقے میں اساتذہ، صحافی، انجینئر، ڈاکٹر، دندان ساز، اکاؤنٹنٹ، اداکار، گلوکار، موسیقار، کھلاڑی وغیرہ شمار کیے جا سکتے ہیں۔

نہیں کر سکتے کہ ہمیں مبصر کا درجہ مل گیا ہے اور نہ یہ خالی خولی تکرار ہماری
تالیفِ قلب کا باعث بن سکتی ہے کہ فلسطینی مسئلہ مشرق وسطیٰ کی چیستان
میں مرکزی مقام رکھتا ہے (یا نہیں رکھتا ہے)۔

ان دونوں فرائض کی بجا آوری میں ہم پہلے ہی اچھی خاصی پیش رفت کر چکے ہیں۔
یہ بات ہمارے لیے قومی فخر کا باعث ہے کہ جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے اور مختلف
ممالک میں تتر بتر ہونے کے باوجود آج کا فلسطینی کسی دوسرے عرب کی نسبت سیاسی
جمہوریت کے طور طریقوں سے زیادہ بہتر انداز سے آشنا ہے۔ یہودیوں اور عربوں
دونوں کے لیے مستقبل کس قسم کا ہونا چاہیے، اس کی تفصیلات کے متعلق مثبت انداز
سے سوچنے اور بات کرنے والے فلسطینیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا
ہے۔ عربوں کا کوئی دوسرا طبقہ سیاسی تاریخ کے عمل کو اتنی اچھی طرح نہیں سمجھتا جس قدر
کہ فلسطینی سمجھتے ہیں اور کسی دوسرے طبقے کے بارے میں اتنا وثوق سے نہیں کہا
جا سکتا جتنا کہ ہمارے طبقے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قومی زندگی میں جمہور کی
براہ راست شرکت کو جاری رکھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطینی مشن کا ایک پہلو یہ ثابت کرنا
ہے کہ اداروں اور نظریات کے بل بوتے پر جو غلبہ حاصل کیا جاتا ہے، وہ کتنا بودا ہوتا
ہے اور یہ کہ انتہائی مظلوم و مقہور لوگ بھی ایک ایسے سیاسی خاکے کا تصور پیش کر سکتے
ہیں جس کی تشکیل میں کشادہ دلی، عالی منشی اور بے تعصبی کا مظاہرہ کیا گیا ہو۔ حالیہ برسوں
کے دوران میں اپنی جلاوطنی اور فلاکت و نکبت کے باوجود سرکردہ فلسطینی گاہے بگاہے
ایک ایسے مستقبل کا ذکر کرتے رہے ہیں جب فلسطین ایک ایسے ملک کا روپ
دھارے گا جہاں دو معاشرے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو امن، اخوت اور
ہم آہنگی کی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ غالباً وقت آنے پر اس قسم کی
صورت ناگزیر ہوگی۔ البتہ فی الحال یہ زمانہ بہت دور نظر آتا ہے۔ لیکن اگر مزید فلسطینی،

مزید یہودی اور مزید امریکی، قصہ مختصر اگر مزید لوگ مسئلہ فلسطین کا جائزہ اس انداز سے لیں کہ یہ فلسطینی عربوں اور اسرائیلی یہودیوں کی مشترکہ بہبود کا مسئلہ ہے تو پھر ایسا دن توقع سے بہت پہلے طلوع ہو جائے گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا یہ ایمان ہے کہ فلسطینی مشن امن کا مشن ہے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ہمارے عوام کی ایک بھاری اکثریت بھی اسی خیال کی حامی ہے۔ ہم محض جلاوطنوں کی ایک آبادی نہیں جو اپنی بحالی اور قومی حق خود ارادیت کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہے۔ بلکہ ہم وہ لوگ ہیں بے شک جن کا قومی وجود تلف ہو چکا تھا لیکن اسی اتلاف سے ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو از سر نو تخلیق کیا ہے اور ہماری قومی جماعت، تنظیم آزادئ فلسطین اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے مستقبل کے بارے میں جو خواب دیکھا ہے، وہ اپنی نوعیت کا واحد خواب ہے۔ (ابھی تک کسی اور فرقے یا فریق نے اس کا متبادل تصور پیش نہیں کیا) اور اس خواب پر ہمیں جو پختہ یقین ہے، تنظیم آزادئ فلسطین اسکی بھی علامت ہے۔ اگر اسرائیل کی بری اور فضائی افواج سے تنظیم آزادئ فلسطین کا موازنہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس طرح پناہ گزیں کیمپوں میں مقیم ہمارے شہری باشندے تنظیم آزادئ فلسطین کی حمایت کرتے ہیں اور خوشی خوشی اپنے آپ کو اسرائیلی طیاروں کی بمباری کا ہدف بنا لیتے ہیں تو یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جائے گی کہ فلسطینی جس مقصد کو سامنے رکھ کر سوئے دار چلے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے فولاد اور خالص قوت کے مقابلے میں امن اور انسانی عزم کا انتخاب کیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں، مصنفوں، دانشوروں، اور جنگجوؤں کی حیثیت سے سیاسی سٹیج پر ہماری موجودگی نے پوری عرب برادری اور تیسری دنیا کو وہ توانائی اور قوت بخشی ہے جو ان کا کوئی سیاسی نظریہ انہیں فراہم نہیں کر سکا تھا۔ بالآخر فلسطینی

مشن بنیادی طور پر افراد کا مشن بن جاتا ہے ــــ یہ فرد کوئی بھی ہو سکتا ہے ۔ یہ یاسر عرفات جیسا رہنما بھی ہو سکتا ہے، سمیع القاسم جیسا شاعر بھی ہو سکتا ہے، یا یہ فرد لبنان، غزہ، الناصرہ یا ڈیٹرایٹ کے ہزاروں مخلص اور اپنی دھن کے پکے مردوں اور عورتوں میں سے کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے ــــ چنانچہ یہی وہ افراد ہیں جو دنیا کے سامنے، صیہونیت کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو سکتے ہیں اور اس قسم کے سوالات پوچھ سکتے ہیں: کیا تم مجھے اس لیے نیست و نابود کر دینا چاہتے ہو تاکہ تم کسی اور کے لیے جگہ بنا سکو؟ اگر تمہارے ہی عزائم ہیں تو پھر تمہیں ایسا کرنے کا کیا حق ہے؟ آخر یہ بات کیوں درست ہے کہ ایک یہودی، جو شکاگو میں پیدا ہوا تھا، اسے تو ترکِ وطن کر کے اسرائیل جانے کا حاصل ہے جب کہ ایک فلسطینی، جو جافہ میں پیدا ہوا تھا، پناہ گزین بن گیا ہے؟ فلسطینی کی اصل قوت کا راز یہی ہے کہ وہ ایک فرد کی حیثیت سے اپنے انسان ہونے پر اصرار کرتا ہے ــــ اور انسان کی یہی وہ ایک علیحدہ فرد ہونے کی حیثیت ہے جس کا اس لیے پیدا ہو جاتا ہے تاکہ کسی عظیم اور پر شکوہ منصوبے کو پروان چڑھایا جا سکے ۔ چنانچہ فلسطینی ایک چھوٹے سے قطعۂ زمین کے لیے جسے صدا ور ہا ٹیلے پن سے فلسطین کہا جاتا ہے، دیتا ہوا ہے یا پھر وہ امن کے ایک ایسے تصور کے ساتھ چمٹا ہوا ہے جس کی اساس نہ تو کسی ایسے منصوبے پر ہے جس کا مقصد ایک قوم کو نا قوم میں تبدیل کرنا ہو اور نہ جغرافیائی سیاست کے کسی ایسے داعیے پر ہے جس کا مقصد (نامکمل)

لہ صیہونیوں نے فلسطینیوں کے ساتھ یہی کیا ۔ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ انہیں ایک قوم سے نا قوم میں تبدیل کر دیں ۔ اس میں انہیں کچھ کامیابی بھی ہوئی ۔ فلسطینی ققنس کی طرح اپنی راکھ سے پھر ابھرے اور ایک متحد قوم کی حیثیت سے دوبارہ نمودار ہو گئے ۔ بہر حال وہ یہودیوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہتے ۔ (مصنف)

توازنِ طاقت پیدا کرنا ہو، بلکہ (اس کے اس تصورِ امن کی اساس) مستقبل کے متعلق ایک ایسے سہانے خواب پر ہے جس کے مطابق فلسطین میں دونوں قوموں کے لیے جن کا اس پر حق مستند اور صحیح ہے، گنجائش ہوگی، نہ کہ صرف یہودیوں کیلئے۔ (متبادل حل)، کے بارے میں میں لازماً منہ پھٹ ہوں، دنیا کے کسی دوسرے خطے کی نسبت مشرقِ وسطیٰ میں اسلحہ کی بھرمار کہیں زیادہ ہے اور سیاسی طور پر جنگ کے لیے بھی یہ خطہ دوسرے خطوں کی نسبت کہیں زیادہ کمربستہ ہے۔ اسوقت اسرائیل جنوبی افریقہ کے جوہری پروگرام میں اس کی مدد کر رہا ہے اور جوہری ہتھیاروں کی تحدید کے معاہدے پر بھی اس نے دستخط نہیں کیے ہیں۔ (اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں) کم از کم آدھی درجن مملکتیں ایسی ہیں جن کی حکومتوں کو داخلی اور خارجی قوتوں سے سنجیدہ خطرات لاحق ہیں۔ امریکہ کچھ ایسے طریقوں سے اس خطے کو اپنے گلے کی زنجیر بنا چکا ہے کہ اس سے پیچھا چھڑانا اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ عام امریکی تو اسے کیا سمجھتے، شاید خود حکومت کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہوگی۔ خیر، وہاں تیل ہے، منڈیاں ہیں، جغرافیائی سیاست سے وابستہ "مفادات" ہیں، جوہری ہتھیار بنانے یا نہ بنانے کا حقِ انتخاب ہے، غرضیکہ سبھی کچھ داؤں پر لگا ہوا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں روس نے بھی امریکہ کے ساتھ "جپھا" ڈالا ہوا ہے اور یوں مسائل کی تعداد دوگنا ہو گئی ہے۔ ادھر لوگوں کا یہ وتیرہ بن چکا ہے کہ جب وہ بھاری بھرکم مسائل کے اس ڈھیر کا تجزیہ کرنے بیٹھتے ہیں تو اپنے آپ کو زیادہ تر ایسے پیش پا افتادہ اور فرسودہ نظریاتی دلائل سے مسلح کر لیتے ہیں جو تکلیف دہ حد تک سادہ ہوتے ہیں جیسے انہیں استعمال کرنے والے بالکل کور چشم ہو چکے ہوں۔ مثلاً اسرائیل نے اپنے شہریوں کو "یہودیوں اور غیر یہودیوں" میں تقسیم کرنے کی سرکاری طور پر جو پالیسی اپنا رکھی ہے، اس سے وہ اب تک سرِ مُو بھی انحراف نہیں کرتا اور نہ اس نے اسے

منسوخ کرنے کی کوئی کوشش کی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے متعلق سوچ بچار کی جو بھی کوششیں ہوئی ہیں، ان میں انصاف پسندی، حقیقت شناسی، ترحم اور دردمندی کے تصورات نے سنجیدہ کردار تو کیا ادا کرنا تھا، اکثر و بیشتر ان کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ اب تک اس خطے پر گھسی پٹی قوم پرستی اور عظیم طاقتوں کے مفادات جیسے عمومی تصورات ہی کی حکمرانی رہی ہے۔ رہی یہ بات کہ لوگوں کے بحیثیت افراد بھی کچھ انسانی حقوق ہوتے ہیں، تو اسے آج تک کسی نے شاید ہی کبھی کوئی اہمیت دی ہو۔ اور آخری گزارش یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں لڑاکا طیاروں یا رائفل کے کندوں سے امن قائم نہیں کیا جا سکتا، اس مقصد کے لیے بہت سادہ اوزار استعمال کرنا ہوں گے اور یہ اوزار وہ جدوجہد ہے جو بنی نوع انسان کے مفادات کی خاطر شعوری طور پر عقلی انداز سے شروع کی جائے گی۔ حقیقتاً مسئلہ فلسطین کا تقاضا یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ (کے ممالک)، امریکہ بلکہ ساری دنیا مل جل کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ اس سلسلے میں بحث مباحثے کیے جائیں، تقریریں کی جائیں، تصنیفات تحریر کی جائیں، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا جائے تاکہ فیصلہ کن طور پر منصفانہ اور صحیح جوابات دستیاب ہو سکیں۔ گریز، احتراز، ٹال مٹول، قوت، خوف اور لاعلمی سے مزید کام نہیں چلے گا۔

۴

غیر یقینی مستقبل

دو باتیں یقینی ہیں: اسرائیل کے یہودی بھی رہیں گے اور فلسطینی بھی رہیں گے۔ اعتماد و یقین سے اس سے کچھ زیادہ کہنا نری حماقت ہو گی اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو خطرے میں پھنسانا ہو گا۔ مجھے اس بارے میں کوئی خاص شبہ نہیں کہ

امریکہ مصر اور اسرائیل پر یہ زور دیتا رہے گا کہ وہ فلسطینیوں کی حکومت خود اختیاری کے متعلق آپس میں مذاکرات کریں۔

فی الحال اردن ان مذاکرات میں شریک ہونے سے احتراز کرے گا لیکن اس کا یہ احتراز صرف قلیل مدت کے لیے ہو گا (بالآخر وہ بھی اس کھیل میں شریک ہو جائے گا۔)

بیگن کا رویہ روز بروز سخت سے سخت تر ہوتا جائے گا۔

کوئی فلسطینی بھی، جس کی تھوڑی بہت بھی حیثیت ہے، اس ناخوشگوار عمل میں شریک نہیں ہو گا۔ لیکن جو تغیرات رونما ہو سکتے ہیں، ذرا ان پر بھی غور فرمائیں:

مصر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ کیا سادات کی مخالفت میں اضافہ[1]

---

[1] اسرائیل سے معاہدہ کرنے کی پاداش میں صدر سادات کو اندرونِ مصر بھی اچھی خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور آخر ۱۹۸۱ء میں ایک فوجی پریڈ کے دوران میں ان کے مخالفین انہیں گولیوں سے بھوننے میں کامیاب ہوئے۔

ہو جائے گا؟ کیا یہ حکومت باقی عرب دنیا سے الگ تھلگ رہ کر زیادہ عرصے تک اپنی بقا قائم رکھ سکے گی؟ فی الحال سعودی عرب اور اردن جس حالت میں سے گزر رہے ہیں، وہ خاص طور پر نازک ہے لیکن اس میں لازماً تبدیلی آئے گی۔ کیا ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی امریکی دباؤ کی مزاحمت کر سکیں گے؟ کیا ان کے حکمران خاندان اپنے داخلی مسائل پر قابو پا سکیں گے اور یوں اپنی سیادت باقی رکھ سکیں گے؟ کیا ایرانی انقلاب اپنے اثرات کو زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرا سکے گا؟ ایران خود کئی مہینوں تک اکھاڑ پچھاڑ کا شکار رہے گا جس کے اس خطے، عالمی معیشت اور جغرافیائی سیاست پر گہرے اور دور رس اثرات پڑیں گے۔ شام اور عراق کے جس اتحاد کی پیش گوئی کی گئی ہے اور جس سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی گئی ہیں، ممکن ہے کہ وہ عرب سیاست میں اپنا کردار ادا کر سکے اور ممکن ہے کہ نہ کر سکے۔ (دونوں میں سے) ہر ایک ملک کی اپنی علاقائی ترجیحات کے بارے میں سوجھ بوجھ اتنے عجیب انداز سے انفرادی رنگ لیے ہوئے ہے (لبنان میں شام نے جو کردار ادا کیا ہے، اس کا ایران کے بارے میں عراقی رویہ سے مقابلہ کریں) کہ یہ بتانا کہ اتحاد بغداد کا حتمی نتیجہ کیا برآمد

لہ صدر سادات کے جانشیں صدر حسنی مبارک بھی اپنے پیش رو کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں۔ مصر کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم ہیں تاہم ان تعلقات میں وہ گرمجوشی نہیں رہی جو صدر سادات کے زمانے میں تھی۔ پھر مصر اب اتنا الگ تھلگ ملک بھی نہیں رہا۔ اگرچہ عرب لیگ کے اجلاسوں میں وہ اب بھی شریک نہیں ہو سکتا لیکن اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا وہ دوبارہ رکن بن گیا ہے اسے یہ رکنیت دلانے میں پاکستان کے مرحوم صدر محمد ضیاء الحق کا بڑا ہاتھ تھا۔

ہو گا، ناممکن ہے۔[ٹ]

آئندہ برسوں میں سعودی عرب جو رویہ اختیار کرے گا، وہ زبردست اہمیت کا حامل ہو گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ (سعودی عرب کا) شاہی خاندان (جو اس وقت اندرونی طور پر اختلافات کا شکار ہے) کسی عرب مملکت یا ادارے سے اپنے تعلقات مکمل طور پر منقطع کرے گا۔ سوال صرف یہ ہے کہ خطے میں ایک یا دوسرے زاویۂ فکر کو منوانے کے لیے سعودی حکمران کتنا معاشی دباؤ ڈال سکیں گے۔ جہاں تک لیبیا جیسی سیماب وش، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، حکومتوں کا تعلق ہے، تو ان کے متعلق صحیح اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہے۔ اس امکان کو تو یقیناً رد نہیں کیا جا سکتا کہ لیبیا کو شاید سادات یا شاید بعض دوسرے حلقوں کی طرف سے شدید حملوں کا سامنا کرنا پڑے لیکن اس کی تیل کی دولت آسانی سے مصر کے حوالے نہیں کی جا سکے گی۔ جسے (مصر کو) امریکہ کے موجودہ منصوبوں کے مطابق معاشی طور پر کمزور ہی رکھا جائے گا۔ ایک پریشان کن احتمال یہ بھی ہے کہ اردن کی موجودہ غیر یقینی صورت حال سے کہیں اسرائیل کو اس پر حملہ کرنے کی ترغیب ہی نہ مل جائے۔ اس قسم کے حملے کا امکان اس وقت اور بھی بڑھ جاتا ہے اگر اسرائیل یہ سوچنے لگے کہ (اردن کے) ہاشمی خاندان نے فلسطینیوں کے متعلق جو حکمتِ عملی اختیار کر رکھی ہے، اس (حملے) کے ذریعے اسے (اردن کے شاہی خاندان کو) اس (اردنی حکمت عملی) میں لچک پیدا کرنے کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔

ٹ شام اور عراق کے مجوزہ معاہدے کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ دونوں الگ الگ اپنی راہوں پر گامزن رہے۔ عراق کئی سالوں تک ایران کے ساتھ جنگ میں الجھا رہا ہے جب کہ شام لبنان میں فلسطینیوں کے خلاف کارروائیاں کرتا رہتا ہے۔ شام کے ایران کے ساتھ اور عراق کے تنظیم آزادیٔ فلسطین کے ساتھ تعلقات خاصے خوشگوار ہیں۔

امریکی پالیسی کی طرح اسرائیلی سیاست بظاہر بہت مستحکم اور پُرعزم معلوم ہوتی ہے لیکن ممکن ہے کہ حقیقتاً ایسا نہ ہو۔ موشے دایان جیسی شخصیتیں شام اور تنظیم آزادیٔ فلسطین کو اشارے کنایے کر رہی ہیں۔ لیکن ان کے خلاف جو احتجاجی آوازیں (امریکہ میں بھی اور اسرائیل میں بھی) بلند کی گئی ہیں وہ کانوں کے پردے پھاڑنے کے لیے کافی ہیں۔ اسرائیل کے سرکاری مؤقف میں کسی قسم کی قابلِ لحاظ تبدیلی پیدا کیے بغیر ہی اس قسم کی ابتکاریاں غیر معین مدت تک کے لیے جاری رکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۹۷۸ء کے موسمِ بہار میں اسرائیل نے جنوبی لبنان پر جو حملہ کیا، اس کے بعد نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس امر پر غور کیا گیا کہ فلسطینیوں کو "حتمی حق" کا نشانہ بنا دینا چاہیے۔ فلسطینیوں کے حامیوں کی نگاہوں میں کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ایک قسم کا سیاسی پھندا ہے جو اس قسم کے قنوطی نقطۂ نظر کو قابلِ قبول بنا دیتا ہے (کہ صیہونی فلسطینیوں کا قلع قمع کرنے پر تلے بیٹھے ہیں)۔ اب بڑا سوال یہ ہے کہ فلسطینی حقِ خود ارادیت کے متعلق اسرائیل اور امریکہ کے نقطہ ہائے نظر کس حد تک ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔ ایک مزید پیچیدگی مصر کے کردار نے بھی پیدا کر دی ہے۔ وہ اسرائیل کے ساتھ بھی ہے اور اس کے خلاف بھی۔

زبردست اہمیت کے حامل معاشی مسائل اور معاشرتی انقلاب — اس خطے کی تعمیر ہی کچھ اس طور ہوئی ہے کہ اس میں ان دونوں کی بھرمار ہے — یقینی طور پر مشرقِ وسطیٰ کے امن کے مستقبل پر اثر انداز ہوں گے۔ مثلاً امریکہ سرکاری طور پر یہ اعلان کر چکا ہے کہ اگر تیل کی رسد کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو وہ (امریکہ) کسی تیل پیدا کرنے والے عرب ملک پر چڑھائی کر دے گا[۱]۔ اور شاہِ (ایران) کے زوال کے بعد

---

۱ امریکہ نے ابھی تک کسی عرب ملک پر حملہ تو نہیں کیا لیکن تیل کی رسد کو یقینی بنائے رکھنے کیلئے وہ کافی تعداد میں جنگی بحری جہاز خلیج فارس میں پھیلائے رکھتا ہے۔

یقیناً مصر اور اسرائیل دونوں ہی اپنے متعلق یہ اشتہار دے رہے ہیں کہ وہ اس علاقے میں پولیس مین کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ فیصلہ کن نکتہ، جو ممکن ہے کہ غیر عقلی اور غیر منطقی نظر آئے، یہ ہے کہ کون سی طاقت سیاسی یا معاشی اشتعال کی کون سی سطح کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہے؟ کیا کوئی احتجاجی تحریک باغیانہ روش اختیار کرے گی؟ کیا کوئی حکومت اپنے ہمسائے کے خلاف چڑھ دوڑے گی؟ کیا لبنان کی سلگتی ہوئی طوائف الملوکی (مثلاً جنوبی لبنان کے باغی اور غدار عیسائی جنگجوؤں کے لیے مسلسل اسرائیلی امداد) یا انقلاب ایران، جو ابھی جاری ہے، کسی خفیہ جاسوسی کے ادارے کو کسی نہ کسی قسم کی سازش کرنے کی ترغیب دے گا؟ کیا اسرائیل اپنی سرحدوں کو مشرقی سمت وسعت دے گا یا مغربی جانب؟ امریکہ مختلف حکومتوں کو جو براہِ راست فوجی امداد دے رہا ہے، کیا وہ اس میں اضافہ کردے گا؟ سوالات بے شمار ہیں اور فی الحال ان کے جوابات حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میرا نکتہ صرف یہ ہے کہ مسئلہ فلسطین ایک ایسا مسئلہ ہے کہ بے شمار لوگ سوچے سمجھے بغیر اضطراری طور پر اس کے حق میں یا اس کی مخالفت میں بر سرِ پیکار ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہ اضطراری افعال تعداد میں بھی بے شمار ہیں اور ان کے نتائج بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی ایسا منظر نامہ یا خاکہ تیار نہیں کیا جاسکا (اس بات سے قطع نظر کہ یہ منظر نامہ یا خاکہ کتنا ہی پیچیدہ، جامع اور صحیح کیوں نہ ہو) جو اتنا مکمل ہو کہ اس میں ان تمام مختلف النوع اضطراری افعال کی توضیح کی گنجائش نکل سکے۔

امریکہ اپنے استعماری مفادات کا تحفظ بھی کرنا چاہتا ہے اور وہ ان کے متعلق تشویش میں بھی مبتلا رہتا ہے، چنانچہ وہ اپنی پالیسی کے ایک ایسے عنصر کی نشاندہی کرتا رہتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلسطین کے متعلق

ایک خاکہ تیار کر لیا ہے۔ اس خاکے کے مطابق امریکہ فلسطینیوں کو "مقامی سطح کے اختیارات" اور "حکومتِ خود اختیاری" دے کر ٹرخانا چاہتا ہے اور یہ دونوں چیزیں یقیناً حقِ خود ارادیت اور آزادی سے کہیں کمتر ہیں۔ مفروضہ یہ ہے کہ اپنی طاقت اور مفادات کے بل بوتے پر امریکہ کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ فلسطینیوں کے مفاد میں بہترین چیز کیا ہو سکتی ہے۔ اپنی حالیہ تاریخ کے دوران میں امریکہ نے لبرل نقطۂ نظر کے نام پر جب بھی اور جہاں بھی پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی، اسے ہمیشہ منہ کی کھانا پڑی۔ اور کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس سے یہ معلوم ہو کہ فلسطینیوں کی سرپرستی کا جو منصوبہ بنایا گیا ہے وہ ناکام نہیں رہے گا۔ لیکن میں میکانکی طور پر عقیدہ جبریت کا اتنا حامی نہیں کہ فوراً یہ ایمان لے آؤں کہ اس قسم کی ناکامی واقعتاً امریکہ کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے یا یہ کہ اس ناکامی کے ظہور پذیر ہونے کی صورت میں فلسطینیوں کو لازماً حقِ خود ارادیت مل جائے گا۔ میں اس بات کو ترجیح دوں گا کہ حقِ خود ارادیت کے حصول میں فلسطینیوں کے عزم پر انحصار کروں۔ جس (فلسطینی عزم) کا میں نے ان صفحات پر ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب امریکہ میں ایسے لوگوں کا ایک خاصا بڑا طبقہ وجود میں آجائے گا۔ جنہیں اس بات کا کماحقہٗ احساس ہو گا کہ وہ پالیسیاں، جو ویتنام میں تباہی و بربادی کا سبب بنیں، فلسطینی عوام کے خلاف استعمال نہیں کی جانا چاہئیں۔

مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کے نتیجے کے طور پر اب جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے جواب میں فلسطینی بھی کافی کارروائیاں کریں گے۔ ہر لحظہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اسرائیل میں اس (تنظیم) کی جو حمایت اور مخالفت پائی جاتی ہے، کچھ عرصے کے بعد اس میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن چونکہ موجودہ صورت حال تعطل کا شکار ہو چکی ہے

اور چونکہ مروجہ تصورات کا، جن کی رُو سے تنظیم آزادی فلسطین کو خاطر میں نہیں لایا جاتا، دیوالیہ پن عیاں ہو چکا ہے اس لیے میں پُر اعتماد لہجے سے یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک دن آئے گا جب فلسطینی سیاسی طور پر پہل کریں گے اور سارے خطے کو ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیں گے۔ اگر انجام کار اس قسم کی کوئی صورتِ حال پیدا ہوئی تو وہ کئی لحاظ سے مصری اور اسرائیلی معاہدۂ امن کا مثبت نتیجہ ہو گی۔ لیکن ہمیں یہ بھی بھولنا نہیں چاہیے کہ فلسطین تشدد اور خون سے لبریز ہو چکا ہے اور ہمیں حقیقت پسندانہ انداز سے اس بات کی توقع رکھنا چاہیے کہ ایک مختصر عرصے کے لیے آئندہ بھی وہاں ہنگامے ہوتے رہیں گے اور کافی انسانی خون بہتا رہے گا۔ بدقسمتی سے فلسطینی مسئلہ اپنی جانی پہچانی صورتوں میں بار بار سامنے آتا رہے گا۔ لیکن ہمیں یہ امید بھی رکھنا چاہیے کہ فلسطین کے عوام — جن میں یہودی اور عرب دونوں شامل ہیں اور جن کے ماضی اور مستقبل نے انہیں آپس میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے — بھی ایک بار پھر اپنا احیا کریں گے۔ ابھی تک کسی قابلِ ذکر حد تک ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا لیکن مجھے علم ہے کہ یہ آمنا سامنا ہو گا اور ضرور ہو گا اور جب یہ آمنا سامنا ہو گا، تو دونوں ہی کا بھلا ہو گا۔

ضمیمہ نمبر ۱

جس زمانے میں بالفور برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا، ڈیوڈ لائڈ جارج وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر متمکن تھا۔ روپے پیسے کے معاملے میں لائڈ جارج اور بالفور دونوں ہی خاصے بے ضمیر واقع ہوئے تھے۔ برطانیہ میں خطابات و اعزازات کا جو سلسلہ مروج ہے، وہ طبقاتی اونچ نیچ میں یقین رکھنے والے معاشرے کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ ان خطابات و اعزازات کے حصول کے لیے انگریز سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے وطن کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور یوں قوم نے تشکر کے طور پر انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ دوسری طرف ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو روپے کے بل بوتے پر یہ اعزازات حاصل کر لیتے ہیں۔ یوں تو خطابات اور اعزازات کی خرید و فروخت کا سلسلہ شاہ جیمز اول (۱۶۰۳-۱۶۲۵ء) کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ شاہ جیمز کو آئرلینڈ کے خلاف جنگوں کے لیے روپے پیسے کی شدید ضرورت رہتی تھی۔ یہ روپیہ اکٹھا کرنے کے لیے اس نے خطابات کی فروخت شروع کر دی۔ وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ یہ خطابات خریدیں اور جو لوگ لیت و لعل کرتے تھے، انہیں وہ بھاری جرمانے کرتا تھا۔ خطابات کی فروخت کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اگرچہ اب لوگوں سے رقوم پارٹی کے لیے چندے کے نام پر بٹوری جاتی ہیں۔ اتفاق سے اس کی ابتدا، بالفور نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں کی لیکن کہا جاتا ہے کہ لائڈ جارج کے عہد میں خطابات و اعزازات

کی فروخت کو جو عروج حاصل ہوا، اس کی مثال برطانیہ کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ لائڈ جارج نے جن لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں بٹوریں اور ان کے معاوضے میں انہیں خطابات سے نوازا، ان میں بدنام زمانہ سمگلر، سٹے باز، ذخیرہ اندوز، اور چور بازاری کا دھندا کرنے والے سبھی شامل تھے۔ موجودہ زمانے کے ایک مصنف اور صحافی جان واکر کی تصنیف The Queen Has Been Pleased (مطبوعہ سیکر اینڈ واربرگ، لندن، ۱۹۸۶ء) میں جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں، ان کے مطابق لائڈ جارج نے ان سودوں میں کم از کم پندرہ لاکھ پاؤنڈ کمائے۔ (یہ پندرہ لاکھ پاؤنڈ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیانی برسوں کے دوران میں وصول کئے گئے۔ اب جب کہ اشیا کی قیمتیں کم از کم سو گنا بڑھ چکی ہیں، فی زمانہ یہ رقم کم از کم پندرہ کروڑ پاؤنڈ بنے گی۔ اس وقت ایک پاؤنڈ کی قیمت کم از کم تیس روپے ہے۔ چنانچہ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم کم از کم ساڑھے چار ارب روپیہ ہو گی۔) لائڈ جارج خطابات کی اس خرید و فروخت کا دھندا اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کرتے تھے۔ جان واکر کے بیان کے مطابق اس کا ایک ایجنٹ مانڈی گریگوری دلالی کے اس دھندے میں کم از کم تیس ہزار پاؤنڈ سالانہ خود کما لیتا تھا۔ وہ شخص جو لارڈ (baron) کا خطاب حاصل کرنے کا متمنی ہوتا تھا، اسے پچاس ہزار سے ایک لاکھ پاؤنڈ تک ادا کرنا پڑتے تھے۔ جن لوگوں کو "نائٹ (عرف عام میں "سر") کا موروثی خطاب baronetcy ملتا تھا، وہ بیس سے چالیس ہزار پاؤنڈ اور خالی خولی "نائٹ" کا خطاب پانیوالے دس ہزار پاؤنڈ ادا کرتے تھے۔

لائڈ جارج نے محض رقوم ہی اکٹھی نہیں کی تھیں بلکہ اخبارات کا منہ بند کرنے کے لیے اس نے مالکوں اور صحافیوں پر بھی خطابات و القابات کی بارش کر دی۔

اس نے چار اخبارات (ٹائمز، ٹیلی گراف، آبزرور اور مرر) کے مالکوں کو وائی کاؤنٹ (برطانیہ میں نوابی خطابات کے پانچ درجے، بیرن، وائی کاؤنٹ ارل، مارکوئیس اور ڈیوک ہیں)، پانچ اخبارات کے مالکوں کو لارڈ (BARON) گیارہ اخبارات کے مالکوں یا مدیروں کو موروثی نائٹ اور تینتیس (۳۳) صحافیوں کو نائٹ ("سر") بنایا۔ جو چھوٹے موٹے خطابات دیے گئے، ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ تاہم سب سے زیادہ اخبارات کے مالک شخص لارڈ نارتھ کلف کو (BARON) بنانے کا اعزاز لارڈ بالفور اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں حاصل کر چکا تھا۔ لارڈ جارج نے البتہ اسے ایک درجہ اوپر اٹھا کر وائی کاؤنٹ بنا دیا۔

اگر انگریز کشمیر پچھتر لاکھ روپے میں فروخت کر سکتے تھے، تو یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے اور اسے ان کا وطن قرار دینے کے لیے بالفور اور لائڈ جارج جیسے لوگوں نے جو رقوم اینٹھی ہوں گی، ان کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ لیکن قرائن سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے ہوں گے۔ اگر یہ لوگ اپنی ہی قوم کے افراد کو سرمائے کے عوض خطابات والقابات فروخت کر سکتے تھے، تو بھلا فلسطین جیسا خطہ انہوں نے کیسے اللہ واسطے یہودیوں کے حوالے کرنے کی ہامی بھری ہوگی، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ (مترجم)

ضمیمہ نمبر ۲

حاشیہ صفحہ نمبر ۱۴۰ - لوخ نیس سکاٹ لینڈ (برطانیہ) کے شمالی سلسلۂ کوہ میں ایک طویل لیکن تنگ جھیل ہے، چونکہ یہ جھیل سنسان اور بے آباد علاقے میں واقع ہے، اس لیے یہاں تک رسائی آسان نہیں تھی۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں جب اس جھیل کو سڑک کے ذریعے ملک کے باقی حصوں سے ملا دیا گیا تو یہاں پہنچنا آسان ہو گیا۔

کم از کم چھٹی صدی عیسوی سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ اس جھیل میں ایک بہت خوفناک بلا رہتی ہے۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس بلا کو دیکھا ہے، سڑک کی تعمیر کے بعد یہاں سیاحوں کا تانتا بندھ گیا اور اس بلا کے قصے دنیا بھر کے اخبارات و جرائد میں شائع ہونے لگے بعض منچلے تو فوٹو بھی اتار لاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک فوٹو میں ایک نامعلوم جانور کے سر اور گردن جیسی چیز نظر آتی ہے۔

سائنسدان اس بلا کے وجود سے منکر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ محض نظر کا دھوکا ہے یا انسانی تخیل کی کرشمہ سازی۔ اصل میں جھیل کی لہریں بعض اوقات اس انداز سے اوپر اٹھتی ہے، جیسے کوئی عظیم الجثہ اور مہیب جانور پانی میں تیر رہا ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ برفانی دور سے قبل یہ جھیل سمندر کا حصہ تھی، برفانی دور میں یہ سمندر سے علیحدہ ہو گئی۔ ممکن ہے اس زمانے میں کوئی سمندری مخلوق اس میں پھنس گئی ہے۔ ۱۹۶۳ء کے بعد بے شمار سائنسی جماعتیں اس جھیل کا معائنہ کر چکی ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی بھی حتمی طور پر اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا کہ یہ بلا (یا عفریت) واقعی موجود ہے یا محض واہمہ ہے

حاشیہ صفحہ - ۱۸ ۵ ؎ یہاں مصنف نے لفظ GENTILE استعمال کیا ہے ابتداً یہودی فلسطین کے ہر اس شخص کو، جو یہودیت کا پیروکار نہیں تھا، حقارت سے GENTILE کہتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو برتر مخلوق اور غیر یہودیوں کو کافر اور مردود قرار دیتے تھے۔ بعد میں یہ لفظ انہوں نے عیسائیوں پر بھی منطبق کر دیا۔ اب اس لفظ میں حقارت کا پہلو نہیں پایا جاتا یہاں اس سے مراد یورپ کے عیسائی ہیں۔

حاشیہ صفحہ نمبر ۱۷۰۴۔ ۱؎ ویسے تو امریکی صدر کی سرکاری رہائش واشنگٹن کی عمارت "وائٹ ہاؤس" ہے۔ لیکن واشنگٹن سے قریب ریاست میری لینڈ میں ایک اور سرکاری رہائش گاہ بھی ہے۔ اس کا نام "کیمپ ڈیوڈ" ہے۔ یہاں اکثر اوقات صدر سیر و تفریح اور آرام کے لیے آتے ہیں۔

ISRAELI SETTLEMENTS ON THE WEST BANK